جلد دوم

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

فہرست

باب ۴

زکوٰۃ کے مصارف

۱ـــــ فقراء و مساکین (فقیر اور مسکین)

۲ـــــ عاملین علیہا (زکوٰۃ کے عامل)

۳ـــــ مؤلفۃ القلوب (تالیف قلب)

۴ـــــ فی الرقاب (غلاموں کی آزادی)

۵ـــــ الغارمون (مقروض)

۶ـــــ فی سبیل اللہ (راہِ خدا)

۷ـــــ ابن السبیل (مسافر)

۸ـــــ مذکورہ مستحقین کے بارے میں چند مباحث۔

۹ـــــ وہ اصناف جن پر زکوٰۃ صرف نہیں کی جاتی۔

قرآن کریم میں زکوٰۃ کا ذکر اسی طرح اجمال کے ساتھ آیا ہے جس طرح قرآن کریم میں نماز کا ذکر اجمالاً آیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں نہ تو ان اموال کا ذکر ہے جن پر زکوٰۃ واجب ہے اور نہ اس کی مقادیر کا ذکر ہے۔ اور نہ ہی اس کے وجوب کی شرائط بیان کی گئی ہیں مثلاً سال کا گزرنا، ایک محدود نصاب ملکیت میں ہونا، اور نصاب سے کم کا زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونا۔

زکوٰۃ کی یہ تفصیلات سُنّت تشریعی ـــــ قولی اور عملی ـــــ میں بیان ہوئی ہیں جس طرح کہ نماز کی تفصیلات بھی سُنّت ہی میں ذکر ہوئی ہیں۔

زکوٰۃ سے متعلق احادیث ثقہ راویوں کی ایک بڑی جماعت سے ہر دور میں منقول ہوتی رہی ہیں اس لیے ان پر ایمان لانا لازمی ہے کہ قرآن کریم کے بعد دوسرا تشریعی مأخذ سُنّتِ رسولؐ ہے جو درحقیقت بیان اور تشریح اور تفسیر ہے قرآن کریم کی۔ اور خود اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (النحل : ۴۴)

اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور تاکہ لوگ خود بھی غور و فکر کریں۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ کسی شخص نے حضرت عمران بن حصین سے کہا کہ ابونجید! آپ حضرات ایسی حدیثیں بھی بیان کرتے ہیں جن کی اصل ہمیں قرآن میں نہیں ملتی۔ عمران یہ سن کر غصہ ہو گئے اور فرمایا کیا تمھیں قرآن میں یہ مل گیا ہے کہ "ہر چالیس درہم پر ایک درہم زکوٰۃ ہے" اور فلاں فلاں جانوروں کی اس تعداد پر ایک بکری زکوٰۃ ہے" "اور اونٹوں کی تعداد پر اتنے اونٹ زکوٰۃ ہے"ـــــ اس نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ پھر یہ اصول تمھیں کہاں سے ملے، یہ تمھیں ہم سے

ملے اور ہمیں نبی کریمؐ سے ملے؟ روایت ہیں ہے کہ انھوں نے بطور مثال کئی باتیں ذکر فرمائیں۔[۱]

مصارفِ زکوٰۃ اور قرآن

اگرچہ قرآن کریم میں زکوٰۃ کا حکم اجمالاً آیا ہے لیکن قرآن کریم نے مصارف زکوٰۃ کو بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان کر دیا ہے تاکہ زکوٰۃ کی تقسیم حاکم کی اپنی مرضی پر موقوف نہ رہے اور اس میں حکمرانوں کا تعصب اور ان کے اپنے مفادات راہ نہ پا سکیں۔ اور اسی طرح ان لالچی لوگوں کو بھی ان کی حدود میں رکھا جاتے جو ایسے مال کو حاصل کرنے سے خدا سے نہیں ڈرتے جس کا حصول ان کے لیے روا نہیں ہے اور جو معاشرتی زندگی میں اپنے زور بازو سے اہل حاجت اور تنگدست لوگوں کے حقوق غصب کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

خود عہد رسالتؐ میں بعض طامع افراد نے صدقات میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی مگر جب آپؐ نے ان کی اس خواہش کو رد کر دیا تو انھوں نے سرورِ کائناتؐ کو الزامات سے مطعون کرنا شروع کر دیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور ان کے نفاق، طمع اور حرص کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا گیا ـــ

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ۝ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (التوبہ : ۵۸ تا ۶۰)

۱۔ مختصر سنن ابی داؤد، للمنذری : ج ۲، ص ۱۷۴۔

اے نبی، ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اگر اس مال میں سے انھیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ بھی اُنھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا۔ اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا، ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں۔

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے، راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

ابوداؤد نے زیاد بن الحارث الصدائی سے روایت نقل کی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور میں نے بیعت کی ——— ان الفاظ کے ساتھ وہ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہیں ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ مجھے صدقات میں سے دیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی یا غیر نبی کے فیصلے پر صدقات کو نہیں چھوڑا بلکہ خود ہی مصارف زکوٰۃ بیان فرما دیئے۔ ان آٹھ مصارف میں سے اگر تم کسی میں داخل ہو تو میں تمھیں دیئے دیتا ہوں۔[1]

مصارفِ زکوٰۃ پر قرآن کی توجہ کی حکمت

ماہرین اقتصادیات اور اجتماعیات کا بیان ہے کہ مختلف براہِ راست

---

[1] اس روایت کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم الافریقی ہے، جس کے بارے میں نقد کیا گیا ہے (مختصر المنذری: ج ۲، ص ۲۳۰)۔

اور بالواسطہ (DIRECT INDIRECT TAXES) ٹیکس لگا کر انہیں وصول کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور دنیا کی حکومتیں ٹیکس وصول کرتی ہی رہتی ہیں اور اکثر عدل و انصاف کے تقاضے بھی پورے کرتی ہیں لیکن اصل اور اہم مسئلہ ان ٹیکسوں کے صرف کرنے کا ہے کہ مصارف میں عدل و انصاف کی میزان برابر نہیں رہتی اور یہ مال ان لوگوں کو مل جاتا ہے جو درحقیقت اس کے مستحق نہیں ہوتے اور وہ لوگ محروم ہو جاتے ہیں جو فی الواقع مستحق ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زکوٰۃ کے وجوب کی تفصیلات اگرچہ بیان نہیں کی ہیں لیکن اس کے مصارف کو تفصیل کے ساتھ اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

مالیاتی تاریخ اس امر سے متعارف ہے کہ اسلام سے قبل دنیا میں لوگوں سے متعدد ٹیکس برضا یا جبراً وصول کیے جایا کرتے تھے اور پھر وہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے خزانوں میں جمع ہو جایا کرتے تھے اور انہی کے لوگوں، مددگاروں اور رشتہ داروں پر خرچ ہوا کرتے تھے یا پھر بادشاہوں کی شان و شوکت کے بڑھانے اور ان کے دبدبے اور رعب میں اضافہ کرنے کے لیے مستعمل ہوا کرتے تھے اور فقیر و مسکین اور ضعیف و ناتواں عوام محروم رہ جایا کرتے تھے۔

اسلام نے سب سے پہلے ضرورت مندوں کی ضرورتوں کی کفالت کی جانب توجہ دی اور مال زکوٰۃ میں اور دیگر محصولاتِ سرکاری (STATE REVANUES) میں ان کا باقاعدہ حصہ مقرر کیا اور اس اجتماعی اصلاح سے اسلام نے نظام مالیات (FINANCIAL SYSTEM) اور نظام ضرائب (TAXES) کو ایسی پیش رفت عطا کی جس سے انسانیت ابھی تک ناآشنا تھی۔

آئندہ سات فصلوں میں ہم قرآن و سنت کی روشنی میں مستحقین زکوٰۃ کا بیان کریں گے اور آخری فصل میں ان لوگوں کی اصناف بیان کریں گے جن پر زکوٰۃ کو صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

پہلی فصل

فقراء اور مساکین

سورۃ توبہ کی آیت نے مصارف زکوٰۃ کی آٹھ مصارف میں تحدید کردی ہے جن میں اولین دو مصرف فقراء اور مساکین ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کا مقصد اول معاشرہ سے فقر (تنگدستی) اور عوز (ناداری) کا خاتمہ کرنا ہے۔

اس لیے کہ آیت قرآنی میں مصارف زکوٰۃ کے بیان میں پہلے فقراء اور مساکین کو بیان کیا گیا ہے اور عربی زبان کا اسلوب بلاغت یہ ہے کہ اہم ترین امور کو پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔

فقراء کی کفالت اور فقر کا خاتمہ چونکہ اسلامی معاشرہ کا مقصد اولین ہے اسی لیے نبی کریمؐ نے بعض احادیث میں صرف اسی کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ جب آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو یہ ہدایت فرمائی۔

"انھیں آگاہ کردو کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہے جو ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقیروں کو لوٹائی جاتی ہے"

فقیر اور مسکین کون ہیں؟

فقیر اور مسکین کون ہیں؟ کیا یہ دونوں مل کر ایک ہی صنف ہیں یا جداگانہ اصناف ہیں؟

امام ابو یوسف اور ابن القاسمؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی صنف ہیں[1] لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ علیحدہ علیحدہ اصناف ہیں مگر بہرحال ان دونوں کی تشریح اور تعبیر (INTERPRETION) میں فقہاء اور مفسرین کا اختلاف ہے نیز یہ کہ آیت میں ان کا ذکر

---

[1] حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۴۹۲۔ وشرح الازہار، ج ۱، ص ۵۰۹۔

ایک ساتھ آیا ہے تو ان سے کیا مراد ہے کہ فقیر اور مسکین کے الفاظ اسلام اور ایمان کی طرح ہیں کہ اگر یہ یکجا ہوں تو ان کے معنی جُدا جُدا ہوتے ہیں اور اگر جُدا جُدا ہوں تو ان میں سے ایک دوسرے کے معنی کو بھی مشتمل ہو جاتا ہے۔

بہرحال آیتِ توبہ میں فقراء اور مساکین دونوں کا ذکر کیا گیا ہے تو ان کے معنی کی تحدید کیا ہو گی؟

شیخ المفسرین امام طبریؒ کہتے ہیں کہ[1] فقیر سے مراد وہ مُتعفِّف (دست سوال دراز نہ کرنے والا) محتاج ہے جو سوال نہ کرے۔ اور مسکین وہ بے کس محتاج ہے جو سوال کرے، اور اس کی تائید خود لفظ مَسکنت سے ہوتی ہے جیسا کہ یہود کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (البقرہ : ۶۱)

ذلت وخواری اور پستی وبدحالی ان پر مسلّط ہو گئی۔

اور حدیث صحیح میں جو یہ آیا ہے کہ

"مسکین وہ نہیں ہے جو ایک دو کھجور لے کر چلا جائے... مسکین وہ ہے جو دست سوال دراز نہ کرے[2]"

تو دراصل یہ حدیث اس حدیث کے قبیل کی ہے، اور یہاں پر یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔

"بہادر وہ نہیں ہے جو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قدرت رکھے[3]"

اور اسی کی مثل دیگر احادیث[4]

---

[1] تفسیر الطبری : ج ۱۴، ص ۳۰۸، ۳۰۹ - ط - المعارف -

[2] آگے یہ حدیث مکمل آرہی ہے -

[3] روایت ابوہریرہؓ، متفق علیہ : بلوغ المرام : باب الترہیب من مساوئ الاخلاق . ص ۳۰۲ -

[4] مثلاً "اندرون من المفلس"، اور "ماتعدون الرقوب فیکم" (المغنی ، ج ۶، ص ۵۷۴ - ط الامام)

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت مسکین وہی سمجھا جاتا تھا جو جاکر سوال کرتا ہو۔ اور اس صورت میں حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ مسکین وہ نہیں ہے جو سوال کرے کہ سوال کرنے سے اس کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے اور اس کی مسکنت ختم ہوجاتی ہے لیکن جو سوال نہ کرے اس کی حاجت اور مسکنت باقی رہتی ہے اور اس کا علم بھی نہیں ہوتا کہ اسے دیا جاسکے[۱]

فقیر اور مسکین میں سے کس کی حالت زیادہ خراب ہوتی ہے اس بارے میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے مسلک شافعیؒ اور مسلک حنبلیؒ کے فقہاء کے نزدیک فقیر کی حالت زیادہ خراب ہوتی ہے، اور مسلک مالکؒ اور مسلک ابوحنیفہؒ کے فقہاء کے نزدیک صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اس سلسلے میں ان فقہاء کے از روئے زبان اور از روئے شریعت اپنے اپنے دلائل بھی موجود ہیں۔

اس اختلاف کے باوجود یہ فقہاء بیان کرتے ہیں کہ اس اختلاف کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ باب زکوٰۃ میں یہ تحقیق کچھ زیادہ سود مند ہے[۲]

۱؎ معالم السنن، ج ۲، ص ۲۳۲۔

۲؎ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں جوزف شاخت نے مسئلہ فقر کو بہت توڑ مروڑ کر بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ

> "فقراء اور مساکین کے درمیان زبردستی فرق پیدا کیا گیا ہے کیونکہ فقہاء کی عادت یہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر جس حالت میں خود ہوتے اسی کے لحاظ سے ان الفاظ کی تشریح کردیا کرتے تھے، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ج ۱۰، ص ۳۶۰"

یہ بکواس صرف وہ شخص ہی کرسکتا ہے جس میں ذرا سا بھی علماء کا سا اخلاق موجود نہ ہو۔ کیا فقہائے احناف میں سے السرخسی فقہائے مالکیہ میں سے ابن العربی، فقہائے شافعیہ میں سے النووی فقہائے حنابلہ میں سے ابن قدامہ اور فقہائے ظاہریہ میں سے ابن حزم خود کو فقیر اور مسکین بتا کر زکوٰۃ لینے کے متمنی تھے اور مادی منفعتوں کے حصول کے لیے فقہی تعریفات میں ردوبدل کردیا کرتے تھے بلاشبہ نہیں! بلکہ یہ فقہائے کرام یا تو خود غنی تھے اور سخاوت کیا کرتے تھے یا فقراء زاہد اور درویش خدا مست تھے جنھیں دنیا سے کوئی محبت نہیں تھی اور ان کی سیرتیں ان کے اعلیٰ کردار کی شاہد عدل ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فقہائے احناف کے نزدیک فقیر اور مسکین

فقہائے احناف کے نزدیک جو شخص زکوٰۃ کے نصاب شرعی سے کم کا مالک ہو وہ فقیر ہے یا اس کے پاس مقدار نصاب سے کم کی مالیت یعنی گھر کا سامان، کپڑے اور کتابیں وغیرہ ہوں وہ بھی فقیر ہے۔ اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

بعد ازاں فقہائے احناف میں یہ اختلاف بھی ہے کہ نصاب کی تحدید سے نصاب نقد یعنی دو سو درہم مراد ہیں یا کسی بھی مال کا نصاب مراد ہے [۱]

بہر حال ان کے نزدیک فقر اور مسکنت کے وصف کے حامل مستحق زکوٰۃ یہ ہیں:-

۱) جس کے پاس بالکل کچھ نہ ہو یعنی مسکین۔
۲) جو گھریلو استعمالی ساز و سامان کا مالک ہو، خواہ اس کی قیمت کتنی ہی ہو، لیکن وہ مستغنی نہ ہو۔
۳) جس کے پاس دو سو درہم سے کم کی مالیت موجود ہو۔
۴) جو علاوہ نقود کے دیگر اموال کے نصاب زکوٰۃ سے کم کا مالک ہو۔ مثلاً چار اونٹ یا انتالیس بکریاں۔

ان صورتوں کے علاوہ ایک اور صورت ہے جو اختلافی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص نصاب نقد کے علاوہ نصاب کا مالک ہو یعنی اس کے پاس پانچ اونٹ یا چالیس بکریاں ہوں مگر ان کی

(بقیہ آگے) رہ گیا شاخت کا یہ کہنا کہ ان الفاظ کی تعریفات میں زبردستی فرق پیدا کیا گیا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شاخت جیسا جاہل آدمی عربی زبان کے الفاظ کے اس قدر باریک معنوی فرق کو محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ گو یہ مسئلہ زبان و لغت کا پہلے ہے اور فقہ و قانون کا بعد میں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کی طرح اس فرق کو مفسرین اور لغت کے ماہرین بھی زیر بحث لائے ہیں اور ان میں موجود فرق کو بیان کیا ہے اور یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس فرق کے بارے میں اختلاف رائے بذات خود مسئلہ زکوٰۃ پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

[۱] مجمع الانہر، در المنتقی، بہامشہ، ص ۲۲۰، ۲۲۳۔

قیمت دو سو درہم نہ بنتی ہو۔ تو بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اسے زکوٰۃ لینا بھی حلال ہے اور اس پر زکوٰۃ واجب بھی ہے اور بعض دیگر اسے غنی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے زکوٰۃ لی جائے گی اور اسے دی نہیں جاتے گی۔[1]

اس کی مزید وضاحت ہم اس غنی کے بیان کے ضمن میں کریں گے جو زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فقیر اور مسکین

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فقر اور مسکینی کا مدار نصاب کی ملکیت کے نہ ہونے پر نہیں ہے بلکہ بقدر کفایت کے مالک نہ ہونے پر ہے۔

ان کے نزدیک فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی موجود نہ ہو اور نہ اس کے لائق کسبِ حلال موجود ہو جس سے اسراف کے بغیر اس کے کھانے پینے رہنے سہنے کی ضرورتیں پوری ہو سکیں، مثلاً اگر دس درہم یومیہ کی ضرورت ہو اور اس کے پاس چار یا تین یا دو درہم ہی موجود ہوں۔

اور مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال ہو یا اس مقدار کا کسبِ حلال ہو جس سے وہ اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے لیکن مکمل طور پر نہیں، مثلاً اگر کسی کی ضرورت دس درہم کی ہے مگر اسے سات یا آٹھ درہم ہی میسر ہوں، اگرچہ وہ نصاب کا مالک ہو۔

بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جس کے پاس اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بقدر کفایت کے نصف سے زائد موجود ہو وہ مسکین ہے اور جس کے پاس قدر کفایت کے نصف سے کم موجود ہو وہ فقیر ہے۔[2]

اس تعریف کے لحاظ سے فقیر کے نام سے یا مسکین کے نام سے مستحق زکوٰۃ ان تینوں میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے۔

۱) جس کے پاس نہ کوئی مال ہو اور نہ اس کا کوئی کسب (کمائی کا ذریعہ) ہو۔

---

[1] بحوالہ مذکور۔

[2] شمس الدین الرملی: نہایۃ المحتاج، ج ۶، ص ۱۵۱، ۱۵۲۔

۲) مال یا کسب تو ہو لیکن اس کی اور اس کے زیرِ کفالت افراد کی نصف سے کم ضروریات اس سے پوری ہوتی ہوں۔

۳) مال یا کسب ہو اور اس سے اس کی اور اس کے زیرِ کفالت افراد کی نصف سے زائد ضروریات پوری ہو جاتی ہیں مگر ضروریات کی پوری تکمیل نہ ہوتی ہو۔

مسلک مالکؒ اور مسلک احمد بن حنبلؒ کے فقہاء کے نزدیک فقیر یا مسکین کی کفایت سے مراد پورے سال کی کفایت ہے جبکہ مسلکِ شافعیؒ کے فقہاء کے نزدیک کفایت سے فقیر یا مسکین جس شہر یا ملک میں رہتا ہو وہاں کی پوری عمر کی کفالت مراد ہے مثلاً اگر بالعموم عمر ساٹھ سال ہوتی ہو اور اس کی تیس سال عمر ہو چکی ہو اور اس کے پاس صرف بیس سال کے گزارے کے لائق مال ہو تو وہ دس سال کی کفایت کے بقدر مال کا زکوٰۃ سے مستحق ہوگا۔

شمس الدین رملی کہتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا اس طرح تو لازم آئے گا کہ اکثر اغنیا بھی زکوٰۃ میں حصہ دار بن جائیں گے کیونکہ جس شخص کے پاس ایسا مال ہو جس کا منافع اسے کافی ہو، یا ایسی زمین جائیداد ہو جس کی آمدنی اسے کفایت کر جائے وہ غنی ہے اور اس لحاظ سے اکثریت اغنیاء کی ہے[1]۔

اگر فقیر یا مسکین کے پاس اس کا رہائشی گھر ہو جس کی اسے ضرورت ہو تو اس گھر سے اس کا فقر اور اس کی مسکنت ختم نہیں ہوگی اور نہ اسے اس گھر کی فروخت کا مکلف ٹھہرایا جائے گا۔ اور اسی طرح جس کے پاس اتنی زمین ہو جس کی آمدنی اس کے لیے کافی نہ ہو تو وہ فقیر یا مسکین ہے۔ ہاں البتہ اگر وہ زمین ایسی قیمتی ہو کہ اس کے فروخت کر دینے سے اسے ایسا روزگار میسر آ سکے جس کی آمدنی اسے کافی ہو جائے تو اسے فروخت کر دینے کے لیے کہا جائے گا۔

کپڑے بھی رہائشی گھر کی طرح ہیں[2] اگرچہ وہ متعدد ہوں اور برائے زیبائش ہوں۔ اور عورتوں

---

[1] بحوالہ مذکور۔

[2] اگر کسی کے پاس اپنا گھر ہو یا ایسا گھر ہو جس میں وہ رہ سکتا ہو اور اس کے باوجود وہ کرائے کا گھر لے کر رہتا ہو تو صاحب نہایۃ المحتاج کے نزدیک اس کا فقر ختم ہو گیا اور دوسرے فقہاء کے نزدیک نہیں ہوا۔

حاشیۃ الشبراملسی علی نہایۃ المحتاج: ج ۶، ص ۱۵۰۔

کے زیور جن کو وہ عادتاً آرائش کے لیے پہنتی ہوں، ان چیزوں سے فقر اور مسکنت ختم نہیں ہوتی۔

علمی کتابیں جن کی اسے ضرورت پیش آتی ہو خواہ سال بھر میں ایک ہی مرتبہ ان کی ضرورت ہوتی ہو، اور خواہ وہ کتابیں فقہ وحدیث اور تفسیر کی ہوں یا طب اور دیگر دنیوی علوم کی ہوں، ان کی موجودگی سے فقر اور مسکنت ختم نہیں ہوتی اور اسی طرح آلات حرفت اور ادویاتِ صنعت سے فقر اور مسکنت ختم نہیں ہوتی۔

نیز وہ مال جس سے مالک انتفاع نہ کر سکے اس کی ملکیت سے فقر اور مسکنت ختم نہیں ہوتے مثلاً اس کا مال کسی دوسرے ملک میں ہو اور وہ اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکتا ہو، یا ظالم حکومت نے جبراً اس پر کوئی پابندی لگا دی ہو یا کسی کی زیرِ حفاظت (CUSTODY) دے دیا ہو۔

یہی صورت ان قرضوں کی ہے جو کسی شخص نے ایک مدت مقررہ کی ادائیگی پر دیئے ہوں (دیون مؤجل) کہ ان سے اس شخص کا فقر اور مسکنت ختم نہیں ہوتے اس لیے کہ فی الحال وہ تنگدست ہے اور جب تک قرضوں کی وصولیابی کا وقت نہ آجائے وہ تنگدست ہی ہے [1]

فقراء اور مساکین کے حصہ میں غنیٔ (مالدار) حصہ دار نہیں ہوتا

فقر اور مسکنت کی وضاحت اور ان مستحقین کی تحدید کے لیے جن میں فقر یا مسکنت موجود ہو ضروری ہے کہ ان کے مدِ مقابل وصف کا بیان کیا جائے، جس وصف کا حامل فقر اور مسکنت کے وصف سے خالی متصور کیا جائے اور یہ وصف غناء (مالداری) ہے۔

فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فقراء اور مساکین کے حصہ میں سے کوئی بھی حصہ کسی مالدار کو نہیں مل سکتا اس لیے کہ زکوٰۃ فقراء اور مساکین کا حصہ ہے اور غنی (مالدار) ان میں داخل نہیں ہے۔ اور فرمان نبوتؐ ہے کہ

وزکوٰۃ ان کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء پر لوٹائی جاتی ہے؛

اور آپؐ کا فرمان ہے کہ

---

[1] نہایۃ المحتاج، ج ۶، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

"غنی کو صدقہ حلال نہیں ہے"[1]

اور نیز اس لیے کہ اگر غنی کو یہ مال مل جائے گا تو ظاہر ہے کہ جو اصل مستحق ہے وہ محروم رہ جائے گا جو خلافِ حکمت ہے جیسا کہ ابن قدامہ نے کہا ہے[2]

لیکن مسئلہ زکوٰۃ کے ضمن میں ہم کس شخص کو غنی قرار دے سکتے ہیں اور غنا (مالداری) کی کیا حد مقرر کرسکتے ہیں۔

مالداری (غنا) کی وہ حد جو وصول زکوٰۃ سے مانع ہے

فقہائے کرام کا غِنا (مالداری) کی اس حد پر اتفاق ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے یعنی یہ کہ خاص شرائط کے ساتھ کوئی شخص کسی افزائش پذیر مال کے مقررہ نصاب کا مالک ہو۔ جبکہ غِنا (مالداری) کی اس حد میں جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہوجائے درج ذیل آراء ہیں[3]

امام ثوریؒ وغیرہ کا مسلک

امام سفیان ثوریؒ ابن المبارکؒ اور اسحاق بن راہویہ[4] کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پچاس درہم یا اس کے مساوی سونے یعنی چوتھائی نصاب کا مالک ہو اس پر زکوٰۃ اور صدقات میں سے لینا حرام ہے۔

دلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ حدیث ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس مال ہو جو اسے غنی کردے تو وہ روزِ قیامت زخمی چہرہ لیے ہوئے آئے گا۔ کسی نے آپ سے

---

[1] ابوداؤد، ترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

[2] المغنی مع الشرح الکبیر۔ ج ۲، ص ۵۲۳۔

[3] غِنا کی ایک صورت یہ ہے کہ اس میں سوال نہ ہو اگرچہ لینے کی اجازت ہو، اس لیے کہ شریعت میں سوال کرنا ضرورت ہی کے وقت جائز ہے۔ اگرچہ اس بارے میں بھی اختلاف ہے جسے ہم آگے کسی مناسب موقعہ پر بیان کریں گے۔

[4] معالم السنن، ج ۲، ص ۲۲۶۔

پوچھا کہ غنیٰ کیا ہے آپؐ نے فرمایا کہ کسی کے پاس پچاس درہم یا اس کی قیمت کے بقدر سونا ہو تو وہ غنی ہے[1]۔

یہ مسلک امام احمدؒ سے بھی مروی ہے۔

اس روایت میں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اس میں نقود (سونا اور چاندی) کی ملکیت میں اور دوسری اشیاء کی ملکیت میں فرق کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص نقود کے علاوہ اشیاء کا مالک ہو اور ان اشیاء سے اس کی کفایت نہ ہوتی ہو تو وہ غنی نہیں ہے اگرچہ ان کی قیمت زیادہ ہو۔ اور اگر پچاس درہم یا اس کے بقدر سونے کا مالک ہو تو وہ غنی ہے اس لیے کہ نقود کے ذریعہ وہ بلاواسطہ اپنی ضروریات رفع کر سکتا ہے جبکہ دیگر اشیاء سے نہیں کر سکتا۔

لیکن محدثین کرام نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس کے ضعف کی وجوہ بھی بیان کی ہیں[2] اور اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو فقہاء نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ اس کا مخاطب مخصوص لوگ تھے جو پچاس درہم سے تجارت کر رہے اور اس سے بقدر کفایت منافع حاصل کر رہے تھے۔ جبکہ بعض دیگر فقہاء نے یہ توجیہ کی ہے کہ جس وقت آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا اس وقت بالعموم پچاس درہم کافی ہو جاتے تھے[3]۔

اور ایک توجیہ اس کی یہ ہے کہ اس کا تعلق سوال سے ہے کہ جو پچاس درہم کا مالک ہو اس کو مانگنا حرام ہے لیکن لینا حرام نہیں ہے اور یہ تاویل زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ جس کے پاس پچاس درہم ہوں اس کو صدقہ جائز نہیں ہے صرف اتنا ہے کہ سوال کرنا مکروہ ہے کیونکہ سوال ضرورت پڑنے پر کیا جاتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ۔ ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور باقی ائمہ نے ضعیف کہا ہے۔ مختصر السنن للمنذری: ج ۲، ص ۲۲۶، ۲۲۷۔

[2] الانصاف: ج ۲، ص ۲۲۱، ۲۲۲۔

[3] معالم السنن۔ ج ۲، ص ۲۲۶۔

اور جس کے پاس وقتی گزارے کے لیے کچھ رقم موجود ہو اسے سوال نہیں کرنا چاہیے[1]

فقہائے احناف کی رائے

فقہائے احناف کے نزدیک جس غنی کو صدقہ لینا حرام ہے اس کے دو پہلو ہیں، یا تو وہ:-

۱) کسی مال کے نصابِ زکوٰۃ کا مالک ہو، مثلاً پانچ مویشی اونٹوں کا مالک ہو، یا اس کے پاس دو سو درہم ہوں یا وہ بیس دینار رکھتا ہو (۸۵- گرام- سونا) اس لیے کہ شریعت میں دو ہی قسمیں ہیں یعنی ایک تو غنی ہے جس سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے اور ایک فقیر ہے جسے زکوٰۃ لوٹائی جاتی ہے۔ اور ایک ہی وقت کسی شخص کا غنی بھی ہونا اور فقیر بھی ہونا درست نہیں ہے مثلاً کوئی شخص صاحبِ نصاب ہو اور اس پر زکوٰۃ لازم آتی ہو مگر وہ کثیر العیال ہو اور اس کے بہت سے اخراجات کی ضرورت ہو، تو اس شخص کو بھی نہ تو زکوٰۃ دینا جائز ہے اور نہ اس کا قبول کرنا درست ہے۔

بعض حنفی فقہاء نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں نقود (زرِ نقد) کا حساب ہوگا، خواہ کوئی بھی مال اس کے پاس موجود ہو اور خواہ وہ مال بجائے خود نصاب ہو یا نہ ہو۔ مثلاً کسی شخص کے پاس چالیس بکریاں ہیں جو کہ بکریوں کا تو نصاب ہے لیکن ان کی قیمت دو سو درہم نہیں بنتی، تو اس اعتبار سے اسے فقیر متصور کیا جائے، اسے زکوٰۃ بھی دی جائے گی اور اسے زکوٰۃ لینا جائز بھی ہوگا۔

اس رائے کے حق میں اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے۔ کہ

وجس کے پاس ضرورت کا مال موجود ہو اور وہ سوال کرے تو اس کا سوال کرنا الحاف میں داخل ہے، آپؐ سے سوال کیا گیا کہ ضرورت کی کیا مقدار ہے۔ فرمایا دو سو درہم[2]

مگر یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کا تعلق اُس غنا سے ہے جس میں سوال کرنا درست نہیں ہے اور اس سے ان فقہاء کی رائے کی تردید نہیں ہوتی جو یہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس دو سو درہم ہوں مگر وہ اس کی ضرورت کو کافی نہ ہوں تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے، اس لیے کہ غنا

---

[1] بحوالہ مذکور۔

کی جس مقدار سے سوال کرنا حرام ہو جاتا ہے اس مقدار سے زکوٰۃ کا لینا حرام نہیں ہوتا۔

ان دونوں مذکورہ بالا آراء کے بارے میں فقہائے حنفیہ کے مابین طویل مباحث ہیں، جنھیں ان کی کتابوں میں دیکھا جائے[1]

۲) اس کے پاس اس کی ضرورت سے فاضل مال ہو اور اس کی قیمت دو سو درہم بنتی ہو، مثلاً زائد از ضرورت کپڑے، بستر، سامان، کتابیں، گھر، دکانیں، اور سواری کے جانور وغیرہ ہوں، جو برائے تجارت نہ ہوں بلکہ برائے استعمال ہی ہوں، اگر اس زائد از ضرورت سامان کی قیمت دو سو درہم ہو تو اسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے۔

مثلاً کسی کے پاس دو گھر ہوں اور ان میں سے ایک گھر زائد از ضرورت ہو، جس کی قیمت دو سو درہم ہو تو اسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہوگا، یا مثلاً کتابیں اور پیشہ ورانہ آلات اسے میراث میں ملے ہوں اور اس کے کام نہ آتے ہوں اور وہ بقدر نصاب قیمت کے حامل ہوں تو اُسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہوگا۔

الکاسانی البدائع میں لکھتے ہیں ــــ

والکرخی نے اپنے مختصر میں ذکر کیا ہے کہ اگر کسی کا گھر ہو اور گھر کا سامان بھی ہو یعنی بستر، کپڑے، ہتھیار، خادم اور کتابیں وغیرہ اور ان میں بقدر دو سو درہم اشیاء ضرورت سے زائد ہوں تو اسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ صحابہ کرام اس شخص کو بھی زکوٰۃ دیا کرتے تھے جو گھوڑے، گھر اور خادم کی صورت میں دس ہزار درہم کا مالک ہوتا تھا ــــ اس لیے کہ یہ اشیاء ضروریات میں داخل ہیں اور بلحاظ زکوٰۃ ان کا وجود اور عدم وجود مساوی ہے[2]

---

[1] مثلاً ملاحظہ کیجیے۔ الدر المختار و حاشیۃ رد المحتار: ج ۲، ص ۸۸، ۸۹۔
مجمع الانہر، و در المنتقی، ص ۲۲۳۔

[2] الکاسانی: بدائع الصنائع: ج ۲، ص ۴۸۔

"الفتاوی" میں ہے کہ اگر کسی کے پاس برائے آمدنی کوئی دکان ہو یا کوئی باغ ہو اور اس کی پیداوار آتی ہو مگر یہ آمدنی اس کی اور اس کے اہل خانہ کی ضرورت کو کافی نہ ہو تو وہ فقیر ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک اس کا زکوٰۃ لینا جائز ہے مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

اور اگر اس کے پاس دو سو درہم کی کھانے کی اشیاء ہوں جو اسے ایک ماہ یا ایک سال کے لیے کافی ہوں تو ایک قول یہ ہے کہ اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ غذا خرچ کے لیے ہے اس لیے نہ ہونے کے درجے میں ہے، اور مروی ہے کہ آپؐ ازواج مطہرات کی ایک سال کی اجناس محفوظ فرما دیتے تھے۔

اور اگر کسی کے پاس گرمی کے موسم میں سردیوں کے کپڑے ہوں تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔

"فتاوی تاتار خانی" میں "الصغری" سے مروی ہے کہ اگر کسی کے پاس گھر برائے سکونت ہو اور گھر اتنا بڑا ہو کہ اس کا کچھ حصہ استعمال میں نہ آتا ہو تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ (یعنی اگر وہ فقیر ہو)

امام محمدؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کسی شخص کے پاس زمین ہو، جس میں زراعت ہوتی ہو، یا دو کانیں ہوں جن کی آمدنی آتی ہو یا اس کے پاس گھر ہو جس کی آمدن تین ہزار کی ہو، جو اس کے اور اس کے اہل خانہ کے اخراجات کے لیے کافی نہ ہو۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ اس شخص کو زکوٰۃ لینا جائز ہے خواہ اس کی یہ ناکافی آمدن ہزاروں تک پہنچتی ہو، مگر امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن فتویٰ امام محمدؒ کے قول کے مطابق ہے۔

ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ عورت کا جہیز کا سامان کپڑے، برتن وغیرہ عورت کے استعمال کی اشیاء ہیں اور ضروریات میں داخل ہیں۔ لیکن جو زیورات، سامان اور برتن وغیرہ ضرورت کے نہ ہوں بلکہ محض آرائش کے ہوں وہ اگر بقدر نصاب ہوں تو عورت غنی (مالدار) متصور ہوگی۔

ابن عابدین فرماتے ہیں کہ میں نے فتاوی تاتار خانیہ، میں باب صدقۂ فطر میں دیکھا کہ حضرت حسن بن علیؓ سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی عورت کے پاس جواہر اور موتی ہوں جو وہ نقریبات میں پہنتی ہو اور یہ اشیاء برائے تجارت نہ ہوں تو کیا ان پر صدقۂ فطر ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ

اگر بقدر نصاب ہوں تو صدقۂ فطر لازم ہے۔ اور عمر الحافظ نے اس بارے میں کہا کہ اس عورت پر کچھ لازم نہیں ہے۔

اس پر ابن عابدین کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ زر نقد کے علاوہ زیورات کے حوائج اصلیہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے [1]

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ کا مسلک

آخری مسلک یہ ہے کہ غنا (مالداری)

یہ ہے کہ بقدر کفایت موجود ہو اور احتیاج نہ ہو، اور احتیاج نہ ہونے کی صورت میں زکوٰۃ حرام ہے اگرچہ وہ کسی شئے کا مالک نہ ہو اور اگر احتیاج ہو تو زکوٰۃ لینا حلال ہے خواہ نصاب کا مالک ہو یا کئی نصابوں کا مالک ہو۔ یہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے۔

خطابی بیان کرتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ غنا (مالداری) کی کوئی حد متعین نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں انسان کی وسعت کی حالت کا اعتبار ہوگا یعنی اگر اس کے پاس بقدر کفایت موجود ہو تو اسے زکوٰۃ لینا حرام ہے اور اگر اسے ضرورت ہو تو اس کے لیے صدقہ حلال ہے [2]

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا ذریعۂ معاش (کسب) موجود ہو تو وہ ایک درہم ہونے کی صورت میں بھی غنی ہے لیکن اگر وہ کسب کے قابل نہیں ہے اور کثرت عیال کا حال ہے تو وہ ہزار دینار کا مالک ہونے کے باوجود بھی غنی نہیں ہوگا [3]

اس مسلک کی تائید نصوص کتاب و سنت اور روح شریعت سے ہوتی ہے اور زبان و لغت سے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ بہر حال اس مسلک کے حق میں دلائل درج ذیل ہیں۔

(۱) قبیصۃ بن المخارق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی کسی

---

[1] حاشیۃ رد المحتار، ج ۲، ص ۸۸، ۸۹ - ط - استانبول

[2] معالم السنن، ج ۲، ص ۲۲۷۔

[3] بحوالۂ مذکور

ذمے داری کے پورا کرنے کے لیے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا، صرف تین اشخاص کو سوال کرنا درست ہے جس پر فاقہ ہو اور اسے زندگی کے تحفظ کے لیے سوال جائز ہو جائے...[1]

ب) ضرورت فقر ہے اور فقر غِنا کی ضد ہے اور اس لحاظ سے جو محتاج ہے وہ فقیر ہے اور اس نص کے عموم میں داخل ہے اور جو غنی ہے وہ ان نصوص کے عموم میں داخل ہے جہاں زکوٰۃ لینے کی حرمت بیان کی گئی ہے۔

اور اس امر کی دلیل کہ احتیاج (ضرورت) ہی فقر ہے اللہ سبحانہٗ کا یہ فرمان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ (فاطر: ۱۵)

لوگو تم ہی اللہ کے محتاج ہو۔

اور کسی شاعر کا قول ہے کہ

وَاِنِّيْ اِلٰى مَعْرُوْفِهَا لَفَقِيْرُ

آیت میں اور شعر میں دونوں جگہ فقر کے معنی احتیاج (ضرورت) کے ہیں۔

اس پر دو امور متفرع ہوتے ہیں:۔

اول: یہ کہ جس شخص کے پاس حسب کفایت مال ہو خواہ وہ مال قابلِ زکوٰۃ ہو یا نہ ہو۔ یا اس کے کسب و عمل سے حاصل ہوا ہو یا کسی زمین وغیرہ کا کرایہ ہو — ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے اور اس کفایت کا اعتبار خود اس کے حق میں اس کے اہلِ خانہ کے حق میں اور اس کے تمام زیرِ کفالت افراد کے حق میں تصور کیا جائے گا کیونکہ ہر ایک کی ضرورت پوری کرنا اس پر لازم ہے اس لیے یہ ضرورت اسی کی ضرورت سمجھی جائے گی۔

اس لحاظ سے وہ تمام افراد جو ملازم ہوں یا یومیہ اُجرت یا فتگان کارکن ہوں ان کی وقت مقررہ پر حاصل ہونے والی آمدنی ان کو غنی بنا دینے والی ہوگی اور ان کے غنا کو ان کے مال و ثروت سے نہیں معلوم کیا جائے گا۔

---

[1] مسلم، ابوداؤد، نسائی ـــ ملاحظہ کیجئے: حدیث ۱۵۷۵ - ج ۲، مختصر السنن للمنذری - یہ حدیث مکمل صورت میں آگے آرہی ہے۔

اس لیے کہ اگر ہر اُس شخص کو فقیر قرار دیا جائے جو نصاب زکوٰۃ کا مالک نہ ہو تو یہ مذکورہ افراد بھی فقیر ہی متصور ہوں گے اور مستحق زکوٰۃ بن جائیں گے جو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

دوم: یہ کہ جو شخص کسی مال کے نصاب زکوٰۃ یا اس سے بھی زائد کا مالک ہو لیکن وہ اس کی اور اس کی زیر کفالت افراد کی کفایت کے لیے کافی نہ ہو تو وہ غنی نہیں ہے اور وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔

مثلاً کسی کے پاس ایک ہزار دینار یا زیادہ کا سامان تجارت ہو لیکن مہنگائی کی بنا پر یا کثرت عیال کی بنا پر اس کے منافع سے اس کی کفایت نہ ہوتی ہو تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔

اور جس کے پاس بقدر نصاب مویشی ہوں، یا پانچ وسق پیداوار کی زرعی زمین ہو لیکن اس سے اس کی کفایت نہ ہوتی ہو تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے لیکن یہ زکوٰۃ لینے کا جواز خود اس پر وجوب زکوٰۃ سے مانع نہیں ہے کیونکہ جس غنا سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ تو کچھ شرائط کے ساتھ نصاب کا مالک ہو جانا ہے جب کہ جو غنا زکوٰۃ کے لینے سے مانع ہے وہ غنا ہے جس سے کفایت حاصل ہو جائے اور ان دونوں کے درمیان کو تلازم نہیں ہے[1]

المیمونی بیان کرتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس اتنی مقدار میں اونٹ یا بکریاں ہوں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے، حالانکہ (وہ اپنی ضرورت کے لحاظ سے) فقیر ہی ہو، یا کسی کے پاس اگر مزرعہ زمین ہو مگر وہ اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو تو کیا اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے آپؒ نے فرمایا کہ "ہاں"۔

اور حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا کہ انھیں خواہ ان کے پاس اتنے اور اتنے اونٹ ہوں[2]

محمد بن الحکم نے امام احمدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر کسی کے پاس ایسی زمین جائیداد ہو جس سے اسے دس ہزار یا زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہو لیکن اسے وہ کافی نہ ہو تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے[3]

---

[1] شرح غایۃ المنتہی: ج ۲، ص ۱۳۵۔

[2] المغنی، ج ۲، ص ۶۶۴۔

[3] شرح الغایۃ، ج ۲، ص ۱۳۵۔

نیز جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر کسی کے پاس زرعی زمین ہو اور اس میں فصل کھڑی ہو لیکن اس کے پاس کٹائی کے لیے کچھ نہ ہو تو کیا وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے آپ نے فرمایا "ہاں"۔[1]

اور شرح الغایۃ میں یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس کتبِ مطالعہ ہوں، یا پہننے کے زیورات ہوں یا کرائے پر دینے کے لیے ہوں لیکن اسے ان کی احتیاج ہو تو یہ ملکیت اسے زکوٰۃ لینے سے مانع نہیں ہے[2]

فقیر جو کسب کی قدرت رکھتا ہو

چونکہ استحقاق (زکوٰۃ کے مستحق ہونے) کا مدار حاجت پر ہے کہ کسی شخص کے پاس اس قدر ہو جس سے اس کی اور اس کے زیر کفالت کی ضرورت پوری ہو سکے۔ اس اصول کے مدِّنظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حاجتمند تو ہو لیکن کام نہ کرتا ہو اور معاشرے پر بوجھ بن کر محض زکوٰۃ اور صدقات پر گزر کرنا چاہتا ہو، حالانکہ جسمانی لحاظ سے وہ محنت کرنے کے قابل ہو، تو کیا ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

اس مقام پر میں مسلک شافعی اور مسلک حنبلی کے فقہاء کی اس رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ کہ فقراء اور مساکین کے حصّہ کی زکوٰۃ نہ تو کسی غنی کو دینا درست ہے اور نہ کسی ایسے شخص کو دینا مناسب ہے جو کسبِ لائق کی قدرت رکھتا ہو اور اس کسب سے وہ اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کی روزی حاصل کر سکتا ہو[3]

اس مسلک کی تائید نصوصِ شریعت اور قواعد اسلام سے بھی ہوتی ہے اور فقہائے احناف جن کے نزدیک کمانے کے قابل فقیر کو دینا جائز ہے، وہ بھی اس رائے کے قائل ہیں کہ خود فقیر کے لیے لینا درست نہیں ہے، اس لیے کسی منفعت کے بجائے خود جائز ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لازماً اسے حاصل بھی کیا جائے، جیسے کوئی شخص کسی غنی کو فقیر سمجھتے ہوئے زکوٰۃ دے دے

---

[1] بحوالہ مذکور۔

[2] بحوالہ مذکور۔

[3] المجموع، ج ۶، ص ۲۲۸۔

کہ اس صورت میں دینے والے کا دینا تو درست ہے مگر لینے والے کا لینا جائز نہیں ہے۔

جمہور فقہائے احناف کی رائے یہ ہے کہ کسب کے قابل فقیر کا زکوٰۃ لینا جائز تو ہے لیکن جب تک اس کے پاس زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ موجود ہو اس کے لیے نہ لینا ہی زیادہ بہتر ہے[1]

اور مسلکِ مالکؒ کے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ کسب کی قدرت رکھنے والے کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے[2]

ہم اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ اس مسلک کی تائید نصوص شریعت اور قواعد اسلام سے ہوتی ہے اس لیے کہ اسلامی نظامِ حیات ہر اس شخص پر عمل کسب کو لازم قرار دیتا ہے جس کو جسمانی توانائی حاصل ہو اور یہی نہیں بلکہ اسلامی نظام ہر شخص کے لیے رزق حلال کے حصول کے مواقع پیدا فرماتا ہے اور اس لیے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیت اور عمل کو بروئے کار لائے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ

"کوئی شخص اس غذا سے بہتر غذا نہیں کھاتا جو اسے اس کے اپنے عمل سے حاصل ہوئی ہو"[3]

اور اس لحاظ سے کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے وہ کسب کی قدرت رکھنے کے باوجود، حصول رزق کی جد و جہد نہ کرے اور لوگوں کے صدقات پر گزارہ کرے اور دستِ سوال دراز کرے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہے کہ

"کسی بھی مالدار شخص کو، قوی مضبوط آدمی کو اور جس کا جسم سلامت ہو زکوٰۃ قبول کرنا جائز نہیں ہے"[4]

---

[1] مجمع الانہر، ص ۲۲۰۔

[2] اس قول کو یحییٰ بن عمر کا بنایا گیا ہے۔ دیکھیے۔ حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۱۴۹۴۔

[3] اس حدیث کو بخاریؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ دیکھیے۔ الترغیب والترہیب: للمنذری ج ۲، کتاب البیوع۔

[4] پانچ محدثین صحاح نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔

الطبری نے زہیر عامری سے روایت کیا ہے کہ ان کی عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے ان سے پوچھا کہ زکوٰۃ کا مال کس کے لیے ہے؟ انھوں نے فرمایا، کہ لنگڑوں کے لیے، اندھوں کے لیے، برہنہ جسموں کے لیے اور کمزوروں، مصیبت زدہ لوگوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو کمانے سے عاجز ہوں۔ زہیر نے پھر پوچھا کہ کار زکوٰۃ میں مصروف لوگوں اور فی سبیل اللہ کے مصرف میں سے مجاہدین کا بھی حق ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ مجاہدین کے لیے اتنا جائز ہے جتنا ان کی جہاد کی ضرورت کے لیے لازمی ہو اور اسی طرح زکوٰۃ کے کاموں میں مصروف لوگوں کے لیے ان کی محنت کے بقدر لینا درست ہے، بعدازاں اُنھوں نے فرمایا کہ کسی بھی مالدار شخص کو، قوی مضبوط آدمی کو اور اس شخص کو جس کا جسم سلامت ہو زکوٰۃ قبول کرنا جائز نہیں ہے[1]

یہ آخری الفاظ متعدد صحابۂ کرام مرفوعاً نبی کریمؐ سے مروی ہیں اور خود عبداللہ بن عمرو بن العاص نے انھیں ایک اور روایت میں نبیؐ سے مرفوعاً روایت کیا ہے[2]

بہرحال اگر مناسب ذریعۂ کسب موجود نہ ہو جس سے کفایت ہو سکے تو محض جسمانی صلاحیت اور قوت کا اعتبار نہ ہوگا کہ جسمانی قوت سے جسم برہنہ ملبوس نہیں ہو سکتا اور بھوکے شخص کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسب کرنے والے کو ذریعۂ کسب میسر نہ آئے تو اس کے لیے زکوٰۃ حلال ہے، کیونکہ وہ عاجز ہے[3]

اور مذکورہ بالا حدیث میں سلامتی جسم اور مضبوط و قوی کے الفاظ آئے ہیں تو ان کے عموم کی ایک اور حدیث سے تقیید ہو گئی ہے اور وہاں بتا دیا گیا ہے کہ قوت جسمانی کے ساتھ

---

[1] تفسیر الطبری، بتحقیق محمود شاکر، ج ۱۴، ص ۲۳۱۔

[2] اس حدیث کو نبیؐ تک حضرات ابو ہریرہؓ، حبشی بن جنادہؓ، جابرؓ، طلحہؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور ابن عمرؓ نے مرفوع کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ نصب الرایہ، ج ۲، ص ۳۹۹، ۴۰۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳، ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ ط۔ حیدر آباد۔

[3] المجموع، ج ۶، ص ۱۹۱۔

کسب مہیا ہونا بھی ضروری ہے۔

عبید اللہ بن الخیار سے مروی ہے کہ انھیں دو افراد نے خبر دی کہ وہ نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے زکوٰۃ کا سوال کیا آپؐ نے ان کی جانب نظر فرمائی تو وہ دونوں تنومند تھے، آپؐ نے فرمایا کہ تم کہتے ہو تو دیئے دیتا ہوں لیکن بہر حال زکوٰۃ میں کسب کے قابل تنومند شخص اور مالدار کا کوئی حصہ نہیں ہے۔[1]

آپؐ نے جو یہ فرمایا کہ اگر تم کہو تو میں دے دیتا ہوں تو یہ اس بنا پر فرمایا کہ آپؐ ان کی باطنی حالت سے واقف نہ تھے کہ ہو سکتا ہے وہ بظاہر تنومند ہوں لیکن انھیں ذریعۂ کسب میسر نہ ہو یا ہو مگر وہ انھیں کافی نہ ہوتا ہو۔

اس حدیث سے فقہا نے ایک مسئلہ یہ اخذ کیا ہے کہ حکمراں یا مال کے مالک کے لیے اسوۂ رسولؐ کی اتباع میں اس زکوٰۃ لینے والے کو جس کی حقیقی حالت سے وہ باخبر نہ ہو نصیحت کر دینا بہتر ہے اور اسے یہ جتلا دینا اچھا ہے کہ کسی کسب کے قابل شخص کے لیے اور مالدار شخص کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں ہے۔[2]

بہر حال کسب سے ضرورت کے لیے کافی کسب مراد ہے کہ کسب سے بالکل عاجز ہونا شرط نہیں ہے[3] اور یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ زکوٰۃ صرف اپاہجوں، بیماروں اور قطعاً کسب سے عاجز لوگوں پر ہی صرف کی جا سکتی ہے۔ بلکہ بقول امام نوویؒ اعتبار اس کسب کا ہے جس سے ضروریات پوری ہو جائیں اور انسانی شرافت برقرار رہے اور اگر ضروریات پوری نہ ہو سکیں تو وہ کسب نہ ہونے کے درجے میں ہے۔[4]

---

[1] اس روایت کو احمدؒ، ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے روایت کیا ہے، امام احمدؒ نے اس حدیث کو نہایت اَجود (عمدہ) قرار دیا ہے اور نوویؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے (المجموع، ج ۶، ص ۱۸۹) ابوداؤد اور اس کے شارح المنذری نے سکوت اختیار کیا ہے (مختصر السنن، ج ۲، ص ۲۳۳)

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۷۰۔

[3] بحوالہ مذکور۔

[4] المجموع، ج ۶، ص ۱۹۰۔

لیکن اس کے باوجود اگر کوئی تنومند اور باصلاحیت شخص سستی اور کاہلی کے طفیل ذریعۂ کسب کے مہیا ہونے کے باوجود بے کار بیٹھا رہے تو اسے مذکورہ بالا حدیث کے تحت زکوٰۃ لینا حلال نہ ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ وہ کسب جس کی موجودگی میں زکوٰۃ حرام ہو جاتی ہے اس کی درج ذیل شرائط ہیں۔

۱) اس کے پاس ذریعۂ کسب موجود ہو۔

۲) جو کام اسے میسّر ہو وہ از روئے شریعت حلال ہو، کیونکہ جو کام شرعاً جائز نہیں ہے وہ نہ ہونے کے درجے میں ہے۔

۳) اس کام کو بغیر ایسی محنت شاقہ کے انجام دے سکے، جتنی محنت کا بالعموم انسان متحمل نہیں ہوتا۔

۴) وہ کام اس کے لیے موزوں اور اس کی حالت، مرتبہ اور معاشرتی مقام کے مناسب ہو۔

۵) اس قدر اس سے حاصل کر سکے جس سے اس کی کفایت ہو جائے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شریعت کی نظر میں ہر وہ شخص جو کسب کی قدرت رکھتا ہو اُسے اتنا کسب حاصل ہو جس سے وہ اپنی کفالت کر سکے، مزید برآں معاشرے کی بالعموم اور حکمرانوں کی بالخصوص یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اس کی مدد کریں۔ اور جو شخص کسب سے عاجز ہو یعنی وہ بچہ ہو، یا بوڑھا ہو، یا پاگل ہو، یا بیمار ہو، یا کسب کی قدرت رکھتا ہو مگر وہ اپنے مناسب کسب نہ پاتا ہو، یا کسب اسے میسّر ہو مگر اس سے اس کی اور اس کے زیرِ کفالت افراد کی کفایت نہ ہوتی ہو تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے اور اس کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہ اسلام کی بہترین تعلیمات ہیں جو سراپا عدل و رحمت ہیں اور اس مادہ پرستانہ نظریہ سے کہیں بہتر ہیں جس میں کہا جاتا ہے کہ ـــــ "جو کام نہیں کرتا وہ نہ کھائے" یہ اصول درحقیقت غیر اخلاقی، غیر طبعی اور غیر انسانی ہے اور اگر آپ کائنات میں غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ متعدد پرندے اور حیوانات بھی کمزور جانوروں کی امداد کرتے ہیں اور انہیں سہارا دیتے ہیں تو کیا مادیّت یہ چاہتی

ہے کہ انسان جانوروں سے بھی فروتر ہو جاتے۔

عبادت میں مصروف شخص کا زکوٰۃ لینا درست نہیں ہے

یہاں پر یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ فقہائے اسلام نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی کسب پر قدرت رکھنے والا شخص سب کچھ چھوڑ کر محض عبادت الٰہی میں مصروف ہو جائے تو نہ اُسے زکوٰۃ دی جائے گی اور نہ اس کے لیے اسے لینا حلال ہوگا اس لیے کہ اس کی عبادت کا فائدہ خود اس کی ذات تک محدود ہے[1] اور اسلام میں نہ تو رہبانیت کی اجازت ہے اور نہ ہی یہ شخص کسبِ حلال کے اسلامی حکم سے مستثنیٰ ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو نیت صادقہ کے ساتھ اور حدود الٰہی کی پابندی کے ساتھ کسب عبادات سے بھی زیادہ افضل ہے۔

علم کے حصول کے لیے وقف آدمی زکوٰۃ لے سکتا ہے

اگر کوئی شخص علمِ نافع کی طلب میں لگا ہوا ہو اور حصول علم کے ساتھ وہ کسب حلال نہ کر سکتا ہو تو اسے بقدر ضرورت زکوٰۃ دی جا سکتی ہے اور اس کے ذریعہ حصول علم کی تکمیل کے لیے کتابوں کے لیے بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے اس لیے کہ طلبِ علمِ دین فرض کفایہ ہے اور اس کے علم کا فائدہ خود اس تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام امت کے لیے ہے اور یہ اس کا حق بنتا ہے کہ اس کی مالِ زکوٰۃ میں سے مدد کی جائے، کیونکہ زکوٰۃ کے مصارف کے دو پہلو ہیں کہ یا تو مسلمانوں میں سے جو محتاج ہو اسے دی جائے یا جس سے مسلمانوں کی ضرورت وابستہ ہو اس کو دی جائے اور یہاں یہ دونوں باتیں جمع ہیں۔

اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ زکوٰۃ صرف ایسے طلبہ کو دی جائے جو ذہین ہوں اور ان کے علم سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہو، اگر یہ بات نہ ہو تو جو طالب علم کسب کی قدرت

---

[1] النووی: الروضۃ، ج ۲، ص ۳۰۹، المجموع، ج ۶، ص ۱۹۱۔

رکھتا ہو اسے زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے[1]۔ یہ ایک عمدہ قول ہے اور اسی پر جدید ریاستیں (MODERN STATES) عمل پیرا ہیں کہ باصلاحیت اور ذہین طلبہ کی تعلیم میں حکومت تعاون کرتی ہے اور انہیں وظائف دے کر اندرون ملک اور بیرون ملک اعلیٰ تعلیم دلواتی ہے۔

جن کا حال پوشیدہ ہو اور دست سوال کرنے سے گریز کریں وہ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں۔

جن لوگوں کو اسلام کی واقفیت نہیں ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فقراء و مساکین جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں، یہ وہ ناکارہ اور بے کار لوگ ہوتے ہیں جو فقیری کا بھیس بھر کر لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں اور بھکاری بن کر شاہراہوں، بازاروں اور مسجدوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔

مسکین کی یہ تصویر لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ سے قائم ہے اور شاید خود عہد نبوتؐ میں بھی بعض لوگ ایسا سمجھا کرتے تھے جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ درحقیقت حاجتمند لوگ کون ہیں اور کون معاشرے کے تعاون کے مستحق ہیں چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ

> مسکین وہ نہیں ہے جو ایک آدھ کھجور اور ایک آدھ لقمہ لے کر چلا جاتا ہے، مسکین درحقیقت وہ ہے جو دست سوال دراز نہ کرے اور اگر تم چاہو تو یہ آیۂ مبارک پڑھو لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا (البقرہ: ۲۷۳)

اِلحاف کے معنی ہیں سوال کرنے میں اصرار کرنے اور لوگوں کو تنگ کر دینے کے اور مفہوم آیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تنگ کر کے اور اصرار کر کے اپنی ضرورت کے لیے

---

[1] بحوالہ مذکور۔ وشرح غایۃ المنتہی، ج ۲، ص ۱۳۷، حاشیۃ الروض المربع، ج ۱، ص ۴۰۰۔ المجموع، ج ۶، ص ۱۹۰، ۱۹۱۔

مطالبہ نہیں کرتے اور جس وقت ان کے پاس بقدر ضرورت موجود رہتا ہے وہ دست سوال دراز نہیں کرتے۔ اور یہاں فقراء مہاجرین کا وصف ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اللہ اور رسول کے لیے خاص کردی تھیں اور ان کے پاس مال اور کسب نہیں تھا جس سے وہ اپنی گزر اوقات کرسکتے[1]

ان فقراء کے بارے میں اللہ سبحانہ نے ارشاد فرمایا کہ

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا (البقرہ : ۲۷۳)

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کرسکتے ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔

یہ لوگ اور ان جیسے دوسرے لوگ دراصل اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی اعانت کی جائے جیسا کہ مذکورہ حدیث میں راہنمائی فرمائی گئی ہے۔

اور ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ

"مسکین وہ نہیں ہے جو ایک یا دو لقمہ کی خاطر یا ایک دو کھجور کی خاطر لوگوں کے گھروں کا طواف کرے بلکہ مسکین وہ ہے کہ جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو لیکن لوگوں کو اس کی حالت کا علم نہ ہوسکے کہ وہ اسے صدقہ دیں اور نہ ہی وہ خود کسی سے سوال کرے[2]"

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۳۲۴۔

[2] یہ حدیث اس روایت سے متفق علیہ ہے۔

یہ وہ مسکین ہے جو درحقیقت اعانت اور امداد کا مستحق ہے اگرچہ لوگ اس سے غافل ہوں اور اس کے بارے میں نہ سمجھ پائیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کمال مہربانی سے ان کی جانب مسلمانوں کی توجہ دلائی ہے اور متنبہ فرمایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بہت سے گھرانے ایسے ہو سکتے ہیں جو مانگنے سے بچتے ہوں، لیکن زمانے کی سختیوں کا شکار ہوں، یا معذوری کی بنا پر عاجز ہوں یا ان کی آمدنی کم اور عیال زیادہ ہوں یا ان کی آمدنی ان کی معقول ضروریات کے لیے ناکافی ہو۔

امام حسن بصریؒ سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ جس کے پاس گھر بھی ہو اور خادم بھی ہو کہ کیا وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے آپ نے فرمایا ہاں لے سکتا ہے اگر اسے ضرورت ہو[1]

امام محمد بن الحسنؒ کا فتویٰ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اگر کسی کے پاس زرعی زمین ہو یا آمدنی دینے والی دکانیں ہوں یا جس کی آمدنی تین ہزار درہم ہو لیکن وہ اسے اور اس کے عیال کے نفقہ کے لیے کافی نہ ہو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے اگرچہ اس کی ملکیت کی قیمت ہزاروں کی ہو اور اسی پر فقہائے احناف کا فتویٰ ہے جیسا کہ ابن عابدین نے لکھا ہے[2]

اسی طرح کا فتویٰ امام احمد بن حنبلؒ کا اس شخص کے بارے میں ہے جس کے پاس جائیداد یا زمین ہو جس کی قیمت کم و بیش دس ہزار درہم ہو، لیکن وہ اس کی ضروریات کے لیے ناکافی ہو تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے[3]

فقہائے شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی جائیداد کی آمدنی اس کی ضرورت کے لیے ناکافی ہو تو وہ فقیر یا مسکین ہے اور اسے اس کی ضرورت کے بقدر زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا اور اسے اپنی جائیداد کی فروخت کا پابند نہیں کیا جائے گا[4]

---

[1] ابو عبید: الاموال: ص ۵۵۶۔

[2] رد المحتار: ج ۲، ص ۸۸۔

[3] المغنی، مع الشرح الکبیر ج ۲، ص ۵۲۵۔

[4] المجموع، ج ۶، ص ۱۹۲۔

کی ضرورت نہ پڑے۔

امام نووی "المجموع" میں فرماتے ہیں کہ ہمارے تمام عراقی فقہاء اور بیشتر خراسانی فقہاء اس امر کے قائل ہیں کہ فقیر اور مسکین کو اتنا دیا جائے کہ جس سے ان کا فقر ختم ہو جائے اور وہ غنی بن جائیں، یعنی ان کی دائمی کفالت ہو جائے۔ اور یہی امام شافعیؒ نے فرمایا ہے۔

اس مسلک کی دلیل قبیصۃ بن المخارق الہلالی کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"تین اشخاص کے سوا کسی کو سوال کرنا جائز نہیں ہے ایک تو اس کو جو کسی کے قرضہ کا ضامن ہو اس کو صرف اس قدر مانگنا جائز ہے کہ وہ اس سے قرضہ ادا کر دے اور اس کے بعد پھر نہ مانگے، دوسرے اس شخص کو جس کو کوئی مصیبت پیش آئے اور اس کا سارا مال ہلاک ہو جائے تو اسے زندگی برقرار رکھنے کے بقدر سوال کرنا جائز ہے اور تیسرے وہ جسے فاقہ ہو اور محلہ کے تین افراد اس امر کی شہادت دیں کہ وہ فاقہ سے ہے اس کو بھی مانگنا جائز ہے صرف اس قدر کہ زندگی برقرار رکھ سکے اس کے سوا سوال کرنا حرام ہے اور وہ حرام کھائے گا"

(مسلم)

ہمارے فقہاء فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں سوال کو اس وقت تک جائز فرمایا جب تک ضرورت پوری نہ ہو جائے۔

اب یہ دیکھا جائے کہ اگر فقیر و مسکین کوئی پیشہ اختیار کر سکتا ہو تو اسے اس پیشہ کے آلات دلوا دیں خواہ ان آلات کی قیمت کم ہو یا زیادہ اور اس کو ایسا پیشہ دلوایا جائے جس سے اس کی تمام ضروریات پوری ہو سکیں یا اکثر ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

ہمارے فقہاء نے اس کا ایک اندازہ اس طرح بیان کیا ہے کہ مثلاً اگر کوئی سبزی فروش ہو تو اس کو پانچ یا دس درہم دیئے جائیں اور جس کا پیشہ جوہری کا ہو اسے دس ہزار درہم دیئے جائیں اور جو شخص تاجر یا خباز (نانبائی) یا عطار یا صراف ہو اسے اسی نسبت سے دیا جائے۔ اور جو شخص درزی یا بڑھئی، یا قصاب، وغیرہ اور دیگر اہل پیشہ کو ان کی ضرورت کے مطابق آلات

لے کر دیئے جائیں گے۔ اور اگر کوئی کاشتکار ہو تو اس کو اتنا حصہ دیا جائے کہ وہ زمین خرید کر اسے زیر کاشت لائے اور وہ آمدنی اسے مستقل طور پر کافی ہو جائے۔

اگر کوئی شخص کسی بھی صنعت اور پیشہ سے واقف نہ ہو اور نہ وہ تجارت کر سکتا ہو اور نہ کسی اور طرح کسب کر سکتا ہو تو اسے تمام عمر کی کفایت کے بقدر مال دیا جائے گا اور ایک سال کی بقدر نہیں دیا جائے گا۔[1]

امام نوویؒ کی المنہاج کی شرح میں شمس الدین الرملی کہتے ہیں کہ اگر فقیر اور مسکین کو کوئی پیشہ اور تجارت نہ آتی ہو تو اسے اس کی مدت عمر کی کفایت کے بقدر دے دیا جائے گا، لیکن اگر وہ اس اندازے سے زیادہ عمر پائے تو پھر بعد میں اسے سال بسال دیا جائیگا۔ جو کسب و تجارت نہ کر سکے اسے دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے نقد دیا جائے گا بلکہ درحقیقت اس کو اس قدر ملکیت دی جائے گی جس کی آمدنی اس کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو سکے، مثلاً اسے کوئی جائیداد خرید کر دی جائے جس کی آمدنی سے وہ گزر اوقات کرتا رہے اور زکوٰۃ سے مستغنی ہو جائے، یہ جائیداد اس کی ملکیت ہو گی اور اس کے بعد وارثوں کو ملے گی اور زرکشی نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ امام اس کو یہ جائیداد خرید کر دے گا اور وہ اسے اپنے پاس رکھنے اور فروخت نہ کرنے کا پابند ہو گا۔

اور اگر یہ ملکیت اس کی اکثر عمر کے لیے کافی نہ ہو تو زکوٰۃ سے اسے بقدر کفایت دیا جائے گا اور دینے کے وقت اس کا فقیر اور مسکین ہونا ضروری نہیں ہو گا۔

الماوردی کہتے ہیں کہ اگر فقیر یا مسکین کے پاس نوے (درہم یا دینار) ہوں اور اسے سو کی ضرورت ہو تو اسے دس مزید دے دیئے جائیں گے اگرچہ بغیر کسب کے یہ نوے اس کی عمر کے کتنے سالوں کے لیے کافی ہوں۔

یہ تمام امور اس شخص کے بارے میں ہیں جو کسب نہ کر سکے لیکن اگر کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے جو اسے کافی ہو تو اسے پیشہ ورانہ آلات کی قیمت دی جائے گی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔

---

[1] المجموع للنووی، ج ۶، ص ۱۹۴، ۱۹۵۔

اور جو بخوبی تجارت کر سکتا ہو اسے اس قدر سرمایہ دیا جائے گا جس کا منافع اس کے شہر کے رواج کے مطابق اسے کافی ہو سکے، اور یہ بات مختلف اشخاص کے لیے اور مختلف علاقوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔

اور اگر کوئی شخص کئی پیشے عمدگی سے انجام دے سکتا ہو تو ان میں سے جس پیشے کے مصارف کم ہوں وہ دیئے جائیں گے اور اگر اس کو کچھ حصہ دینے سے اس کی کفایت ہو سکتی ہو تو اسے کچھ حصہ دیا جائے گا۔[1]

یہ تصریحات امام شافعیؒ نے الام میں کی ہیں اور ان پر مسلک شافعیؒ کے فقہا نے مزید تفریعات کی ہیں اور بڑی جزرس تفصیلات بیان کی ہیں جو فقہ اسلامی کے ذخیرۂ علمی پر دلالت کرتی ہیں۔

مسلک احمدؒ میں بھی ایک روایت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق موجود ہے اور انھوں نے بھی اس امر کو روا قرار دیا ہے کہ وہ اپنی قدر کفایت دائمی ایک ہی وقت میں لے لے اور اس سے تجارت کرے یا کوئی آلۂ صنعت لگالے، اور یہی رائے مسلک حنبلی کے بعض فقہا نے اختیار کی ہے اور اسے ترجیح دی ہے۔[2]

الخطابی قبیصہ کی سابق حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے کی انتہائی حد قدر کفایت ہے جس سے زندگی گزر سکے اور بھوک کا مداوا ہو جائے اور اس بارے میں انسان کی معاشرتی حالت (SOCIAL STATUS) اور معاشی کیفیت کا لحاظ کیا جائے گا جس کی کوئی مقرر حد نہیں ہے جو ہر حالت میں جاری ہو سکے۔[3]

جب زکوٰۃ دو تو غنی بنا دو

یہ مذکورہ بالا مسلک حضرت عمرؓ کے اس قول کے مطابق ہے کہ

---

[1] نہایۃ المحتاج، الی شرح المنہاج، الشمس الدین الرملی رح ۶، ص ۱۵۹۔

[2] الانصاف، ج ۳، ص ۲۳۸۔

[3] معالم السنن، ج ۲، ص ۲۳۹۔

"جب زکوٰۃ دو تو غنی بنا دو"[1]

اور یہ حکیمانہ اصول حضرت عمرؓ کی سیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ اور حضرت عمرؓ کا عمل بھی یہی تھا کہ آپ صرف وقتی طور پر بھوک رفع کرنے کے لیے زکوٰۃ نہیں دیا کرتے تھے بلکہ کو اس قدر دے دیا کرتے تھے کہ وہ غنی ہو جاتا تھا۔

چنانچہ ایک شخص نے جب آپ کے پاس آکر اپنی بدحالی کا ذکر کیا تو آپ نے اسے تین اونٹ دیئے تاکہ وہ تنگدستی سے محفوظ ہو جائے کیونکہ اہل عرب کے یہاں اونٹ سب سے قیمتی مال تھے۔

اور آپؓ عاملین زکوٰۃ کو کہا کرتے تھے کہ ہر مستحق کو بار بار زکوٰۃ دیتے رہو خواہ اس کے پاس سو اونٹ ہو جائیں[2]

ایک موقع پر آپؓ نے خود فقراء کے بارے میں اپنے طریقہ کار کی اس طرح وضاحت فرمائی کہ

"میں ان کو دیتا رہوں گا خواہ ان کے پاس سو اونٹ ہو جائیں"[3]

عطاء جو فقیہ بھی ہیں اور بزرگ تابعی بھی ہیں فرماتے ہیں کہ

"جب کوئی شخص کسی مسلمان گھرانے کو زکوٰۃ دے تو اس کی ضرورت پوری کر دینا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے"[4]

میری رائے میں تو ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی ریاست فقراء اور حاجتمندوں کے لیے بطور وقف کارخانے، اور تجارتی مراکز وغیرہ بنا دے جن کی آمدنی سے ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور انھیں اس کو فروخت کرنے کا کوئی اختیار نہ ہو۔

---

[1] الاموال ص ۵۶۵۔

[2] الاموال ص ۵۶۵، ۵۶۶۔

[3] ایضاً۔

[4] ایضاً

دوسرا مسلک: ایک سال کی کفایت کے بقدر دیا جاتے

دوسرا مسلک جس مسلک کے مالکی فقہاء اور جمہور حنابلہ قائل ہیں یہ ہے کہ فقیر اور مسکین کو اس کی ایک سال کی ضروریات کے بقدر دیا جائے، کیونکہ بالعموم انسان اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی زندگی کے لیے ایک سال کی ضروریات ہی کو کافی تصور کرتا ہے اور اس سلسلے میں سُنّتِ نبویؐ بھی موجود ہے کہ آپؐ نے اپنے گھر والوں کے لیے ایک سال کی غذا ذخیرہ فرمائی۔[1]

نیز یہ کہ اموال زکوٰۃ بھی سالانہ ہوتے ہیں اور ہر سال زکوٰۃ کی نئی آمدنی آتی ہے جس میں قرین قیاس یہی ہے کہ وہ ہر سال مستحقین میں تقسیم ہو۔[2]

اس مسلک کے قائل کی رائے یہ ہے کہ سال کی کفایت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ جس قدر بھی کافی ہو وہی مقدار ہو گی یعنی اگر پورے سال کی کفایت کے بقدر نصاب نقد یا مویشی یا زرعی زمین دینی ہو تو دی جائے گی اگرچہ وہ اس مقدار کے بعد غنی ہو جائے کیونکہ جب اس کو دیا گیا اس وقت وہ فقیر و مستحق تھا۔[3]

شادی بھی کفایت متصور ہو گی

کفایت کے مفہوم کی مزید تحقیق اور اسلام کے مطابق اس کے اصل تصور کے بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کھانے پینے، لباس اور رہائش کے ساتھ اس کی نوعی اور جنسی جبلّت کو کفایت کے زمرے میں شمار کیا جائے کہ جنس سے افزائش نسل انسانی ہوتی ہے جو ارادۂ الٰہی

۱۔ متفق علیہ۔

۲۔ بعض مالکی فقہاء نے کہا ہے کہ اگر زکوٰۃ ہر سال تقسیم نہ کی جاتی ہو تو سال سے زیادہ کی کفایت کے بقدر دی جائے گی، جیسا کہ حاشیۃ الدسوقی ص ۴۶۴ پر ہے۔

۳۔ شرح الخرشی علی متن الخلیل ج ۲، ص ۲۱۵۔ حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۴۹۴۔ فقیر کو ایک ہی مرتبہ پورے سال کی کفایت کے بقدر غذائی اشیاء اور لباس دے دیا جائے گا اور اگر مال زائد ہو تو اسے غلام اور بیوی کا مہر بھی دیا جائے گا۔

کے مطابق ہے اور اسلام اس جبلت کو انسانی وجود سے علیحدہ کرنے کے بجائے اس کی تنظیم کرتا ہے اور اس کو مقررہ حدود میں جاری رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام میں اس امر کی اجازت نہیں ہے کہ انسان اپنی جنسی توانائی کو مٹا دے یا بغیر شادی کے زندگی گزار دے بلکہ اسلام نے ہر صاحب استطاعت شخص کو شادی کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ

"جو شخص تم سے مہر دینے اور گھر بسانے کی قدرت رکھتا ہو وہ شادی کرے اس لیے کہ اس سے نگاہ نیچی ہوتی ہے اور شرمگاہ زنا سے محفوظ ہو جاتی ہے"[۱]

اس لحاظ سے شادی کے خواہشمند افراد کی جبکہ وہ اس کی مالی ذمے داریاں نہ پوری کر سکتے ہوں اعانت کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء نے تحریر کیا ہے کہ اگر فقیر غیر شادی شدہ ہو اور اسے نکاح کی احتیاج ہو تو اس کی نکاح کی مد میں بھی مال دینا کفایت کے ضمن میں شامل ہوگا[۲]۔ اور بعض فقہاء اس حد تک چلے گئے ہیں کہ اگر ایک بیوی اس کے لیے کافی نہ ہو تو دو بیویاں کر سکتا ہے اور یہی اس کے حق میں اتمام کفایت ہوگا۔[۳]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی جانب سے ایک منادی یہ آواز دیا کرتا تھا کہ کوئی مسکین ہے، کوئی مقروض ہے، کوئی نکاح کا خواہشمند ہے۔ اور پھر ان سب کی ضرورتیں بیت المال سے پوری کی جاتیں[۴]۔

اس سلسلے میں اصل یہ حدیث ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کی کہ میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کر لی ہے، آپ نے پوچھا کتنے مہر پر؟ اس نے کہا کہ چار اوقیہ پر (۴×۴۰ = ۱۶۰ درہم)

۱؎ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو کتاب الصوم میں روایت کیا ہے۔

۲؎ حاشیۃ الروض المربع، ج ۱، ص ۴۰۰۔ ہامش، مطالب اولی النہی: ج ۲، ص ۱۳۷۔

۳؎ شرح کتاب النیل وشفاء العلیل فی فقہ الاباضیہ: ج ۲، ص ۱۳۵۔

۴؎ البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر ج ۹ ص ۲۰۰۔

اس پر آپؐ نے فرمایا چار اوقیہ پر؟ ایسا لگتا ہے کہ تم چاندی پہاڑ میں سے کاٹ کر لے آتے ہو، اتنا تو ہمارے پاس دینے کو نہیں ہے شاید ہم اگلی آمدن میں تمہاری ضرورت پوری کر دیں[1]

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوتؐ میں دربار رسالت سے مہر کی ادائیگی ایک معمول تھا اور اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت ہمارے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے لیکن ہم بعد میں دے دیں گے۔

کُتب علم فراہم کرنا کفایت میں سے ہے

اسلام عقل کی تکریم کرتا ہے اور دعوت علم دیتا ہے اور عُلماء کے مقام کو سر بلند کرتا ہے اور علم کو ایمان کی کنجی اور عمل کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور مقلد کے ایمان اور جاہل کی عبادت کو قابل شمار متصور نہیں کرتا بلکہ وضاحت سے ارشاد ہوتا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

(الزمر : ۹)

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں۔

جاہل اور عالم کے مابین فرق کو اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ

(فاطر : ۱۹، ۲۰)

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔

اور فرمانِ نبوتؐ ہے کہ

"حصولِ علم ہر مسلمان پر فرض ہے"[2]

---

[1] نیل الاوطار، ص ۳۱۶۔ اُواق، اُوقیہ کی جمع ہے اور اس وقت ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوا کرتا تھا اور اس وقت ایک بکری پانچ سے دس درہم تک آیا کرتی تھی۔ اس لحاظ سے مہر کی یہ رقم زائد ہوتی۔

[2] ابن عبدالبر نے العلم میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے اور السیوطی نے اس پر صحت کی علامت قائم کی ہے۔

یہ واضح رہے کہ یہاں پر علم سے مراد صرف علمِ دین نہیں ہے بلکہ ہر وہ مفید علم ہے جو مسلمانوں کی دنیا کی زندگی میں فائدہ مند ہو ان کی جسمانی صحت کے لیے فائدہ بخش ہو، ان کی اقتصادی اور عمرانی ترقی کے لیے ضروری ہو اور انھیں ان کے دشمن پر برتری عطا کرنے والا ہو اور یہ علم فرض کفایہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے تحریر کیا ہے کہ جو شخص اپنے تمام اوقات حصول علم میں لگائے ہوئے اسے زکوٰۃ دی جائے گی جب کہ جو شخص اپنے تمام اوقات عبادت میں لگا دے تو اسے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ اس لیے کہ اسلام میں عبادت کے لیے تمام اوقات کے لگانے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ حصولِ علم میں جملہ اوقات کھپانے کی حاجت ہے نیز یہ کہ عابد کی عبادت اس کی ذات کے لیے ہوتی ہے۔ اور عالم کے علم سے سب لوگ مستفید ہوتے ہیں[1]

فقہاء نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ تنگدست طالب علم کو مدِ زکوٰۃ میں کتبِ علم لینا جائز ہے اور اس میں دین اور دنیا دونوں کی مصلحت ہے[2]

اور فقہائے احناف کے نزدیک کسی محتاج طالب علم کے لیے زکوٰۃ کا بلا کراہت ایک شہر سے دوسرے شہر زکوٰۃ منتقل کرنا جائز ہے[3]

ان دونوں مسالک میں سے کون سا زیادہ قابلِ عمل ہے ؟

ہم نے یہاں پر دو مسلک بیان کیے ہیں — ایک یہ کہ فقیر کو مدت عمر کی کفایت کے بقدر ایک ہی وقت دے دیا جائے اور دوسرا مسلک یہ ہے کہ اسے سال بھر کی کفایت کے بقدر دیا جائے — اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مسالک میں سے کون سا مسلک زیادہ قابلِ عمل

---

[1] المجموع، ج ۶، ص ۱۹۰۔

[2] الانصاف فی الفقہ الحنبلی، ج ۳، ص ۱۶۵، ۲۱۸۔

[3] الدر المختار وحاشیتہ، ج ۲، ص ۹۴۔

ہے اور بالخصوص اس صورت میں جبکہ کوئی اسلامی ریاست نظام زکوٰۃ جاری کرنا چاہے۔

میری رائے میں یہ دونوں ہی مسالک قابلِ عمل ہیں، اس لیے کہ فقراء اور مساکین کی دو اقسام ہیں۔

ایک قسم وہ جو عمل میں اور کسب میں مصروف ہو اور اس کا کسب اسے کافی ہو لیکن اس کے آلات صنعت یا سرمایہ تجارت یا آلات کاشتکاری یا زمین اس کی ضروریات سے کم ہو، اس شخص کو زکوٰۃ میں سے موت عمر کی کفایت کے بقدر دیا جائے گا تاکہ اسے اپنے پیشہ کے جاری رکھنے کے لیے دوبارہ احتیاج نہ پیش آئے۔

اور دوسری قسم وہ ہے جو کسب سے عاجز ہو جیسے اپاہج، اندھا، بہت ہی بوڑھا شخص، بیوہ اور بچہ۔ انھیں سال بسال کی کفایت کے بقدر دیا جائے اور ایک وظیفہ مقرر کر دیا جائے جو ہر سال ادا کیا جائے اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ کہیں مستحق اس رقم کو ضائع نہ کر دے تو اس کو ہر ماہ دیا جائے، جو کہ ہمارے آج کے دستور کے مطابق بھی ہے کہ ملازمین کو تنخواہیں اور دیگر اجرتیں وغیرہ ماہوار ادا کی جاتی ہیں۔

بلکہ یہ بات درج کرنے کے بعد میں نے حنبلی مسلک کی کسی کتاب میں بھی مسلک لکھا ہوا دیکھا ہے۔ چنانچہ غایۃ المنتہی اور اس کی شرح میں اس شخص کے بارے میں جو صاحب جائیداد اور زمین والا ہو اور اس کی آمدنی دس ہزار یا اس سے زائد ہو مگر وہ اسے کافی نہ ہو امام احمدؒ کا قول نقل کرنے کے بعد درج ہے کہ وہ زکوٰۃ میں سے بقدر کفایت لے سکتا ہے اور کسی پیشہ ور کو آلات کی خریداری کے لیے اور تاجر کو اس کے رأس المال کے پورا کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اور فقیر اور مسکین کو اس کی اور اس کے خاندان کی کفالت کے بقدر سال بسال دیا جائے گا اس لیے کہ زکوٰۃ سال بسال وصول کی جاتی ہے تو اسی کے حساب سے اس کی ادائیگی بھی ہونی چاہیے[1]۔ اور یہ تقریباً وہی ہے جو میں تحریر کر چکا ہوں۔ اس میں اگرچہ موت عمر کی کفایت کی وضاحت نہیں ہے لیکن یہ امر پیشہ ورانہ آلات کی خریداری اور رأس المال

---

[1] مطالب اولی النہی: ج ۲، ص ۱۳۶۔

کے مکمل کر دینے سے خود بخود مفہوم ہوتی ہے۔

فقیر کو زکوٰۃ کی ادائیگی کی تحدید کی مقدار سے متعلق مسالک

جو فقہا زکوٰۃ کی اس مقدار کی تحدید کے قائل ہیں جو فقیر یا مسکین کو دی جائے گی انھوں نے کم و بیش مختلف مقداریں متعین کی ہیں۔

چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ دو سو درہم یعنی نقود کے نصاب سے زائد دینا جائز نہیں ہے اور اگر اس کی بیوی اور اولاد بھی ہو تو ہر ایک کو بقدر نصاب دیا جا سکتا ہے۔

بعض دیگر فقہاء کے نزدیک پچاس درہم سے اور بعض اور فقہاء کے نزدیک چالیس درہم سے زائد نہ دیئے جائیں اور یہ بھی قول ہے کہ ایک شب و روز کی مقدار خوراک سے زیادہ نہ دیا جائے۔

ان تمام اقوال کی ظاہری طور پر فقیہ ابن حزم نے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ زکوٰۃ میں سے کم و بیش ہر مقدار دی جا سکتی ہے اور اس کی کوئی تحدید نہیں ہے کیونکہ خود قرآن و سنت نے اس کی تحدید نہیں کی ہے[1]

امام غزالیؒ کی رائے

امام غزالیؒ نے بھی الاحیاء میں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے اور اس بات کو ترجیح دی ہے کہ فقیر کو یا مسکین کو اس کے پورے سال کی کفایت کے بقدر دیا جائے چنانچہ سنت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عیال کی اور اپنی ضرورت کا غذائی سامان پورے سال کا ذخیرہ کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

بیان کرتے ہیں کہ زکوٰۃ اور صدقہ کے بارے میں مقدار کے تعین میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ کسی نے اس حد میں اس قدر کمی کی ہے کہ ایک شب و روز کی خوراک ہی اس کی مقدار متعین کی ہے اور اس کے لیے سہل بن الحنظلیہ کی اس روایت کی دلیل بنایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] المحلی: ج ۶، ص ۱۵۶۔

علیہ وسلّم نے غنی ہونے کی صورت میں سوال سے منع فرمایا اور جب آپؐ سے غنا کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ صبح و شام کا کھانا۔ (ابوداؤد)

اور بعض دیگر فقہا کہتے ہیں کہ غنا کی حد بقدر نصاب کا مالک ہونا ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ نے صرف مالداروں ہی پر زکوٰۃ واجب فرمائی ہے اس لیے مستحق اپنے لیے اور اپنے عیال میں سے ہر ایک کے لیے نصاب زکوٰۃ کے بقدر لے سکتا ہے۔

اور کچھ فقہا نے کہا ہے کہ حدِ غنا پچاس درہم یا اس کی قیمت کے بقدر سونا ہے کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ

"جو شخص غنی ہونے کے باوجود سوال کرے وہ روزِ قیامت اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خراشیں ہوں گی آپؐ سے پوچھا گیا کہ غنی کیا ہے آپؐ نے فرمایا پچاس درہم یا اس کے بقدر سونا"

کہا گیا ہے کہ اس حدیث کا راوی قوی نہیں ہے[۱]

اور بعض فقہا نے کہا ہے کہ اس کی حد چالیس درہم ہے۔

اس کے برعکس جن فقہا نے اس میں توسّع اختیار کیا ہے تو انھوں نے کہا ہے کہ اسے اتنی مقدار دی جائے گی کہ وہ اس سے زمین خریدے اور تمام عمر اس سے گزر کر سکے، یا تجارتی سامان خریدلے اور اس سے تجارت کرتا رہے کہ یہی غنا ہے اور حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ تم جب دو تو غنی بنا دو۔

بلکہ یہاں تک بھی ہے کہ اگر کسی کو محتاجی پیش آجائے تو وہ اپنی سابقہ حالت پر واپس آنے کے لیے بھی لے سکتا ہے خواہ وہ دس ہزار درہم کیوں نہ ہوں مگر بہر حال حدود اعتدال کے اندر رہتے ہوئے ہو۔

حضرت ابوطلحہؓ جب باغ کی وجہ سے نماز سے غافل ہو گئے تو آپ نے اسے صدقہ کر دیا، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اگر اپنے رشتہ داروں کو دے دو تو زیادہ بہتر ہے آپ

---

[۱] احیاء علوم الدین: الغزالیؒ۔ ج ۱، ص ۲۰۱۔ ط۔ الحلبی۔

نے وہ حضرت حسانؓ اور حضرت قتادہؓ کو دیا حالانکہ دونوں حضرات غنی تھے۔ اور حضرت عمرؓ نے ایک اعرابی کو ایک اونٹنی اور اس کا بچہ دے دیا تھا۔

اور جہاں تک ایک یوم کی خوراک یا اوقیہ سے کمی کا مسئلہ ہے تو وہ درحقیقت سوال ممانعت اور دروازوں پر جانے کی ممانعت سے متعلق ہے اور ظاہر ہے کہ سوال کرنا بُرا ہے اور اس کا حکم جُداگانہ ہے۔

بہرحال یہ تجویز زیادہ موزوں ہے کہ مستحق کو زمین خرید کر دی جائے اور وہ اس کی آمدن سے اپنی ضروریات پوری کرے اور اسراف اور ضیاع سے بچنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ایک سال کی کفایت کے بقدر دیا جائے[1]

زکوٰۃ لینے کے آداب کے بارے میں یہ امام غزالیؒ کا فرمودہ ہے۔ اور الاحیاء جیسی کتاب جس میں متصوفین اور اہلِ خشیت کے احکام و آداب بیان ہوئے ہیں، زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ مسائل کی صورت کسی قدر تقشف اور سختی لیے ہوئے ہو مگر ایسا نہیں ہے بلکہ امام غزالیؒ نے خاصا توسع اختیار کیا ہے اور انھوں نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ مستحق کو زمین لے کر دے دینا زیادہ مناسب ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوطلحہؓ کے عمل سے استدلال کیا ہے۔

ابو عبید کی ترجیح ابو عبید اسلام کے نظام مالیات کے بارے میں ایک مستند مقام رکھتے ہیں، انھوں نے بھی اسی توسّع کی تائید کی ہے اور حضرت ابوطلحہؓ کے مذکورہ بالا واقعہ کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ باغ کھجور کا تھا اور اس میں زرعی زمین بھی تھی جو ظاہر ہے کہ بڑا قیمتی تھا اور ابوطلحہؓ نے اس کو صرف دو افراد کو دے دیا۔

ہر چند کہ یہ ایک نفلی صدقہ تھا مگر فرض صدقہ اور نفلی صدقہ ایک ہی لینے والے کے حق میں ایک ہی حکم رکھتے ہیں اور غنی کے لیے دونوں میں سے ہر ایک کا لینا جائز نہیں ہے۔ زکوٰۃ جسے اللہ

---

[1] اس حدیث کے بارے میں عراقی کہتے ہیں کہ اسے اصحاب سنن نے روایت کیا ہے، ترمذیؒ نے حسن قرار دیا ہے اور نسائیؒ اور خطابی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

نے حتماً مالداروں کے اموال میں فقراء کے لیے مقرر فرمادیا اسی کی زیادہ مقدار لینے والے کے لیے حرام ہوجاتی ہے تو رضا کارانہ خیرات و صدقہ کا زیادہ حصہ لینا تو ان فقراء کے لیے بدرجہ اولی حرام ٹھہرے گا لیکن اگر یہ ان لوگوں کے لیے حلال ہوگیا اور نفلی صدقہ دینے والا نیکوکار اور محسن ٹھہرا تو پھر یقیناً ایسی صورت میں معطی فرض زکوٰۃ ادا کرنے میں اور بھی نیکوکار ٹھہرے گا۔[1]

بعد ازاں ابو عبید حضرت عمرؓ اور حضرت عطا وغیرہ کے آثار نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

الغرض یہ تمام آثار اس امر کا ثبوت ہیں کہ محتاجوں اور فقیروں کو زکوٰۃ دینے کے لیے مسلمانوں پر کوئی حد مقرر نہیں ہے جس سے تجاوز کیا نہ جائے خواہ جس کو دیا جا رہا ہے وہ مقروض اور نادار زندہ بھی نہ ہو بلکہ اس عمل کی انجام دہی میں محبت و ہمدردی اور فضل و احسان کارفرما ہے گا اس لیے کہ اس کا تعلق مُعطی کی صوابدید پر ہے جس میں وہ طرف داری نہ کرے نہ اپنی خواہش کو ترجیح دے اسے یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص جو بہت مالدار ہو ایک مسلم گھرانہ کو ایسی فقیری و بے چارگی کی حالت میں دیکھے کہ ان کے پاس سر چھپانے کو گھر تک نہ ہو چنانچہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ میں سے انہیں ایک گھر خرید کر دے دے جس سے وہ سردیوں کی شدت اور گرمی کی تمازت سے محفوظ ہوجائیں یا مثلاً وہ دیکھے کہ ان کے بدن ننگے ہیں اور ان کے پاس کپڑے پہننے کو نہیں ہیں اور وہ ان کے لیے کپڑے مہیا کر دے جس سے نمازمیں ان کی ستر پوشی اور گرمی سردی سے بچاؤ ہوجاتے یا وہ ایسے غلام کو دیکھے جو بدسرشت مالک کے قبضے میں ہو اور جو اپنے غلام پر ظلم و زیادتی کرتا ہو اور اسے خرید کر آزاد کر دے یا وہ کسی نادار مسافر کو دیکھے جس کی منزل دور ہو اور اسے اس کے وطن تک پہنچانے کے لیے کرایہ پر یا خرید کر سواری کا بندوبست کر دے تو اس قسم کے سلوک جن کے لیے ظاہر ہے کہ بڑی رقمیں درکار ہیں اگر اس قسم کی امداد کرنے کے لیے مُعطی کا دل نفل صدقہ و خیرات و عطیات کرنے کو نہ چاہے اور وہ ان مدوں میں اپنے مال کی زکوٰۃ لگا دیتا ہے تو کیا اس سے اس کی فرض زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کیوں نہیں ضرور ادا ہو جائے گی اور اللہ نے چاہا تو وہ محسن بھی مانا جائے گا۔[2]

---

[1] ابو عبید: الاموال۔ ص ۵۶۱۔

[2] ایضاً ص ۵۶۷۔

معیشت کے لائق معیار

اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ زکوٰۃ کا مقصود فقیر کو ایک یا دو درہم دے دینا نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو انسانی زندگی کے لائق معیشت فراہم کی جائے کیونکہ انسان ایک مکرم مخلوق ہے اور روئے زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور اسلام کے رشتے سے وہ اس امر کا مستحق ہے کہ معاشرے میں اس کو عزت نفس حاصل ہو اور اس کے ساتھ عدل وانصاف پر مبنی سلوک کیا جائے تاکہ خیر امت کے ایک فرد ہونے کا فرق واضح ہو سکے۔

انسانی معیشت کے لائق معیار زندگی یہ ہے کہ کم از کم ہر انسان کو اور اس کے خاندان کو زندگی گزارنے کے لیے غذا، سردی گرمی کے مناسب کپڑے اور رہائش کے لیے مکان میسر ہو۔ جیسا کہ ابن حزمؒ نے المحلیٰ میں ذکر کیا ہے اور جس کی تفصیل آٹھویں باب میں آئے گی، نوویؒ نے اس بات کو المجموع اور الروضہ میں بیان کیا ہے اور دیگر فقہاء نے بھی اس امر کو بیان کیا ہے۔

امام نوویؒ اس کفایت کی تحدید کے بیان میں جو زکوٰۃ کا مقصود ہے کہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ کفایت کی معتبر مقدار یہ ہے کہ لباس، کھانا، رہائش اور تمام ناگزیر ضروریات مہیا کی جائیں جو اس شخص کو اور ان لوگوں کو جن کا نفقہ اس کے ذمے ہو کافی ہو اور یہ سب چیزیں اس کی حالت کے مطابق ہوں اور ان کی تکمیل میں نہ تو کنجوسی برتی جائے اور نہ بے حد اسراف سے کام لیا جائے۔[1]

اور ہمارے دور میں تو یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو اتنی گنجائش میسر ہو کہ وہ اپنی اولاد کو ضروری علم دین سکھا سکے اور لازمی تعلیم دلوا سکے تاکہ جہالت کی تاریکی چھٹ جائے اور وہ معزز زندگی گزار سکیں اور اپنے دینی اور دنیاوی فرائض کو بہتر طریقے پر انجام دے سکیں۔ ہم انسان کی ناگزیر ضروریات کے بیان میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ ان ضروریات میں ایک مسلمان فرد کی جہالت کو دور کرنا بھی ہے کہ جہالت اس کی معنوی اور اخلاقی زندگی کی موت ہے۔

---

[1] المجموع، ج ۶، ص ۱۹۱۔ الروضۃ ج ۲ ص ۳۱۱۔

نیز عصرِ حاضر کی ایک ناگزیر ضرورت علاج کی سہولت ہے کہ ہر شخص کو علاج فراہم کیا جائے اور اس کی زندگی کو موت کی نذر نہ کر دیا جائے کہ یہ قتل نفس کے مترادف ہے اور اپنے ہاتھوں سے انسانی زندگی کو ہلاکت میں ڈال دینا ہے چنانچہ حدیث نبوی میں ہے کہ

"اے اللہ کے بندو دوا کرو کہ اللہ نے جو بیماری پیدا کی ہے اس کی دوا بھی اتاری ہے۔"[1]

اور فرمانِ الٰہی ہے۔

وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ: ۱۹۵)

اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

نیز فرمایا

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (النساء: ۲۹)

اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔

اور صحیح حدیث ہے کہ

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس پر ظلم ہونے دیتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اگر مسلم افراد اور مسلم معاشرہ کسی مسلمان کو مرض میں مبتلا چھوڑ دیں اور اس کا علاج نہ کریں تو یہ اس کو ظلم اور ناانصافی کے حوالے کر دینا ہے۔

مسلم معاشرے کے افراد کے معیارِ زندگی کی کوئی لگی بندھی تحدید نہیں کی جا سکتی بلکہ درحقیقت یہ معیار مختلف ادوار میں اور مختلف ماحول میں قوم کی مجموعی قومی دولت اور آمدنی کے لحاظ سے مختلف ہوگا، بلکہ اس معیار میں اتنا فرق ہو سکتا ہے کہ جو امور ایک ماحول کے لیے ایک دور میں کمالیات (آسائشات) میں سے ہوں وہ ہی امور کسی اور دور میں اور کسی اور ماحول میں ضرورت اور حاجت بن جاتے ہیں۔

---

[1] اس روایت کو احمد نے اصحاب السنن نے ابن حبان نے اور حاکم نے روایت کیا ہے، اور المناوی نے التیسیر میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

مستقل اور باقاعدہ اعانت

اُس فقیر اور مسکین کے حوالے سے اسلام کے نظامِ زکوٰۃ کا مقصد جو کوئی پیشہ یا تجارت اختیار نہ کر سکتا ہو یہ ہے کہ اس کے اور اس کے خاندان کے لیے موزوں معیشت فراہم کی جائے اور اسے پورے ایک سال کی ضرورت کے بقدر مال فراہم کیا جائے نہ کہ ماہ دو ماہ کی ضرورت، اور یہ کہ یہ اعانت دائمی اور باقاعدہ ہوتا آنکہ فقر دور ہو جائے اور مستحق شخص غنی ہو جائے، یا اس میں از خود کسب کی قدرت اور استطاعت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ابو عبید نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

"ایک مرتبہ حضرت عمرؓ دوپہر کو ایک درخت کے سائے میں قیلولہ کر رہے تھے کہ ایک عرب دیہاتی عورت آئی اور اس نے عرض کی کہ میں مسکین ہوں میرے بچے ہیں اور امیر المؤمنین نے ہمارے یہاں تحصیل زکوٰۃ کے لیے محمد بن مسلمہ کو مامور کیا تھا لیکن انھوں نے ہمیں کچھ نہیں دیا، میں آپ کے پاس آئی ہوں تاکہ آپ انھیں ہمارے بارے میں ہدایت فرمادیں۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے غلام یرفا کو آواز دی اور حکم دیا کہ محمد بن مسلمہ کو بلاؤ، اس عورت نے کہا کہ میری ضرورت کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ آپ میرے ساتھ اُن کے پاس چلیں اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ انشاء اللہ وہ تمہارا کام کریں گے یرفا محمد بن مسلمہ کے پاس پہنچا اور کہا کہ امیر المؤمنین نے آپ کو بلایا ہے چنانچہ وہ آئے اور آپ کو سلام کیا۔ وہ عورت شرما گئی اور حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم اپنی جانب سے میں کسر نہیں چھوڑتا کہ تم میں سے بہترین آدمی کو منتخب کروں، بھلا بتاؤ اللہ کے سامنے تم کیا جواب دوگے جب وہ تم سے اس عورت کے بارے میں سوال کرے گا، یہ سن کر محمد بن مسلمہ آبدیدہ ہو گئے۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہم نے ان کی تصدیق کی اور ان کے بنائے ہوئے راستے کی اتباع کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی عمل کیا جس کا اللہ نے آپؐ کو حکم دیا تھا چنانچہ آپؐ نے زکوٰۃ مستحقین میں تقسیم فرمائی اور اس پر عمل پیرا رہتے ہوئے آپؐ نے اپنی جان اللہ کو سونپ دی پھر اللہ نے

حضرت ابوبکرؓ کو ان کا جانشین بنایا اور وہ بھی مرتے دم تک آپ کے طریقۂ کار پر عمل پیرا رہے، پھر اس نے مجھے ان کا جانشین بنایا اور میں نے تم میں سے بہترین کو انتخاب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اگر میں نے تمھیں پھر مامور کیا تو اس عورت کو اس سال اور پہلے سال کی زکوٰۃ دینا، اور ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں مامور نہ کروں، پھر انھوں نے ایک اونٹ منگوایا اور اُسے آٹا اور زیتون کا تیل دیتے ہوئے کہا یہ لے لو ہم خیبر جا رہے ہیں وہاں ہم سے ملو، چنانچہ وہ عورت خیبر میں ان کے پاس پہنچی اور انھوں نے اس کے لیے دو دوسرے اونٹ منگوائے اور کہا یہ لے لو اس میں گزر بسر ہو جائے گی تا آنکہ محمد بن مسلمہ تمھارے پاس پہنچیں میں نے انھیں ہدایت کر دی ہے کہ وہ تمھارا اس سال کا اور پچھلے سال کا حق تمھیں ادا کر دیں۔[۱]

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نظام حکومت میں حکمراں کو اپنی قوم کے بارے میں کس قدر ذمہ دار ہونا چاہیے کہ ہر فرد کی معیشت کی اس کو فکر ہو اور وہ اس کا بندوبست کرے، اور خود افراد بھی اس امر کا شعور رکھتے ہوں کہ ان کے لیے موزوں معیشت کو فراہمی اسلامی ریاست کی ذمے داری ہے۔

اور اس واقعہ سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اسلام کے نظام مالیات میں زکوٰۃ کس قدر اہم ہے اور کس طرح زکوٰۃ مسلم معاشرے کے افراد کی اجتماعی کفالت کی اساس فراہم کرتی ہے اور یہ کہ یہ ایک دائمی مستقل اور منضبط اعانت ہے اور اگر کسی فرد کو یہ اعانت نہ پہنچے تو اسے یہ حق ہے کہ وہ اس کی باقاعدہ شکایت کرے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کا طریقہ کار یہی تھا کہ جس کو زکوٰۃ دی جائے بقدر کفایت دی جائے اور اس قدر دی جائے کہ اسے غنی بنا دے چنانچہ آپؓ نے پہلے اس اعرابی عورت کو آٹے اور تیل سے لدا ہوا اونٹ دیا پھر اسے دو اونٹ دیئے اور بعد ازاں محمد بن مسلمہ نے اسے زکوٰۃ میں گزشتہ سال کا اور رواں سال کا حق دیا۔

اور سب سے بڑھ کر، کہ حضرت عمرؓ اس طریقہ کار میں سنت رسولؐ کے متبع تھے اور پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکرؓ کے طریقے کی پیروی کرنے والے تھے اور حضرت عمرؓ کا یہ طریقہ محض ان کا اپنا اجتہاد نہ تھا۔

●

---

[۱] ابوعبید: الاموال، ص ۵۹۹۔

دوسری فصل

عاملین زکوٰۃ
یا
زکوٰۃ کا انتظامی اور مالی ادارہ

فقرا، اور مساکین کے بعد زکوٰۃ کا دوسرا مصرف عاملین علیہا (زکوٰۃ کے حصول اور اس کی تقسیم سے متعلق افراد) کا ہے اور اس سے مقصود وہ تمام انتظامی ڈھانچہ ہے جو زکوٰۃ سے متعلق جملہ امور کو انجام دے یعنی زکوٰۃ کے وصول کنندگان، اس کو رکھنے والے، اس کی حفاظت کرنے والے، لکھنے والے اور حساب کرنے والے اور مستحقین میں تقسیم کرنے والے ۔۔۔ ان سب کی اجرتیں مال زکوٰۃ سے ادا کی جائیں گی اور مال کے مالکوں سے اس مد میں علیحدہ سے کچھ نہیں لیا جائے گا اور اس زکوٰۃ کے مال کو ایک مستقل حساب متصور کیا جائے گا جو اس کے نظام کو چلانے والوں پر بھی خرچ ہو سکے گا۔

اس صنف سے متعلق قرآن کا اہتمام اور اس پر نص کی موجودگی اور اس کو آٹھ مصارف میں سے ایک قرار دے دینا اور اس کو مستحقین کی ترتیب کے بیان میں فقرا اور مساکین کے بعد رکھنا، اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ انفرادی فریضہ نہیں ہے بلکہ ایک سرکاری ذمے داری ہے کہ وہ اس نظام زکوٰۃ کو چلائے اور اس کی نگرانی کرے اور اس نظام کے لیے وصول کنندگان، خازن اور کاتب و محاسب کے جس عملے کی ضرورت ہو اسے مقرر کرے اور اسی زکوٰۃ کے فنڈ سے ان کی تنخواہیں ادا کرے [1]

---

[1] دیکھیے اگلے باب کی فصل۔ زکوٰۃ کا ریاست سے تعلق۔

زکوٰۃ وصول کنندگاں کا بھیجنا ریاست کی ذمّے داری ہے

اسی لیے فقہاء نے کہا ہے کہ امام پر زکوٰۃ کے وصول کنندگان کا بھیجنا لازم ہے اور خود نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین وصول کنندگان بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کو صدقہ (زکوٰۃ) کی وصولیابی کے لیے بھیجا۔" (بخاری و مسلم)

حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ابن اللتیبہ کو صدقات پر عامل مقرر فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

غرض عاملین زکوٰۃ کے بھیجنے کے بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں۔

اور عاملین زکوٰۃ کے بھیجنے کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ بعض لوگوں کے پاس مال ہوتا ہے لیکن ان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس پر کس قدر زکوٰۃ واجب ہے اور بعض جانتے تو ہیں مگر بخل کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں نکالتے اس لیے ضروری ہے کہ سرکاری وصول کنندگان ان سے جاکر وصول کریں[1]

امام اور اس کے نائب پر یہ بھی لازم ہے کہ فصلوں اور پھلوں کی تیاری کے وقت بھی عاملین روانہ کرے کہ فصلوں اور پھلوں کی تیاری کا وقت ان پر زکوٰۃ واجب ہونے کا وقت ہے اور ان میں سال گزرنا شرط نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے کٹائی کے وقت اور پھلوں کے توڑے جانے کے وقت موجود ہوں۔

مویشی اور دیگر اموال جن میں سال گزرنے کا اعتبار ہے اس میں موزوں یہ ہے کہ وصول کنندگان کے وصول کے لیے آنے کا کوئی مہینہ مقرر ہو اور بہتر یہ ہے کہ محرم ہو، خواہ گرمی ہو یا سردی اس لیے کہ اسلامی سال کا آغاز محرم سے ہوتا ہے[2]

---

[1] النووی : المجموع - ج ۶، ص ۱۶۷۔

[2] ایضاً۔

عاملین زکوٰۃ کی ذمے داری

عاملین زکوٰۃ کی کئی ذمے داریاں ہیں اور ان سب کا تعلق نظام زکوٰۃ سے ہے۔ کہ وہ یہ اعداد و شمار جمع کریں کہ کن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہے اور کتنی واجب ہے، کس کے حق میں لازم ہے، مستحقین کی تعداد کتنی ہے، ان کی ضرورتیں کس قدر ہیں اور یہ ضرورتیں کتنی مقدار زکوٰۃ میں پوری ہو جائیں گی ـــــ غرض ایک مکمل نظام ہو جس میں تجربہ کار اور باخبر لوگ ان تمام کی معلومات اپنے پاس جمع رکھیں۔

زکوٰۃ کے دو ادارے

ہمارے زمانے میں زکوٰۃ سے متعلق دو ادارے قائم ہو سکتے ہیں:۔

۱) حصول زکوٰۃ سے متعلق ادارہ۔

۲) تقسیم زکوٰۃ سے متعلق ادارہ۔

۱) حصول زکوٰۃ کا ادارہ اور اس کا دائرہ کار

زکوٰۃ وصول کنندگان کی ذمے داریاں ہمارے موجودہ نظام میں ٹیکس کی وصولیابی سے متعلق نظام کے مشابہ ہوں گی کہ وصول کنندگان اپنے پاس مالداروں ـــــ یعنی جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ـــــ کے اعداد و شمار مرتب کریں گے، ان کے اموال کی نوعیتیں درج کریں گے اور جو زکوٰۃ کی مقداریں ان پر واجب ہونگی وہ بھی درج کریں گے، نیز اسی ادارے کا یہ کام ہوگا کہ زکوٰۃ کی ان مقداروں کو جمع کر کے تقسیم کرنے والے ادارے کے حوالے کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس تمام کام کے لیے ضروری ہوگا کہ ہر علاقے میں اس ادارے کی شاخیں یا ذیلی تنظیمیں موجود ہوں۔

علاوہ بریں اس ادارے کا دائرہ کار موجودہ دور کے ٹیکسوں کی وصولیابی کے دفاتر سے زیادہ وسیع ہو سکتا ہے کیونکہ ٹیکسوں کا تعلق بالعموم نقود ـــــ کرنسی ـــــ سے ہوتا ہے جبکہ زکوٰۃ وصول کرنے والے ادارے کا دائرہ کار غلوں، پھلوں، مویشی اور کانوں وغیرہ کو بھی محیط ہوگا۔ (لیکن ان تمام اشیاء میں زکوٰۃ واجب شدہ کی قیمت لینا بھی درست ہے جیسا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے ـــــ اور جس کا بیان اگلے باب میں ہوگا۔)

اس ادارے کے ذیلی شعبے اس طرح تشکیل پا سکتے ہیں۔

۱) ایک شاخ صرف کانوں اور دفینوں کی زکوٰۃ بحساب خمس ۲۰ نبر وصول کرے۔

۲) دوسری شاخ غلوں اور پھلوں اور ان پیداواروں کی زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور ہو جن میں شرح زکوٰۃ عُشر (۱۰ نبر) یا نصف عُشر (۵ نبر) ہوتی ہے۔

۳) تیسری شاخ مویشیوں پر زکوٰۃ وصول کرے اور اس کا مخصوص حساب اپنے پاس رکھے۔

۴) چوتھی شاخ نقود اور اموال تجارت پر بحساب ربع عُشر (۲½ نبر) زکوٰۃ وصول کرے۔

۲) تقسیم زکوٰۃ سے متعلق ادارہ اور اس کا دائرہ کار

اس ادارے کی شکل و صورت اجتماعی انشورنس کے مماثل ہو سکتی ہے۔ اس ادارے کی ذمے داریاں یہ ہوں گی کہ وہ مستحقین زکوٰۃ کا پتہ لگانے کے لیے بہتر طریقے اختیار کرے۔ ان کے استحقاق کا پتہ چلائے۔ یہ معلوم کرے کہ انھیں کس قدر ضرورت ہے۔ اور کتنی رقم کافی ہو گی اور تعداد اور اجتماعی حالات کے مطابق ان کی ضروریات کس طرح مضبوط بنیادوں پر پوری ہوں گی۔

امام نووی فرماتے ہیں۔

امام پر اور زکوٰۃ وصول کنندہ پر لازم ہے کہ وہ مستحقین کی تعداد سے اور ان کی ضرورت سے بخوبی واقف ہوں اور یہ بھی علم رکھتے ہوں کہ زکوٰۃ کی کتنی رقم ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو گی اور اس کے ساتھ ہی وہ زکوٰۃ کی وصولیابی کے فوراً بعد اس کی تقسیم شروع کر دیں تاکہ مال کے ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا نہ ہو۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہائے اسلام نے زکوٰۃ کے مستحقین کا علم حاصل کرنے اور ان پر زکوٰۃ کے صرف کیے جانے کے موضوع پر بہت توجہ دی ہے تاکہ مستحقین کو زکوٰۃ ان کے مطالبہ کے بغیر فوراً پہنچ جائے۔

اس ادارے کی بھی ہر مقام پر شاخیں ہونا چاہئیں۔ اور اسے درج ذیل شعبوں میں تقسیم

---

[1] الروضۃ: ج ۲، ص ۳۳۷۔

کیا جا سکتا ہے۔

ا) ادارہ کا ایک شعبہ ان فقراء (تنگدستوں) سے متعلق ہو سکتا ہے جو کسب سے عاجز ہونے کی بنا پر تنگدستی میں مبتلا ہوں یا جو بہت بوڑھے ہوں، بیوہ اور یتیم ہوں اور ایسے کارکن ہوں جو دوران کار اپنے اعضاء گنوا بیٹھے ہوں، یا جو بیماری کی وجہ سے کام کاج سے عاجز ہوں، یا جو اپاہج اور لاچار ہوں، یا مصیبت رسیدہ اور مجنون اور پاگل ہوں اور یہ ثابت ہو جائے کہ انھیں میراث وغیرہ سے ایسا مال نہیں ملا ہے جس سے وہ مالدار ہو گئے ہوں۔

ب) ایک شعبہ ان لوگوں سے متعلق ہو سکتا ہے جو کسب تو کرتے ہوں مگر ان کی آمدنی محدود ہو اور کم آمدنی ہونے کی بنا پر یا کثرتِ عیال کی بنا پر انھیں کافی نہ ہو یا مہنگائی کی بنا پر ان کی آمدن ان کے لیے ناکافی ہو گئی ہو۔ انہی لوگوں کو بعض فقہاء نے مساکین قرار دیا ہے۔

ج) غارمین (مقروض، تاوان رسیدہ) کا شعبہ جو مصیبت زدہ لوگوں کو بھی مشتمل ہوگا اور ان لوگوں کو بھی جو کسی جائز کام کے لیے قرض لے کر مقروض ہو گئے ہوں، یا جنھوں نے دو افراد کے درمیان صلح کرانے کی خاطر ان کا کوئی تاوان اپنے ذمے لے لیا ہو اور اسی قسم کے دیگر اجتماعی فلاحی کاموں کی انجام دہی کی بنا پر ان پر مالی ذمے داری آن پڑی ہے۔

د) ان سیاسی پناہ گزینوں اور مہاجروں کا شعبہ جو نظام کفر وظلم سے فرار ہو کر اسلامی ریاست میں آگئے ہوں اور ایسے طلبہ جو خدمت اسلام کے لیے دوسرے ممالک میں بھیجے گئے ہوں، اور یہ ابن السبیل کا بھی مصرف ہے۔

ھ) بلاد کفر میں اشاعت اسلام کرنے والی تنظیموں کا شعبہ اور یہ مصرف فی سبیل اللہ کا ہے اور یہ تنظیمیں دعوتِ اسلام دیں گی، سرزمینِ اسلام میں اسلام کی حکمرانی قائم کریں گی، اور مسلمان ملکوں کو کافروں کے اقتدار سے نجات دلا کر وہاں نظامِ اسلامی کی جدوجہد کریں گی۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ان شعبوں میں سے ہر ایک پر کتنا خرچ کیا جائے اور انھیں زکوٰۃ میں سے کس قدر اعانت دی جائے گی، یہ اولی الامر کی صوابدید پر موقوف ہے،

اور اس کے لیے مکمل اعداد و شمار جمع کیے جائیں اور جس علاقے سے زکوٰۃ جمع کی جارہی ہے اس کی ضروریات کو مدِ نظر رکھا جائے اور اسلام کی عالمی دعوت کو پیشِ نظر رکھا جائے اور مسلمانوں کے ایک امتِ واحدہ اور ایک ممتاز اُمت ہونے کے مصالح کا خیال رکھا جائے۔

استحقاق کا اثبات

ان میں سے ہر شعبہ پر یہ لازم ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ جس شخص پر وہ زکوٰۃ صرف کر رہا ہے وہ فی الواقع زکوٰۃ کا مستحق بھی ہے یا نہیں ہے اس سلسلے میں احادیث بھی موجود ہیں جن سے استنباط کر کے فقہاء نے متعلقہ قواعد اور اصول منضبط کیے ہیں جن میں بعض ہم یہاں پر ذکر کرتے ہیں۔

ا) فقراء اور مساکین کے حصہ کے استحقاق کے لیے یہ شرط ہے کہ فقیر یا مسکین کا کوئی ایسا کسب موجود نہ ہو جو اس کی اور اس کے عیال کی کفایت کے لیے کافی ہو، گویا اس میں مستحق ہونے کے لیے کسب سے مطلق عاجز ہونا شرط نہیں ہے، اور اس لحاظ سے کمانے کی قدرت رکھنے والا ایسا شخص جسے کوئی کام میسر نہ آئے اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے کیونکہ یہ عاجز کے حکم میں ہوگا اور جو شخص اپنے کسب سے اپنی کفایت کے بقدر نہ حاصل کر سکتا ہو تو وہ اس کفایت کے بقدر زکوٰۃ لے سکتا ہے۔

ب) کسب وہ معتبر ہے جو اس کی حالت اور اس کی خاندانی شرافت کے مطابق ہو اگر ایسا کسب نہیں ہے تو وہ نہ ہونے کے درجے میں ہے چنانچہ اگر عالم ہو یا ادیب ہو یعنی ایسا فرد جو بالعموم جسمانی محنت کی کمائی کے نادی نہیں ہوتے ان کو اگر موزوں کسب میسر نہ ہو تو وہ بھی مناسب کام میسر آنے تک فقراء اور مساکین کے حصے سے لے سکتے ہیں۔

ج) جو شخص کسب کی قدرت رکھتا ہو مگر طلب علم میں لگا ہوا ہو کہ اگر کسب میں لگے تو تحصیل علم چھوڑنا پڑے تو ایسے شخص کے لیے بھی زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس طالب علم کو واقعی حصول علم ہو رہا ہو اور اس کا علم مسلمانوں کے لیے فائدہ بخش ہوگا۔ لیکن جو کسب پر قادر ہو اور اسے علم نہ آ رہا ہو تو کسی مدرسہ میں مقیم ہونے کے باوجود اسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے۔

د) اگر کسی شخص کے پاس جائیداد ہو جس کی آمدنی اس کی کفایت سے کم تر ہو تو وہ فقیر اور

مسکین ہے اور اسے زکوٰۃ سے اس کی کفایت کے بقدر دیا جائے گا اور اسے جائیداد فروخت کرنے کے لیے نہیں کہا جائے گا، اور اسی طرح علم میں مصروف شخص کو کتب فروخت کرنے کے لیے نہیں کہا جائے گا کیونکہ اسے ان کتابوں کی ضرورت ہے۔

۴) اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ مالدار ہے اور وہ فقر کا دعویٰ کرے تو جب تک وہ بیّنہ (ثبوت) نہ دے اس کا یہ دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کا غنی ہونا تو ثابت ہے اب فقیری (تنگدستی) کے اثبات کے لیے ثبوت ضروری ہے، جس طرح کسی پر قرض ہو اور اس مقروض کا مالدار ہونا ثابت ہو اور وہ اپنی تنگدستی کا دعویٰ کرے تو اسے بھی ثبوت پیش کرنا ہوگا۔

۵) لیکن اگر اس کا مالدار ہونا متعارف نہ ہو اور وہ تنگدست ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا یہ دعویٰ قابلِ قبول ہوگا اس لیے کہ تنگدستی ایک امرِ خفی ہے اور اس پر بیّنہ قائم کرنا دشوار ہے۔

۶) اگر ادنیٰ شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس کوئی کسب نہیں ہے تو اگر اس کی ظاہری حالت بھی ایسی ہی ہو، مثلاً وہ بہت بوڑھا ہو، یا جوان ہو مگر بہت کمزور ہو تو اس کا قول بغیر یمین کے قابل قبول ہوگا کیونکہ اس کا بیان حسبِ حال ہے۔ اور اگر مضبوط نوجوان ہو تو اس کا بھی قول قبول کر لیا جائے اور بیّنہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، لیکن اس سے یمین کا مطالبہ کیا جائے گا۔

اس بارے میں فقہائے شافعیہ کے دو اقوال ہیں، زیادہ صحیح یہ ہے کہ یمین کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ احمدؒ، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ دو اشخاص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ میں سے کچھ مانگا آپؐ نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا کہ وہ مضبوط ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم کہتے ہو تو دیئے دیتا ہوں لیکن اصل بات یہی ہے کہ اس میں غنی (مالدار) اور کسب کے قابل مضبوط آدمی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

زکوٰۃ تقسیم کرنے والے کو ناواقف لوگوں کو بتانا چاہیے کہ زکوٰۃ قوی اور مضبوط آدمی کے لیے نہیں ہے۔

ح) اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کے ذمّے عیال ہیں جن کی کفایت کے بقدر اس کے پاس روزی نہیں ہے تو اس سے ثبوت کا مطالبہ کیا جائے گا کہ اس بارے میں ثبوت فراہم کرنا آسان ہے۔

ط) اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس پر کسی تاوان کی ادائیگی لازم ہے یا وہ مقروض ہے تو اس کا قول بغیر ثبوت قبول نہیں کیا جائے گا۔

ی) ان مذکورہ بالا صورتوں میں ثبوت پیش کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دعویٰ پیش کیا جائے، گواہیاں ہوں اور عدالت سماعت کرے بلکہ محض دو عادل افراد کا یہ خبر دے دینا کہ اس شخص کا دعویٰ درست ہے کافی ہے، بلکہ لوگوں کے مابین اس کی اصل صورتحال کا متعارف ہونا بھی بیّنہ (ثبوت) کے درجے میں ہے حتیٰ کہ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ایسی متعارف صورت حال کے بارے میں ایک شخص کا خبر دے دینا بھی کافی ہے[1]

حدیث میں ان اشخاص کے بارے میں جن کو سوال کرنا جائز ہے آیا ہے کہ
وہ شخص جو گرفتار فاقہ ہو اور اس کی قوم کے تین عقلمند آدمی بتائیں کہ واقعی اس پر فاقہ ہے"

خطابی کہتے ہیں یہ بات اس شخص کے بارے میں ہے جس کی ملکیت کا علم ہو اور بظاہر وہ فراخ دست ہو لیکن کسی وجہ سے اس کا مال ضائع ہو جائے، چور لے جائے، یا کسی کے پاس امانت رکھائی ہو اور وہ واپس نہ کرے یا ایسی ہی کوئی صورت ہو جس سے ظاہری حالت سے اس کی حقیقی حالت کا علم نہ ہو سکے اور اس کے بارے میں شک پیدا ہو جائے تو اس کی حالت کا پتہ چلانے کے بعد اسے زکوٰۃ میں سے کچھ دیا جائے گا اور اس سلسلے میں اس کے جاننے والوں سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔ اور یہی اس فرمان نبوت ؐ کے معنی ہیں کہ "قوم کے تین عقلمند آدمی بتائیں کہ اس پر فاقہ ہے" اس فقرے میں عقلمند کی شرط بطور تاکید ہے یعنی بتانے والا

---

[1] النووی : المجموع ، ج ٦ ، ص ١٨٩ - بعد۔

غنی اور بے خبر نہ ہو جس کو اصل حال کا پتہ ہی نہ ہو۔ اس لحاظ سے اس امر کا تعلق شہادت (گواہی) سے نہیں ہے بلکہ محض اصل حال کا پتہ لگانے سے ہے۔ چنانچہ اگر اس شخص کے پڑوسی اور اس کے باخبر اور سمجھدار رشتہ دار یہ بتلائیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکے گی[1]

عاملینِ زکوٰۃ کی شرائط

عامل زکوٰۃ کی چند شرائط ہیں۔

۱) اوّلاً یہ کہ مسلمان ہو، اس لیے کہ زکوٰۃ کا کام مسلمانوں کی ایک ذمّے داری ہے تو اس میں بھی اور ذمے داریوں کی طرح اسلام کی شرط ہونی چاہیے، البتہ جو امور براہِ راست زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم سے متعلق نہ ہوں اس میں یہ شرط نہیں ہے مثلاً چوکیدار (برائے حفاظت) یا مویشیوں کو لے جانے والا۔

امام احمدؒ سے ایک قول یہ مروی ہے کہ عامل کا غیر مسلم ہونا درست ہے، اس لیے کہ عاملین علیہا کا لفظ عام ہے جس میں کافر اور مسلم دونوں داخل ہیں، نیز یہ کہ جو کچھ عامل اس کام کا معاوضہ لے گا وہ تو درحقیقت اس کے کام کی اجرت ہوگی اور دیگر اجرتوں کی طرح وہ بھی جائز ہوگی[2] بہرحال زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس خالص دینی فرض کے لیے مسلم ہی کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اس کام میں امانت شرط ہے جیسا کہ شہادت میں امانت شرط ہے اور نیز یہ کہ یہ مسلمانوں کی ایک ذمّے داری ہے اور جس طرح دیگر اسلامی ذمّے داریوں کے پورا کرنے والے کا مسلمان ہونا شرط ہے اسی طرح اس میں بھی ہے اور جو شخص اہلِ زکوٰۃ میں سے نہیں ہے اس کو اس کام کی اُجرت بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ حربی کو جائز نہیں ہے اور مزید یہ کہ کافر امین (امانت دار) نہیں ہے اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اُن پر اعتماد نہ

---

[1] الخطابی : معالم السنن ، ج ۲، ص ۲۳۸۔

[2] المغنی : ج ۲، ص ۶۵۴۔

کرو کہ اللہ نے ان کو خائن قرار دیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ نے کسی نصرانی کو تحریر پر مامور کیا تو حضرت عمرؓ نے اس پر اعتراض فرمایا، فرض زکوٰۃ جو کہ رکن اسلام ہے اس پر کسی غیر مسلم کو مامور کرنا درست نہیں ہے[1]

۲) دوم یہ کہ مُکلّف یعنی عاقل اور بالغ ہو۔

۳) سوم یہ کہ امین (امانت دار) ہو اس لیے کہ مسلمانوں کے مال کے بارے میں اس پر بھروسہ کرنا پڑے گا اس بنا پر فاسق اور خائن کو اس کام کے لیے مامور نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا شخص خیانت کرے گا فقراء کے حقوق کی ادائیگی میں سستی کرے گا اور اپنی خواہش اور ہوائے نفس کا اتباع کرے گا۔

۴) احکام زکوٰۃ کا علم۔ عامل زکوٰۃ کو احکام زکوٰۃ سے واقف ہونا چاہیئے[2] تاکہ اسے معلوم ہو کہ اسے کیا زکوٰۃ لینی ہے اور کیا نہیں لینی ہے اور ضرورت کے مطابق وہ جزئی اجتہاد بھی کر سکے، یہ حکم اس صورت میں ہے جب عامل کے ذمے زکوٰۃ کے عمومی امور ہوں لیکن اگر اس کے ذمے ایک متعیّن دائرے میں رہتے ہوئے کام کرنا ہو تو پھر وہ احکام زکوٰۃ کے جاننے کا پابند نہیں ہوگا۔

۵) کام کی قدرت و صلاحیت رکھتا ہو، اور اس کی پوری ذمے داریاں سنبھال سکتا ہو اور امانت داری کے ساتھ اس میں قوتِ عمل بھی موجود ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے

إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (القصص: ۲۶)

بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

نیز قرآن میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے شاہِ مصر سے فرمایا۔

اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ (یوسف: ۵۵)

ملک کے خزانے میرے سپرد کر دیجیے میں حفاظت بھی کرنے والا ہوں اور علم بھی

---

[1] المغنی: ج ۶، ص ۴۶۰۔

[2] النووی: المجموع، ص ۱۶۷، شرح غایۃ المنتہی، ج ۲، ص ۱۳۷۔

رکھتا ہوں۔

آیت مذکورہ میں حفظ سے مراد امانت اور علم سے مراد باخبر اور صلاحیت ہونا ہے اور ہر کامیاب عمل کے لیے یہی دونوں امور اساس ہیں۔

۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت کا زکوٰۃ کے امور پر متعین نہ کرنا ——— اکثر فقہا نے کہا ہے کہ امور زکوٰۃ کی انجام دہی کے لیے آپؐ کے قرابت داروں یعنی بنوہاشم کو متعین نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ روایت ہے کہ فضل بن عباس اور مطلب بن ربیعہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کا عامل مقرر کرنے کی درخواست کی اور ان میں سے ایک نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپؐ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ آپؐ ہمیں صدقات پر مامور فرمادیں اور ہمیں وہی معاوضہ ملے جو سب لوگوں کو ملتا ہے ——— اور جو لوگ آپ کو لاکر دیتے ہیں وہی ہم بھی آپؐ کو لا کر دیں گے تو آپؐ نے فرمایا کہ

و زکوٰۃ محمدؐ اور آل محمدؐ کے لیے موزوں نہیں ہے کہ یہ لوگوں کے گندے مال ہیں[1]۔

(احمد و مسلم)

اس حدیث میں آل رسولؐ کو زکوٰۃ کے اموال کی طرف نظر کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں ان دونوں حضرات نے کہا تھا کہ ——— ہم بھی اس مال سے اسی طرح فائدہ اٹھائیں جس طرح دوسرے لوگ اٹھا رہے ہیں ——— اور حدیث میں زکوٰۃ کے مال کو گندہ قرار دینا بطور تشبیہ ہے کہ یہ مال کو اور نفوس کو پاک وصاف کرتا ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (التوبہ : ۱۰۳)

مال زکوٰۃ ایک عام مال ہے اور اس میں سے بغیر حق کے کچھ لے لینا گناہ عظیم ہے، اور آپؐ نے اپنے اقارب کو منع فرماکر یہ مثال قائم فرمادی کہ لوگ اس مال کی طمع کرنے سے گریز

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۷۵ - ط - الحلبی۔

کریں اور اُسے بغیر حق لینے سے باز رہیں۔

اہل بیت میں سے الناصر نے بنی ہاشم کو زکوٰۃ پر مقرر کرنے کو جائز کہا ہے اور یہی رائے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی ہے۔

صدقات کی ولایت کے بارے میں قاضی ابویعلی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں پر زکوٰۃ لینا حرام ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار اور غلام ان کو بھی نظام زکوٰۃ میں ذمہ داری دی جاسکتی ہے اور وہ اس کی اجرت لے سکتے ہیں، اس لیے کہ جو معاوضہ کام کا ملتا ہے وہ کام کی اجرت ہوتی ہے زکوٰۃ نہیں ہوتی، اس لیے اس کی مقدار اس کے عمل سے متعین ہوگی۔

اور الخرقی کہتے ہیں کہ

و بنی ہاشم، کافر اور غلام کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی الا یہ کہ وہ عامل ہوں اور انھیں ان کے عمل کی اجرت دی جائے "۔[1]

گویا ان حضرات فقہاء کے نزدیک حدیث برائے تحریم نہیں ہے بلکہ احتیاط اختیار کرنے کی تاکید کے طور پر ہے۔

اور جن فقہائے کے نزدیک یہ حدیث تحریم پر دلالت کرتی ہے ان کے نزدیک ذوی القربیٰ کے لیے زکوٰۃ کے کام کی اُجرت لینا بھی ناجائز ہے الا یہ کہ وہ زکوٰۃ کا کام کرکے کسی اور مد سے اُجرت لے لیں تو جائز ہے اور حضرت علیؓ نے بھی بنو العباس کے افراد کو عامل زکوٰۃ بنایا تھا۔[2]

۷) لبعض فقہاء نے عامل کے مرد ہونے کی بھی شرط لگائی ہے اور کہا ہے کہ عورت کا عامل بننا درست نہیں ہے اس لیے کہ یہ صدقات کی ولایت (ذمہ داری) ہے مگر اس رائے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس حدیث کو دلیل بنایا جائے۔

---

[1] قاضی ابویعلی: الاحکام السلطانیہ، ص ۹۹ - المجموع، ج ۶، ص ۱۶۸۔

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۷۵۔

"وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جو کسی عورت کو اپنا حکمراں بنالے"[1]

دراصل یہ حدیث عام حکمرانی سے متعلق ہے اور جہاں تک کسی خاص عمل کا تعلق ہے، جیسے زکوٰۃ کا عامل ہونا، تو وہ اس حدیث کے تحت نہیں آتا۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ ایسی کوئی تاریخی روایت موجود نہیں ہے کہ کبھی کسی عورت کو زکوٰۃ کا عامل بنایا گیا ہو جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ عورت کا عامل بنانا درست ہے۔

لیکن یہ بھی دلیل نہیں ہے اس لیے کہ اس دور کے اقتصادی اور اجتماعی حالات میں عورت کو اس قسم کی ذمہ داری تفویض نہیں کی جایا کرتی تھی جو بہرحال اس کی حرمت کی دلیل نہیں ہے۔

بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ عاملین علیہا مذکر کا لفظ ہے اور عورت کو شامل نہیں ہے[2] ـــــ لیکن اگر یہ بات صحیح تسلیم کرلی جائے تو پھر عورت کو فقراء اور مساکین میں بھی داخل نہ ہونا چاہیے کہ یہ الفاظ بھی مذکر آئے ہیں۔ بہرحال یہ بات اجماع کے خلاف ہے اس لیے کہ عورت مذکر کے خطاب اور صیغہ میں اس کی تابع ہوتی ہے۔

حق یہی ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی خاص دلیل موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ عورت کا عاملِ زکوٰۃ بننا درست نہیں ہے، لیکن اسلام کے عمومی احکام اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ عورت باوقار رہے اور مردوں کی گہما گہمی اور غیر ضروری اختلاط سے دور رہے اور اس اعتبار سے اس کام کا عورت کے بجائے مرد کا انجام دینا زیادہ بہتر ہے سوائے اس کے کہ عورت کسی مخصوص اور محدود دائرہ کار میں متعین کی جاتے، مثلاً عورت کو اس خدمت پر مامور کیا جائے کہ وہ بیوہ اور عاجز عورتوں کو زکوٰۃ پہنچائے، ظاہر ہے کہ اس قسم کا کام عورت مرد سے بہتر

---

[1] امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں بروایت حسن بصری از ابوبکرہ کتاب الفتن والمغازی میں نقل کی ہے۔

[2] شرح غایۃ المنتہی: ج ۲، ص ۱۳۷۔

طور پر کر سکتی ہے۔ غرض اس باب میں شریعت کی جانب سے کوئی تنگی نہیں ہے بلکہ وقت اور ضرورت کے مطابق اس میں توسّع موجود ہے۔

۸) فقہاء نے یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ عامل زکوٰۃ آزاد ہو غلام نہ ہو، جبکہ دیگر فقہاء نے اس شرط کو رد کیا ہے اس لیے کہ احمدؒ اور بخاریؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"سمع اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر ایسا حبشی غلام حاکم ہو جس کا سر کشمش کی طرح ہو"

نیز یہ کہ غلام بھی وہی کام سرانجام دے گا جو آزاد دے گا اس لیے جائز ہے[1]

عامل کو کس قدر دیا جائے؟

عامل بھی ایک ملازم ہے اور اس لیے اس کو اس کے کام کی اتنی اجرت ملنی چاہیئے جتنی کہ اس کے لیے کافی ہو چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عاملین کو زکوٰۃ میں سے تنخواہ قیمتوں کی حدود کے مطابق دی جائے گی جو ان کی آٹھ اصناف کی قسموں کے برابر ہونے پر مبنی ہے اگر ان کی اُجرت ان قسموں سے زائد ہو تو وہ علاوہ زکوٰۃ کے کسی اور مد سے دی جائے گی۔

جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ عامل کو تنخواہ زکوٰۃ ہی سے دی جائے گی، جیسا کہ نصِ قرآنی میں موجود ہے اگرچہ یہ تنخواہ قیمتوں کی شرح سے زائد ہو اور یہی امام شافعیؒ کا بھی ایک قول ہے۔ بہرحال امام شافعیؒ کی مندرجہ بالا رائے زیادہ عمدہ ہے کہ اس میں فقراء اور مساکین کی رعایت موجود ہے اور یہی بات موجودہ ٹیکسوں کے اس اصول کے مطابق ہے کہ ٹیکسوں کے حصول کے طریقہ پر اخراجات کا بار کم سے کم ہونا چاہیے۔

عاملؔ اگر خود مالدار (غنی) ہو تو بھی اسے اس کے کام کی اُجرت دی جائے گی، اس لیے کہ یہ امداد نہیں ہے بلکہ اس کی خدمت کا معاوضہ ہے۔

ابوداؤد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"غنی کو صدقہ حلال نہیں ہے سوائے ان پانچ افراد کے، اللہ کے راستے میں

---

[1] ایضاً ص ۱۳۸۔

جہاد کرنے والا، عامل زکوٰۃ مقروض یا تاوان رسیدہ، یا جس نے زکوٰۃ کی کوئی شئے خریدلی ہو، یا کسی شخص کا کوئی پڑوسی مسکین ہو اور وہ زکوٰۃ لے کر اسے دے دے اور وہ ہی شئے مسکین اسے ہدیہ کر دے۔[1]

مالِ زکوٰۃ پر حرص کی شدید ممانعت

اگر عاملِ زکوٰۃ امانت دار ملازم ہو تو اس کی ذمّے داری یہ ہے کہ وہ حکم کے مطابق زکوٰۃ جمع کرے اور حکم کے مطابق اسے رکھے اور مالِ زکوٰۃ میں سے اپنے لیے کچھ نہ لے اور نہ کوئی شئے چھپائے کہ زکوٰۃ عام مسلمانوں کا مال ہے اس میں کوئی حرص وطمع بالکل جائز نہیں ہے اور اس خیانت کے شدید گناہ ہونے اور اس پر سخت عذاب ہونے کی احادیث میں اس قدر وعیدیں آئی ہیں کہ انسان کانپ اُٹھتا ہے۔

حضرت عدی بن عمیرہ سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہم جس کسی کو عامل بنائیں اور وہ اس میں سے ایک سُوئی بھی چھُپا لے تو یہ خیانت ہوگی جسے روزِ قیامت اسے لا کر پیش کرنا ہوگا[2] یہ سن کر ایک سیاہ فام شخص کھڑا ہُوا، گویا میں اسے دیکھ رہا ہُوں، اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آپ مجھ سے اپنا کام واپس لے لیں، آپؐ نے فرمایا تمھیں کیا ہُوا۔ اس نے عرض کی کہ میں

---

[1] النووی المجموع میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن یا صحیح ہے، اور اسے ابوداؤد نے دو سلسلہ سند سے روایت کیا ہے ایک عطا بن یسار از ابوسعید خدری از نبیؐ اور دوسرے عطاء سے مُرسل، دونوں سندیں عمدہ ہیں۔ المنذری کہتے ہیں (مختصر السنن ج ۲، ص ۲۳۵) کہ اس حدیث کو ابن ماجہ نے مُسند روایت کیا ہے اور ابوعمر النحوی کہتے ہیں کہ یہ حدیث بروایت زید بن مُسلم بہت سے حضرات نے موصول روایت کی ہے۔

[2] اس آیت کی جانب اشارہ ہے۔

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران : ۱۶۱)

اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائیگا۔

نے آپ کو اس اس طرح فرماتے ہوئے سُنا ہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے اور میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ جس شخص کو ہم عامل بنائیں اسے کم و بیش جو بھی ملے وہ لے آئے، پھر جو اس میں سے دیا جائے لے لے اور جس شئے سے روک دیا جائے اس سے باز آجائے۔ (مسلم، ابوداؤد)

حضرت ابورافعؓ سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بقیع (قبرستان) سے گزر رہے تھے، کہ آپؐ فرمانے لگے تجھ پر افسوس، تجھ پر افسوس، ابورافعؓ کہتے ہیں کہ مجھ پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور میں یہ سمجھ کر تھوڑا سا پیچھے ہوگیا کہ آپ مجھے فرما رہے ہیں، آپؐ نے فرمایا تجھے کیا ہوا؟ چلو۔ میں نے عرض کی کیا مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے؟ آپؐ نے پوچھا کیوں؟ میں نے عرض کی آپؐ مجھے فرما رہے ہیں کہ تجھ پر افسوس، آپؐ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ دراصل یہ (قبر والا) فلاں شخص ہے جسے میں نے زکوٰۃ پر عامل بنا کر بھیجا تھا، اس نے ایک ادنیٰ دھاری دار چادر کی خیانت کی، اب اس کو ویسی چادر آگ کی پہنادی گئی ہے۔ (نسائی، ابن خزیمہ)

حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو زکوٰۃ پر عامل بنا کر بھیجا اور فرمایا کہ اے ابوالولید اللہ سے ڈرتے رہنا کہیں تم روز قیامت آؤ، اور ایک چلاتا ہوا اونٹ، ایک پکارتی ہوئی گائے ایک بلبلاتی ہوئی بکری تمہارے اوپر سوار ہو، انھوں نے استفسار کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح ہوگا، آپؐ نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تو آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو مبعوث فرمایا میں کسی شئے پر آپؐ کا عامل نہیں بنوں گا۔ (طبرانی)

حضرت عبادہؓ نے اپنے دین کی سلامتی کی خاطر عامل بننے کا ارادہ ترک فرمادیا تاکہ ان کا دین خطرے میں نہ پڑے اور انھیں اس مذکورہ وعید کا ہدف نہ بننا پڑے۔

ملازمین کو دیا جانے والا ہدیہ رشوت ہے

جس طرح کسی عامل کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال میں سے کوئی شئے چھپالے، خواہ وہ ایک سوئی کیوں نہ ہو اسی طرح اسے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ کسی زکوٰۃ دینے والے مالدار شخص ہدیہ یا تحفہ لے کہ یہ رشوت ہے خواہ وہ ہدیہ کے نام سے لے۔

عاملِ زکوٰۃ کو تنخواہ سرکاری خزانے سے ملتی ہے اور اسے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس پر کوئی اضافہ کرے کہ اس طرح زکوٰۃ دہندگان سے کچھ لے لینا لوگوں کا ناحق مال کھانا ہے اور فقرا اور مساکین کے حق میں اغنیاء سے ساز باز کرنا ہے اور اس طرح زکوٰۃ وصول کرنے والا تہمت کا نشانہ بن جاتا ہے اور جو شخص خود اپنے آپ کو ہدفِ ملامت بنائے اسے کسی دوسرے کو بُرا کہنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

ابو حمید الساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ازدی شخص (ابن اللتبیہ) کو عامل مقرر فرمایا، جب وہ آئے تو انھوں نے کہا یہ آپؐ کا حصّہ ہے اور یہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ جو کام اللہ نے مجھے تفویض کیا ہے اس میں جب میں کسی کو والی مقرر کرتا ہوں تو وہ آکر کہتا ہے کہ یہ تمھارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا کہ وہیں اس کو ہدیے آتے اگر وہ سچا ہے۔ قسم بخدا تم میں سے جو شخص بغیر حق کوئی شئے لے گا روزِ قیامت وہ اس کو اٹھائے ہوئے آئے گا اور میں اس روز ایسے شخص کو نہیں پہچانوں گا جس پر کوئی چلاتا ہوا اونٹ، چیختی ہوئی گائے اور بلبلاتی ہوئی بکری لدی ہو۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے، یہاں تک کہ آپؐ کے بغلوں کی سپیدی ظاہر ہوگئی اور آپؐ نے فرمایا اے اللہ میں نے پہنچا دیا۔ (بخاریؒ، مسلم، ابوداؤد[1])

زکوٰۃ وصول کنندگاں کے لیے ہدایات نبویؐ: اہلِ مال سے نرمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو نرمی اور اعتدال کی نصیحت فرماتے تھے اور اپنے بہترین اصحاب میں سے اس کام کے لیے منتخب فرماتے تھے۔ فصلوں اور پھلوں کی زکوٰۃ کے لیے ایسے صحابہ کو روانہ فرماتے جو خَرص (اندازہ) کے جاننے والے ہوں اور صحیح اندازہ کر سکیں۔

ابن عبد البر کہتے ہیں کہ خَرص (اندازہ) کے معنی ہیں مالک کے مال کا خیانت سے محفوظ رہنا، اس لیے اگر وہ خرص کے بعد کمی کا دعویٰ کرے تو اسے ثبوت دینا ہوگا اور اس سے

---

[1] المنذری: الترغیب والترھیب ج ۱، ص ۲۷۷۔ المنیریہ۔

اندازہ کرنے والے کے اندازے کے مطابق فقراء کا حق وصول کیا جائے گا۔

پھلوں کے اندازے (خرص الثمار) کے بارے میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرص ثمار کے لیے عمّال مقرر فرمائے اور ان سے کہا کہ اندازے میں ذرا تخفیف سے کام لو کہ مال میں کچھ وصیت کی جاتی ہے، کچھ ہدیہ دیا جاتا ہے کچھ جانور کھا جاتے ہیں اور کچھ موسموں کے ردوبدل کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس نصیحت کا مفہوم یہ ہے کہ زکوٰۃ دہندگان مالداروں کے ساتھ نرمی برتی جائے، اور یہ مدنظر رکھا جائے کہ مال میں دیگر مطالبات بھی ہوتے ہیں جن سے انسان غفلت نہیں برت سکتا ان میں کچھ مطالبات انسان خود اپنے اوپر لازم کرتا ہے جیسے وصیت اور ہدیہ اور بعض فطری طور پر لازم آجاتے ہیں جیسے آندھی اور طوفان کی نذر ہو جاتے ہیں۔

مال والوں کے حق میں دُعا

روحانی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ میں اور دیگر دنیاوی ٹیکسوں میں فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اپنی خوشی سے زکوٰۃ دیتا ہے اور اس پر فضلِ الٰہی کا طالب ہوتا ہے اور زکوٰۃ وصول کرنے والا بھی اسے دعا دیتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ : ۱۰۳)

اے نبی تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں انھیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دُعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے کہ ان کے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر آئے تو آپ نے فرمایا اے اللہ ابو اوفی کی اولاد کو خیر و برکت عطا فرما۔[1]

---

[1] احمدؒ، بخاریؒ، مسلمؒ۔

کیا مسلمانوں کے مفاد کے کاموں میں مصروف افراد کو عاملینِ زکوٰۃ پر قیاس کیا جائیگا؟

ابن رشد فرماتے ہیں کہ جن فقہاء نے عاملین زکوٰۃ کو زکوٰۃ فنڈ میں سے تنخواہیں دینا جائز قرار دیا ہے ان کے نزدیک قضاۃ اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف دیگر افراد کو بھی زکوٰۃ سے تنخواہیں دینا جائز قرار دیا ہے[1]

نیل الاوطار اور اس کی شرح میں فقہ اباضیہ کا یہ مسلک درج ہے کہ زکوٰۃ میں سے تنخواہ عامل زکوٰۃ کو دی جا سکتی ہے اور ہر اس شخص کو دی جا سکتی ہے جو مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہو جیسے قاضی، والی، اور مفتی، اگرچہ یہ افراد غنی ہوں اس لیے کہ یہ عام مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہیں اور اس بنا پر وہ اپنے طور پر کوئی کام نہیں کر سکتے[2]

لیکن عام فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کارکنان دولت (سرکاری ملازمین) کو زکوٰۃ سے تنخواہیں نہیں دی جائیں گی بلکہ فئے اور خراج سے دی جائے گی۔ البتہ جن فقہاء نے فی سبیل اللہ کی مد میں توسع اختیار کیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ یہ مد ہر نیکی اور ہر خدمت پر مشتمل ہے ان کے نزدیک زکوٰۃ سے جملہ مفاد عامہ کے کاموں میں مصروف افراد کو تنخواہیں دی جا سکتی ہیں جیسا کہ چھٹی فصل میں بیان ہوگا۔

●

---

[1] بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۷۶۔

[2] النیل وشرحہ، ج ۲، ص ۱۳۴۔

تیسری فصل

مؤلفۃ القلوب

مؤلفۃ القلوب سے وہ افراد مراد ہیں جنھیں کچھ مال دے کر اسلام کی جانب راغب کرنا یا اسلام پر قائم رکھنا مقصود ہو یا یہ مقصود ہو کہ ان کے شر سے مسلمانوں کو بچایا جائے، یا وہ مسلمانوں کے دفاع کے لیے تیار ہو جائیں اور مسلمانوں کے دشمنوں سے مقابلے میں مسلمانوں کی مدد کریں۔

زکوٰۃ کے اس مصرف سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کوئی شخصی حسن سلوک اور انفرادی عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ مصارفِ زکوٰۃ میں سے یہ مصرف ایسا ہے کہ اسے انفرادی طور پر پورا نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس مصرف کو اجتماعی طور پر سربراہ حکومت یا اس کا نائب یا قوم کا اہل حل وعقد (مشورہ) کا ادارہ ہی انجام دے سکتا ہے۔ اور یہی لوگ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کون مؤلفۃ القلوب ہیں اور کس کی تالیفِ قلب اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

مؤلفۃ القلوب کی اقسام

مسلم اور کافر مؤلفۃ القلوب کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

۱) ایسا شخص جسے دینے سے اس کے یا اس کی قوم یا خاندان کے دائرہ اسلام میں داخل ہو جانے کی توقع ہو جیسے صفوان بن امیہ جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر امان دے دی تھی اور انھیں چار ماہ کی مہلت دی تھی کہ وہ اس مدت میں اپنے بارے میں فیصلہ کر کے بتائیں، اس کے بعد وہ آئے اور انھوں نے

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی جانب سے شرکت کی اور ابھی تک انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور اس غزوہ میں جانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ہتھیار بھی عارتیاً لیے تھے۔ غرض انھیں آپ نے بہت سے لدے ہوئے اونٹ عطا کیے اور وہ بولے کہ یہ تو ایسی عطا ہے کہ اس کے بعد فقیری کا اندیشہ ہی نہ رہے۔

اس روایت میں ترمذی اور مسلم نے سعید بن المسیب سے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ انھوں نے کہا آپ نے مجھے اتنا دیا کہ آپ میرے لیے سب سے زیادہ محبوب ہو گئے [۱]

بہر حال صفوان اسلام لے آئے اور اسلام میں عمدہ ثابت ہوئے۔

اسی طرز کا تعلق یہ واقعہ ہے کہ جو احمد نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے نام پر جو سوال کیا جاتا آپ ضرور دیتے۔ ایک شخص نے آکر سوال کیا، آپ نے دو پہاڑوں کے مابین زکوٰۃ کی بہت سی بکریوں کا حکم دیا، وہ شخص اپنی قوم کی جانب واپس گیا تو اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو اسلام قبول کر لو کہ محمدؐ ایسی بڑی عطا دیتے ہیں کہ فقیری کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ [۲]

ب) ایسا شخص جس کے شر کا اندیشہ ہو اور اسے دے دینے سے اس کے شر سے تحفظ حاصل ہو سکتا ہو جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسے لوگ بھی آیا کرتے تھے کہ اگر انھیں کچھ دیا جاتا تو خوش ہو جاتے اور اسلام کی تعریف کرتے اور کہتے یہ بڑا اچھا دین ہے اور اگر انھیں نہ دیا جاتا تو وہ عیب جوئی کرتے اور اسلام کی مذمت کرتے۔ [۳]

ج) ایسا شخص جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہو اور اسے اسلام پر ثابت قدمی کی خاطر اسے دیا جائے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۶۵ ط الحلبی۔

[۲] نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۶۶۔ المطبعۃ الثانیہ۔

[۳] تفسیر الطبری: ج ۱۴، ص ۳۱۳۔

امام زہری سے پوچھا گیا کہ مؤلفۃ القلوب کون ہیں، انھوں نے فرمایا کہ اگر کوئی یہودی یا نصرانی اسلام لے آئے تو وہ بھی مؤلفۃ القلوب میں سے ہے، پوچھا گیا اگر وہ غنی ہو، انھوں نے کہا اگرچہ غنی ہو[1] اور حسن کہتے ہیں کہ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوں وہ مؤلفۃ القلوب ہیں۔[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ نیا نیا اسلام میں داخل ہونے والا شخص اپنے سابق دین کو چھوڑ کر مالی قربانی بھی دیتا ہے کہ اس کا مال اس کے والدین اور اس کے خاندان کے پاس رہ جاتا ہے اور بسا اوقات اسے کھانے پینے تک کی تنگی ہوجاتی ہے اور اسے اپنے خاندان والوں کی ہر طرح کی مزاحمت برداشت کرنا پڑتی ہے اس لحاظ سے یہ شخص محض رضائے الٰہی کی خاطر اپنے رشتہ داروں کو اور اپنی دنیا کو ترک کر دیتا ہے اور اس امر کا مستحق ہوجاتا ہے کہ اس کی امداد کی جائے اور اس کی اعانت کی جائے۔

د) یا کوئی شخص مسلمانوں کے سرداروں اور بڑے لوگوں میں ہو اور اسے دینے سے اس کے ہم قوم کافر افراد کے اسلام کی توقع ہو، جیسے حضرت ابوبکرؓ نے عدی بن حاتم اور زبرقان بن بدر کو دیا حالانکہ دونوں اچھے اسلام کے حامل تھے اور مسلمانوں کے مابین ان کا ایک مرتبہ اور مقام تھا۔[3]

ھ) کمزور ایمان کے ایسے مسلمان جو اپنی قوم کے سردار ہوں اور ان کے بارے میں توقع ہو کہ وہ آئندہ ایمان میں ثابت قدم ہوجائیں گے، ان کا ایمان قوی ہوجائے گا اور وہ جہاد میں مضبوط ثابت ہوں گے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے طلقاء کو جو اسلام لے آئے تھے، ہوازن کی غنیمت کا بڑا حصہ دیا، اور ان لوگوں میں منافق بھی تھے اور ضعیف الایمان بھی تھے، اور اس کے بعد ان میں سے بیشتر لوگ اسلام

---

[1] ایضاً ص ۴۱۳۔ المصنف لابن ابی شیبہ ج ۳، ص ۲۲۳۔ ط حیدر آباد۔

[2] المصنف بحوالہ مذکور۔ الاکلیل للسیوطی ص ۱۱۹۔

[3] تفسیر المنار ج ۱۰، ص ۵۷۴-۵۷۷۔

میں ثابت قدم ہو گئے۔[1]

ف) سرحدوں پر اور دشمنوں کے علاقے سے ملے ہوئے علاقوں کے مسلمانوں کو بھی اس مد میں سے دیا جا سکتا ہے تاکہ دشمن اگر حملہ کرے تو وہ پہلی دفاعی لائن بن سکیں۔

س) وہ مسلمان جو اپنے اثر و نفوذ سے ان لوگوں سے زکوٰۃ دلوائیں جو بغیر اظہار قوت زکوٰۃ دینے کے لیے آمادہ ہوں اور اس طرح ان کی تالیف سے دو نقصانوں میں سے کمتر کو اختیار کر لیا جائے، اور یہ ایک جزئی سبب ہے اور مفاد عامہ میں سے ہے۔[2]

مؤلفۃ القلوب کی یہ تمام انواع مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو مشتمل ہیں اگرچہ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ تالیف قلب کی مد میں سے صرف مسلمان ہی کو دیا جائے گا اور اس غیر مسلم کو نہیں دیا جائے گا جس کے اسلام کی توقع ہو اور جہاں تک نبی کریمؐ کے غزوۂ حنین کے موقع پر کفار کو تالیف کی خاطر دینے کا مسئلہ ہے تو وہ آپؐ نے فئے میں سے دیا تھا یا خاص اپنے مال میں سے عطا فرمایا تھا۔

امام شافعیؒ کے استدلال یہ ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کے صدقات مسلمانوں ہی کی طرف لوٹا دیئے ہیں جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث ہے کہ[3]

"یہ اموال مسلمانوں کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء کو لوٹائیں گے"

امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں الواحدی سے نقل کیا[4] ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس امر سے بے نیاز فرما دیا ہے کہ وہ مشرکین کی تالیف قلب کریں، بلکہ اگر امام کی رائے ہو کہ مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کی تالیف قلب سے عام مسلمانوں کو فائدہ ہوگا تو جائز ہے کیونکہ مشرکین پر زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ اور جن مشرکین کی تالیف قلب کے لیے دیا

---

[1] تفسیر القرطبی، ج ۸، ص ۱۷۹، ۱۸۱۔

[2] المجموع، ج ٦، ص ۱۹٦، ۱۹۸، غایۃ المنتہی وشرحہ ج ۲، ص ۱۴۱۔

[3] الام ج ۲، ص ٦۱ - ط بولاق۔

[4] ج ۱٦، ص ۱۱۱۔

بھی گیا ہے تو وہ مال فئے میں سے دیا گیا ہے۔

امام رازی الواحدی کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ الواحدی نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کو مشرکین کی تالیف قلب سے بے نیاز کر دیا ہے تو یہ انھوں نے اس بنا پر کہا ہے کہ خیال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو زکوٰۃ میں سے دیا، حبکہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ آپؐ نے زکوٰۃ میں سے مشرکین کو کچھ نہیں دیا، اور آیت میں بھی ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے جو یہ دلالت کرے کہ مؤلفۃ قلوبھم سے مراد صرف مشرکین ہی ہیں بلکہ یہ مسلمانوں اور مشرکین دونوں ہی پر مشتمل ہے۔

مَیں کہتا ہُوں کہ اگر مؤلفۃ قلوبھم مسلم اور غیر مسلم دونوں کو مشتمل ہے تو پھر کافر کو بھی بطور تالیف زکوٰۃ دینا جائز ہُوا البتہ کافر کو مخصوص کر دینا غیر درست ہُوا۔

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ مؤلفۃ قلوبھم وہ اعراب وغیرہ تھے جن کو نبی کریمؐ ان کے ایمان قبول کرنے کے وقت کچھ دیا کرتے تھے[1]

ہم پہلے ہی حضرت انسؓ کی وہ حدیث ذکر کر چکے ہیں جس میں یہ بیان ہُوا ہے کہ آپؐ نے ایک شخص کو زکوٰۃ کی بکریاں دیں اور اس نے اپنی قوم میں جا کر کہا، کہ اسلام لے آؤ کہ محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ بھوک کا اندیشہ ہی ختم ہو جاتا ہے اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص پہلے مسلمان نہیں تھا۔

اور اگر کسی کافر کی اس لیے تالیف کی جائے کہ اس کا دل اسلام کے لیے راضی ہو جائے تو یہ کوئی قابل تعجب امر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ قرطبی نے کہا ہے کہ یہ بھی جہاد کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ مشرکین کی تین قسمیں ہیں ایک وہ کافر ہیں جو دلیل سے کفر سے رجوع کر لیتے ہیں، دوسری قسم وہ کافر ہیں جو قوت سے اور تلوار سے کفر سے باز آجائیں اور تیسری قسم وہ کافر ہیں جو عطاؤ احسان سے راہِ کفر ترک کر دیں۔ اور امام کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہر قسم کو کفر سے نجات دلانے کے لیے اس کے مطابق طریقہ

---

[1] تفسیر الطبری، ج ۱۴، ص ۳۱۴۔

اختیار کرے۔[1]

کیا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد مؤلفۃ القلوب کا حصّہ ساقط ہو گیا؟

امام احمدؒ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حکم باقی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی یا نسخ واقع نہیں ہوا ہے، یہی زہریؒ اور ابو جعفر الباقر کی رائے ہے[2] اور جعفریہ اور زیدیہ مسلک ہے۔[3]

یونس بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس بارے میں زہریؒ سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ مجھے اس کے نسخ کا علم نہیں ہے۔

ابو جعفر النحاس کہتے ہیں کہ یہ حکم بہر حال موجود ہے اور اب بھی اگر کسی کے شر کو دور کرنے کے لیے یا اسے اسلام پر ثابت قدم بنانے کے لیے کچھ دینا ضروری ہو تو دیا جا سکتا ہے۔

قرطبی مالکی فقیہ قاضی عبدالوہاب سے نقل کیا ہے کہ اگر اس مد میں دینے کی ضرورت ہو تو اب بھی دیا جائے گا۔[4]

قاضی ابن العربی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اگر اسلام طاقتور ہو تو یہ صنف ختم ہو جائے گی اور اگر ضرورت ہو تو یہ حصّہ دیا جائے گا، جیسا کہ زمانۂ نبوتؐ میں دیا جاتا تھا اس لیے کہ حدیث صحیح ہے۔

"اسلام کا آغاز بھی اجنبیت کی حالت میں ہوا اور اس کی انتہا بھی عالم اجنبیت میں ہوگی"۔

فقہ اباضیہ کی بہ رائے النیل اور اس کی شرح میں ہے کہ اگر امام قوی ہو اور ان سے بے نیاز

---

[1] تفسیر القرطبی، ج ۸، ص ۱۷۹۔

[2] تفسیر الطبری، ج ۱۴، ص ۳۱۴، ۳۱۶۔ المغنی ج ۲، ص ۶۶۶۔

[3] البحر، ج ۲، ص ۱۷۹، ۱۸۰۔ شرح الازہار، ج ۱، ص ۵۱۲۔ فقہ الامام جعفر، ج ۲، ص ۹۰۔

[4] القرطبی۔ بحوالہ مذکور۔

[5] القرطبی، ج ۲، ص ۱۳۴، ۱۳۶۔

ہوتو یہ مد ساقط ہے لیکن اگر کافروں کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا ہو تو پھر درست ہے۔

طبریؒ نے حسن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اب مؤلفۃ القلوب موجود نہیں ہیں[۱]

عامر الشعبی نے کہا ہے کہ مؤلفۃ القلوب عہدِ نبوتؐ میں تھے مگر جب حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا[۲]

نوویؒ نے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگرچہ کفار کی تالیف درست ہے مگر انہیں فئے میں سے دیا جائے گا نہ کہ زکوٰۃ میں سے، اس لیے کہ زکوٰۃ میں کفار کا کوئی حق نہیں ہے۔

مسلمانوں میں سے مؤلفۃ القلوب کے بارے میں ان کے دو اقوال ہیں، ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہیں کچھ نہیں دیا جائے گا اس لیے کہ اسلام نے مسلمانوں کو عزت عطا فرما دی ہے اور وہ تالیف قلب سے مستغنی ہو گئے ہیں۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو آپؐ کی وفات کے بعد بھی دیا جائے گا اس لیے کہ جس لیے انہیں دیا جاتا ہے وہ مصلحت آپؐ کے بعد بھی پائی جا سکتی ہے۔

اور اس بارے میں بھی کہ انہیں کہاں سے دیا جائے دو قول ہیں، ایک یہ کہ انہیں صدقات میں سے دیا جائے گا کیونکہ اس بارے میں نصّ قرآنی موجود ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان پر فئے کے مصالح کے حصے میں سے صرف کیا جائے گا کہ یہ مسلمانوں کے مفاد کے مطابق ہوگا[۳]

مالکی مسلک میں بھی دو اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ مسلمانوں کے معزز اور اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد یہ حصہ متروک ہو گیا اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حصہ باقی ہے اور ہم اس سلسلے میں عبدالوہاب اور ابن العربی کی آراء نقل کر چکے ہیں[۴]

---

۱ تفسیر الطبری، ج ۱۴، ص ۳۱۵۔

۲ ایضاً۔

۳ المہذب وشرحہ للنووی: (المجموع) ج ۶، ص ۱۹۷، ۱۹۸۔

۴ تفسیر القرطبی السابق، الخطابی، معالم السنن (ج ۲، ص ۲۳۱) کہتے ہیں کہ یہ حصہ موجود ہے اور انہیں دیا جانا چاہیے اور یہی رائے ابن قدامہ نے المغنی ج ۲، ص ۶۶۶ پر تحریر کی ہے۔

متن خلیل میں ہے کہ یہ حکم باقی ہے منسوخ نہیں ہوا ہے، اس لیے کہ مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ میں سے حصہ دینے کا مطلب اسے اسلام کی ترغیب دینا ہے، اعانت کرنا نہیں ہے کہ غلبۂ اسلام سے یہ مد ساقط ہو جائے۔

الصادی کہتے ہیں کہ یہ قول اس بنا پر ہے کہ مؤلف کافر ہو اور اسے اسلام کی جانب ترغیب دینے کے لیے دیا جائے اور یہی ابن حبیب کا قول ہے اور دوسرا قول ابن عرفہ کا ہے کہ مؤلف وہ ہے جو نیا نیا اسلام لایا ہو اسے اس لیے دیا جائے گا کہ وہ اسلام پر قائم رہے اور اس لیے یہ حکم بدستور باقی ہے[1]

جمہور حنفی فقہاء کہتے ہیں کہ یہ حصہ اب ختم ہو چکا ہے اور اب تالیف قلب کے لیے کسی کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔

البدائع میں ہے کہ یہی قول صحیح ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے زکوٰۃ میں سے اس مد میں کچھ نہیں دیا اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اس کو رد بھی نہیں کیا کیونکہ روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما چکے تو مولفۃ القلوب حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور ان سے عرض کی کہ آپ ہمارے حصے کے بارے میں ہمیں تحریر لکھ دیں جو کہ حضرت ابوبکرؓ نے لکھ دی پھر یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آتے اور انھیں اس کی اطلاع دی تو آپ نے یہ خط لکھ کر پھاڑ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں اس لیے دیا کرتے تھے تاکہ تم اسلام پر ثابت قدم رہو۔ اب تو اللہ نے اسلام کو عزت دے دی ہے اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہو گے (تو تمھارے ہی لیے بہتر ہوگا) ورنہ ہماری تلوار فیصلہ کرے گی۔ یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور آپ کو اس بات سے باخبر کیا اور کہنے لگے کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جیسا انھوں نے کیا ٹھیک ہی کیا غرض حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے قول کی یا عمل کی تردید نہیں کی، اور عام صحابہؓ کو بھی اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو ان میں سے بھی کسی نے رد نہیں کیا اور اس طرح اس پر اجماع ہو گیا۔ اور یہ امر بھی ثابت ہے کہ

---

[1] حاشیۃ الصادی، ج ۲، ص ۳۵۔

آپ انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھنے کے لیے دیا کرتے تھے، اسی لیے اللہ نے ان کا نام مؤلفۃ القلوب رکھا ہے کیونکہ اس وقت اسلام کمزور تھا اور مسلمانوں کی تعداد کم تھی، بعد میں بکثرت ہو گئے اور قوی ہو گئے اور اسلام معزز ہو گیا اور اہلِ شرک ذلیل ہو گئے۔ اور اگر کوئی حکم کسی مخصوص مصلحت کے ساتھ وابستہ ہو تو اس مصلحت کے ختم ہو جانے پر وہ حکم بھی ختم ہو جاتا ہے[1]

البدائع کے اس کلام کا خلاصہ دو امور ہیں۔

ایک یہ کہ یہ حکم اجماعِ صحابہ سے منسوخ ہے۔

دوسرے یہ کہ تالیف کے حکم کی مخصوص علت اور وجہ ہے اور وہ ہے ان لوگوں کو جن کی تالیف کی جا رہی ہے اسلام کی جانب مائل رکھنا، جو اشاعتِ اسلام اور اس کے غلبہ سے ختم ہو چکی ہے۔ یعنی یہ حکم اپنی علت کے ختم ہو جانے سے ختم ہو گیا ہے کیونکہ یہ دینا عزتِ اسلام کے لیے تھا اور اللہ نے اسلام کو معزز بنا دیا ہے[2]

نسخ کے دعویٰ کا ابطال

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں دعوے صحیح نہیں ہیں، نہ ہی تالیف کا حکم منسوخ ہوا اور نہ تالیف کی ضرورت ختم ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ کے عمل کو نسخ کی دلیل بنانا درست نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو اس حق سے محروم کیا جن کو عہدِ نبوتؐ میں یہ حصہ مل رہا تھا اور اسلام کو عزت حاصل ہو چکی تھی اور اسلام ان سے مستغنی ہو گیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ کا یہ عمل اس طرح درست ہے کہ تالیف کوئی دائمی شئے نہیں ہے کہ جو لوگ کسی ایک دور میں مؤلف بنائے گئے ہوں وہ ہمیشہ کے لیے اس حصہ کے مستحق بن جائیں بلکہ اسلام کی بھلائی اور مسلمانوں کی بہبود کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کرنا اولوالامر کا کام ہے کہ تالیف کی کس قدر ضرورت اور کن لوگوں کی تالیف کی ضرورت ہے۔

---

[1] بدائع الصنائع، ج ۲/ص ۴۵۔

[2] ردالمحتار، ج ۲، ص ۸۲۔

علمائے اصول نے ایک قاعدہ یہ وضع کیا ہے کہ اگر کوئی حکم کسی وصف مشتق کے ساتھ مُعلّق ہو تو جس سے اشتقاق ہے اس کے علّت ہونے کی نشاندہی کرے گا اور یہاں پر صدقہ کو مؤلفۃ القلوب پر معلق کیا گیا ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ تالیف قلب انھیں صدقات دینے کی علّت ہے، اس لیے جب یہ علّت موجود ہوگی دیا جائے گا اور نہیں ہوگی تو نہیں دیا جائے گا۔

اور تالیف قلب کرنا یا نہ کرنا ولی امر کے اختیار میں ہے اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ جن لوگوں کی پہلا حاکم تالیف قلب کر رہا ہے وہ اُس کو ترک کر دے بلکہ اسے یہ بھی اختیار ہے کہ اپنے عہد میں تالیف کا سلسلہ بالکل ختم کر دے یعنی اگر اس کے عہد میں کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو جس کی تالیف کی جائے۔ کیونکہ یہ ایک اجتہادی امر ہے اور اس بارے میں زمانے کے اختلاف، حالات کے فرق اور ممالک کی تبدیلی سے حکم مختلف ہو سکتا ہے۔

غرض حضرت عمرؓ کا عمل کسی نصّ کو معطل کرنا یا کسی شرعی قاعدے کو منسوخ کرنا نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ آٹھ موجود اصناف میں تقسیم کی جاتی ہے اگر ان میں سے کوئی صنف موجود نہ ہو تو اس کا حصہ ساقط ہو جاتا ہے اور یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اس سقوط سے کتاب اللہ کا حکم معطل یا منسوخ ہو گیا۔

مثلاً اگر عاملین علیہا (زکوٰۃ کے کارکن) موجود نہ ہوں، کہ اسلامی حکومت ہی موجود نہیں جو زکوٰۃ جمع کرے اور اسے مستحقین میں تقسیم کرے اور اس کام کے سرانجام دینے والوں کو تنخواہیں دے۔ اس لیے عاملین علیہا کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔

اور اگر الرقاب (گردنوں کو آزاد کرانے کی) صنف موجود نہ ہو، جیسا کہ ہمارے اس دور میں غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہے تو یہ حصہ ساقط ہو جائے گا مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ یہ قرآن کا نسخ یا اس کے حکم کو معطل قرار دینا ہے۔[1]

---

[1] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض معاصرین کا یہ کہنا کہ اگر مصلحت مقتضی ہو تو نصّ کے حکم کو معطّل کر دینا یا اس کے مخالف طرزِ عمل اختیار کرنا جائز ہے، غلط ہے۔ ان حضرات نے اپنی اس

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

اس لحاظ سے حضرت عمرؓ کا عمل نسخ نہیں ہے چہ جائے کہ اسے مؤلفۃ القلوب کے حصے کے بالکلیہ منسوخ ہوجانے پر اجماع قرار دیا جائے اور اسی طرح حسن اور شعبی کا یہ قول کہ آج کل مؤلفۃ القلوب موجود نہیں ہے، اس کے نسخ کا قول نہیں ہے بلکہ امرِ واقع کی خبر دینا ہے۔

نسخ کا تو مطلب یہ ہے کہ کسی حکم کو جسے اللہ نے مقرر کیا ہو باطل کر دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ابطال کا حق بھی اسی کو ہوتا ہے جسے قانون بنانے کا حق ہو۔ اور اسلام میں قانون ساز اللہ سبحانہ ہے اور وہ نبی پر وحی کے ذریعے اپنے احکام نازل کرتا ہے اس لیے اگر نسخ ہو سکتا ہے تو وہ دورِ نبوتؐ اور زمانۂ نزولِ وحی میں ہو سکتا ہے، اور اس کی خبر ہمیں خود فرمانِ نبوتؐ ہی سے ہوگی، یا کم از کم یہ ہو کہ قرآن و سنت کی دو متضاد نصوص ایسی موجود ہوں کہ ان میں کسی بھی طریقے سے تطبیق نہ پیدا کی جاسکتی ہو اور ان میں سے ہر ایک نص کی تاریخ کا بھی علم ہو اور اس طرح ہم بعد والے حکم کو پہلے کا ناسخ قرار دے دیں۔

کیا مؤلفۃ القلوب میں بھی یہی صورت حال ہے کیا ان کے بارے میں کتاب و سنت

(بقیہ آگے) رائے کے حق میں حضرت عمرؓ کے اسی مذکورہ عمل کو دلیل بنایا ہے چنانچہ صبحی محمصانی نے "فلسفۃ التشریع" میں یہی رائے اختیار کی ہے (ص ۱۰۸) کہ حضرت نے سیاست شرعیہ یا مسلمانوں کی مصلحت کے پیشِ نظر نصوص کی بھی مخالفت کی ہے۔

اسی طرح پروفیسر محمود اللبابدی نے قاہرہ کے "دار التقریب بین المذاہب" کے مجلے رسالۃ الاسلام کے ایک مقالے "اسلام کا قانونی اقتدار" میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ امت کی مجلس شوریٰ اپنے اقتدار سے بعض نصوص شرعی کو ختم کرسکتی یا معطل کرسکتی ہے۔ اور اس رائے کی دلیل اسی حضرت کے واقعہ کو بنایا ہے بہرحال یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی نص کی مخالفت کی ہو یا اسے معطل کردیا ہو بلکہ اصل حقیقت وہی ہے جو ہم بیان کرچکے ہیں۔

علمائے ازہر نے اس مقالے کی بڑی سخت تردید کی ہے اور مرحوم شیخ محمد محمد المدنی نے اس کی تردید میں ایک مضمون بھی "نقد بر نقد" کے نام سے لکھا جو قاہرہ سے مطبع ہوا ہے۔

کی دو متعارض نصوص موجود ہیں یا کوئی ایسی صریح نصؔ موجود ہے جس نے مؤلفۃ القلوب کے حصّہ کو منسوخ کردیا ہو۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی سی بھی صورت نہیں ہے تو پھر اس حکم کے نسخ کا کیونکر دعویٰ کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ کی واضح نصؔ موجود ہو اور اس پر دورِ رسالتؐ کے اختتام تک عمل ہوتا رہا ہو۔

شاطبی کہتے ہیں کہ اگر مکلف پر احکام ثابت ہوجائیں تو جب تک کوئی محقق حکم موجود نہ ہو نسخ کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس حکم کا مکلف پر ثبوت ایک امر محقق ہے تو اس حکم کا خاتمہ بھی ایک امر محقق سے ہی ہوگا، اسی لیے علمائے محققین کا اس امر پر اجماع ہے کہ خبر واحد سے قرآن کی نصؔ کا یا خبر متواتر کا نسخ نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح ایک قطعی امر کو ظنی بات سے رفع کرنا ہوجائے گا۔[1]

خبر واحد جو کہ بہرحال نبی کریمؐ سے مروی حدیث ہوتی ہے اس سے بھی قرآنی نصؔ منسوخ نہیں ہوتی تو صحابی کے قول یا اس کے عمل سے کیسے ہوسکتی ہے حالانکہ حضرت عمرؓ کا جو عمل زیر بحث ہے اس میں سرے سے کوئی نسخ کا مفہوم ہی موجود نہیں ہے۔

اور شاطبی سے پہلے علامہ ابن حزمؒ کہہ چکے ہیں کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن یا سُنّت کا کوئی حکم منسوخ ہے، جب تک اس کی کوئی یقینی دلیل موجود نہ ہو اس لیے کہ فرمانِ الٰہی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

نیز فرمایا ہے۔

وَاتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ (الاعراف: ۳)

---

[1] الموافقات، ج ۳، ص ۶۴۔

اللہ سبحانہ نے قرآن کریم میں جو احکام نازل فرمائے ہیں اور جو اپنے نبیؐ کی زبانی دیئے ہیں ان سب کی اتباع فرض ہے۔ اور کسی حکم کے منسوخ کہنے کا یہ مطلب ہوگا کہ اس امر کی اطاعت نہ کی جائے اور اتباع لازم نہ رہے اور ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی معصیت ہے الا یہ کہ نسخ کی قطعی دلیل موجود ہو، اور اگر کوئی اس کے برخلاف نسخ کا قائل ہو تو وہ گویا شریعت کے ابطال کی راہ کھول رہا ہے کہ اس طرح ہر نص قرآنی اور حدیث کے نسخ کا دعوی کیا جا سکتا ہے جو کہ اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ غرض جو بات بالیقین ثابت ہو وہ ظن سے رد نہیں ہو سکتی اور جس حکم کا اللہ اور رسولؐ نے یقینی حکم دیا ہے وہ جب تک اس کے نسخ کا ایسا قطعی اور یقینی حکم موجود نہ ہو جس میں کوئی شک نہ ہو، ساقط نہیں ہو سکتا[1]

اس لحاظ سے درست اور صحیح یہی ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ باقی ہے اور یہ حکم نہ منسوخ ہوا ہے اور نہ معطل ہوا ہے کہ اس پر سورۂ توبہ کی صریح نص موجود ہے جو کہ قرآن کے باعتبار نزول آخری حصے میں سے ہے۔

ابو عبید کہتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور اس میں کتاب و سنت میں وارد کسی نسخ کا ہمیں علم نہیں ہے اگر کچھ لوگوں کی یہ کیفیت کہ انھیں سوائے حصول و یافت کے اسلام سے اور کچھ دلچسپی نہ ہو اور حالت یہ ہو کہ اگر وہ ارتداد اختیار کرلیں یا مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے لگیں تو ان کی طاقت و قوت اور ان کے غلبہ کی وجہ سے اسلام کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اس وجہ سے امام یہ مناسب تصور کرے کہ انھیں زکوٰۃ سے کچھ دے کر خاموش کر دے تو اسے تین وجوہ کی بنا پر اختیار ہوگا۔

ایک وجہ تو کتاب و سنت پر عمل۔

دوسری وجہ مسلمانوں کا تحفظ۔

تیسری وجہ یہ کہ ان لوگوں سے ناامید نہ ہونا چاہیے ہو سکتا ہے اسلام کی مسلسل حوصلہ افزائیوں سے وہ اسے سمجھنے اور اس میں خوشی سے دلچسپی لینے لگیں[2]

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام: الباب العشرین فصل کیف یعلم المنسوخ، ص ۵۸ ج ۴ - رجحر

[2] الاموال - ص ۶۰۷ -

ابن قدامہ المغنی میں مسلک احمدؒ کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصارف زکوٰۃ میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ باقی ہے اور اس امر کی دلیل کتاب وسنّت میں موجود ہے یعنی یہ کہ اللہ سبحانہٗ نے مؤلفۃ القلوب کو منجملہ آٹھ مصارف زکوٰۃ کے ذکر کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"اللہ سبحانہٗ نے مصارف زکوٰۃ کو آٹھ حصّوں میں تقسیم فرمایا ہے"

اور مشہور احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آپؐ مؤلفۃ القلوب کو عطایا دیا کرتے تھے، بلکہ آپؐ وفات کے وقت تک دیتے رہے اور کتاب وسُنّت سے اس حکم کا نسخ ثابت نہیں ہے اور نسخ محض احتمال سے ثابت نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ نسخ کی کسی نصؔ کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے اور نصؔ آپؐ کی وفات اور وحی کا سلسلہ منقطع ہوجانے کے بعد ظاہر نہیں ہوسکتی۔ اور حکمِ قرآن کا نسخ قرآن ہی سے ثابت ہوسکتا ہے یا سنّت سے جبکہ اس مقام پر کتاب وسنّت میں سے کوئی نصؔ موجود نہیں ہے، اس لیے قولِ صحابی، یا اپنی رائے سے اس حکم کو منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ یہ فقہاء قیاس کے بالمقابل قول صحابی کو ترک کردیتے ہیں تو پھر غور کیجیے کہ قول صحابی کی بنا پر قرآن وسنّت کو کیوں کر ترک کیا جاسکتا ہے۔

زہریؒ کہتے ہیں کہ مجھے مؤلفۃ القلوب کے حصّے کے نسخ کا علم نہیں ہے[1]

---

[1] فقہائے احناف کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا ناسخ کیا ہے جبکہ مؤلفۃ القلوب کا حکم قرآن کی قطعی اور حتمی نصؔ سے ثابت ہے۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اس کا ناسخ اجماع ہے اور انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ مولفۃ القلوب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے مُوقف کو اجماع قرار دے دیں، لیکن آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہ اجماع نہیں ہے۔ اور بعض دیگر نے اس اجماع پر نسخ کی دلیل تلاش کرنے کی سعی بھی کی ہے چنانچہ ابن نجیم نے البحرالرائق میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان مؤلفۃ القلوب کے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف: ۲۹)

صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ میں سے حصّہ دینے کی جو وجہ فقہائے نے بیان کی ہے وہ یقیناً کتاب وسنّت کے مطابق ہے اور مؤلفۃ القلوب سے مستغنی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ

(بقیہ آگے) ابن عابدین کہتے ہیں کہ اجماع ناسخ نہیں ہے اور نہ یہ رائے درست ہے اس لیے کہ نسخ تو صرف حیاتِ نبوی ہی میں ہو سکتا ہے اور اجماع کا انعقاد آپؐ کی وفات کے بعد ہو سکتا ہے۔ اس لیے بعض فقہائے نے کہا ہے کہ نسخ کی دلیل حضرت معاذ بن جبلؓ کے یمن بھیجنے کی حدیث ہے کہ انھیں آپؐ نے حکم فرمایا کہ زکوٰۃ ان کے اغنیاء سے لی جائے اور ان کے غریبوں کو دی جائے۔ (الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین علیہ: ج ۲، ص ۸۳- ط- استنبابنول)
صحیح بات یہ ہے کہ یہ محض تاویلیں ہیں اور ان تاویلوں سے ایک قطعی اور واضح نصّ کا نسخ ممکن نہیں ہے، مثلاً مذکورہ بالا سورۂ کہف کی آیت بالیقین مکّی ہے، تو ایک مکی آیت سے اس آیت کا نسخ کیسے ثابت ہو سکتا ہے جو مدینہ منورہ میں بہت بعد میں نازل ہوئی۔ اور اصلی بات یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں تعارض کیا ہے کہ ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ مانا جائے۔ اسی طرح حدیث معاذ کا حال ہے کہ اس میں زکوٰۃ کا مقصود بیان کیا گیا ہے کہ یہ بادشاہوں کے لگائے ہوئے ٹیکسوں کی طرح نہیں ہے کہ غریبوں اور محنت کشوں سے لے کر بادشاہوں کی شان وشوکت پر خرچ کیا جائے بلکہ قوم کا یہ سرمایہ قوم کے مالداروں سے لے کر قوم کے ناداروں پر صرف کیا جاتا ہے۔ اگر اس حدیث میں محض فقراء کے لفظ سے یہ سمجھا گیا ہے کہ مولفۃ القلوب کا حصّہ باقی نہیں رہا ہے تو اس سے تو یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ فقراء کے علاوہ عاملین علیہا، الرقاب، الغارمین کی بھی صنف مراد لی جا سکتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ فقہائے احناف میں سے علاؤ الدین بن عبدالعزیز کو کہنا پڑا کہ مؤلفۃ القلوب کا حصّہ عہد رسالتؐ میں ثابت ہو چکا تھا کہ اس وقت انھیں دینے کا مقصد یہ تھا کہ کفر کا غلبہ تھا اور اسلام کمزوری میں تھا اور مؤلفۃ القلوب کو دے کر ان کی ہمدردی اسلام کی جانب کی جائے مگر جب یہ حالت تبدیل ہو گئی اور اسلام غالب ہو گیا تو یہ حصّہ بھی ممنوع ہو گیا لیکن منسوخ نہیں ہوا بلکہ نا حال باقی ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے عاقلہ پر دیت لازم ہوتی ہے کہ عہدِ نبوتؐ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ان کا حکم ختم ہوگیا ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کو ایسے وقت دیا نہیں جائے گا اور جب دوبارہ انھیں دینے کی ضرورت ہو گی پھر دیا جائے گا اور یہی تمام احناف کا حال کہ اگر مستحقین زکوٰۃ کی کوئی صنف کسی دور میں موجود نہ ہو تو خاص اس زمانے میں اس کا حکم ساقط ہو جائے گا اور جب وہ صنف دوبارہ موجود ہو گی تو پھر زکوٰۃ میں سے اس کا حصہ دیا جائے گا۔[1]

تالیف قلوب کی ضرورت ختم نہیں ہوئی

فقہائے احناف کا یہ کہنا کہ اسلام کی اشاعت اور غلبہ سے تالیف قلوب کی ضرورت ختم ہوگئی ہے تو یہ دعوی تین اسباب کی بنا پر غلط ہے۔

۱) بعض مالکی فقہاء نے کہا ہے کہ مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ میں حصہ ان کی اعانت کے طور پر نہیں دیا جاتا تاکہ اسلام کے غلبہ سے یہ اعانت ختم کر دی جائے بلکہ ان کو اس لیے دیا جاتا ہے کہ وہ اسلام کی جانب راغب ہو کر جہنم سے نجات پا جائیں۔[2]

یہ دراصل دعوتِ اسلام کا ایک ذریعہ ہے اور اس سے حقیقی مقصود یہی کہ کچھ لوگوں کو مالی امداد دے کر انھیں اسلام کی جانب راغب کیا جائے اور انھیں جہنم سے نجات

(بقیہ آگے) میں یہ اہل خاندان کے ذمے آیا کرتی تھی اور بعد میں یہ اہل دیوان پر عائد ہونے لگی، تو یہ اہل دیوان پر عائد ہونا اس کا نسخ ہونا نہیں ہے کہ عہد نبوت میں نصرت اور مدد کا مدار اہلِ خاندان تھے اور بعد کے عہد میں نصرت کا مدار اہلِ دیوان بن گئے اور یہ گویا اسی مفہوم کا اثبات ہو گیا جس کے لیے دیت عائد ہوئی ہے یعنی باہمی نصرت اس رائے کو النہایہ نے بھی عمدہ کہا ہے۔

بہرحال اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مثلاً آج کے عہد میں اسلام کمزور ہو گیا ہے تو آج بھی مؤلفۃ القلوب کا حصہ دیا جائے گا۔ اور یہی وہ بات ہے جس کے فقہائے احناف قائل نہیں ہیں، چنانچہ ابن الہمام اس رائے سے نسخ کی نفی نہیں ہوتی کہ انھیں دینے کا جواز ایک حکم شرعی تھا جو پہلے ثابت تھا اور بعد میں ختم ہو گیا۔ (تفسیر الآلوسی ج ۳، ص ۳۲۷)

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۶۶۔

[2] حاشیۃ الصاوی، علی بلغۃ السالک ج ۱، ص ۲۳۲۔

دلائی جائے اور ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ انسانیت کی راہ ہدایت کی جانب راہنمائی کرتے انھیں جاہلیت سے نکالنے اور عذابِ آخرت سے بچانے کی پوری پوری جد وجہد کریں۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان دنیاوی منفعت کی خاطر اسلام قبول کرلیتا ہے لیکن بعد میں اسلام میں اس کی خدمات بہت عمدہ ثابت ہوتی ہیں چنانچہ ابو یعلی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ زمانہ نبوتؐ میں کوئی شخص ایسا بھی ہوتا کہ پہلے دنیا کی خاطر اسلام لے آتا مگر پھر وہ اسلام میں خالص ہو جاتا اور اسے اسلام ساری دنیا کی دولتوں سے زیادہ پیارا ہو جاتا تھا۔[1]

مذکورہ بیان بایں صورت ہے کہ مؤلف، کافر ہو اور اسے اسلام کی جانب ترغیب دینے کے لیے دیا جائے، حالانکہ ہر مؤلف اس طرح نہیں ہے، بلکہ مؤلفہ وہ نومسلم بھی ہوتے ہیں جو اسلام قبول کرنے کی بنا پر اور اپنا سابقہ دین ترک کر دینے کی بنا پر خاندانی منفعتوں اور اپنے مذہب کے لوگوں کے فوائد سے محروم ہو جاتے ہیں اور ان کی طرف سے ان پر ابتلاء اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے، ان مسلمانوں کو اس لیے دیا جاتا ہے تاکہ ان کی تائید ہو جاتے اور یہ اسلام پر ثابت قدم ہو جائیں اور جو اسلام کی وجہ سے ان پر مصیبتیں آرہی ہیں ان کا مقابلہ کر سکیں۔

۲) یہ دعویٰ اس امر پر مبنی ہے کہ تالیف اسی وقت ہوتی ہے جب اسلام اور اہلِ اسلام کمزور ہوں، اور بعض نے یہ شرط لگائی ہے کہ مؤلف فقیر اور محتاج ہو، مگر یہ نصوص کو بلا وجہ اور بلا دلیل اور بغیر کسی شرعی حکمت کے توڑ مروڑ کر پیش کرنا ہے۔

آج تو ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک کی امداد کر رہے ہیں، جیسا کہ جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے بعض یورپی ممالک کی امداد کی اور اس طرح بعض ترقی پذیر مشرقی ممالک کی امداد کی ہے۔

امام طبریؒ نے کس قدر عمدہ بات کہی ہے کہ درحقیقت اللہ سبحانہٗ نے زکوٰۃ میں دو حکمتیں رکھی ہیں پہلی حکمت تو یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی بھوک کا مداوا ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ

---

[1] مجمع الزوائد میں ہے کہ اس روایت کو ابو یعلیٰ نے نقل کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ (ج ۳، ص ۱۰۴)

اس سے اسلام کو تقویت اور تائید حاصل ہوتی ہے۔ اور بجو مد اسلام کی تائید اور تقویت کے لیے ہو وہ غنی اور فقیر سب کو دی جائے گی، اس لیے کہ اسے ضرورت کے لیے نہیں دیا جاتا بلکہ اعانت اسلام کے لیے دیا جاتا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے خرچ کیا جاتا ہے کہ جہاد میں بھی غنی اور فقیر کا کوئی فرق نہیں ہے کہ انھیں جہاد کے لیے دیا جاتا ہے ان کی تنگدستی دور کرنے کے لیے نہیں دیا جاتا، اسی طرح مؤلفۃ القلوب بھی ہیں کہ اگرچہ وہ غنی بھی ہوں تب بھی انھیں دیا جا سکتا ہے تاکہ وہ اسلام کی جانب مائل ہوں اور پھر اسلام لا کر ثابت قدم ہو جائیں اور اس طرح اسلام کو تقویت اور تائید حاصل ہو۔

جب اللہ سبحانہ نے آپؐ کو فتح عطا فرمائی، اسلام کی اشاعت ہو گئی اور اہل اسلام کو عزت حاصل ہو گئی آپؐ اس کے بعد بھی مؤلفۃ القلوب کو دیتے رہے، تو اب یہ دلیل نہیں دی جا سکتی کہ اسلام کی اشاعت اور غلبہ کے بعد تالیف کی ضرورت باقی نہیں رہی[1]

۳) اور آج کل صورتِ حال بالکل تبدیل ہو چکی ہے اب مسلمان دنیا کے فرمانروا نہیں رہے ہیں بلکہ اب اسلام دوبارہ اسی طرح اجنبی ہو گیا ہے جس طرح کہ وہ پہلے اجنبی تھا۔ اور اقوامِ عالم مسلمانوں کو اس طرح کھا رہی ہیں جس طرح دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے، اور کمزوری مسلمانوں کے قلوب میں اتر چکی ہے۔ اگر یہی کمزوری اور بے چارگی تالیف قلب کی علت ہے تو یہ تو موجود ہے اس لیے اس مد میں زکوٰۃ دینا بھی درست ہے جیسا کہ ابن العربی وغیرہ نے کہا ہے[2]

---

[1] تفسیر الطبری: بتحقیق شاکر۔ ج ۱۴، ص ۳۱۶۔

[2] خود حنفی فقہاء کہتے ہیں کہ محض یہ کہہ دینا کہ تالیف کی علت (وجہ) ختم ہو جانے کی بنا پر تالیف ختم ہو گئی، کوئی موزوں دلیل نہیں ہے کیونکہ کسی حکم کے باقی رہنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی علت بھی باقی رہے مثلاً حج میں رمل کا حکم اس علت کی بنا پر تھا کہ کافروں پر اسلام کی قوت کا اظہار کیا جائے، اب یہ علت باقی نہیں ہے مگر حکم باقی ہے احرام کی حالت میں احرام کی چادر کو داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر شانے پر ڈالنے کی علت باقی نہیں ہے مگر حکم باقی ہے، اس

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

مولفۃ القلوب کو دینے اور ان کی تالیف کا کس کو حق ہے؟

تالیف کے جواز کا تعین کرنا

اور یہ اندازہ کرنا کہ اس کی ضرورت موجود ہے اولو الامر کا کام ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین اس کام کو خود ہی انجام دیا کرتے تھے اور یہی صحیح اور فطری طریقہ ہے کیونکہ اس کام کا تعلق داخلی اور خارجی سیاست سے ہے اور اس میں دین اسلام کی مصلحت اور مسلمانوں کے مفاد کو مدِّ نظر رکھنا لازمی ہے[1]

چونکہ آج کل اسلامی حکومتیں اسلام کے نظام زکوٰۃ کی ذمے داریوں کو پورا نہیں کر رہی ہیں اس لیے ان کی جگہ اسلامی جماعتیں یہ فرائض انجام دے سکتی ہیں۔

اور اگر کوئی جماعت بھی موجود نہ ہو تو پھر کیا ایک مسلمان انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ تالیف قلب کے طور پر کسی کافر کو دے سکتا ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ ایسا کرنا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک زکوٰۃ کا کوئی اور مصرف باقی نہ رہا ہو مثلاً اگر کچھ مسلمان غیر اسلامی ملک میں رہ رہے ہوں اور وہاں مستحق زکوٰۃ موجود نہ ہوں، اور ان کی رائے یہ ہو کہ اگر وہ مقامی غیر مسلموں کو اپنی زکوٰۃ دیں گے تو وہ اسلام کی جانب مائل ہو سکتے ہیں یا کم از کم مسلمانوں کی نصرت پر آمادہ ہو سکتے ہیں تو انھیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اس صورت میں اگر زکوٰۃ کی رقم کسی اسلامی ملک نہ بھیجی جا سکتی ہو تو اسے اشاعت اسلام پر خرچ کیا جائے۔

(بقیہ آگے) لیے کسی حکم کے اس کی علت کے باقی رہنے تک باقی رہنے کے لیے بھی دلیل شرعی کا ہونا ضروری ہوا، البتہ اجماع کی صورت میں اس کا تعین لازمی نہیں رہتا۔ اور ثبوت دلیل پر حکم عائد ہو جاتا ہے اگرچہ وہ ہمارے سامنے ظاہر نہ ہو۔ (ردالمحتار، ج ۲، ص ۸۲ - ۸۳ - ط استنبانبول۔)
صاف محسوس ہوتا ہے کہ فقہائے احناف باوجود سعی کامل کے اپنے مؤقف کو درست نہیں ثابت کر سکے۔

[1] شرح الازھار، (ج ۱، ص ۵۱۳۔) میں ہے کہ امام اگر تالیف میں کوئی دینی مصلحت محسوس کرے تو اس کے لیے تالیف جائز ہے اور مسلک زیدیہ کے مطابق خود مال کے مالک کو تالیف کے لیے زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

دورِ جدید میں مؤلفۃ القلوب کے حصّہ کا کیا مصرف ہے؟

چونکہ مؤلفۃ القلوب کا حکم باقی ہے

اور انھیں زکوٰۃ سے حصّہ دینے کا حکم قطعی بھی موجود ہے اور یہ حکم منسوخ نہیں ہُوا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس حصّہ کو کس طرح خرچ کریں۔

اس حصّہ سے شریعت کا جو کچھ مقصود ہے وہ ہم بیان کر چکے ہیں اور اسی سے اس سوال کا جواب مل چکا ہے کہ تالیف قلب سے شریعت کا مقصود لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنا، انھیں ثابت قدم بنانا، ان میں سے کمزوروں کو تقویت دینا، اسلام کے مددگار حاصل کرنا اور دشمنانِ اسلام کے شر کو دور کرنا ہے۔

دورِ جدید میں اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسلم حکومتیں غیر مسلم حکومتوں کو مالی امداد دے کر ان کو مسلمانوں کا ہمدرد بنائیں یا بعض تنظیموں اور جماعتوں سے مالی تعاون کر کے انھیں اسلام کی جانب مائل کریں اور مصنفین اور اہلِ قلم سے تعاون کر کے انھیں اسلام کی مدافعت پر آمادہ کریں، اور اس امر پر تیار کریں کہ وہ اُمتِ مسلمہ پر ہونے والی افتراپردازیوں پر گرفت کریں اور ان کا جواب دیں۔

جو لوگ دینِ اسلام قبول کرتے ہیں ان کی کسی بھی اسلامی ملک سے کوئی امداد یا تعاون نہیں ہوتی حالاں کہ انھیں زکوٰۃ کے اس حصّے سے دیا جانا چاہیے تاکہ اس سے ان کی ہمت مضبوط ہو اور وہ اسلام پر قائم ہو جائیں، جیسا کہ یہی رائے امام زہریؒ اور حسن بصریؒ کی ہے، بالخصوص اس امر کے پیشِ نظر کہ مشنری تنظیمیں عیسائیت قبول کر لینے والوں کی ہر طرح کی مالی امداد کرتی ہیں اور انھیں ہر مادی اور اخلاقی تعاون بہم پہنچاتی ہیں، اور ان مشنری تنظیموں کو عیسائی دولت مند ممالک کثیر رقمیں اور امدادیں فراہم کرتے ہیں حالاں کہ ان کے مذہب میں ہمارے مذہب کے نظامِ زکوٰۃ جیسا کوئی نظام بھی موجود نہیں ہے کہ ہمارے نظامِ زکوٰۃ میں منجملہ آٹھ مصارف کے ایک مصرف بطورِ خاص تالیف قلب کا مقرر کر دیا گیا ہے۔

اسلام ایک ایسا طریقۂ حیات ہے جو عین فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اور عقلِ سلیم سے

بھی ہم آہنگ ہے اور اس میں ایسی وسعت، ہمہ گیری اور جامعیت موجود ہے جو اس کی اشاعت میں بے حد ممد ثابت ہوتی ہے اور اس کی تبلیغ میں بے انتہا مؤثر ہوتی ہے، لیکن جو لوگ اس دین کو قبول کرتے ہیں انھیں کوئی مادی تعاون حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اس دین پر اطمینان سے غور کر سکیں اور جو اس دین کے قبول کرنے میں انھیں قربانی دینی پڑتی ہے اور جو اپنے اہلِ خاندان اور اہلِ قبیلہ اور اہل قوم کے ظلم و ستم برداشت کرنے پڑتے ہیں، ان کی برداشت کی ان میں ہمت پیدا ہو سکے۔

بہت سے ممالک میں اسلامی جماعت اس خامی کی قدرے تلافی ضرور کر رہی ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ مناسب وسائل سے محروم ہے۔

اس بات کی وضاحت کے لیے آپ ذرا براعظم افریقہ پر نظر ڈالیے جہاں زبردست سیاسی اور مذہبی کش مکش برپا ہے اور دنیا کی ہر بڑی طاقت وہاں کے عوام کو اپنے شکنجے میں کسنے اور وہاں کی حکومتوں کو اپنا ہمنوا بنانے اور وہاں کے لیڈروں کو خریدنے کے لیے کوشاں ہے۔ ایک طرف استعماری اور مشنری قوتیں کارفرما ہیں۔ دوسری طرف اسرائیلی صیہونی ریشہ دوانیاں ہیں اور تیسری طرف مارکسی اشتراکی دیو سارے افریقہ کو ہڑپ کرنے کے لیے مُنہ کھولے آگے بڑھ رہا ہے۔

ظاہر ہے اگر دنیا میں کوئی ایسی اسلامی ریاست قائم ہوتی جو دعوت اسلامی کی اشاعت کو اپنا فریضہ سمجھتی تو وہ اس منظر سے بے نیاز نہ رہتی بلکہ آگے بڑھ کر اشاعتِ اسلام کی تدبیریں کرتی۔ کیونکہ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کا ایک دَور ایسا بھی گزر چکا ہے جب کہ اسلام کا کردار فعال، مؤثر اور جاندار تھا، جب کہ آج اسلام اپنی دفاعی پوزیشن میں ہے اور اسلام اور غیر اسلام کا معرکہ خود سرزمین اسلام میں لڑا جا رہا ہے اور اس جنگ میں اسلام شکست کھا کر اپنا ہی کچھ علاقہ ہاتھ سے دے بیٹھا ہے۔ اور جیسا کہ سید رشید رضا نے کہا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ آج کافر مسلمانوں کی تالیف کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کو اپنا حامی اور ہمنوا بنالیں اور انھیں سامراج کا غلام بنا کر انھیں ان کے دین سے برگشتہ کر دیں اور اسلام سے بیگانہ کر دیں۔

کیا مسلمانوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بھی تالیف کی مد میں خرچ کر کے اسلام کی جانب اقوام عالم کو مائل کریں۔

زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور مال سے تالیف کا جواز

یہ ضروری نہیں ہے کہ تالیف پر جو کچھ بھی صرف کیا جائے وہ زکوٰۃ ہی میں سے ہو بلکہ اس مقصد کے لیے دوسرے ذرائع سے بھی مال صرف کرنا درست ہے بالخصوص اس صورت میں جبکہ زکوٰۃ کے باقی سات مصارف میں زکوٰۃ کا صرف کرنا زیادہ ضروری اہم ہو اور ان میں مستحقین کی کثیر تعداد پائی جاتی ہو چنانچہ امام شافعیؒ کی اس رائے پر بھی عمل ہو سکتا ہے کہ تالیف پر مصالح کے حصے میں سے خرچ کیا جائے۔ بہرحال اس کا تعلق ایک منصف اور عادل ولی امر کی رائے سے ہے اور اس کا فیصلہ کرنا اہلِ شوریٰ کی ذمے داری ہے۔

چوتھی فصل

فی الرّقاب

(گردنوں کا آزاد کرانا)

قرآن کریم نے زکوٰۃ کے بعض مصارف کو الف لام کے ساتھ ذکر کیا ہے اور بعض کو فی کے ساتھ

سورۃ توبہ کی آیت صدقہ میں وارد آٹھ مصارف زکوٰۃ میں ہم چار کا بیان کر چکے ہیں جو یہ ہیں:-

الفقراء　　المساکین　　العاملین علیہا　　المؤلفۃ قلوبہم

اس کے بعد چار مصارف اور رہ گئے ہیں اور وہ یہ ہیں:

فی الرقاب

والغارمین

فی سبیل اللہ

وابن السبیل

مذکورہ بالا پہلے چار مصارف میں اور بعد کے چار مصارف میں قرآن کریم نے فرق کیا ہے اور وہ یہ کہ پہلے چار مصارف سے پہلے (لام) آیا ہے جس کے معنی "لیے" کے ہیں اور جو ملکیت کا مفہوم ادا کرتا ہے جبکہ باقی چار مصارف کو فی کے بعد بیان کیا ہے جس کے معنی "میں" کے ہیں اور جو ظرفیت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

یہ قرآن کریم کا ایک معجزانہ اسلوب بیان ہے اور اس میں کوئی بلیغ حکمت پنہاں ہے چنانچہ زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ پہلی چار اصناف کو لام کے بعد باقی چار اصناف کو فی کے بعد اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ علم ہو جائے کہ بعد کے چار پہلے چار سے زیادہ مستحق ہیں کہ ان میں زکوٰۃ

رکھ دی گئی ہے ضم کر دی گئی ہے اور ان کا جزء بنا دی گئی ہے [۱]

ابن المنیر الانتصاف میں الزمخشری کے اس کلام کے بعد فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ایک لطیف نکتہ اور ایک گہرا راز ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلی چار اصناف اس مال کی مالک ہیں جو انہیں دیا جانے والا ہے (یعنی مال زکوٰۃ) اور وہ اس کو اس طرح لیں گے جیسے وہ اپنی ملکیتی شئے لے رہے ہوں، اس لیے ان مصارف کو لام سے ذکر کیا گیا کہ عربی زبان میں لام اظہار ملکیت کے لیے آتا ہے جبکہ بعد کے چار مصارف کو جو مال زکوٰۃ دیا جا رہا ہے وہ ان کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس مال کو ان سے متعلق مصالح میں صرف کیا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ غلاموں کی آزادی کے لیے جو مال صرف کیا جا رہا ہے وہ ان کو نہیں دیا جاتا بلکہ ان کے مالکوں اور ان کے آقاؤں کو دیا جاتا ہے تاکہ وہ ان کی گردنیں آزاد کر دیں اس لحاظ سے یہ حصہ ان کی دسترس میں نہیں آیا کہ اسے لام سے ذکر کیا جاتا جس میں ملکیت کا مفہوم آجاتا ہے بلکہ درحقیقت یہ مصرف ایسا ہے کہ اس سے مستحق کو فائدہ تو پہنچتا ہے مگر مال زکوٰۃ اس کی ملکیت میں نہیں جاتا۔

یہی صورت غارمین (مقروض اور تاوان زدہ) کی ہے کہ اس مصرف میں بھی مال زکوٰۃ مستحق کی ملکیت میں نہیں آتا بلکہ اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے اسے قرض دیا تھا یا جس کا تاوان اس کے ذمے آگیا تھا۔ اور اس طرح اسے اس ذمے داری سے رستگاری دلا دی جاتی ہے۔

جہاں تک فی سبیل اللہ کے مصرف کا تعلق ہے تو وہ بالکل واضح ہے۔

اور ابن السبیل بھی فی سبیل اللہ میں آسکتا ہے لیکن اس کو علیحدہ اس لیے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کی جدا خصوصیت قائم ہو جائے اور پھر اس پر نہ لام آیا ہے اور نہ فی آیا ہے اور اسے لام پر عطف کرنا بھی ممکن ہے لیکن ظاہر ہے کہ قریب فی واقع ہوا ہے اس لیے اس پر عطف کرنا زیادہ موزوں ہے [۲]

---

[۱] الکشاف: ج ۲، ص ۴۵، ۴۶ ـ ط ـ الحلبی ـ ۱۳۶۷ھ۔

[۲] الانتصاف من الکشاف، بحاشیہ سابق۔

میں کہتا ہوں کہ ابن السبیل (مسافر) پر بھی جو خرچ کیا جاتا ہے وہ اس کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ اس کے سفر کی مصالح پر صرف ہوتا ہے اور اس کے منزل پر پہنچنے کا مقصد پورا کرنا ہوتا ہے، اس لحاظ سے اسے کچھ دینے کے بجائے اس کے جہاز کا یا ریل کا ٹکٹ لے کر دے دیا جائے تو اس مصرف کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح فخر الرازی فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے صدقات کے پہلے چار مصارف کو لام تملیک کے ساتھ بیان فرمایا اور ارشاد ہوا (انما الصدقات للفقراء) اور جب الرقاب کا مصرف بیان کیا تو وہاں لام کی بجائے "فی" آیا اور کہا (فی الرقاب) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف کو زکوٰۃ میں سے ان کا حصہ دے دیا جاتا ہے۔ اور وہ اس میں اپنی مرضی سے تصرف کر سکتے ہیں۔ جبکہ الرقاب کے مصرف میں غلاموں کو نہیں دیا جاتا بلکہ ان کی رہائی کے لیے صرف کیا جاتا ہے، اور انھیں یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اس حصے میں اپنی مرضی سے تصرف کریں۔

اسی طرح غارمین کا قرض ادا کر دیا جاتا ہے، فی سبیل اللہ میں مجاہدین کی اسلحہ وغیرہ کی ضروریات پوری کر دی جاتی ہیں اور یہی صورت ابن السبیل (مسافر) کی ہے کہ اس کی ضرورت پوری کر دی جاتی ہے۔

غرض پہلی چار اصناف کو زکوٰۃ میں سے جو حصہ ملتا ہے وہ اس کو صرف کرنے کی مختار ہوتی ہیں جبکہ باقی چار اصناف میں مال زکوٰۃ ان کو دیا نہیں جاتا بلکہ ان کی ان ضروریات میں صرف کیا جاتا ہے جن کی بنا پر وہ مستحق قرار پائے ہیں۔[1]

الخازن نے بھی اپنی تفسیر میں یہی بات بیان کی ہے۔[2]

مستحقین کی اصناف میں اس فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے المنار[3] کے مصنف نے یہ تقسیم

---

[1] الرازی: التفسیر الکبیر، ج ۱۶، ص ۱۱۲۔

[2] الجمل حاشیۃ الجلالین، ج ۲، ص ۲۹۲۔

[3] المنار: ج ۱۰، ص ۵۸۶، ۵۹۰۔ ط ثانیہ۔

کی ہے اور اسی کو ان کے بعد شیخ شلتوت نے اختیار کیا ہے[1] کہ مصارف کے دو حصے ہیں ایک حصہ اشخاص اور دوسرا حصہ مصالح۔

اشخاص کے حصہ میں پہلے چار مصارف اور غارمین اور ابن السبیل داخل ہیں (یعنی چھ) اور مصالح میں صرف دو مصرف آتے ہیں یعنی فی الرقاب اور فی سبیل اللہ اور یہی دو مصرف ہیں جن پر "فی" براہِ راست آیا ہے۔

سید رشید رضا نے الغارمون اور ابن السبیل کو مصالح میں شمار نہیں کیا حالانکہ عطف کے لحاظ سے یہ بھی فی کے تحت آتے ہیں بلکہ انھیں بھی لام پر عطف کر دیا ہے۔ اور وہ اس لیے تاکہ چھ اصناف جو اشخاص ہیں وہ علیحدہ ہو جائیں۔

مگر اس میں تامل یہ ہے کہ عطف قریب پر ہونا چاہیے نہ کہ دور پر اور قرآنی بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جن اصناف کو زکوٰۃ (بطور ملکیت) دی جاتی ہے وہ علیحدہ اور مستقل بیان ہوں اور جن اصناف کی مصالح میں زکوٰۃ صرف کی جاتی ہے ان کو جدا بیان کیا جائے اور یہی رائے الزمخشری ابن المنیر اور الرازی وغیرہ نے اختیار کی ہے۔

اور اسی رائے کی تائید المغنی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ[2]

مستحقین کی پہلی چار اصناف کو مستقل دیا جائے گا یعنی فقراء، مساکین، عاملین علیہا، اور مؤلفۃ قلوبہم ــــ اور دینے کے بعد ان سے یہ استفسار نہیں کیا جائے گا کہ انھوں نے اسے کہاں خرچ کیا اور وہ مال ان کی ملکیت ہو جائے جسے انھیں کسی بھی صورت میں واپس نہیں کرنا ہوگا، جبکہ باقی چار مستحق ــــ یعنی فی الرقاب، الغارمون، ابن السبیل اور فی سبیل اللہ ــــ کو اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیا جائے گا کہ اگر وہ اسی ضرورت پر صرف کریں جس کی وجہ سے وہ زکوٰۃ کے مستحق بنے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان سے واپس لیا جائیگا۔

اور ان اصناف میں اور ان سے پہلی اصناف میں فرق یہ ہے کہ ان میں سے پہلی

---

[1] الاسلام عقیدہ و شریعۃ، ص ۱۱۱ - ۱۱۳ - ط دار القلم۔

[2] ج ۲، ص ۶۷۰۔

چار اصناف کے زکوٰۃ لینے کا مقصود خود زکوٰۃ سے حاصل ہوتا کہ فقیر غنی ہو جائے مؤلفین کی تالیف ہو جائے اور عاملین کی اجرتیں ادا ہو جائیں جبکہ بعد کے چار اس مفہوم میں زکوٰۃ نہیں لیتے بلکہ ایک متعین اور مخصوص ضرورت کے دور کرنے کے لیے لیتے ہیں اور اگر ان کی ضرورت سے بچ جائے تو انھیں اسے واپس کرنا ہوتا ہے، ماسوا غازی (مجاہد) کے کہ (اور وہ بھی اُن اشیاء کے علاوہ جو باقی رہیں جیسے ہتھیار اور گھوڑا وغیرہ کہ یہ اشیاء مجاہد بھی جہاد کے بعد بیت المال میں واپس کرے گا۔)

ابن قدامہ کا یہ بیان صحیح ہے البتہ اگر وہ اس کی تائید میں قرآن کے اختلافِ تعبیر کو بھی بیان کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا جیسا کہ ان کے حنابلہ میں سے غایہ المنتہی کے شارح نے بیان کیا ہے۔[1]

فی الرقاب کا مفہوم

الرقاب رَقَبَۃ کی جمع ہے جس کے معنی قرآن میں غلام اور باندی کے آئے ہیں اور یہاں یہ مراد غلام یا باندی کا آزاد کرنا ہے گویا قرآن کا اسلوبِ تعبیر یہ ہے کہ غلامی انسان کی گردن میں ایک طوق کی طرح ہوتی ہے جس سے انسان کو آزاد کرانا ہوتا ہے اور اس کو اس بندھن سے نجات دلانا ہے۔

چنانچہ مصارفِ زکوٰۃ کی آیت میں "فی الرقاب" کا مفہوم یہ ہُوا کہ زکوٰۃ کا ایک حصّہ گردنوں کے آزاد کرانے میں صرف ہوگا یعنی اس حصّے سے غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرایا جائے گا۔ جس کے دو طریقے ہوں گے۔

۱) مکاتب کی اعانت کی جائے یعنی جس غلام سے اس کے مالک نے معاملہ مکاتبت کر لیا ہو اس کی مدد کرنا اور اس کی صورت یہ ہے کہ غلام سے وہ یہ معاملہ کرلے کہ غلام اسے ایک طے شدہ مقررہ معاوضہ اپنے کسب سے حاصل کر لے اسے ادا کرے اور اس کی ادائیگی کے بعد آزاد ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے غلاموں سے مکاتبت کرنے اور اس عہد کتابت کی پابندی

---

[1] مطالب اولی النہی : ج ۲/ص ۱۵۱۔

کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ غلاموں کے مالک ان کے ساتھ آسانی اور سہولت کا رویہ روا رکھیں اور سارا معاشرہ انھیں غلامی کے چنگل سے آزاد کرانے میں ان کی مدد اور اعانت کرے ۔ فرمان الٰہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّآتُوْهُمْ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ آتَاكُمْ (النور : ۳۳)

اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو اگر تمھیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے

بعد ازاں اللہ سبحانہٗ نے مال زکوٰۃ میں سے بھی ایک حصہ مقرر کر دیا جس میں سے انھیں دیا جائے گا اور ان کی گردنوں کی آزادی میں ان سے تعاون کیا جائے گا۔

گردنوں کی آزادی کے بارے میں یہی رائے امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب اور لیث بن سعد کی ہے۔ اور دلیل میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت پیش کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ وفی الرقاب سے مراد مکاتب غلام ہے اور اس کی تائید مذکورہ بالا آیت سے بھی ہوتی ہے کہ فرمایا (وَآتُوْهُمْ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ آتَاكُمْ)[1]

۲) گردنوں کو آزاد کرانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص خود کسی غلام کو خرید کر آزاد کر دے یا کئی افراد مل کر خرید یں اور آزاد کر دیں یا ولی امر (حکمران) زکوٰۃ کے مال میں سے غلام خرید کر آزاد کر دے۔

یہ امام مالکؒ کی مشہور رائے ہے اور امام احمدؒ اور اسحٰق کی رائے ہے اور ابن العربی کہتے ہیں کہ یہی رائے صحیح ہے اور اس کی تائید اس طرح کی ہے کہ یہی ظاہر قرآن ہے، کہ اللہ سبحانہٗ نے جہاں بھی رَقَبَہ (گردن) کا ذکر کیا ہے وہاں غلام ہی آزاد کرنا مراد ہے، اگر مکاتب مراد

---

[1] الرازی : التفسیر الکبیر، ج ۱۶، ص ۱۱۲ - الہدایۃ وفتح القدیر : ج ۲، ص ۱۷ -

بھی ہے کہ وہ آزاد کردہ غلام کچھ اپنے تاوان اور قرض بھی چھوڑ سکتا ہے جو آزاد کرنے والے اور اس کی قوم کو بھگتنا پڑیں اور اس طرح منفعت اور نقصان دونوں کی سطح برابر ہو جاتی ہے ؎

یہ تو وہ صورت ہے جب ایک شخص اپنی زکوٰۃ انفرادی طور پر تقسیم کر رہا ہو لیکن اگر حاکم اسلامی نظام زکوٰۃ کی ذمے داریاں پوری کر رہا ہو تو اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ مال زکوٰۃ کی گنجائش کے مطابق غلام خرید کر آزاد کر سکتا ہے بشرطیکہ دوسرے کسی مصرف پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ (بلکہ امام شافعیؒ کے نزدیک تو تمام مصارف میں زکوٰۃ کی برابر تقسیم لازم ہے اور اس لحاظ سے فی الرقاب کی مد دوسری مدوں سے کم نہ ہونی چاہیے۔) اور بہتر یہی ہے کہ ولی امر (حکمران) دونوں امور اختیار کرے یعنی مکاتب کی بھی اعانت کرے اور غلام اور باندی کو خرید کر آزاد بھی کرے۔

یہی وہ بات ہے جو امام زہریؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو تحریر فرمائی تھی کہ الرقاب کے دو حصے ہونے چاہئیں ایک حصہ کو مسلم مکاتب پر صرف کیا جائے اور ایک حصہ سے ان مسلمان غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے جو پابند صوم و صلوٰۃ ہوں اور اسلام میں ثابت قدم ہو چکے ہوں ؎

مگر ہماری رائے یہ ہے کہ حاکم نصف کا یا کسی اور نسبت کا پابند نہیں ہے بلکہ مصلحت کے مطابق اور اہل حل و عقد کے مشورے کے مطابق اسے عمل کرنا چاہیے۔

سب سے پہلے اسلام نے غلامی کے خاتمہ کے مؤثر اقدامات کیے ہیں

آج کی دنیا میں غلامی کا بالکلیہ خاتمہ ہو چکا ہے مگر ہم اس سلسلے میں برملا اس حقیقت کا اظہار کریں گے کہ یہ اسلام ہی ہے جس نے سب سے پہلے دنیا سے غلامی کو ختم کرنے کی مؤثر تدریجی اور ہمہ گیر تدابیر اختیار کی ہیں۔

؎ ایضاً ؎ ایضاً

اسلام نے سب سے پہلے غلامی کے ان بڑے بڑے ذرائع کا خاتمہ کیا جہاں سے غلامی جنم لیا کرتی تھی یعنی اسلام نے اس امر کو قطعاً ممنوع قرار دیا کہ کسی شخص کو خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اغوا کر کے غلام بنا دیا جائے، اسلام نے اس بات کی ممانعت کر دی کہ کوئی شخص اپنے آپ کو فروخت نہ کرے اور نہ ہی اپنے بچّوں اور بیوی کو فروخت کرے، اسلام نے اس امر کی بھی اجازت نہیں دی کہ اگر مقروض قرض نہ ادا کر سکے تو قرض خواہ اُسے اپنا غلام بنا لے یا کسی مجرم کو اس کے ارتکابِ جرم کی سزا میں غلام بنا لیا جائے، جیسا کہ اسلام سے پہلے کے قوانین میں یہ طریقہ مروج تھا اور اسلام میں یہ بھی جائز نہیں کہ ظالمانہ لوٹ مار کی غرض سے کیے جانے والے حملوں میں قیدیوں کو غلام بنا دیا جائے[1]

ان تمام طریقوں میں اسلام نے غلام بنانے کے صرف ایک طریقے کو جائز قرار دیا ہے اور وہ طریقہ بھی لازم نہیں ہے بلکہ کئی صورتوں میں سے یہ ایک صورت ہے جس کے انتخاب کی اجازت دی گئی ہے اور وہ یہ کہ کسی ایسی اسلامی جنگ میں جس کا مقصد بے انصافی اور زیادتی نہ ہو جو قیدی آئیں اگر ملک و ملت کے مفاد میں اور مسلم اُمّہ کا مشورہ ہو تو انھیں غلام بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ صورت ہو کہ دشمن نے مسلمان قیدیوں کو غلام بنا لیا ہو تو مسلمان بھی کافر قیدیوں کو غلام بنا لیں، کہ یہ معاملہ برابری کا ہو گا اور مصلحت کے مطابق ہو گا۔ اور اگر امام (اسلامی حکومت کا سربراہ) اگر چاہے تو وہ کافر قیدیوں کو بغیر کسی مادی یا معنوی معاوضہ کے رہا کر سکتا ہے، یا اپنے مسلمان قیدیوں کے تبادلے میں کافر قیدیوں کو رہا کر سکتا ہے۔ جیسا کہ مدمقابل آنے والے کافر قیدیوں کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے

حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (القتال : ۴)

یہاں تک کہ جب تم انھیں اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو، اس کے بعد (تمھیں اختیار ہے) احسان کر دو یا فدیہ کا معاملہ کر لو۔

---

[1] الدکتور علی عبدالواحد وافی، حقوق الانسان فی الاسلام، ص ۱۳۹، ۱۶۱- ط- وزارۃ الاوقاف، بالقاہرہ

اگر ایک جانب اسلام نے غلامی کے بے شمار دروازوں میں سے ایک دروازے کو کھلا رکھا ہے تو غلاموں کی آزادی کے بھی بے شمار راستے وا کر دیئے ہیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دراصل اسلام نے آزادی کی راہ دکھائی ہے غلامی کی نہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام نے آزاد کر دینے کی دعوت دی ہے اور اسے اللہ کے نزدیک ایک عبادت قرار دیا ہے، اس کے بعد غلام آزاد کرنے کو اسلام نے بہت سی ایسی خطاؤں کا کفارہ قرار دیا ہے جس میں انسان اپنی بشری کمزوریوں کی بنا پر مبتلا ہو جاتا ہے، جیسے قسم توڑ دینا، شوہر کا بیوی سے ظہار کر لینا، رمضان کے روزے میں صحبت کر لینا اور خطاءً قتل کر دینا۔ بلکہ اگر مالک اپنے غلام کو ناحق مار لگا دے تو اس کا بھی کفارہ یہی قرار دیا کہ مالک اس غلام کو آزاد کر دے۔

پھر مالکوں کو حکم دیا گیا کہ اگر تم اپنے غلاموں میں کوئی خیر دیکھو تو ان سے معاملہ آزادی (مکاتبت) کر لو اور انھیں موقع دو کہ وہ آزادی سے کسب کریں اور اس سے اسلامی معاشرہ کو فائدہ پہنچائیں۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ

(النور : ۳۳)

اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو اگر تمھیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔

ان اقدامات سے بڑھ کر یہ اقدام کیا گیا کہ زکوٰۃ میں ایک حصہ غلاموں کی آزادی کے لیے متعین کر دیا یعنی بیت المال کی مستقل آمدنی میں ان کی آزادی کے لیے ایک فنڈ قائم کر دیا گیا اور عام مسلمانوں پر ان کی آزادی کا ایک ٹیکس لگا دیا اور وہ ہے زکوٰۃ کے مصارف میں سے "فی الرقاب" کا حصہ۔[1]

---

[1] علاوہ بریں اسلام نے غلاموں کا مادی اور اخلاقی مرتبہ بھی بہت بلند کیا اور انھیں قابلِ احترام

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

اور اسلام کا فی الرقاب کی مد متعین کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت غلاموں کی آزادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے جو زکوٰۃ کا ایک کثیر حصہ بھی ہوسکتا ہے بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر دوسرے مصارف زکوٰۃ میں زکوٰۃ کے صرف کی ضرورت باقی نہ رہے تو زکوٰۃ کی مجموعی رقم فی الرقاب پر صرف کر دی جائے۔ جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عہد میں ہوا۔

یحییٰ بن سعید بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے افریقہ کے صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا وہاں میں مستحقین زکوٰۃ — فقراء کی جستجو میں رہا مگر مجھے نہ ملے کہ عمر بن عبد العزیز نے سب کو غنی بنا دیا تھا اس پر میں نے زکوٰۃ کی مجموعی رقم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے پر صرف کر دی۔[1]

اگر مسلمان اپنی سیاست و حکمت میں اسلام کو اسی عمدگی کے ساتھ کار فرما رکھتے اور ایک طویل عرصے تک عادل و راشد حکومت باقی رہتی تو یقیناً بہت تھوڑے سے وقت میں غلامی کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

کیا مسلمان قیدی کو فی الرقاب کی مد سے رہا کرایا جا سکتا ہے؟

اگرچہ فی الرقاب کا خصوصی مفہوم تو غلاموں کا آزاد کرانا ہے لیکن اگر اسے کو عام مفہوم پر لیا جائے تو کیا اس مد میں وہ مسلمان قیدی نہ آسکتے ہیں جو دشمن کے قبضہ میں ہوں کیونکہ ان مسلمان کا فروں کا حکم اس طرح پہلا ہو جس طرح غلاموں پر کافر کا چلتا ہے اور اس قید بندگی

(بقیہ گزشتہ) انسان قرار دیا بلکہ انھیں ان کے مالکوں کا بھائی قرار دیا اور حکم دیا کہ مالک اپنے غلام کو وہی پہنائے جو خود پہنے ... جو خود کھائے، اس کی ہمت و قدرت سے زیادہ اس سے کام نہ لے، اسے نہ مارے اور نہ ایذا پہنچائے اور نہ اسے غلام کہہ کر مخاطب کرے کہ اس طرح اس کے احساسات مجروح ہوں گے۔

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیزؒ: ابن عبد الحکم۔ ص ۹۵۔

زندگی میں وہ غلاموں کی سی حالت میں آگئے ہوں۔

مسلک امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ اقدام جائز ہے اور زکوٰۃ کی مد سے مسلمان قیدی کو رہا کرایا جا سکتا ہے[1]

قاضی ابن العربی مالکی فرماتے ہیں کہ قیدیوں کی زکوٰۃ سے آزادی کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، اصبغ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے، جب کہ ابن حبیب کہتے ہیں کہ جائز ہے کیونکہ جب ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی غلامی سے آزاد کرانا عبادت ہے اور زکوٰۃ کی مد سے اس کی آزادی جائز ہے تو یقیناً مسلمان کو کافر کی غلامی سے رہائی بدرجہ اولی جائز ہونی چاہیے[2] اگر آج غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہے تو جنگیں تو جاری ہیں اور حق و باطل کی کشمکش بھی برپا ہے اور اس طرح فی الرقاب، کی مد میں مسلمان قیدیوں کو رہا کرانے کی کافی گنجائش موجود ہے

کیا سامراج کی غلام اقوام کی آزادی کے لیے فی الرقاب کی مد میں سے صرف کرنا درست ہے؟

سید رشید اپنی تفسیر المنار میں لکھتے ہیں کہ انفرادی آزادی کا مصرف موجود نہ ہو تو فی الرقاب کی مد میں سے غلام اقوام کی آزادی کے لیے بھی صرف کیا جا سکتا ہے[3] اور اسی کی تائید شیخ شلتوت نے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ آج جبکہ شخصی غلامی باقی نہیں رہی ہے، اس کی جگہ ایک اور غلامی نے لے لی ہے جو پہلی غلامی سے بھی زیادہ خطرناک ہے یعنی قوموں کی فکری، معاشی اور ذہنی غلامی اور ان کے وجود ملی اور اقتدار اعلیٰ کی غلامی۔ پہلے تو افراد غلام ہوتے تھے، جو مر جاتے تھے اور

---

[1] الروض المربع، ج ۱، ص ۴۰۲۔

[2] احکام القرآن، ج ۲، ص ۹۵۶۔

[3] تفسیر المنار، ج ۱۰، ص ۵۹۸۔

ان کی موت کے ساتھ ان کی غلامی بھی مرجاتی تھی اور ان کا ملک اور ان کی قوم آزاد رہتی تھی مگر آج اقوام غلام ہو جاتی ہیں تو ان کی آزادی کی کوئی سبیل نہیں رہتی اور غلام قوم غلام نسلوں کو جنم دیتی رہتی ہے اس لیے ان غلاموں کی گردنوں کا چھڑانا اور انھیں اس ذلت سے نجات دلانا بھی ضروری ہے صرف صدقات ہی سے نہیں بلکہ پورے جان و مال کے ساتھ اس سے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ صاحب دولت مسلمانوں پر اپنی برادر مسلمان اقوام کی جانب سے کس قدر ذمے داریاں ہیں [1]

سید رشید رضا نے اور شیخ شلتوت نے الرقاب کی مد میں بہت زیادہ وسعت اختیار کر لی ہے اور غلام افراد کی مد میں غلام اقوام کو بھی داخل کر لیا ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس قدر وسعت کی ضرورت نہیں ہے کہ اس توسع میں اسلامی اصطلاحات کے اصل مفاہیم گم ہو جائیں بلکہ اسلامی اقوام کی مدد کے لیے فی سبیل اللہ کی مد بھی موجود ہے اور ریاست کے دوسرے موارد بھی اس مد میں استعمال ہو سکتے ہیں۔

●

---

[1] الاسلام عقیدۃ و شریعۃ ص ۴۴۶۔

پانچویں فصل

اَلْغَارِمُون

چھٹا مصرف جیسا کہ قرآن کی آیت صدقات میں بیان ہوا ہے الغارمون ہے

اَلْغَارِمُون کون لوگ ہیں؟

اَلْغَارِمُون غارِم کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جس پر قرض ہو[1] اور غریم کے معنی قرض خواہ کے ہیں اور اس کا اطلاق مقروض پر بھی ہوتا ہے۔ از روئے لغت غرم کے معنی لازم ہونے کے ہیں اور اسی معنی میں یہ فرمان الٰہی ہے۔

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا

اور اس بنا پر کہ قرض مقروض پر لازم ہوتا ہے اسے غارم کہا جاتا ہے اور اسی مفہوم کے لحاظ سے غریم بھی مقروض کے معنی میں ہے، (اور قرض خواہ کے معنی میں بھی ہے)۔

امام ابوحنیفہ رح کے مسلک کے مطابق غارِم وہ شخص ہے جس پر قرض ہو اور وہ اپنے قرض کے علاوہ نصاب کا مالک نہ ہو[2] اور امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک

---

[1] فتح القدیر میں ابن الہمام تحریر کرتے ہیں کہ غارِم وہ ہے جس پر قرض لازم ہو یا جس کا قرض کسی کے ذمے ہو مگر وہ وصول نہ کر سکے اور وہ نصاب کا مالک نہ ہو۔ ابن الہمام کی یہ تحریر محل نظر ہے اس لیے کہ از روئے لغت غارِم وہی ہے جس پر قرض ہو (مقروض) ہو سکتا ہے مصنف کو غارِم اور غریم میں اشتباہ پیدا ہو گیا ہو کیونکہ غریم قرض خواہ اور مقروض دونوں کو کہا جاتا ہے بہرحال قرض خواہ کی جو صورت ابن الہمام نے ذکر کی ہے کہ وہ صاحب نصاب نہ ہو اور اپنا قرض بھی وصول نہ کر سکے تو اس کو زکوٰۃ میں سے دینا جائز ہی ہے کہ وہ تو فقیر ہے جیسے مسافر۔ حاشیۃ رد المحتار، ج ۲، ص ۶۳۔

[2] البحر الرائق ج ۲، ص ۲۶۰ ۔ الدر المختار وحاشیۃ رد المحتار، ج ۲، ص ۶۳۔

اس کی دو اقسام ہیں ـــــ ایک وہ غارم (مقروض) جس نے اپنی ذات کے لیے قرض لیا ہو اور دوسرا وہ مقروض (غارم) جس نے کسی اجتماعی مصلحت کے لیے قرض لیا ہو، ان میں سے ہر ایک کا جداگانہ حکم ہے۔

الغارمون جنھوں نے اپنی ذات کے لیے قرض لیا ہو

وہ مقروض جس نے

اپنی کسی ذاتی ضرورت کے لیے قرض لیا ہو، مثلاً اپنے بعض اخراجات کے لیے، لباس کے لیے، کسی شادی بیاہ کے لیے، بیماری کے علاج کے لیے، یا گھر بنانے کے لیے، یا سامان خریدنے کے لیے، یا خطاء یا سہواً کسی کی کوئی شئے ضائع کر دی ہو اس کا تاوان ادا کرنے کے لیے، تو یہ وہ مقروض ہوگا جو اپنی ذاتی ضرورت کے لیے قرض لیتا ہے۔

طبری نے ابو جعفر سے اور اسی کے مثل قتادہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ غارِم وہ ہے جو بغیر اسراف اپنی ضرورت کے لیے قرض لے اور اس مقروض کا قرض امام بیت المال سے ادا کرے گا۔[۱]

مصیبت زدگان بھی اسی صنف میں سے ہیں

الغارمون کا وصف زیادہ وسعت کے ساتھ

ان لوگوں پر بھی منطبق ہوتا ہے جن کو زندگی میں کسی اچانک مصیبت نے آگھیرا ہو، ان کا سارا مال و اسباب کسی آفت کی نذر ہو گیا ہو اور وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے قرض لینے پر مجبور ہو گئے ہوں چنانچہ مجاہد سے مروی ہے کہ اَلْغَارِمِیْنَ تین ہیں، ایک وہ شخص جس کا مال و اسباب سیلاب میں بہہ گیا ہو، دوسرا وہ شخص جس کا سامان آتشزدگی میں جل گیا ہو اور تیسرا وہ شخص جو عیال دار ہو اور اس کے پاس مال نہ ہو اور وہ قرض حاصل کر کے اپنی ضروریات پوری کرے۔[۲]

---

[۱] تفسیر الطبری، بتحقیق محمود شاکر ج ۱۴، ص ۳۱۸۔

[۲] مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳، ص ۲۰۷۔ ط۔ حیدرآباد۔

قبیصہ بن المخارق کی حدیث میں جسے احمدؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو ولی امر سے زکوٰۃ میں حصہ مانگنے کی اجازت دی ہے جس کا مال کسی آفت میں ضائع ہو گیا ہو، تاکہ وہ اپنی زندگی برقرار رکھ سکے۔

اس حدیث کو ہم مکمل الغارمین کی قسم دوم کے بیان میں ذکر کریں گے۔

اس لحاظ سے زکوٰۃ مصائب اور آفات میں اسلامی معاشرے کے افراد کے لیے انشورنس (تأمین) کا درجہ رکھتی ہے اور یہ تأمین کی ایسی صورت ہے جس سے اسلام کے سوا کوئی نظام زندگی آشنا نہیں، اس لیے کہ یہ نظام تأمین دنیا کے ہر انشورنس کے نظام سے کہیں زیادہ جامع مکمل اور عمدہ ہے۔

مغرب جس انشورنس سے تاریخ کے کئی مراحل سے گزر کر روشناس ہوا ہے وہ ایک محدود نامکمل اور غیر جامع نوعیت کی انشورنس ہے جس میں فرد کو از خود کسی انشورنس کمپنی سے اپنی تأمین کا معاملہ کرنے کے لیے متعین رقم کی بالاقساط ادائیگی کرنا پڑتی ہے اور کمپنی مصیبت کے وقت جو ادائیگی کرتی ہے وہ اسی رقم کے مطابق ہوتی ہے جو پالیسی ہولڈر POLICY-HOLDER نے ادا کی ہے، خواہ اس مصیبت زدہ شخص کا نقصان اور آفت اس رقم سے کہیں زیادہ ہو۔ غرض انشورنس کمپنی کو اس امر سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ شخص کے اصل اور حقیقی کی تلافی ہوئی ہو یا نہیں ہوئی ہے، بلکہ جس کی پالیسی کی رقم زیادہ ہے اسے زیادہ مل جاتا ہے خواہ اس کے نقصانات کم ہوں اور جس کی پالیسی کی رقم کم ہو اسے کم ملتا ہے خواہ اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محدود آمدنی والے بہت معمولی رقموں کی انشورنس کراتے ہیں اور جب ان پر مصیبت آتی ہے تو انھیں اس کا فائدہ بھی کم حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ مغرب کے انشورنس کے نظام کی بنیاد تجارت ہے کہ کوشش یہ ہے ان کی انشورنس کی اقساط لے کر اس سے کاروبار کیا جائے اور اس کے منافع میں سے کچھ حصہ، حصہ داروں (پالیسی ہولڈروں) میں تقسیم کر دیا جائے۔*

---

* درحقیقت مغرب کا انشورنس کا نظام سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے اس لیے انشورنس

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

جبکہ زکوٰۃ کے اس اسلامی انشورنس میں نہ پہلے سے اقساط ادا کرنی ہیں، بلکہ اسلامی ریاست از خود ہر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ کی اس کی مصیبت اور اس کی آفت کے اعتبار سے مدد کرتی ہے اور اس کا مکمل خسارہ پورا کرتی اور اس کے جملہ نقصان کی تلافی کرتی ہے۔

غارِم کو اس کی ذات کے لیے دینے کی شرائط

اس نوع میں قضائے دَین کے مقصد کیلیے دینے کی چند شرائط ہیں:۔

پہلی شرط یہ ہے کہ اسے قضائے دَین (قرض کی ادائیگی) کے لیے فی الواقع ضرورت ہو یعنی اگر وہ مالدار ہو اور اپنے قرض کو اپنے پاس موجود رقم سے یا سامان کی فروخت سے ادا کر سکتا ہو تو اسے قرض کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا[ا]، اور اگر بالکل کسی شئے کا مالک نہ ہو لیکن کسب وعمل سے اپنے قرض کے ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو اسے بھی دیا جائے گا، کیونکہ اس طرح ادائیگی میں اسے وقت لگے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس دوران ادائے قرض سے کوئی اور مانع پیش آجائے بخلاف فقیر کے کہ اگر وہ کسب پر قادر ہو تو وہ اپنی ضرورت اسی وقت پوری کر سکتا ہے۔

بہر حال مقروض کے ادائے قرض کے لیے احتیاج ہونے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ بالکل کسی شئے کا مالک نہ ہو بلکہ فقہائے نے تصریح کی ہے کہ رہائش، لباس، بستر، برتن،

(بقیہ آگے) فی الواقع سرمایہ داری کے لیے مفید ہے کہ اگر ایک سرمایہ دار کو کوئی گھاٹا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی ادائیگی کے حساب سے دوسرا سرمایہ دار یعنی انشورنس کمپنی اس کے نقصان کی تلافی کر دے، جبکہ اسلام کا نظام زکوٰۃ معاشرے میں مالی لحاظ سے پیچھے رہ جانے والے افراد کی براہِ راست دستگیری کرتی ہے اور اس طرح معاشی ناہمواری کو دور کرتی ہے۔ (م، صدیقی)

[ا] امام شافعیؒ کا قول یہ بھی ہے کہ مالدار کو بھی دیا جائے گا اور وہ غارم لذات البین کے مشابہ متصور ہوگا۔ المجموع، ج ۶، ص ۲۰۷۔ نہایۃ المحتاج، ج ۶، ص ۱۵۵۔

خادم، اور سواری وغیرہ اس سے خارج ہیں اور ان اشیاء کے مالک ہونے کے باوجود اسے زکوٰۃ کی مدین ادائے قرض کے لیے دیا جا سکتا ہے۔

اور اگر مقروض کے پاس مال تو ہو مگر اتنا ہو کہ اگر وہ اس سے قرض ادا کردے تو باقی مال اس کی ضرورت کو کافی نہ ہو تو اس کی کفایت کے بقدر مال اس کے پاس چھوڑ کر باقی مال قرض میں دیا جائے گا اور اس کی کمی زکوٰۃ سے پوری کی جائے گی، اور کفایت سے مراد مسلک شافعیؒ کے مطابق وہی ہے جس کا پہلے بیان ہو چکا ہے یعنی اس قدر مقدار مال جو اس کی عمر کے بیشتر حصے کے لیے کافی ہو، اس کے بعد جو باقی رہے اسے قرض میں دیا جائے گا اور کمی کو پورا کیا جائے گا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مقروض نے قرض کسی امر طاعت کے لیے یا کسی امر جائز کے لیے لیا ہو، اور اگر اس نے قرض کسی حرام اور ناجائز کام کے لیے لیا ہو یعنی شراب، زنا، جوا اور دوسرے بے ہودہ کاموں کے لیے لیا ہو تو اس کی ادائیگی زکوٰۃ سے نہیں ہو سکتی اور اسی طرح اگر اس نے اپنی ذات پر یا اپنے بچوں پر کوئی مسرفانہ اخراجات کیے ہوں تو وہ بھی زکوٰۃ سے ادا نہیں ہوگا اس لیے کہ قرض لے کر مسرفانہ کام حرام ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ

(الاعراف : ۳۱)

کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

معصیت الٰہی کے کاموں کی بنا پر مقروض ہو جانے والے کو زکوٰۃ کی مد میں سے نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح اسے مزید عصیاں پر آمادگی ہوگی اور معصیت الٰہی میں اس سے تعاون کرنا ہوگا حالانکہ اُسے توبہ کی تلقین کرنی چاہیے اور اگر وہ توبہ کرلے پھر زکوٰۃ میں سے اس کا قرض ادا کر دیا جائے اس لیے کہ توبہ سے ماسبق پر گرفت ختم ہو جاتی ہے اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اُس نے گناہ ہی نہ کیا ہو۔

لیکن بعض فقہاء نے اس میں یہ قید بھی لگائی ہے کہ اعلان توبہ پر کچھ وقت گزر جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ فی الواقع اس نے توبہ کر لی ہے اور پہلی حالت کو درست کر کے اب

صحیح طریقہ پر قائم ہوگیا ہے جبکہ بعض فقہا کی رائے یہ ہے کہ اگر غالب گمان یہ ہو کہ اُس نے توبہ درست کی ہے تو خواہ توبہ پر کم ہی وقت گزرا ہو اس کا قرض زکوٰۃ سے ادا کر دیا جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ قرض فوری ادائیگی کا حامل ہو اور اگر قرض کی ادائیگی کی مدت مقرر ہو جو ابھی نہیں آئی ہو تو اس بارے میں اختلاف ہے ایک یہ ہے کہ ایسے مقروض کو بھی زکوٰۃ میں سے ادائے قرض کے لیے دیا جائے گا کہ فی الحقیقت وہ بھی غارِم ہے اور نص کے عموم میں داخل ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس مقروض کو زکوٰۃ میں سے نہیں دیا جائے گا، کہ سر دست اس کو ضرورت نہیں ہے اور ایک اور قول یہ ہے کہ اگر ادائے قرض کی مدت رواں سال ہی آرہی ہو تو اسے رواں سال کی زکوٰۃ میں سے دے دیا جائے گا ورنہ نہیں دیا جائے گا۔[1]

میری رائے یہ ہے کہ ان ہر سہ اقوال کے بجائے زکوٰۃ کی آمدنی اور جملہ اصناف کے مستحقین زکوٰۃ کی تعداد کو دیکھا جائے اور ان کی ضروریات کی مقدار کا جائزہ لیا جائے اگر زکوٰۃ کی آمدن زیادہ ہو اور مستحقین کی تعداد کم ہو تو پہلے قول پر عمل ہو سکتا ہے اور قرض خواہ فوری ہو یا موجل بہر صورت زکوٰۃ میں سے اس کی مدد کی جائے گی اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو دوسرے قول پر عمل کیا جا سکتا ہے اور دَینِ موجل کی ادائیگی پر دیگر اصنافِ مستحقین کو ترجیح دی جائے اور اگر صورتِ حال ان دونوں کے درمیان کی ہو تو تیسرے قول پر عمل ہو سکتا ہے۔

اور اگر زکوٰۃ کی ادائیگی انفرادی طور پر کی جاتی ہو تو زیادہ احتیاج والے کو مقدم رکھنا چاہیے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ قرض ایسا ہو جس کی عدم ادائیگی پر حبس کیا جا سکتا ہو، لہٰذا اس میں بیٹے کا قرض اگر باپ پر ہو تو وہ بھی داخل ہے اور تنگدست شخص کا قرض بھی داخل ہے جبکہ کفارہ اور زکوٰۃ کا قرض اس سے خارج ہے کہ کسی شخص کے قرض کی عدم ادائیگی پر مقروض کو محبوس کیا جاتا ہے اور کفارہ اور زکوٰۃ اللہ کے لیے ہے۔[2]

---

[1] المجموع، ج ۶، ص ۲۰۷ — ۲۰۹، نہایۃ المحتاج، ج ۶، ص ۱۵۴، ۱۵۵۔ شرح الخرشی علی خلیل ج ۲، ص ۲۱۸۔

[2] حاشیۃ الصاوی : ج ۱، ص ۲۳۳۔

و) اگر کوئی شخص کسی سے کوئی مال لے اور اس کی ادائیگی کی نیت ہو تو اللہ اس کی ادائیگی کروا دیتا ہے اور جس کی نیت اس کو ضائع کر دینے کی ہو تو اللہ اسے ضائع کروا دیتا ہے[1]

ج) اگر ادائیگی کے ارادے کی تمام علامات کے باوجود ادا کرنے سے قاصر ہو تو اسلامی ریاست اسے اس قرض سے نجات دلائی جائے گی اور اس عزت کو پامال کرنے والے بوجھ کو اس کے سر سے اٹھایا جائے جسے ھَمِّ شب اور بارِ روز کہا جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرض سے اللہ کی پناہ مانگتے اور یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ غَلَبَۃِ الدَّیْنِ وَغَلَبَۃِ الْعَدُوِّ وَشَمَاتَۃِ الْاَعْدَاءِ[2]

اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ قرض مجھ پر غالب آجائے، دشمن غالب آجائے اور دشمنوں کی ملامت کا نشانہ بنوں۔

قرض نہ صرف یہ کہ مقروض کی نفسیات پر برا اثر ڈالتا اور اس کے اطمینان وسکون کو غارت کرتا ہے بلکہ وہ اس کے اخلاق اور طرزِ عمل کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوتا ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر قرض سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ اور آپ جب عذاب قبر سے پناہ مانگتے، زندگی اور موت کے فتنے سے پناہ مانگتے اور مسیح دجال کے فتنے سے پناہ مانگتے اس کے ساتھ ہی آپ قرض سے بھی پناہ مانگتے صحابہ کرام نے جب آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص مقروض ہو جاتا ہے تو جھوٹ بولنے لگتا اور وعدہ خلافی کرنے لگتا ہے[3]

---

[1] بخاری، احمد، ابن ماجہ از ابو ہریرہؓ ۔ (کنز العمال ج ۶، ص ۱۱۴)

[2] نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے از عبد اللہ بن عمر مرفوعاً بلوغ المرام: ص ۳۱۴۔

[3] صحیح البخاری، کتاب الاستقراض، باب من استعاذ من الدین۔

اس حدیث سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ انسان کی اقتصادی حالت اس کے اخلاق اور طرز عمل پر اثر انداز ہی ہوتی ہے اور اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا البتہ یہ کہنا غلط ہے کہ اقتصادی حالت ہی انسانی زندگی کا واحد عامل ہے اور محض معاشی حالات ہی انسانی زندگی میں ردوبدل لاتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کو قرض سے اجتناب کی تلقین فرماتے یہاں تک کہ آپؐ مقروض کی نماز جنازہ نہ پڑھاتے جو کہ صحابۂ کرام کے لیے ایک شدید تنبیہ تھی کہ سب ہی آپؐ کی نماز اور دعا کے متمنی ہوتے اور آپؐ کی دعا سے محروم ہونے کو اپنے لیے سخت محرومی اور عظیم خسارہ سمجھا کرتے تھے۔

بعدازاں جب فتوحات ہوگئیں اور مال غنیمت بکثرت آنے لگا اور بیت المال کی آمدنی میں اضافہ ہوگیا تو آپؐ خود ہی مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی فرمانے لگے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کو اگر کسی مقروض شخص کی نماز جنازہ کے لیے بلایا جاتا تو آپؐ استفسار فرماتے کہ اس نے قرض ادا کر دیا ہے اگر آپؐ کو بتایا جاتا کہ اس نے ادا کیا ہے تو آپؐ نماز پڑھاتے ورنہ فرماتے کہ اپنے ساتھی کی خود ہی نماز پڑھاؤ پھر جب فتوحات ہوگئیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں مومنین کا ان کی اپنی ذات سے زیادہ ولی ہوں اس لیے اب جو مقروض انتقال کرے گا اس کے قرض کی ادائیگی میں کروں گا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو غارمین کی اعانت کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ حق اخوت ادا ہو جائے، اعانت کا فریضہ پورا ہو جائے اور حضرت حق تعالیٰ سے ثواب حاصل ہو، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ عہد نبوتؐ میں کسی نے پھل خریدا اور اس پر آفت آگئی اور اس بنا پر وہ مقروض ہو کر بالکل مفلس ہوگیا، آپؐ نے فرمایا کہ اس پر صدقہ کرو، لوگوں نے اس پر صدقہ کیا جس سے اس کا قرضہ نہیں اترا تو آپؐ نے اس

---

[1] بخاری، ومسلم، بلوغ المرام ص ۱۸۰۔ کنز العمال ج ۶، باب الترھیب من الاستقراض من غیر ضرورۃ۔

کے قرض خواہوں سے فرمایا یہی جو کچھ مل رہا ہے لے لو اور اس کے سوا تمھیں کچھ نہیں ملے گا[1]
قرآن کریم نے ان وجوہات کی بنا پر مقروض کے قرض کی ادائیگی کو ادائے زکوٰۃ کا ایک مقررہ حصّہ قرار دیا ہے۔ اور اس طرح اسلام نے مقروض کو قرض کے بندھن سے چھڑانے کی عملی تدابیر کی ہیں اور مقروض کو قرض کے بوجھ تلے دبنے نہیں دیا ہے کہ وہ بالکل مفلس ہو کر اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اور اس طرح قرض کی ادائیگی اور مالِ زکوٰۃ سے اس کو دور کرنے کی عملی تدابیر کرنے کے دو اہم مقاصد ہیں۔

۱) پہلا مقصد خود مقروض سے متعلق ہے کہ مقروض کی رات کی بے چینی اور دن کی بے آرامی ختم ہو جائے اور مطالبات، تقاضوں اور قید و بند کی صعوبتوں سے نجات پا جائے۔

۲) دوسرے مقصد کا تعلق اُس قرض خواہ سے ہے جو مقروض کو قرض دیتا ہے اور اس کی شرعی ضرورت میں اس کے کام آتا ہے کہ اسلام اس کے قرض کی ادائیگی میں اس سے تعاون کرتا ہے اور معاشرے کے افراد کو مروّت تعاون اور قرض حسنہ پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح زکوٰۃ سود کے برخلاف ایک پیکار بن جاتی ہے۔

غرض اس طرح اسلام مقروض کی دستگیری کرتا ہے اور اس کو اس امر پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ اپنی اصلی ضروریات کو فروخت کر کے زندگی کے اساسی مقومات سے تہی دست اور ساماں و متاع سے محروم زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے ـــــ جی نہیں بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی خلافت میں اپنے والیوں کو تحریر فرمایا تھا کہ مقروض لوگوں کے قرض ادا کرو۔ اس پر کسی شخص نے انھیں تحریر کیا کہ بعض مقروض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس گھر بار خادم اور سواری سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تحریر کیا کہ ہر ایک مسلم کے پاس اس کا رہائشی گھر ہونا چاہیے، کام کاج کے لیے خادم ہونا

---

[1] بلوغ المرام ص ۱۷۷ ۔ باب التفلیس والحجر۔

چاہیے اور دشمن سے نمٹنے کے لیے گھوڑا بھی ہونا چاہیے اور اس کے گھر میں کچھ ساز و سامان بھی ہونا چاہیے اور ان سب اشیاء کے باوجود وہ مقروض بھی ہو تو اس کا قرض غارم کے طور پر ادا کیا جانا چاہیے[1]

یہ ہے قانون الٰہی! یہ ہے عدل وانصاف پر مبنی وہ معاشرتی نظام جو چودہ صدی پہلے طلوع ہوا تھا..... کہاں یہ اس قدر بلند قوانین اور کہاں موجودہ دور کے خود ساختہ قوانین جو کہ جدید تہذیب کے حامل قوانین کہلاتے ہیں جن کی رو سے ایک تاجر کو اپنے دیوالیہ پن کا اعلان کرنا پڑتا ہے، اپنے کاروبار کو ختم کر دینا پڑ جاتا ہے اور اپنے گھر کی تباہی مول لینا پڑ جاتی ہے اور ساری تباہی اور بربادی کے باوجود اسے معاشرے سے یا ریاست (STATE) سے کوئی امداد حاصل نہیں ہوتی۔

اور ذرا پہلے قوانین پر نظر ڈالیے تو رومی قانون نے ایک دور میں یہ بھی جائز قرار دیا ہے کہ قرض خواہ مقروض کو اپنا غلام بنالے چنانچہ رومی قانون کی 'دوازدہ الواح کے قانون' میں درج ہے کہ اگر آزاد مقروض قرض ادا نہ کر سکے تو وہ قرض خواہ کی غلامی میں دے دیا جائے گا اور اگر مقروض غلام ہو تو اس کے حبس اور قتل کا حکم دیا جائے گا[2]

اسی سے ملتا جلتا دستور عربی جاہلیت کے معاشرے میں یہ تھا کہ جو مقروض قرض کی ادائیگی سے عاجز ہوا اسے فروخت کر کے قرض خواہ کا قرض ادا کر دیا جاتا تھا۔ اور بعض نے روایت کیا ہے کہ یہ دستور اوائل اسلام میں بھی جاری رہا اور بعد میں منسوخ ہوا اور پھر قرض خواہ کو مقروض کی آزادی سلب کرنے کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا[3]

فرمان الٰہی ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا

---

[1] الاموال ص ۵۵۶۔

[2] روح الدین الاسلامی، ص ۳۲۸۔

[3] تفسیر القرطبی، ج ۳، ص ۲۷۱۔

خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ : ۲۸۱)

تمہارا قرض دار تنگدست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

الغارم جس نے دوسرے کی مصلحت کے لیے قرض لیا ہو

اس سے وہ اہل خیر و اخلاق اشخاص مراد ہیں جو دو افراد کے مابین یا دو جماعتوں کے مابین ہونے والے فتنہ و فساد کو اور جان و مال کے نقصان کو دور کرنے کی خاطر ان کے مالی تاوان اپنے ذمہ لے لے اور ان متحارب افراد کے درمیان صلح کرا دے، جو کہ ایک اسلامی معاشرے کی ہی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس لیے اسلام تاوان کے اس بوجھ کو زکوٰۃ کی مد سے اتارتا ہے تاکہ صلح کرانے والے معاشرے کے سرکردہ معزز افراد اس کارِ خیر سے پیچھے نہ ہٹیں، چنانچہ شریعت نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنا یہ مطالبہ رکھیں اور ان کے اس تاوان کو زکوٰۃ سے ادا کر دیا جائے[1]

حتیٰ کہ فقہائے اسلام نے یہ تصریح کی ہے کہ اگر ذمیوں کی دو جماعتوں میں لڑائی جھگڑا ہو جائے اور کوئی شخص ان کے مابین صلح کرا دے تو اس کا تاوان بھی زکوٰۃ کی مد سے ادا کیا جائے گا[2]

لوگوں کے درمیان اُن صلح کرانے والوں کی طرح وہ اہلِ خیر بھی ہیں جو کوئی مفید اجتماعی کام کریں، مثلاً کوئی صاحبِ خیر یتیم خانہ قائم کر دے، یا غریبوں کے علاج کے لیے ہسپتال بنا دے، یا نماز کے لیے مسجد بنائے، یا مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوئی مکتب یا مدرسہ بنائے غرض اسی قسم کے اجتماعی بہبود اور معاشرتی اصلاح و خیر کے کام کرے تو اس کی مسلمانوں کے عام مال سے امداد کی جائے گی۔ کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ الغارمین سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے مابین

---

[1] الروض المربع، ج ۱، ص ۳۰۲۔

[2] مطالب اولی النہی، ج ۲، ۱۴۳۔

صُلح کرانے کی خاطر کوئی مالی بوجھ برداشت کرلیں اور اگر یہ مذکورہ افراد بالفرض الغارمین میں داخل نہ ہوں تو بہرحال از روئے ان کو از روئے قیاس اس حکم میں داخل کیا جاسکتا ہے۔[۱]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو افراد اس قسم کی مفید اجتماعی خدمات انجام دیں اور اس کے لیے قرض لے لیں تو ان کے قرض کی ادائیگی زکوٰۃ کے مال میں سے کی جاسکتی ہے اگرچہ وہ غنی کیوں نہ ہو جیسا کہ بعض مسلک شافعیؒ کے فقہاء نے کہا ہے۔[۲]

الغارمین کی پہلی قسم جو اپنی ذاتی مصلحت کے لیے قرض لے لیتے ہیں ان کو بھی زکوٰۃ کی مدمیں سے امداد کی جاسکتی ہے تو جو الغارمین اجتماعی مصالح کے لیے قرض لیتے ہیں ان کو تو اور بھی زکوٰۃ کی مد میں سے امداد ملنی چاہیے اور جبکہ پہلی قسم کے الغارمین کو مالداری کے باوجود زکوٰۃ میں سے ادائے قرض کے لیے دیا جاسکتا ہے تو دوسری قسم کے الغارمین کو بھی مالداری (غنا) کے باوجود دیا جاسکتا ہے۔[۳]

ہم پہلے ہی العاملین علیہا کے مصرف کے بیان میں یہ حدیث ذکر کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ صرف پانچ افراد کے لیے حلال ہے۔ (آخر تک)

اور قبیصۃ بن مخارق ہلالی سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مالی بوجھ اٹھالیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے سوال کیا، آپؐ نے

۱۔ تفسیر القرطبی، ج ۳، ص ۱۷۲۔

۲۔ بعض فقہائے شافعیہ کی یہ رائے ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی عمارت کے لیے کسی قیدی کو آزاد کرانے کے لیے یا کسی مہمان کی مہمان نوازی کے لیے قرض لیا تو اسے مالدار ہونے کے باوجود زکوٰۃ سے دیا جائے گا بشرطیکہ اس کی املاک بصورتِ جائیداد ہوں، بصورتِ نقد نہ ہوں (النوویؒ: الروضۃ ج ۲، ص ۳۱۹۔) لیکن رملی کہتے ہیں کہ اگر اس کے پاس بصورتِ نقد بھی موجود ہو تو چونکہ اس نے ایک نفع عام کا کام کیا ہے اس لیے اسے دیا جائے گا۔ (نہایۃ المحتاج ج ۶، ص ۱۵۵)

۳۔ یعنی اس صورت میں جبکہ انھوں نے اپنے مال میں سے نہ دیا ہو کہ ایسی حالت میں وہ مقروض نہ ہوں گے، جیسا کہ فقہاء نے کہا ہے۔

مرنے والے کا قرض زکوٰۃ سے ادا کیا جاسکتا ہے

جس طرح زندہ شخص کا قرض زکوٰۃ سے ادا ہو سکتا ہے

کیا اسی طرح کسی مردہ شخص کا قرض بھی زکوٰۃ سے ادا ہو سکتا ہے؟ امام نووگی نے اس بارے میں مسلک شافعیؒ کی دو صورتیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ جائز نہیں ہے اور یہی صمیری کا قول ہے اور نخعیؒ ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ جائز ہے اس لیے کہ آیت زکوٰۃ میں عموم ہے اور اس لیے کہ زندہ کی طرح مردہ کے دَین (قرض) کیلئے تبرع درست ہے اور یہی رائے ابو ثورؒ کی ہے۔[1]

امام احمدؒ سے بھی یہی مروی ہے کہ مردہ شخص کے قرض کی ادائیگی زکوٰۃ سے درست نہیں ہے، اس لیے کہ غارِم (مقروض) تو خود میت ہے اور اسے دینا ممکن نہیں ہے اور اگر قرض خواہ کو دیا جائے تو وہ غریم کو دینا ہوا نہ کہ غارم کو۔[2]

دوسرا قول جس کی رُو سے مردہ شخص کے قرض کی ادائیگی زکوٰۃ کی مد سے جائز ہے تو اس کے جواز کی وجہ آیت کا عموم ہے کہ غارِم کا لفظ ہر غارِم پر مشتمل ہے خواہ وہ زندہ شخص ہو یا مردہ اور اس لیے کہ زندہ کی طرح اس کے قرض کی بھی بطور تبرع ادائیگی جائز ہے اور یہی رائے ابو ثورؒ اور امام مالکؒ کی ہے۔[3]

خرشی متن خلیل پر اپنی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس امر میں کوئی فرق نہیں ہے کہ مقروض مردہ ہو یا زندہ، بہر حال سلطان مد زکوٰۃ سے لے کر اس کا قرض ادا کروا سکتا ہے بلکہ بعض فقہاء نے تو یہ بھی کہا ہے کہ مردہ شخص کا قرض زکوٰۃ سے ادا کیا جانا زندہ شخص کے قرض کے ادا کیے جانے سے زیادہ موزوں ہے، اس لیے کہ زندہ کی بہ نسبت مردہ شخص کے قرض کی ادائیگی کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔[4]

---

[1] المجموع، للنووی: ج ٦ - ص ٢١١ -

[2] المغنی، ج ٢، ص ٦٦٧ -

[3] المجموع، ج ٦، ص ٢١١ -

[4] شرح الخرشی وحاشیۃ العدوی، ج ٢، ص ٢١٨ -

قرطبی کہتے ہیں[1] ہمارے علمائے کہا ہے کہ مردہ مقروض بھی غارمین' میں سے ہے اور اس کا قرض بھی ادا کیا جانا چاہیے اس سلسلے میں ارشاد نبوت ہے کہ

"میں ہر مومن کا خود اس کے اپنے نفس سے زیادہ ولی ہوں۔ اگر کوئی مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے اہل کا ہے اور اگر کوئی شخص قرض اور تنگدست بچے چھوڑ کر مر جائے تو اس کی ذمے داری مجھ پر ہے" (بخاری و مسلم)

یہی فقہ جعفریہ کی رائے ہے[2]

ہماری رائے یہ ہے کہ مردہ شخص کے قرض کی زکوٰۃ سے ادائیگی میں نصوص شریعت اور اس کی اصل روح مانع نہیں ہے، اس لیے کہ مصارف زکوٰۃ کی دو اقسام ہیں ایک قسم وہ ہے جس میں لام تملیک ان کا ملکیتی استحقاق بیان کیا گیا ہے یعنی فقراء، مساکین، عاملین علیہا، اور مؤلفۃ قلوبہم، اور دوسری قسم وہ ہے جس کو فی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یعنی الرقاب، الغارمین، فی سبیل اللہ، اور ابن السبیل۔ مطلب یہ ہوا کہ الغارمین پر بھی فی آیا ہے اور لام تملیک (لِ) نہیں آیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ زکوٰۃ کا غارم کی ملکیت میں آنا شرط نہیں ہے اور اس کی طرف سے ادائیگی درست ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا بھی یہی فتویٰ ہے[3] اور اس کی تائید مذکورہ بالا حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کی مد سے قرض حسنہ کا اجراء

ایک اور مسئلہ کا تعلق اس بحث سے ہے اور وہ یہ کہ کیا زکوٰۃ سے قرض حسنہ دیا جا سکتا ہے اور اس کو غارمین پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ قیاس صحیح اور اسلام کے عام مقاصد اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ ہم زکوٰۃ میں سے غارمین کے حصے سے ضرورتمندوں کو قرض حسنہ دیں اور اس کا باقاعدہ ایک نظام بنا کر اس کا مستقل فنڈ

---

[1] تفسیر القرطبی، ج ۸، ص ۱۸۵۔

[2] فقہ الامام جعفر، ج ۲، ص ۹۱

[3] فتاویٰ ابن تیمیہؒ

قائم کر دیں اور اس طرح زکوٰۃ کو سود کے خاتمہ کا ایک مؤثر ذریعہ بنا دیں۔

یہی رائے ہمارے اساتذہ ابوزہرہ، خلاف اور حسن نے اختیار کی ہے اور اس کی توجیہ انھوں نے اس طرح کی ہے کہ جس طرح منصفانہ قرض زکوٰۃ سے ادا کیے جا سکتے ہیں اسی طرح سود سے خالی قرض حسنہ بھی دیئے جا سکتے ہیں تاکہ انھیں بیت المال کو واپس کر دیا جائے[1]

اور اسی سے مشابہ رائے استنبول اور پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے ایک مقالے "غیر سودی قرض" میں اختیار کی ہے[2] اور قرآن میں غارمین کو مصارف زکوٰۃ میں سے ایک مصرف قرار دیئے جانے کو دلیل بنایا ہے اس لیے کہ مقروض افراد دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔

۱) وہ جو سخت تنگدستی کی بنا پر اور عدم وسائل کی بنا پر مقررہ مدت میں اپنا قرض نہیں ادا کر سکتے۔

۲) جو وقتی ضرورتیں رکھتے ہیں اور وہ کم وقت میں قرض کی ادائیگی کے وسائل رکھتے ہیں[3] ان کے نزدیک اس دوسری صنف کو بھی غارم قرار دینا چاہیے۔ لیکن کیسے؟ کہ ابھی تو اس نے قرض لیا ہی نہیں ہے — اس لیے ہمارے خیال میں ہمارے تینوں فقہاء ابوزہرہ، خلاف اور حسن کی ہی رائے زیادہ موزوں ہے۔

●

---

[1] حلقۃ الدراسات الاجتماعیہ، ص ۲۵۴۔

[2] کویت کے مطبع المنار نے اس مقالے کو اپنی سیریز "اسلامی معاشیات" کے نمبر ۲ کے تحت شائع کیا ہے۔

[3] دیکھیے مقالہ کا صفحہ ۸، ۹۔

چھٹی فصل

فی سبیل اللہ

قرآن کریم نے مصارف زکوٰۃ میں سے ساتویں مصرف کو فی سبیل اللہ (در راہِ خدا) سے تعبیر کیا ہے۔ پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ اس تعبیر کا کیا مقصود ہے اور کون لوگ اس سے مراد ہیں؟

اس لفظ کے لغوی معنی تو واضح ہیں کہ سبیل کے معنی طریق اور راستہ کے ہیں اور سبیل اللہ کے معنی ہیں وہ راستہ جس سے رضائے الٰہی اور اس کی خوشنودی حاصل ہو۔

علامہ ابن اثیرؒ فرماتے ہیں کہ سبیل اللہ کا لفظ عام ہے جو ہر اس عمل کو شامل ہے جس کا مقصود رضائے الٰہی ہو خواہ وہ عمل فرض ہو یا نفل یا مستحب۔ اور مطلقاً اس لفظ کا اطلاق جہاد پر ہوتا ہے اور اس معنی میں یہ لفظ اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ اس کا مفہوم جہاد ہی متصور ہونے لگا ہے۔[1]

ابن اثیرؒ کی اس تشریح سے یہ امور واضح ہو گئے کہ

۱) اس لفظ کے لغوی معنی ہر اس مخلصانہ عمل کے ہیں جو خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے انجام دیا گیا ہو خواہ وہ انفرادی عمل ہو یا اجتماعی۔

۲) اس کے عمومی معنی اور اکثری مفہوم جہاد ہے اور کثرتِ استعمال نے اسے اسی معنی میں منحصر کر دیا ہے۔

اور ان دونوں معانی کے فرق کی بنا پر ہی فقہاء کے مابین اس کے مفہوم کے تعین میں اختلاف ہوا ہے گو اس امر پر اجماع ہے کہ جہاد کے معنی بہر حال فی سبیل اللہ میں موجود ہیں لیکن

---

[1] النهاية : لابن الأثير، ج ۲، ص ۱۵۶۔ ط۔ المطبعة الخيرية۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا جہاد ہی اس کا مفہوم ہے یا اس کے لغوی معنی بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں اور بلکہ اس سے بڑھ کر ہر خیر اور بِرّ کا کام اس میں داخل ہے۔

اس سلسلے میں اب ہم فقہاء کی آراء اور اس لفظ کے شرعی مفہوم کے تعین میں ان کے اختلاف کو بیان کرتے ہیں اور اسی ضمن میں ہم وہ رائے بھی بیان کریں گے جسے ہم ترجیح دیتے ہیں۔

حنفیہ کا مسلک امام ابو یوسفؒ فی سبیل اللہ سے وہ افراد مراد لیتے ہیں جو اپنی تنگدستی کی بنا پر، زادِ راہ ختم ہو جانے کی بنا پر یا سواری کے نہ ہونے کی بنا پر لشکرِ اسلام میں شامل ہو جانے سے عاجز ہوں اور کمانے کی قدرت رکھنے کے باوجود ان کے لیے زکوٰۃ جائز ہو گئی ہو، اس لیے کہ اگر وہ اس وقت کسب میں مصروف ہو جائیں تو جہاد میں شرکت نہیں کر سکیں گے۔

امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ سبیل اللہ سے مراد وہ افراد ہیں جو قافلۂ حج سے کٹ گئے ہوں اس لیے کہ مروی ہے کہ ایک شخص نے اونٹ راہِ خدا میں دیا تو آپؐ نے اس پر حاجی کو سوار کرانے کا حکم دیا اور اس لیے کہ سفرِ حج بھی اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم کی تعمیل ہے اور اس میں نفس کا مجاہدہ بھی ہے اس لیے سفرِ حج فی سبیل اللہ ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد طلبۂ علم ہیں اور یہ قول فتاویٰ ظہیریہ میں درج کیا گیا ہے مگر یہ قول اس لیے بعید ہے کہ جب آیت صدقات نازل ہوئی اس وقت ایسے افراد موجود نہیں تھے جنھیں طلبۂ علم کہا جائے۔ مگر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے طلب علم سے مراد تو احکام شرعی کا علم ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی طالب علم اس مقصد میں صحابہ کرامؓ کے اور اصحاب صُفّہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔

الکاسانی، البدائع میں فرماتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد تمام اطاعت اور تقرب (ثواب) کے اعمال ہیں، اور اللہ کی اطاعت کی سعی کرنے والے محتاج اور نیکیوں کے راستے پر چلنے والے تنگدست اسی زمرہ میں داخل ہیں۔

البحر الرائق میں ابن نجیم تحریر کرتے ہیں کہ بہرحال فقر (تنگدستی) کی شرط لازمی

ہے۔[1]

اس پر صاحب المنار نے اپنی تفسیر[2] میں کہا ہے کہ اس شرط کا یہ مطلب ہوگا کہ فی سبیل اللہ ایک مستقل مصرف کی حیثیت میں باقی نہ رہے کیونکہ تنگدستی کی شرط سے یہ مصرف فقرا اور مساکین کے مصرف میں تبدیل ہو جائے گا۔[3]

اس بیان کا ماحصل یہ ہوا کہ اگرچہ حنفی فقہاء کے مابین فی سبیل اللہ کی مراد کے تعین میں اختلاف ہے لیکن اس امر پر اتفاق ہے کہ فی سبیل اللہ کے مصرف میں احتیاج اور فقر ایک شرط لازم ہے، خواہ وہ غازی ہو یا حاجی ہو یا طالب علم یا خیرات کی سعی کرنے والا یہی وجہ ہے کہ ان کے اس اختلاف رائے کو اختلاف لفظی قرار دیا گیا ہے کہ ماسوا عاملین کے جملہ مصارف پر زکوٰۃ اسی وقت صرف کی جاتی ہے جب وہ حاجتمند ہو۔

ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ فقیر محتاج کا زکوٰۃ میں مقررہ حصہ ہے خواہ وہ فقیر ان اوصاف میں سے اور کسی وصف سے متصف ہو یا نہ ہو۔ اور اس وضاحت سے پھر یہی سوال سامنے آتا

---

[1] الاختیار لتعلیل المختار: ج ۱، ص ۱۱۹۔ البحر الرائق ج ۲، ص ۲۶۰۔ الدر المختار وحاشیۃ رد المحتار، ج ۲، ص ۸۳، ۸۴۔

[2] تفسیر المنار، ج ۱، ص ۵۸۰۔

[3] حنفی فقہائے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ غازی یا حاجی جو راستے میں رہ جائے اگر اس کے وطن میں اس کے پاس مال نہ ہو تو وہ فقیر ہے ورنہ وہ ابن السبیل ہے۔ مگر یہ جواب غیر تشفی بخش ہے۔ اس لیے کہ وہ درحقیقت فقیر ہی ہے البتہ اس میں مطلق فقیر سے ایک وصف زائد ہو گیا کہ وہ عبادت الٰہی میں مصروف ہے۔ (البحر: ج ۲، ص ۲۶۰۔ رد المحتار، ج ۲، ص ۸۴) میں کہتا ہوں کہ یہ غازی یا حاجی فقرا کی صنف سے خارج نہیں ہیں۔ اور آلوسی نے اپنی تفسیر (ج ۳، ص ۳۲۸) میں یہ قول نقل کیا ہے کہ حقیقت وہی ہے جو جصاص نے الاحکام میں ذکر کی ہے کہ جو شخص اپنے گھر میں غنی ہو اور اسے زکوٰۃ جائز نہ ہو، جب وہ سفر جہاد کا عزم کرلے جس میں اسے ہتھیار اور سامان کی ضرورت ہو تو اسے زکوٰۃ سے دیا جائے گا۔

ہے کہ فی سبیل اللہ کو قرآن نے ایک مستقل صنف کیوں قرار دیا ہے اور اس مصرف کی جداگانہ حیثیت اور نوعیت کیا ہے ؟

اسی طرح فقہائے حنفیہ کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کو شخصی ملکیت بنایا جائے اور اسی لیے زکوٰۃ کو تعمیر مسجد میں پل وغیرہ بنانے اور راستوں کے درست کرنے میں اور حج اور جہاد کے کرایوں پر صرف کرنا درست نہیں ہے بلکہ کسی بھی ایسے کام میں صرف کرنا درست نہیں ہے جس میں تملیک (ملکیت) نہ ہو جیسے میت کا کفن اور مردہ شخص کے قرض کی ادائیگی [1]

مالکی مسلک کی رائے

قاضی ابن العربی احکام القرآن میں فی سبیل اللہ کی تفسیر میں امام مالکؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کی متعدد صورتیں ہیں لیکن میرے علم میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہاں پر جہاد مراد ہے اور محمد بن الحکم کہتے ہیں کہ زکوٰۃ گھوڑوں، ہتھیاروں اور آلات حرب پر خرچ کی جائے گی اور دشمن کو اس کے اقدام سے روکنے کے لیے صرف کی جائے گی چنانچہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل بن ابی حثمہ کے واقعہ میں شورش کو فرو کرنے کے لیے زکوٰۃ کے سو اونٹ عطا فرمائے [2]

متن خلیل کی شرح الدردیر میں ہے کہ زکوٰۃ میں سے مجاہد کو ہتھیار اور گھوڑا خریدنے کے لیے دیا جائے گا خواہ مجاہد غنی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ جہاد کے وصف کے ساتھ فقر کا وصف ہونا لازمی نہیں ہے اور زکوٰۃ میں اس جاسوس کو بھی دیا جا سکتا ہے جو دشمن کی خبریں پہنچائے خواہ وہ کافر ہو لیکن کافروں سے بچنے کے لیے زکوٰۃ کی مد سے شہر پناہ کی دیوار بنانا یا مقابلے کے لیے جانے کے لیے سواری بنانا جائز نہیں ہے [3]

الدسوقی اپنے حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ زکوٰۃ سے شہر پناہ کی دیوار کے بنانے اور مقابلہ

---

[1] ردالمختار، ج ۲، ص ۸۵۔

[2] احکام القرآن، ج ۲، ص ۹۵۷۔

[3] خود الدردیر نے اپنی شرح میں شہر پناہ کی دیوار اور کشتیاں زکوٰۃ سے بنائے جانے کو اس صورت میں ناجائز کہا ہے جبکہ وہ برائے جہاد نہ ہوں۔ الشرح الصغیر وحاشیۃ الصادی، ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

کے لیے جانے کے لیے کوئی مرکب بنانے کے عدم جواز کا قول صرف ابن بشیر کا ہے جبکہ اس کے بالمقابل رائے ابن عبدالحکم کی ہے۔ اللخمی نے اس کے علاوہ کوئی رائے تحریر نہیں کی ہے اور اسے التوضیح میں بیان کیا ہے۔ اور ابن عبدالسلام کہتے ہیں کہ یہی صحیح ہے [۱]

غرض مسلک مالکؒ درج ذیل امور پر مشتمل ہے۔

۱) ان کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فی سبیل اللہ جہاد سے متعلق ہے اور وہ سب امور اس میں آتے ہیں جو جہاد سے متعلق ہوں جیسے جہاد کے گھوڑے تیار کرنا وغیرہ، جبکہ فقہائے احناف کے مابین جہاد، حج اور طالب علم اور تمام امور ثواب کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون سے امور فی سبیل اللہ ہیں۔

۲) مسلک مالکؒ کے فقہاء مجاہد اور مرابط کے غنی ہونے کے باوجود اس کو زکوٰۃ میں سے دیئے جانے کے قائل ہیں۔ (بخلاف فقہائے احناف کے) اور ان کی یہ رائے ظاہر قرآن کے مطابق ہے کہ قرآن نے اسے مستقل مَصرف قرار دیا ہے اور فقراء اور مساکین کے مَصرف کو ایک جداگانہ مَصرف بیان کیا ہے۔ اور یہی امر سنّت نبویؐ سے بھی ہم آہنگ ہے کہ سنّت میں مصارف زکوٰۃ کے بیان میں غازی فی سبیل اللہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابن العربی نے حنفیوں کے غازی کے فقر کے ساتھ مشروط کرنے کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نص پر اضافہ ہے جو کہ ان کے نزدیک نسخ ہے اور قرآن کا نسخ قرآن سے یا سنّت متواترہ ہی سے ہوسکتا ہے [۲]

۳) مسلک مالک کے جمہور فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ کو ہتھیاروں، گھوڑوں، شہر پناہوں اور جنگی کشتیوں کے بنانے پر صرف کیا جاسکتا ہے اور ان کے نزدیک بھی فقہائے احناف کی طرح یہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ صرف مجاہدین اشخاص ہی پر صرف کی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں مالکی فقہاء کی رائے قرآن کی تعبیر سے زیادہ قریب ہے

---

[۱] الشرح الکبیر مع حاشیۃ الاسوقی: ج ۱، ص ۴۹۷۔

[۲] احکام القرآن، ج ۲، ص ۹۵۷۔

کیونکہ قرآن میں اس مصرف کا ذکر "فی" کے ساتھ ہوا اور "لام تملیک" کے ساتھ نہیں ہوا ہے کہ اس تعبیر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجاہدین اشخاص پہلے زکوٰۃ جہاد کے مصالح میں صرف ہونی چاہیے۔

شافعیؒ فقہاء کا مسلک

امام نوویؒ کی "المنہاج" اور اس کی ابن حجرؒ کی شرح میں ہے کہ "فی سبیل اللہ" وہ مجاہدین ہیں جو حکومت سے باقاعدہ تنخواہیں نہ ملتی ہوں اور وہ از خود جہاد میں شریک ہوں، کیونکہ اگر ان کو تنخواہیں ملتی ہیں تو وہ اپنے پیشہ اور حرفت میں مصروف ہیں۔ فی سبیل اللہ کا مقصود ہر وہ کار نیک ہے جس سے رضائے الٰہی مقصود ہو، بعد میں یہ مطلق جہاد کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور بعد میں اس سے مقصود وہ مجاہدین ہو گئے جو بلا معاوضہ خدمتِ جہاد انجام دے رہے ہوں کہ یہ مجاہدین دوسرے مجاہدین سے درجہ فضیلت رکھتے ہیں[1] یہ مجاہدین اگرچہ غنی بھی ہوں تو بھی زکوٰۃ کی اس مد سے ان کی اعانت کی جائے گی۔

امام شافعیؒ نے الام میں تصریح کی ہے کہ صدقہ دہندگان کے پڑوسیوں میں سے جو افراد جہاد کریں انھیں فی سبیل اللہ کی مد سے دیا جائے گا، خواہ وہ غنی ہوں یا فقیر اور ان کے سوا اس مد میں سے کسی کو نہیں دیا جائے گا الا یہ کہ جو افراد ان سے مشرکین کا دفاع کریں اور وہ حاجتمند ہوں تو انھیں دیا جائے گا[2]

امام شافعیؒ نے صدقہ دہندگان کے پڑوسیوں (جیران الصدقہ) کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ ان کے نزدیک ایک شہر سے دوسرے شہر زکوٰۃ منتقل کرنا درست نہیں ہے۔

امام نوویؒ الروضۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

غازی کی روانگی، اس کی آمد اور اس کے سرحدی مقام پر قیام کے دوران کے اخراجات زکوٰۃ کی فی سبیل اللہ کی مد سے ادا کیے جائیں گے۔ لیکن اگر سفر کے اخراجات زیادہ ہوں تو کیا

---

[1] تحفۃ المحتاج بشرح المنہاج، ج ۳، ص ۹۶۔ نہایۃ المحتاج، ج ۶، ص ۱۵۵، ۱۵۶۔

[2] الام، ج ۲، ص ۶۰۔ ط۔ بولاق۔

تمام ادا کیے جائیں گے اس بارے میں ہر دو اقوال ہیں اگر مجاہد شاہسوار ہو تو اس کو گھوڑے کی خریداری کے لیے دیا جائے گا اور اسی طرح آلات ضرب و قتال پر صرف کیا جائے گا، اور اسے گھوڑا اور ہتھیار کرائے پر لینے کی بھی اجازت ہوگی اور بہ صورت مال (زکوٰۃ) کی کمی بیشی کے ساتھ مختلف ہو سکتی ہے۔ اور اگر مجاہد پیادہ ہو تو اسے گھوڑے کی خریداری کے لیے رقم نہیں دی جائے گی۔

النووی، المفتاح کی شرح میں کہتے ہیں کہ غازی کو اس کے اخراجات اور اس کی آمد و رفت کے اخراجات اور اس کے گھر والوں کے اخراجات دیئے جائیں گے۔ اگرچہ جمہور فقہاء نے اہلِ خانہ کے اخراجات سے سکوت اختیار کیا ہے، لیکن بہر حال ان اخراجات کا دیا جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اسے سواری اُجرت پر لے دے اور چاہے تو اسے گھوڑا خرید کر دے دے اور اُسے فی سبیل اللہ وقف کر دے کہ وقتِ ضرورت دوسرے مجاہد کو عاریتاً دے دیا جائے اور جب وہ جہاد سے فارغ ہو جائے تو گھوڑا بیت المال کو واپس کر دے[1]

اس مقام پر فقہائے شافعیہ فرماتے ہیں کہ اگر فئے معدوم ہو جائے اور امام (حکومت) کے پاس مُرتزِقہ (تنخواہ پانے والے فوجیوں اور مجاہدین) کے لیے کچھ بھی نہ ہو تو کیا انھیں زکوٰۃ کے فی سبیل اللہ کے حصے سے کچھ دیا جا سکتا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس بارے میں دو اقوال ہیں، اور ظاہر قول یہ ہے کہ انھیں زکوٰۃ میں سے کچھ نہیں دیا جائے گا بلکہ اغنیاء مسلمین پر ان کی اعانت لازم ہوگی[2]

اور اگر اغنیاء (دولتمند) نہ دیں یا ان کے پاس زائد مال نہ ہو اور امام کے پاس اہلِ فئے کے علاوہ نہ ہوں تو کیا وہ اپنی ضرورت کے مطابق زکوٰۃ سے لے سکتے ہیں۔

---

[1] الروضۃ للنووی، ج ۲، ص ۳۲۶، ۳۲۷۔

[2] بحوالہ مذکور، ص ۳۲۱۔

ابن حجرؒ نے شرح المنہاج میں کہا ہے کہ یہ جائز ہے[1]

یہاں پر ہمارے نزدیک قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ

شافعیہ کا مسلک اس مصرف کے جہاد اور مجاہدین ہی پر خرچ کرنے کے بارے میں مالکیہ کے مسلک کے مطابق ہے اور اس امر کے جواز میں بھی ہر دو مسلک ہم آہنگ ہیں کہ مجاہد اگرچہ غنیؔ ہو پھر بھی اسے جہاد میں مدد دی جائے اور اسے ہتھیار اور جنگی سامان فراہم کیا جائے۔

مگر دو امور میں مسلک شافعیؒ حنفی مسلک کے برخلاف ہے۔

۱) ایک یہ کہ ان کے نزدیک زکوٰۃ میں صرف کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مجاہدین رضا کار ہوں اور ان کو پبلک خزانے سے کوئی تنخواہ یا حصہ نہ ملتا ہو۔

۲) اس حصہ پر (فی سبیل اللہ) فقراء اور مساکین کے حصوں سے زیادہ خرچ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک مصارف کے جملہ اقسام میں مساوات ضروری ہے جیساکہ اس باب کی آٹھویں فصل میں بیان ہوگا۔

مسلک حنبلی

مسلک حنبلی میں بھی شافعی مسلک کی طرح فی سبیل اللہ سے مراد رضا کار غازی ہیں جن کو حکومت سے کوئی تنخواہ نہ ملتی ہو یا اگر انھیں کچھ ملتا ہو تو ان کے لیے ناکافی ہو، بایں صورت مجاہد کو برائے جہاد بقدر کفایت دیا جائے گا اگرچہ وہ غنیؔ ہو اور اگر عملاً وہ شریکِ جہاد نہ ہوا تو جو اس نے لیا ہے وہ واپس کرے گا۔ نیز سرحدوں کی نگرانی اور حفاظت بھی ان کے نزدیک جہاد ہے اور اس کو بھی فی سبیل اللہ کی مد سے حصہ ملے گا۔

"غایۃ المنتہی" اور اس کی شرح میں مذکور ہے کہ امام (حکومت) کے لیے یہ بھی درست ہے کہ وہ مجاہد کو زکوٰۃ سے گھوڑا خرید کر دے دے تاکہ وہ اس پر جہاد کر سکے اگرچہ وہ خود صاحبِ نصابِ زکوٰۃ ہو، کیونکہ وہ اپنی زکوٰۃ امام (حکومت) کو دے کر بری ہو چکا ہے۔

---

[1] تحفۃ المحتاج ، ج ۳ ، ص ۹۶۔

نیز اسی طرح امام کے لیے یہ بھی درست ہے کہ وہ مجاہدین کو جہاز اور کشتیاں خرید کر دے کیونکہ یہ بھی بہر حال مجاہد کی ضرورت ہیں اور مسلمانوں کے مفاد میں ہیں اور امام مسلمانوں کے مفاد کے مطابق اور ان کے مصالح کے موافق اقدامات کرنے کا مجاز ہے۔

جبکہ مال کے مالک کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ میں سے گھوڑا خرید کر اسے فی سبیل اللہ کی مد میں مجاہد کو دے دے یا زمین غازیوں (مجاہدین) کے لیے وقف کر دے کیونکہ یہ ابتاء (ادائے زکوٰۃ) مامور بہ نہیں ہے (اس کا حکم نہیں ہے) [1]

مگر حج کے بارے میں امام احمدؒ سے دو روایات مروی ہیں۔

ایک یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کی زکوٰۃ کی مد سے حج ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی فقیر کو زکوٰۃ میں سے دے دے تاکہ وہ اس سے حج کرے یا حج میں اسے امداد ہو جائے کیونکہ ام معقل اسدیہ کی حدیث ہے کہ

«ان کے شوہر نے ایک اونٹ فی سبیل اللہ (زکوٰۃ) علیحدہ کر دیا۔ ان کا ارادہ عمرہ کا تھا اس لیے انھوں نے اپنے شوہر سے اونٹ مانگا مگر انھوں نے انکار کیا، اس پر وہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آئیں اور آپ سے ذکر کیا۔ آپ نے ان کے شوہر کو حکم دیا کہ وہ یہ اونٹ ان کو دے دیں اور فرمایا کہ حج اور عمرہ بھی فی سبیل اللہ ہیں» [2]

یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ اور اسحٰق کا قول بھی اسی کے موافق ہے۔

---

[1] مطالب اولی النہی: ج ۲، ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

[2] اس روایت کو احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے اور یہ ضعیف ہے اس لیے کہ اس کی سند میں ایک متکلم فیہ راوی ہے نیز اس کی سند میں اضطراب بھی ہے۔ ابوداؤد نے اس کو ایک اور روایت سے نقل کیا جس کی سند میں محمد بن اسحاق ہے جو مدلّس ہے اور معنعن ہے۔ نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۸۱۔ ط۔ الحلبی۔

دوسری رائے جمہور کے قول کے مطابق یہ ہے کہ زکوٰۃ میں سے حج پر صرف نہیں کیا جائے گا۔

ابن قدامہ المغنی میں کہتے ہیں یہ کہ یہی صحیح ہے اس لیے کہ مطلق فی سبیل اللہ سے جہاد ہی مراد ہوتا ہے اور سوائے چند مقامات کے قرآن میں بھی جہاد ہی مراد ہے، اس بنا پر آیت (صدقات) میں وارد فی سبیل اللہ سے جہاد ہی مراد ہوگا کہ یہی اس آیت کا ظاہر بھی ہے۔ نیز اس لیے کہ حج کے مصارف کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کو اس کی احتیاج ہو، جیسے فقراء، مساکین، رقاب اور مقروض (غارمین)۔ اور دوسرے وہ جن پر صرف کرنے کی مسلمانوں کو احتیاج ہو، مثلاً عامل، غازی، مؤلف، اصلاح ذات البین کی خاطر مالی بوجھ برداشت کرنے والا۔ جبکہ فقیر کو حج کرانا نہ تو فقیر کی احتیاج ہے کہ اس پر حج فرض نہیں ہے، نہ اس پر حج کی فرضیت میں مصلحت ہے بلکہ یہ ایک بوجھ ہے جس سے اللہ نے رخصت دی ہے اور نہ ہی فقیر کو حج کرانا مسلمانوں کی احتیاج ہے۔ اس لیے اس زکوٰۃ کو اصناف زکوٰۃ میں حاجتمندوں پر صرف کرنا چاہیے یا مسلمانوں کے مصالح میں دینا چاہیے [1]

ابن قدامہ کا یہ بیان بڑا واضح ہے اور اس پر کسی مزید اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔

جس حدیث پر امام احمدؒ کی پہلی رائے کی بنیاد قائم ہے، اس کی سند ضعیف ہے اور اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی مسلک شافعیؒ کے فقہاء نے کہا ہے کہ حج کے سبیل اللہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن آیتِ صدقات میں زکوٰۃ کی جو مد فی سبیل اللہ کے عنوان سے ذکر ہوئی ہے اس کے ذیل میں حج نہیں آتا۔ نیز حدیث "پانچ کے سوا زکوٰۃ حلال نہیں ہے" میں غازی فی سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے جس سے آیتِ صدقات کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ نیز زیرِ بحث حدیث میں اونٹ کو فی سبیل اللہ صدقہ قرار دیا گیا جیسا کہ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان کے شوہر نے اُس اُونٹ کے اللہ کی راہ کے لیے ہونے کی وصیت کی [2] اور ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اُس شخص کے لیے جو اس پر حج کرے؛ اور اگر یہ فرض کر لیں کہ

---

[1] ابن قدامہ: المغنی، ج ۶، ص ۴۷۰، ۴۷۱۔

وہ زکوٰۃ ہی کا اونٹ تھا تو یہ احتمال ہے کہ جس کو یہ اونٹ دیا تھا وہ خود فقیر ہو اور اس سے انتفاع کا مستحق ہو، یا اس نے اسے بغیر مالک بنائے سوار کرایا ہو۔[1]

اس مصرف کے بارے میں چاروں مسالک کے متفقہ امور | گزشتہ بیان

سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ چاروں مسالک درج ذیل تین امور پر متفق ہیں۔

۱) جہاد قطعی طور پر فی سبیل اللہ کی زکوٰۃ کی مد میں شامل ہے۔

۲) زکوٰۃ مجاہدین پر صرف کرنا جائز ہے۔ جبکہ سامان جہاد اور مصالح جہاد پر صرف کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔

۳) زکوٰۃ کو دیگر رفاہی اور اصلاح عامہ PUBLIC WELFARE میں صرف کرنا جائز نہیں ہے مثلاً پلوں اور بندوں کی تعمیر مساجد اور مدارس کی تشکیل، راستوں کی درستگی اور لاوارث) مردوں کی تکفین وغیرہ۔ بلکہ ان امور کو فئے اور خراج جیسے بیت المال کے دیگر آمدنی کے ذرائع سے پورا کیا جائے گا۔

اور ان مصارف میں زکوٰۃ کو خرچ کرنا اس لیے جائز نہیں ہے کہ اس میں بقول حنفیہ تملیک نہیں ہوتی یا بقول دیگر فقہا یہ مدات آٹھ مصارف زکوٰۃ میں شامل نہیں ہیں۔

البدائع میں جو یہ کہا گیا ہے کہ (زکوٰۃ) تمام طاعتوں اور عبادتوں میں صرف ہو سکتی ہے تو وہاں انھوں نے ایک شخص کی تملیک کی شرط لگائی ہے، اس لیے اسے کسی عام ادارہ کو نہیں دیا جا سکتا، نیز انھوں نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ یہ لینے والا شخص فقیر ہو۔ اس لحاظ سے یہ رائے بھی اسی پر دلالت کرتی ہے جس پر سبیل اللہ کے مفہوم کو محدود کرنے والوں کی رائے دلالت کرتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اپنی اس رائے میں منفرد ہیں کہ انھوں نے مجاہد کے لیے فقر کی شرط عائد کی ہے۔ جیسا کہ امام احمدؒ اپنی اس رائے میں منفرد ہیں کہ انھوں نے حج اور عمرہ پر زکوٰۃ کے

---

[1] تحفۃ المحتاج، ج ۳، ص ۹۶۔

صرف کو جائز کہا ہے۔

بہرحال شافعی اور حنبلی مسلک کے فقہاء اس امر پر متفق ہیں زکوٰۃ لینے والے مجاہدین رضاکار ہوں اور باقاعدہ فوجی نہ ہوں اور ان کے نام (تنخواہوں کے لیے) حکومت کے رجسٹر میں درج نہ ہوں۔

نیز فقہائے احناف کے علاوہ جملہ فقہاء اس امر پر بھی متفق ہیں کہ زکوٰۃ کو فی الجملہ مصالح جہاد پر صرف کرنا بھی درست ہے۔

سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت اختیار کرنے والے فقہاء

قدیم وجدید فقہاء میں سے بعض نے سبیل اللہ کے مفہوم کو جہاد تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان کے نزدیک تمام امورِ خیر، جملہ بھلائی کے کام اور عبادت اور حصولِ تقرب کے اعمال بھی سبیل اللہ میں داخل ہیں کہ لفظ کا لغوی مفہوم یہی ہے۔

قفال کی رائے

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کا ظاہری لفظ غازیوں کے لیے محدود نہیں ہے۔ اس لیے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء سے نقل کیا ہے کہ صدقات (زکوٰۃ) کا تمام خیر کے کاموں میں صرف کرنا جائز ہے بلکہ اسے مردوں کی تکفین، حفاظتی قلعے بنانے اور تعمیرِ مساجد میں صرف کرنا بھی درست ہے اس لیے کہ فی سبیل اللہ ان تمام کے لیے عام ہے[1]

لیکن قفال نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ فقہاء کون ہیں حالانکہ محققین کے نزدیک فقیہ مجتہد کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر رازیؒ نے بھی اس پر کوئی گرفت نہیں کی جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید امام رازیؒ بھی اسی جانب جھکاؤ اور میلان رکھتے ہیں۔

حضرت انس اور حضرت حسن بصری کی جانب اس رائے کا انتساب

ابن قدامہ نے المغنی

---

[1] تفسیر الرازی: ج ۱۶/ ص ۱۱۳۔

ہیں اس رائے کو انس بن مالک اور حسن بصری کی طرف منسوب کیا ہے اور ان کا یہ قول کیا ہے کہ
"جو زکوٰۃ قلعوں پر اور راستوں پر صرف کی (دی جائے) جائے وہ زکوٰۃ درست ہے"[1]
اس عبارت کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ ان امور پر صرف کی جانے والی زکوٰۃ جائز ہے لیکن ابو عبید نے اس کا ایک اور مفہوم بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنی زکوٰۃ لے کر عاشر کے پاس سے گزرے اور اس سے عاشر یہ زکوٰۃ لے لے۔ جو کہ ولی امر (حکومت) کی جانب سے مقرر ہوں اور پلوں اور راستوں پر متعین ہوں تاکہ وہ اہل حرب مستامن سے اور ذمی تاجروں سے اور مسلمانوں سے عائد شدہ تجارتی ٹیکس وصول کریں، جیسا کہ آج کل کی چنگی ہوتی ہے کہ وہ بالعموم گزرگاہوں کے ناکوں پر بنائی جاتی ہے۔
ابو عبید نے تابعین وغیرہ کے بھی اقوال نقل کیے ہیں۔ مثلاً ابراہیم، شعبی، ابو جعفر الباقر۔ ان اقوال سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے یعنی عاشر جو لے اس کا زکوٰۃ میں شمار کر لینا۔ جبکہ حسن سے صراحتاً یہ قول منقول ہے مگر میمون بن مہران کی رائے اس کے برخلاف ہے کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ علیحدہ دیتے تھے اور عاشر کے لیے ہوئے کو زکوٰۃ میں شمار نہیں کرتے تھے۔ لیکن ابو عبید کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک انس، حسن، ابراہیم، شعبی اور محمد بن علی ہی کی رائے درست ہے اور یہی لوگوں میں مقبول ہے۔[2]
ابو عبید کی طرح ابن ابی شیبہ نے بھی "باب من قال یحتسب بما اخذ العاشر" میں ان دونوں کی رائے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رائے کا ابن قدامہ کا انس اور حسن کی طرف منسوب کرنا ثابت نہیں ہے۔[3]

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۱۶۷۔ (عبارت کے الفاظ یہ ہیں: "ما اعطیت فی الجسور والطرق فھی صدقۃ ماضیۃ"۔)

[2] الاموال، ص ۵۷۳/ ۵۷۵۔

[3] المصنف، ج ۳، ط حیدرآباد۔ ص ۱۶۶۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "ما اخذ منك علی الجسور والقناطر فتلك زکوٰۃ قاضیۃ"۔

امامیہ جعفریہ کی رائے

مسلک امامیہ جعفریہ کی کتب میں سے "المختصر النافع" میں ہے کہ

"ہر تقرب اور مصلحت کا کام مثلاً حج جہاد اور پلوں کا بنانا فی سبیل اللہ ہے، مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ فی سبیل اللہ کی مدصرف جہاد کے ساتھ مختص ہے" [1]

"جواہر الکلام فی شرح شرائع الاسلام" میں ہے جو کہ فقہ جعفریہ کی موسوعہ (انسائیکلوپیڈیا) ہے کہ تمام مصالح پر مشتمل امور مثلاً پلوں کی تعمیر، حج اور تمام امور خیر میں صرف کرنا فی سبیل اللہ ہے اور یہی عام متاخرین کی رائے ہے اور اس کی تائید خود ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے اس لیے کہ "سبیل" کے معنی تو راستے کے ہیں اور جب سبیل کے لفظ کی اضافت اللہ کی جانب ہوگی تو اس کا مفہوم یہی ہوگا کہ ہر وہ کام جو رضائے الٰہی اور حصول ثواب کے لیے ہو۔ اور حصول ثواب کے لیے ہو۔ اور اس میں جہاد بھی شامل ہے [2]

فقہائے زیدیہ کی رائے

زیدیہ مسلک کی کتاب "الروض النضیر" جس میں امام زید کے اقوال کی شرح کی گئی ہے، بیان کیا گیا ہے کہ مردے کے کفن اور مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ صرف نہیں کی جائے گی۔ اور جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک عموم کے ساتھ تمام امور خیر فی سبیل میں داخل ہیں اگرچہ جہاد کے مفہوم میں اس کا استعمال زیادہ ہوگیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اوائل اسلام میں جہاد زیادہ درپیش تھا لیکن اس کے ساتھ دوسرے امور خیر کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا تھا اور حقیقت عرفیہ کے لحاظ سے اب تک اپنی پہلی وضع پر باقی ہے اور اس میں تقرب کی تمام انواع داخل ہیں کہ مصالح عامہ اور خاصہ کا اقتضا بھی یہی ہے تاآنکہ کسی دلیل کی بنا پر اس کی تخصیص ہو۔

---

[1] المختصر النافع، ص ۵۹، دار الکتاب العربی۔ القاہرہ۔

[2] جواہر الکلام، ج ۲، ص ۷۹۔ المحلی: شرائع الاسلام، ج ۱، ص ۸۷۔ فقہ الامام جعفر ج ۲، ص ۹۲۔

اور یہ البحر کی عبارت ہے جب تک کوئی دلیل تخصیص موجود نہ ہو فی سبیل اللہ اپنے عموم پر مشتمل ہے[1]

غرض "البحر" اور "الروض" کے مصنفین کے نزدیک سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت راجح ہے۔

شرح الازہار میں ہے کہ اس صنف میں یہ بھی جائز ہے کہ زکوٰۃ کا بقیہ عام مصالح مسلمین پر صرف کیا جائے، امام الھادی نے بھی تصریح کی ہے اور ابوطالب نے کہا ہے کہ فقراء کے غناء کے باوجود بھی ان مصالح میں صرف کیا جانا چاہیے کہ اگر فقیر محتاج موجود ہو تو وہ زکوٰۃ کا زیادہ حقدار ہے۔ بعض کے نزدیک یہ شرط درجۂ استحباب میں ہے ورنہ اگر فقراء کی موجودگی کے باوجود (مصالح پر) صرف کی جائے تو بھی جائز ہے۔

حواشی الازھار میں البحر سے نقل کیا گیا ہے۔ کہ مصالح پر صرف کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ سبیل اللہ کی مد سے زکوٰۃ بچ گئی ہو بلکہ آٹھواں مصارف میں سے بچی ہوئی رقم مصالح پر صرف ہو سکتی ہے جیسا کہ اَموالِ مَصالح WELFARE FUNDS سے فقراء پر صرف کیا جا سکتا ہے[2]

الروضۃ الندیہ کے مصنّف کی رائے

مسلک اہلِ حدیث کے فقیہ نواب صدیق حسن خان اپنی تصنیف الروضۃ الندیہ میں لکھتے ہیں کہ سبیل اللہ سے مراد رضائے الٰہی کے لیے اختیار کیا جانے والا راستہ ہے، جہاد بھی رضائے الٰہی کا سب سے عظیم طریقہ ہے لیکن اس تخصیص کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے فی سبیل اللہ کے مصرف سے صرف جہاد مراد ہے۔ بلکہ اس حصۂ زکوٰۃ کو کسی بھی رضائے الٰہی کے کام پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ یہی آیت میں وارد فی سبیل اللہ کے لغوی معنی ہیں اور جب تک از روئے شرع کسی اور مفہوم کے بارے میں نقلی دلیل موجود نہ ہو لفظ اپنے

---

[1] الروض النضیر، ج ۲، ص ۲۸۴، البحر، ج ۲، ص ۱۸۲۔

[2] شرح الازھار، و حواشیہ ص ۱۱۵، ۱۱۶۔

لغوی معنی ہی پر برقرار رہتا ہے بلکہ ان علماء پر صرف کرنا جو مسلمانوں کی دینی خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہوں فی سبیل اللہ ہے کیونکہ ان کا بھی اللہ کے مال میں حصہ ہے خواہ وہ اغنیاء ہوں خواہ فقراء۔ بلکہ ان پر صرف کرنا زیادہ اہم ہے کہ علماء ورثۃ الانبیاء ہیں اور حاملین دین ہیں اور انہی کے ذریعے اللہ سبحانہٗ دین کی اور شریعت کی حفاظت فرماتا ہے[1]

جدید علماء کی آراء: القاسمی کی رائے

شیخ جمال الدین قاسمی اپنی تفسیر میں رازیؒ کا قول درج کرتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کا لفظ مجاہدین اور غازیوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ اس کے بعد انھوں نے قفال کی رائے نقل کی ہے، اور التاج کے مصنف کا یہ قول کیا ہے کہ ہر وہ کام جس سے خدا کی رضا مقصود ہو فی سبیل اللہ میں داخل ہے[2]

ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد قاسمی نے ان پر سکوت اختیار کیا ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ وہ ان اقوال سے متفق ہیں۔

رشید رضا اور شلتوت کی آراء

تفسیر المنار کے مصنف سید رشید رضا آیت صدقات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

درست یہی ہے کہ فی سبیل اللہ سے یہاں مسلمانوں کے مصالح عامہ ہی مراد ہیں جن سے دین و ریاست کے معاملات استوار ہوں اور افراد مراد نہیں ہیں چنانچہ افراد کا حج بھی فی سبیل اللہ نہیں ہے، اس لیے کہ حج صاحبِ استطاعت ہی پر فرض ہے، نیز یہ کہ حج فرض عین ہے جس طرح کہ نماز اور روزہ ہے اور مصالح دینیہ سے نہیں ہے۔ جبکہ حج کا قائم کرنا شعائر اسلام میں سے ہے اس لیے فی سبیل اللہ کی مد کی زکوٰۃ کو حج کے راستے کو پرامن بنانے، حج کے دنوں میں پانی اور غذا کی فراہمی کا بندوبست کرنے اور حاجیوں کی کی صحت کا انتظام کرنے پر صرف کی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کا کوئی اور

---

[1] الروضۃ الندیہ، ج ۱، ص ۲۰۶، ۲۰۷۔

[2] محاسن التاویل، ج ۷، ص ۳۱۸۱۔

مصرف نہ ہو[1]

اس کے بعد سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ[2] فی سبیل اللہ کی مد ان تمام عام شرعی مصالح پر مشتمل ہے جو ریاست اور دین کا جزو اہم ہوں۔ ان میں سے سب سے اول جنگی صلاحیت فراہم کرنا، اسلحہ خریدنا، لشکر کی غذائی ضرورت پوری کرنا، غازیوں کو مسلح کرنا اور نقل و حمل کے اسباب فراہم کرنا شامل ہے (ظاہر ہے کہ یہاں اسلامی جنگ اور وہ اسلامی لشکر مراد ہے جو صرف اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جنگ کر رہا ہو) اسی طرح کی رائے پہلے محمد بن الحکم کی گزر چکی ہے۔ غازی کو مسلح کرنے کی ایک شرط یہ ہے کہ غازی جنگ سے واپس آکر ہتھیار اور گھوڑا بیت المال میں جمع کرا دے اس لیے کہ یہ اشیاء اس کی دائمی ملکیت نہیں بنی ہیں بلکہ صرف اسے راہِ خدا میں استعمال کے لیے دی گئی ہیں۔

فی سبیل اللہ کے عموم میں فوجی ہسپتال اور عام فلاحی ہسپتال کا قیام، شاہراہیں بنانا، فوج کی نقل و حرکت کے لیے ریلوے لائن بنانا، سنگین مورچہ تعمیر کرنا، فوجی مقاصد کے ہوائی اڈے، خندقیں اور دمدمے بنانا بھی داخل ہیں۔

ہمارے دور میں تو فی سبیل اللہ کی ایک اہم مد دعوتِ اسلام کے لیے افراد کار تیار کرنا بھی ہے تاکہ منظم جمعیتیں انھیں بلاد کفار میں بھیجیں اور وہ وہاں جا کر تبلیغ اسلام کریں اور اس عظیم مصلحت ملی کی تفصیل ہم وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں[3]

شیخ محمود شلتوت نے بھی فی سبیل اللہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس سے مراد وہ عام مصالح ہیں جو کسی ایک فرد کی ملکیت نہ ہوں اور کوئی ایک شخص ان سے منتفع نہ ہوتا ہو، بلکہ وہ اللہ کی ملک ہو اور اس کی منفعت تمام مخلوق میں مشترک ہو۔ ان مصالح میں اولین

۱۔ تفسیر المنار، ج ۱۰، ص ۵۸۵۔

۲۔ ایضاً۔ ص ۵۸۷۔

۳۔ آل عمران: ۱۰۴۔

مصلحت جنگی استعداد ہے تاکہ امت کو داخلی بغاوت سے اور خارجی حملے سے محفوظ رکھا جاسکے اور قومی وقار بحال رہے۔ نیز یہ مد جدید ترین جنگی ساز وسامان کو بھی مشتمل ہے، اس میں فوجی اور عام ہسپتال بھی آتے ہیں، راستے بنانا اور ریلوے لائن بچھانا بھی اس میں شامل ہے جو اسلام کے جمال اور وقار کو روشن کریں، اس کی حکمت بیان کریں، اس کے احکام بیان کریں اور دشمنانِ اسلام کے حملوں کا دفاع کریں۔

اور اسی طرح اس فی سبیل اللہ کی مد میں ایسے وسائل اختیار کرنا بھی شامل ہے جس سے حفظ قرآن کا سلسلہ تاقیام قیامت جاری رہے[۱]

بہرحال شیخ شلتوت کی یہ رائے بھی مذکورہ بالا سید رشید رضا کی رائے کی مؤید ہے۔

اسی اساس پر انھوں نے تعمیر مساجد پر زکوٰۃ کے صرف کرنے کے بارے میں یہ جواب دیا۔ کہ

اگر کسی بستی میں پہلی مسجد تعمیر کی جارہی ہو، یا مسجد موجود ہو اور اس میں گنجائش کم ہو اور بستی کے لوگوں کو ایک اور مسجد کی ضرورت ہو تو از روئے شریعت تعمیر اور اصلاحِ مسجد پر زکوٰۃ کا صرف کرنا درست ہے اور یہ فی سبیل اللہ کی مد میں شمار ہوگی۔

کیونکہ فی سبیل اللہ کا مقصود مصالح عامہ ہیں جن سے تمام مسلمان مستفید ہوتے ہوں، اس لیے یہ مد مساجد، شفاخانوں، تعلیم گاہوں، لوہے کے کارخانوں وغیرہ کو شامل ہے یعنی جن کاموں کی افادیت اجتماعی ہو۔ یہ بتانا بہتر ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے درمیان اختلافی ہے۔ (اس کے بعد شیخ نے رازی کا نقل کردہ قفال کا قول نقل کیا ہے کہ صدقات کو تمام امور خیر میں صرف کیا جاسکتا ہے) اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں اپنی اس رائے پر مطمئن ہوں اور یہی فتویٰ دیتا ہوں لیکن شرط یہی ہے جو مساجد کے بارے میں بیان ہوئی ہے کہ اس کی ضرورت ایسی ہو کہ اس کے بغیر گزارہ نہ ہو ورنہ تو مسجد کے علاوہ امور پر صرف کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہوگا[۲]

---

[۱] الاسلام عقیدہ و شریعۃ، ص ۹۷، ۹۸۔

[۲] الفتاوی شلتوت: ۲۱۹۔

مخلوف کا فتویٰ مفتی مصر شیخ حسنین مخلوف سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ کیا اسلامی فلاحی تنظیموں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟ تو انھوں نے جواز کا فتویٰ دیا اور فی سبیل اللہ کے مفہوم کے ضمن میں رازی اور قفال کے اقوال نقل کیے۔[1]

موازنہ اور ترجیح ہم نے اوپر مسالک اربعہ کی وہ آراء نقل کر دی ہیں جن میں سے بیشتر اس امر کی حامل ہیں کہ فی سبیل اللہ سے صرف جہاد مراد ہے نیز ہم نے قدیم فقہاء اور جدید علماء کی وہ آراء بھی درج کر دی ہیں جن کی رو سے فی سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت ہے اور یہ لفظ علاوہ جہاد کے دیگر امورِ خیر پر بھی مشتمل ہے۔

اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں آراء میں سے کون سی درست اور حق ہے۔

جن حضرات نے توسع اختیار کیا ہے ان کی دلیل واضح ہے کہ لفظ کا اصلی اور وضعی مفہوم جملہ امورِ خیر پر مشتمل ہے اور اس لیے اسے مساجد، مدارس اور ہسپتالوں کی تعمیر اور تمام امورِ خیر میں صرف کیا جا سکتا ہے۔

جبکہ مسالک اربعہ کے جمہور فقہاء کا اعتماد ان دو دلائل پر ہے۔

۱) پہلی دلیل جس پر فقہائے احناف نے اپنے استدلال کی بنا رکھی ہے یہ ہے کہ زکوٰۃ کا ایک رکن تملیک (کسی کی ملکیت میں آنا) ہے جو کہ امورِ خیر میں موجود نہیں ہے کہ ان میں کسی کی ملکیت نہیں ہوتی اور تملیک کے رکن ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے زکوٰۃ کو صدقہ فرمایا ہے اور صدقہ کی حقیقت یہ ہے کہ مال کا کسی فقیر کو مالک بنا دیا جائے۔[2]

۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ مساجد، مدارس اور پانی پینے کی جگہیں بنانے جیسے امورِ خیر ان آٹھ مصارف میں نہیں آتے جو آیت صدقات میں بیان کیے گئے ہیں۔ اور اس آیت کا آغاز اِنَّمَا سے ہو رہا ہے جو حصر (تحدید) اور اثبات کے لیے آتا ہے اس لیے جو مصارف آیت میں مذکور ہوئے وہ تو ثابت ہو گئے اور اس

---

[1] فتاویٰ شرعیہ - للشیخ مخلوف ج ۲-

[2] فتح القدیر، ج ۲، ص ۲۰-

کے سوا کالعدم قرار پائے۔ نیز الفاظ حدیث بھی ہیں کہ اللہ نے زکوٰۃ کو آٹھ حصوں میں تقسیم فرما دیا ہے۔ اور اسی پر ابن قدامہ نے المغنی میں اعتماد کیا ہے[1]

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں پہلی دلیل قابل غور ہے کیونکہ قرآن نے جن مصارف کو فی کے ساتھ بیان کیا ہے ان میں تملیک شرط نہیں ہے چنانچہ فقہا نے زکوٰۃ سے غلام کے آزاد کرانے اور مردے کا قرضہ ادا کرنے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ اس میں تملیک نہیں ہے نیز یہ کہ ولی امر (حکومت) کو دے دینے سے تملیک تو ہو گئی کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مالک خود ہی فقیر کے ہاتھ میں دے بلکہ امام (حکومت) یا اس کا نائب زکوٰۃ لے کر اسے ان امور میں صرف کر سکتا ہے۔

دوسری دلیل جو اس امر پر قائم ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہیں، تو یہ بھی توسّع اختیار کرنے والے فقہاء کے رد میں کافی نہیں ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک مساجد وغیرہ کی تعمیر فی سبیل اللہ کے مصرف میں داخل ہے اور اِنّما میں سے اللہ سبحانہ نے جن آٹھ مصارف کی تحدید کی ہے ان سے خارج نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رائے کے قائلین کی صحیح تردید یہی ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ فی سبیل اللہ سے صرف غازی ہی مراد ہیں جیسا کہ جمہور فقہاء کی رائے ہے اور یہ کہ یہ عام امور خیر پر مشتمل نہیں ہے جیسا کہ لفظ کا عموم دلالت کرتا ہے۔

اور اس لفظ — فی سبیل اللہ — کے اصل مفہوم کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ جائزہ لیں کہ قرآن میں یہ لفظ کن کن مقامات پر وارد ہوا ہے کہ قرآن کی بہترین تفسیر وہی ہے جو خود قرآن سے کی جائے۔

قرآن کریم میں وسبیل اللہ کا لفظ

قرآن کریم میں سبیل اللہ کا لفظ ساٹھ سے زائد مرتبہ آیا ہے[2] اور دو طرح آیا ہے۔

۱) کسی مقام پر 'فی' کے ساتھ آیا ہے جیسے اسی آیت صدقات میں فی سبیل اللہ آیا ہے اور

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۷۰۔

[2] المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم۔

کہیں عَنْ کے ساتھ آیا ہے جو کہ تئیس ۲۳ مقامات پر آیا ہے۔

جہاں عَنْ کے ساتھ آیا ہے وہاں یا تو صَدَّ کے فعل کے ساتھ آیا ہے جیسے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا (النساء : ۱۶۷)

جو لوگ اس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو خُدا کے راستے سے روکتے ہیں وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دُور نکل گئے ہیں۔

نیز

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانفال : ۳۶)

جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں۔

یا ضلال کے فعل کے ساتھ آیا ہے، مثلاً

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (لقمان : ۶)

اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دے۔

۲) "فی" کے ساتھ سبیل اللہ قرآن میں زیادہ آیا ہے اور اس صورت میں یا تو انفاق کے فعل کے بعد آیا ہے۔ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یا ہجرت کے بعد آیا ہے وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یا جہاد کے بعد آیا ہے وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یا قتال اور قتل کے بعد آیا ہے يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ اور وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ یا مخمصہ یا ضرب وغیرہ الفاظ کے بعد آیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن میں سبیل اللہ کے لفظ سے کیا مراد ہے؟

لغت میں سبیل کے معنی طریق (راستہ) کے ہیں، ظاہر ہے کہ سبیل اللہ سے وہ راستہ مراد ہوگا جو رضائے الٰہی اور ثوابِ اخروی تک پہنچانے والا ہو کہ اللہ سبحانہٗ نے اپنے انبیاء کو اسی لیے مبعوث فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کی اس راستہ کی جانب راہنمائی کریں اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ حکم دیا گیا کہ آپ لوگوں کو اللہ کے راستے کی جانب بلائیں۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

(النحل : ۱۲۵)

اے نبیؐ، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔

بلکہ یہ اعلان عام بھی فرما دیں۔

هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (یوسف : ۱۰۸)

میرا راستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

اس راہ کے برعکس ایک اور راہ ہے جسے قرآن نے سبیل الطاغوت کہا ہے اور جس کی جانب ابلیس اور اس کا لشکر دعوت دیتا ہے اور اس راہ پر چلنے والا اللہ کی ناراضگی کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان دونوں راستوں کا فرق ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ (النساء : ۷۶)

جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

سبیل اللہ کی جانب بلانے والے کم ہوتے ہیں اور اس راہِ حق کے دشمن اور اس سے روکنے والے بکثرت ہوتے ہیں۔

يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (الانفال: ۳۶)

وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (لقمان : ۶)

اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دے۔

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ( )

ہوائے نفس راہ حق پر چلنے سے روکتی ہے کہ حق کے راستے کی مشقتیں نفس کی خواہشات کے برخلاف ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (ص ۲۶)

کیونکہ دشمنان خدا اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے جدوجہد بھی کرتے ہیں اور مال بھی خرچ کرتے ہیں، اس لیے مؤمنین انصار اللہ کا یہ فریضہ ہوا کہ وہ راہِ حق کے فروغ کے لیے کوششیں کریں اور اس کے لیے اپنا مال صرف کریں اور یہی اسلام نے فرض قرار دیا ہے اور زکوٰۃ کا ایک حصہ فی سبیل اللہ کے اس اہم مصرف کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور مسلمانوں کو بالعموم اپنے مال میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے پر آمادہ کیا اور بتاکید حکم دیا۔

انفاق کے ساتھ سبیل اللہ کا مفہوم

انفاق کے ساتھ سبیل اللہ کا لفظ دو معنی میں آیا ہے۔

۱) ایک تو لفظ کے حقیقی معنی میں آیا ہے اور تمام انواعِ برّ، طاعات اور سبل خیر کو عام ہے، مثلاً یہ فرمان الٰہی:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ

حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ (البقرہ : ۲۶۱)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اسی طرح اللہ جس عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔

نیز یہ فرمان الٰہی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ : ۲۶۲)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے نہ دکھ دیتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔

ان آیات سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ فی سبیل اللہ کا لفظ قتال اور اس سے متعلقہ امور کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ان آیات میں منّ (احسان) اور اذی (ایذا رسانی) کا ذکر بھی آیا ہے جو کہ ظاہر ہے تنگدست اور صاحب حاجت لوگوں پر خرچ کرنے کی صورت ہی میں ہوگا۔ اور اسی طرح یہ فرمان الٰہی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (التوبہ : ۳۴)

دردناک سزا کی خوش خبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

اس آیت میں بھی سبیل اللہ کا عام مفہوم مراد ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے ارشاد فرمایا اور جنگ مقصود نہیں ہے[۱] ورنہ فقرا، مساکین، یتیموں اور مسافروں پر خرچ کرنے والا

---

[۱] فتح الباری، ج ۳، ص ۱۷۲۔

بھی ان کافروں کے زمرے میں داخل ہوجائے گا جنھیں عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

بعض معاصرین کی رائے یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کا لفظ انفاق کے ساتھ لازمی طور پر جہاد ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کسی اور معنی کا اس میں احتمال نہیں ہے[1]

لیکن یہ رائے فی سبیل اللہ کے قرآن میں استعمال کے مکمل مطالعے پر مبنی نہیں ہے کیونکہ سورۂ بقرہ کی دونوں مذکورہ بالا آیات اس کے خلاف ہیں۔

۲) دوسرا مفہوم اللہ کے دین کی نصرت، اس کے دشمنوں سے جنگ اور روئے زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے سے متعلق ہے تاکہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہی ہوجائے، سیاق کلام سے اس معنی خاص میں اور معنی عام میں امتیاز ہوجائے اور یہ مفہوم قتال اور جہاد کے الفاظ کے بعد آتا ہے مثلاً

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ

اور جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ

اسی طرح سورۂ بقرہ میں آیات قتال کے بعد آیا ہے۔

وَاَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوا اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ : ۱۹۵)

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔

بلا شبہ یہاں پر انفاق نصرت اسلام اور اسلام کے خلاف لڑنے والے دشمنوں پر اللہ کا کلمہ غالب کرنے اور اللہ کے دین سے روکنے والوں کو اس امر سے باز رکھنے کے معنی میں ہے۔

اسی طرح سورۂ حدید میں آیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ

---

[1] النظام الاقتصادی فی الاسلام، تقی الدین النبہانی، ص ۲۰۸ - ط- ثالثہ۔

وَالْاَرْضِ لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (الحدید : ۱۰)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے، ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے، اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔

سیاق کلام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں پر انفاق کا وہی مفہوم ہے جو گزشتہ آیت میں تھا۔

سورۂ انفال میں فرمایا جاتا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

(الانفال : ٦٠)

اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیّا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے، اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمھاری طرف پلٹایا جائے گا۔ اور تمھارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

یہ مقام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد دشمنان خدا سے جنگ کرنا ہے اور اللہ کے دین کو کامیاب بنانا ہے جیسا کہ یہ حدیث صحیح بھی اس امر پر دلالت

کرتی ہے۔

"جس نے اس لیے جہاد کیا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو یہی فی سبیل اللہ ہے۔"

(بخاری و مسلم)

اسی خاص مفہوم کو جہاد اور غزوہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور "نصرت اسلام" کی تعبیر زیادہ موزوں ہے، ورنہ تُجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ "جہاد میں جہاد کرو۔"

مصارف زکوٰۃ والی آیت میں فی سبیل اللہ کا استعمال

انفاق کے ساتھ سبیل اللہ کے دو مفہوم ہیں عام اور خاص — اور ان دونوں مفاہیم کے لحاظ سے دیکھنا یہ ہے کہ مصارف زکوٰۃ والی آیت میں فی سبیل اللہ کا کیا مفہوم ہے کیونکہ اگرچہ وہاں انفاق کا لفظ نہیں آیا لیکن بہر حال ملحوظ ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ یہاں پر سبیل اللہ کا عام مفہوم مراد نہیں ہے اس لیے کہ یہ عموم متعدد جہات پر مشتمل ہے جن کی تمام اصناف اور اشخاص کا حصر نہیں ہو سکتا جو کہ آٹھ مصارفِ زکوٰۃ کے تعین کے برخلاف ہے، جیسا کہ ظاہر آیت اس جانب اشارہ کرتی ہے اور جیسا کہ حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ کہ

"اللہ سبحانہٗ کسی نبی یا کسی شخص کے فیصلہ دربارۂ صدقات پر راضی نہیں ہوا اور خود اسے آٹھ حصوں میں تقسیم فرمایا۔"

جیسا کہ فی سبیل اللہ اپنے عمومی مفہوم کے لحاظ سے فقراء اور مساکین کو اور باقی سات اصناف کو شامل ہے کیونکہ یہ تمام ہی بِر (نیکی) اور اطاعت کے کام ہیں — تو اس مصرف میں اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کے مصرف میں کیا فرق ہے؟

کلام اللہ جو انتہائی بلیغ بے حد جامع اور بلا فائدہ تکرار سے پاک ہے اس میں اس کے کوئی خاص اور جداگانہ معنی ہونے چاہئیں جو اُسے دیگر تمام مصارف سے ممتاز کر دے۔

اور فقہاء اور مفسرین قدیم زمانے سے اس کا مفہوم جہاد لیتے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس

لفظ کے اطلاق کے وقت اس کا یہی مفہوم ہوتا ہے۔ اور اسی لیے ابن الاثیرؒ نے کہا ہے کہ گویا کثرتِ استعمال سے یہ اس مفہوم پر مقتصر ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسا کہ ہم اس فصل کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں۔

طبرانی کے اس قول سے بھی ابن الاثیرؒ کی تائید ہوتی ہے کہ انھوں نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ صحابۂ کرام رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ تھے کہ انھوں نے ایک توانا اور تندرست نوجوان کو دیکھا اور کہنے لگے کہ کاش اس شخص کی جوانی اور صحت فی سبیل اللہ جہاد اور تائیدِ حق میں صرف ہوتی۔[۱]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرام سے متعدد احادیث مروی ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ فی سبیل اللہ سے جہاد مراد ہے، جیسے کہ ایک صحیح حدیث میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ

"میں فی سبیل اللہ (راہِ خدا) گھوڑے پر سوار ہوا"

ایک اور حدیث ہے۔

"راہِ خدا ایک صبح اور ایک شام دنیا و مافیہا سے بہتر ہے" (بخاری و مسلم)

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔

"جو شخص اللہ پر ایمان اور اس کے وعدے کو سچا سمجھتے ہوئے راہِ خدا میں گھوڑا تیار کرتا ہے تو اس کا پیٹ بھرنا، پانی سے سیراب ہونا، اس کی لید اور اس کا پیشاب روزِ قیامت اس کی میزان میں حسنات لکھی جائیں گی" (بخاری)

"جو شخص راہِ خدا میں ایک دن کا روزہ رکھے گا اللہ اس دن کے بدلے اس کے چہرے کو ستّر سال کے لیے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے گا"

(بخاری و مسلم)

---

[۱] المنذری نے الترغیب میں کہا ہے کہ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال، رجال صحیح ہے، ج ۲، ص ۴، ط۔ المنیریہ۔

"جس شخص نے درراہِ خدا کچھ خرچ کیا اس کو ستر گنا کر کے لکھا جائے گا"
(نسائی اور ترمذی، ترمذی نے حسن کہا ہے)
"جس شخص کے قدم راہِ خدا میں غبار آلود ہوتے اس کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی" [1]
(بخاری)

اس کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث موجود ہیں اور کسی بھی شخص نے فی سبیل اللہ سے ماسوا جہاد کے اور کوئی مفہوم نہیں لیا ہے۔

یہ تمام قرائن اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ آیتِ مصارف میں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہی ہے۔ جیسا کہ جمہور کی رائے ہے۔ بہر حال یہاں پر لغوی اور اصل معنی میں نہیں ہے اور اسی پر یہ حدیث کہ پانچ اشخاص کے سوا کسی کو صدقہ حلال نہیں ہے اور اس میں آپ نے غازی فی سبیل اللہ کا ذکر فرمایا۔

ان تمام دلائل کے پیشِ نظر میں اس امر کو ترجیح دیتا ہوں کہ فی سبیل اللہ کا لفظ تمام مصالح اور قربات پر مشتمل نہیں ہے اور اس میں اس قدر توسع نہیں ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اس میں زیادہ تضییق بھی نہیں ہے کہ اس کو صرف جنگی مفہوم میں جہاد کے معنی میں محصور سمجھا جائے۔

جہاد تو قلم سے بھی ہوتا ہے اور زبان سے بھی، فکری بھی ہوتا ہے اور تربیتی بھی، اجتماعی بھی اور اقتصادی بھی، سیاسی بھی اور عسکری ۔ ۔ ۔ ۔ اور جہاد کی ان جملہ اقسام کے لیے امداد کی اور مال کی ضرورت ہے۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کی شرط اساسی پوری ہو یعنی جہاد کے ہر نوع میں اسلام کی تائید اور اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہو، اس طرح کی ہر جدوجہد جہاد فی سبیل اللہ، خواہ اس کی کوئی بھی قسم ہو اور خواہ اس میں ہتھیار استعمال کیے جائیں یا نہ کیے جائیں۔

امام طبری فی سبیل اللہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ کے دین کی تائید، اسلامی شریعت کی تاسیس پر صرف کرنا فی سبیل اللہ خرچ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ دشمنانِ

---

[1] ان احادیث کو المنذری نے الترغیب میں ذکر کیا ہے۔ ج ۲، کتاب الجہاد۔

اسلام سے جہاد اور قتال اور کفار سے جنگ اسی جدوجہد کا ایک حصّہ ہے، کیونکہ کبھی اللہ کے دین کی تائید و نصرت کے لیے قتال اور جنگ کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے بلکہ بعض حالات میں یہی ایک ناگزیر طریقہ رہ جاتا ہے جس سے نصرت دین ہوسکتی ہے لیکن ایسے ادوار بھی آتے ہیں کہ جن نظریاتی جدّوجہد، جنگی اور مادی جدّوجہد سے کہیں زیادہ مؤثر، گہری اور عمیق ثابت ہوتی ہے جیساکہ ہمارے دَور میں ہے۔

اس لحاظ سے اگر چاروں مسالک کے فقہاء نے اس حصّہ کو غازیوں کے تیار کرنے اور سرحدوں پر حفاظتی دستے متعین کرنے اور ان کی گھوڑوں اور ہتھیاروں سے امداد کرنے پر صرف کا قول اختیار ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج ہمارے اس دَور میں ایک اور نوع کے غازی تیار کرتے ہیں اور ایک اور قسم کے حفاظتی دستے ترتیب دیتے ہیں تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کو علمی اور فکری انداز میں پیش کر کے نظریاتی فتوحات حاصل کر سکیں اور اسلام پر کیے جانے والے حملوں کی بہترین مدافعت کر سکیں۔

جہاد کے مفہوم بیان کردہ توسع کی دلیل یہ ہے کہ

۱) اسلام میں جہاد جنگی غزوہ اور تلوار سے قتال پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ

"رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا کہ کون سا جہاد افضل ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ ظالم بادشاہ کے روبرو کلمۂ حق کہنا"[1]

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ

"مجھ سے قبل اللہ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا، اس کی اُمّت میں حواری ہوئے ہیں اور ایسے اصحاب پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے نبی کی سُنّت کو اختیار کیا اور اس کے حکم کی پیروی کی، پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئے جو وہ کہتے رہے جو وہ نہیں

---

[1] احمد، نسائی، بیہقی، اور ضیاء المقدسی نے طارق بن شہاب سے روایت کیا ہے۔ اور المنذری نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، التیسیر للمناوی، ج ۱، ص ۱۸۲۔

کرتے تھے اور وہ کام کرتے تھے جن کا انھیں حکم نہیں دیا گیا تھا، جس نے ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے، جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور اس کے بعد ایمان کا رائی کے برابر بھی کوئی حصہ باقی نہیں رہتا"

اور آپؐ نے فرمایا کہ

"مشرکین سے اپنے مال، جان اور زبانوں سے جہاد کرو"[1]

۲) جہاد کے جو اسالیب ہم نے بیان کیے ہیں اگر وہ بلحاظ نصّ بھی جہاد کے مفاہیم میں داخل نہ ہوں تو از روئے قیاس وہ ضرور داخل ہیں کیونکہ جہاد سے اور مذکورہ بالا اعمال ہر دو سے مقصود اعلائے کلمۃ اللہ اسلام کی تائید اور دشمنان اسلام کا مقابلہ اور ان کا دفاع ہے۔

ہمارے سامنے یہ مثال بھی آچکی ہے کہ فقہاء نے عاملین زکوٰۃ میں مسلمانوں کی فلاح کے کاموں میں مصروف لوگوں کو بھی شمار کیا ہے۔ چنانچہ ابن رشدؒ فرماتے ہیں کہ

"جن فقہاء نے زکوٰۃ کے عامل پر صرف کرنے کو جائز کہا ہے حالانکہ وہ غنی ہو ان کے نزدیک زکوٰۃ کا قاضیوں اور ان لوگوں پر صرف کرنا بھی جائز ہے جو لوگوں کی فلاح کے کاموں میں مصروف ہوں"[2]

اسی طرح ہمارے سامنے یہ مثال بھی ہے کہ بعض فقہائے احناف نے جس شخص کا مال جاتا رہا ہو اور اسے اس پر قدرت نہ رہے اسے بھی ابن السبیل کے ساتھ ملحق کیا ہے اگرچہ وہ اپنے شہر میں موجود ہو، اس لیے کہ اعتبار حاجت کا ہے جس وقت بھی موجود ہو۔

اس لیے یہ بات قابل تعجب نہ ہونی چاہیے کہ ہم جہاد (بمعنی قتال) میں وہ تمام کوششیں شمار کریں جو قولاً یا عملاً نصرت اسلام کے مقصد کو پورا کرنے والی ہوں۔

---

[1] احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن حبان، حاکم از انس۔ حاکم نے کہا کہ صحیح ہے۔ التیسیر ج ۱، ص ۳۸۵۔

[2] بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۷۶ - الحلبی۔

اس سے قبل ہم دیکھ چکے ہیں کہ زکوٰۃ میں قیاس کو کس قدر دخل ہے اور ہر مسلک میں قیاس ضرور اختیار کیا گیا ہے۔ اس بنا پر ہم نے فی سبیل اللہ کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ جمہور کی اس کے مفہوم میں توسّع کی رائے کے عین مطابق ہے۔

اس مقام پر یہ ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال اور بعض ادارے ہو سکتا ہے کہ کسی ملک میں یا کسی زمانے میں یا کسی مخصوص صورت حالات میں جہاد فی سبیل اللہ متصور ہوں اور ہو سکتا ہے کہ یہی اعمال اور یہی ادارے کسی اور ملک میں یا مختلف حالات میں یا کسی زمانے میں جہاد متصور نہ کیے گئے ہوں۔

مثلاً عام حالات میں ایک دینی درسگاہ کا قیام ایک بہترین عمل خیر متصور ہو گا لیکن اُسے جہاد نہیں کہا جائے گا۔ لیکن اگر کسی مقام پر حالات کا نقشہ یہ ہو کہ تمام تعلیمی ادارے مشنریوں کے قبضے میں ہوں، یا اشتراکی تسلط میں ہوں، یا لادینی ادارے بن چکے ہوں تو ایک دینی اصلاحی درسگاہ کا قیام ایک عظیم جہاد بن جائے گا، اور اس درسگاہ سے نژادِ نو کو اسلامی فکری تعلیم سے آراستہ کر کے انھیں دشمنانِ اسلام کی فکری اور نظریاتی یلغار کے بالمقابل کھڑا کیا جائے اور انھیں اس نہج پر تیار کیا جائے گا کہ وہ مختلف نظاموں، کتابوں اور لٹریچر میں پھیلے ہوئے زہر کا تریاق دریافت کریں اور اُمتِ مسلمہ کو اس زہر سے محفوظ رکھنے کی سعی کریں۔

یہی بات تباہ کن لائبریریوں کے بالمقابل اسلامی دارالمطالعہ کے قیام کے بارے میں کہی جا سکتی ہے اور اسی طرح مسلمانوں کے علاج کے لیے اسلامی شفاخانے کا قیام اس دائرے میں آسکتا ہے، تاکہ مسلمان مشنری ڈاکٹروں کی گمراہیوں اور ان کی کارستانیوں سے محفوظ رہیں ــــ

بہرحال چونکہ فکری اور ثقافتی یلغار زیادہ مہلک اور زیادہ خطرناک ہوتی ہے اس لیے اس کی مدافعت بھی جہاد کے نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت کی حامل ہو گی۔

ہمارے دور میں فی سبیل اللہ کا حصّہ کہاں صرف کیا جائے؟

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ

مشہور قول اور مسالک اربعہ کی اصل رائے کے مطابق فی سبیل اللہ غزواتی جنگی اور عسکری مفہوم میں وارد ہُوا ہے بالفاظ دیگر فی سبیل اللہ سے مراد اسلامی جنگ ہے، یعنی جس طرح کی جنگیں صحابہ کرام اور تابعین عظام نے لڑیں کہ قرآن کے زیر سایہ اللہ کا نام لے کر میدان دنیا میں کود گئے اور ان کا واحد اور اولین مقصود یہ تھا کہ لوگوں کو لوگوں کی بندگی سے نجات دلا کر ایک اللہ کی عبادت کی جانب بلایا جائے، تنگی عیش سے رہائی دلا کر آزاد زندگی کی دعوت دی جائے اور جاہلیتوں کے ظلم وستم سے چھڑا کر عدلِ اسلامی سے ہمکنار کیا جائے۔

بعض مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ اسلامی جنگوں کا وجود ایک عرصہ ہُوا ختم ہو چکا ہے اور اب جو جنگیں ہوتی ہیں وہ اسلامی نہیں ہوتیں بلکہ وطنی اور قومی جنگیں ہوتی ہیں کہ مسلمانوں کے دشمن مسلمانوں کی سرزمین پر حملہ آور ہوتے ہیں اور مسلمان اپنے وطن اپنی قوم اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے لڑتے ہیں اور لڑ رہے ہیں اس لیے ان جنگوں کو دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ عام دنیاوی جنگیں ہیں، اس لیے نہ تو انھیں فی سبیل اللہ قرار دیا جانا چاہیے اور نہ ان پر زکوٰۃ صرف کرنا درست ہونا چاہیے۔

یہ استدلال محل نظر ہے اور اس پر تحقیقی نظر ڈال کر معلوم کرنا چاہیے کہ اس میں کس قدر بات درست ہے کہ اور کون سی نادرست ہے۔

اسلامی جنگ اور اسلامی جہاد کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے جس صورت میں صحابہ کرام نے ظلم وجور کو مٹانے، طاغوتی قوتوں کو ختم کرنے، اور انسانوں کو انسانوں کی بندگی اور غیر اللہ کی عبادت سے آزاد کرانے کے لیے جنگیں لڑی تھیں۔ لامحالہ ان جنگوں کی کوئی مثال نہیں ملتی، نہ وہ مقاصد موجود ہیں اور نہ ہی وہ نتائج، نہ وہ آداب موجود ہیں اور نہ ان کے آثار! یہ اسلامی جنگ اور اسلامی جہاد کی بلاشبہ ایک مثالی اور دلکش اور منفرد صورت تھی۔ لیکن اسلامی تاریخ نے ان کے علاوہ بھی جنگیں دیکھی ہیں جن میں اہلِ اسلام نے ذات کی، حرمتوں کی، وطن کی اور مقدسات کی حفاظت کی۔ اور یہ جنگیں جو مسلمانوں نے دشمنوں سے لڑی ہیں یہ بھی دورِ اول کے جہاد ہی کی طرح مقدس ہیں، مثلاً وہ معرکے جن میں عماد الدین زنگی، نور الدین محمود، صلاح الدین ایوبی اور ظاہر بیبرس کے نام روشن ہوتے۔ کہ حطین،

بیت المقدس اور عین جالوت کے یہ معرکے درحقیقت مسلمانوں کی سرزمین کو تاتاریوں اور صلیبیوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لیے لڑے گئے تھے۔

اگر صحابۂ کرام اور تابعین عظام کا جہاد دعوتِ اسلام کے لیے تھا تو نور الدین اور صلاح الدین کا جہاد سرزمین اسلام کی حفاظت کے لیے تھا۔ اور جہاد جس طرح عقیدۂ اسلامی کے تحفظ کے لیے فرض ہے اسی طرح ارضِ اسلام کے تحفظ کے لیے بھی فرض ہے۔

سرزمینِ اسلام کی حفاظت اور مدافعت اس لیے فرض اور عبادت ہے کہ دارالاسلام ہی اسلام کی جائے قرار ہے اور مسلمان دارالاسلام کی دفاعی جنگ اس لیے لڑتا ہے کہ اس سرزمین میں اسلام محفوظ ہے اس لیے نہیں لڑتا کہ یہ سرزمین اس کے آباؤ اجداد کی سرزمین ہے۔ اس لیے کہ جہاں اسلام کا علم بلند نہ کیا جا سکے اور جہاں اسلام کی بات نہ سنی جائے وہاں کی سرزمین سے ہجرت مسلمان پر فرض ہو جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت فرمائی۔

سرزمین اسلام کو کفار کی حکمرانی سے آزاد کرانا

بلاشبہ ہمارے اس دور میں جس عمل پر جہاد کے معنی منطبق ہو سکتے ہیں وہ مسلط کافروں کی فرمانروائی سے سرزمین اسلام کو آزاد کرانا ہے اور وہاں غیر اسلامی نظام حکومت ختم کر کے اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے خواہ کافر یہودی ہوں یا نصرانی، یا بت پرست یا ملحد اور بے دین ہوں کہ کفر تمام کا تمام ایک ہی ملت ہے۔

سرمایہ دار ممالک ہوں یا اشتراکی کسی مذہب کے پیروکار ہوں یا لادین۔ کوئی بھی اسلامی ملک پر قبضہ کر لے اس کے خلاف جنگ فرض ہے اور تمام مسلمانوں پر ان کی امداد و تعاون لازم ہے۔

مسلمانوں پر کبھی بھی اس قدر سخت ابتلا کا دور نہیں آیا جتنا کہ آج کل ہے کہ متعدد اسلامی ممالک سامراجیوں اور کافروں کے قبضے میں ہیں اور سب سے زیادہ المناک صورت حال یہ ہے فلسطین پر دنیا بھر کے بکھرے ہوئے یہودی قابض ہو گئے ہیں، کشمیر بھی ایک مسلمانوں کا خطۂ ارض ہے جس پر ہندو قابض ہیں اور ان کے علاوہ اریٹیریا، حبشہ، چاڈ،

مغربی صومالیہ اور قبرص پر قابل نفرت، قریبی اور مکّار صلیبی قابض ہیں اور اسی طرح سمرقند، بخارا، تاشقند، ازبکستان اور البانیا پر سرکش اور ملحد اشتراکیت اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔

ان تمام ممالک کا کفر کے پنجوں سے چھڑانا مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کا اس مقصد کے لیے باہمی اتحاد لازم ہے اور یقیناً مسلمانوں کی جانب سے ان ممالک کی آزادی کی جنگ مقدس فریضۂ اسلامی اور جہاد متصوّر ہوگی۔

بلکہ جہاں کہیں بھی مسلمان اپنے وطن کو کافروں سے آزاد کرانے کے لیے لڑ رہے ہیں ان کی یہ جنگ بلا اختلاف جہاد فی سبیل اللہ ہے اور ان مجاہدین کی امداد اور تعاون تمام مسلمانوں پر فرض ہے اور مسلمانوں کا اپنی آمدنی کا ایک حصّہ بطور زکوٰۃ اس جہاد میں دینا درست ہے۔ یہ مقدار زکوٰۃ کی مقدار کے لحاظ سے، جہاد کی ضرورتوں کے لحاظ سے اور دیگر مصارف زکوٰۃ کے لحاظ سے کم و بیش ہو سکتی ہے جو کہ اہل حل و عقد اور مسلمانوں کی شوریٰ کی رائے پر موقوف ہے۔

ہر جنگ فی سبیل اللہ جہاد نہیں ہے

اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی بھی موقع پر مسلمانوں، جو کہ محض نام کے مسلمان ہوں، ہتھیار اٹھا لینا، جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے کہ خواہ ان کا کوئی بھی مقصود ہو، ان کی کوئی بھی غایت ہو اور ان کا کوئی بھی شعار ہو اور خواہ وہ اللہ کا نام لے کر شریک جنگ ہوئے ہوں یا ایسے ہی مخلوقات میں سے کسی کے نام پر شریک جنگ ہو گئے ہوں اور ان کے ذہنوں میں اسلامی جنگ اور قومی جنگ اور وطنی جنگ میں کوئی فرق نہ ہو، غرض ہر صورت میں ان کی جنگ جہاد ہی ہوگی ایسا نہیں ہے، بلکہ جہاد وہی ہے جو فی سبیل اللہ ہو جس کے محرکات اسلامی ہوں اور جس کے مقاصد اسلامی ہوں، یعنی مقصود یہ ہو کہ اللہ کے دین کو نصرت حاصل ہو، اس کا کلمہ بلند ہو اور دارالاسلام کی مدافعت ہو۔ ان محرکات اور اہداف کے ساتھ جو جنگ ہوگی وہ اسلامی جنگ (جہاد) ہوگی۔ لیکن اگر کسی جنگ میں یہ محرکات اور یہ اہداف کارفرما نہیں ہیں تو وہ ایک معمول کے مطابق جنگ ہے اور ویسی ہی جنگ ہے جیسی غیر مسلم اور ملحد لڑتے ہیں۔ اور اس جنگ کا اللہ کے دین سے، اس کی کتاب سے اور اس کے رسول

سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس قسم کی جنگ میں کوئی مال صرف کرنا اور اسے فی سبیل اللہ سمجھنا جائز نہیں ہے۔

فرض کر لیجیے کہ البانیہ یا ازبکستان کے اشتراکی اپنے ملک کو ـــــ جو ایک اسلامی ملک ہے ـــــ اشتراکی روس سے آزاد کرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کے لیے جنگ شروع کر دیں تو ان کی یہ جنگ جہاد فی سبیل اللہ شمار نہیں ہوگی اور نہ انھیں مالِ زکوٰۃ دینا جائز ہوگا کیونکہ اسلام کی نظر میں ازبکستانی اشتراکی اور روسی اشتراکی برابر ہیں اور یہ جنگ درحقیقت ملک کو ایک طاغوت سے رہائی دلا کر دوسرے طاغوت کے حوالے کر دینے کے لیے ہوگی۔ کیونکہ اسلام میں رنگ و نسل کے اختلاف اور وطن کے فرق کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور ہر نسل کے اور ہر وطن کے طاغوت یکساں ہیں۔

یہ جنگ جہاد اس صورت میں ہوگی جبکہ مسلمانوں کا مقصود کفر کی حکمرانی ختم کر کے اسلام کی حکمرانی قائم کرنا ہو اور جاہلیت کو مٹا کر اسلام کی سربلندی مطمح نظر ہو۔

غرض اسلام کی نظر میں مطلقاً جنگ مقدس نہیں ہے بلکہ وہ جنگ مقدس اور جہاد ہے جو فی سبیل اللہ ہو۔ کیونکہ دنیا کے تمام انسان جان، عزت اور وطن کی حفاظت کے لیے لڑتے ہیں اور اس کے لیے اپنے جان و مال کی قربانیاں بھی دیتے ہیں، یہاں تک کہ جو بے دین ہیں وہ بھی بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں اور اپنے ملک کا دفاع کرتے ہیں اور اپنی قوم کی حفاظت کرتے ہیں ـــــ مگر اللہ کے نزدیک اس عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

اور یہی مسلمان مجاہدین اور غیر مسلم محاربین میں فرق و امتیاز بھی ہے کہ مسلمان خالصتاً خدا کے لیے اور فی سبیل اللہ جہاد کرتے ہیں۔ اور اسی نیت اور مقصد کی بنا پر ان کی جنگ اور ان کا جہاد مقدس قرار دیا گیا ہے اور ایک عظیم عبادتِ الٰہی متصور کیا گیا ہے۔

یعنی ایک مسلمان جب جہاد کرتا ہے تو اس لیے نہیں کرتا کہ ایک رنگ و نسل کے لوگوں کی جگہ دوسرے رنگ و نسل کے لوگ یا ایک طبقہ کی جگہ دوسرے طبقہ کے لوگ مسند نشیں ہو جائیں اور حکمراں بن جائیں۔ بلکہ مسلمان اس لیے جہاد کرتا ہے کہ غیر اللہ کی حکمرانی ختم کر کے اللہ کی حکمرانی قائم کرے، اس کی شریعت برپا کرے اور اس کا کلمہ بلند کرے۔

اس مقصد کے علاوہ جو بھی جنگ ہے وہ فی سبیل الوطن ہے فی سبیل اللہ نہیں ہے اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس قسم کی کسی جنگ کو دین اسلام کا جاننے والا کوئی بھی عالم فی سبیل اللہ قرار نہیں دے سکتا اور نہ ایسی جنگ میں زکوٰۃ کے صرف کرنے کے جواز کا فتویٰ دے سکتا ہے کیونکہ ان جنگوں میں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہتھیار اٹھانے والے (نام نہاد مسلمان) عملاً کفار سے بھی زیادہ اسلام کے دشمن ثابت ہوں۔

حافظ ابو محمد عبد الغنی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ عبد الرحمٰن بن ابی نعم بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، کہ ایک عورت آئی اور اس نے کہا کہ اے ابو عبد الرحمٰن، میرے شوہر نے اپنا مال فی سبیل اللہ دے دینے کی وصیت کی ہے ابن عمرؓ نے فرمایا تو اس کی وصیت کے مطابق فی سبیل اللہ ہو گیا۔ میں نے کہا کہ آپؓ نے اسے تشفی بخش جواب نہیں دیا، تو اس پر ابن عمرؓ نے فرمایا تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں یہ کہہ دوں کہ یہ ان لشکروں کو دے دو جو دوسروں پر زیادتیاں کرتے اور راہزنی کرتے ہیں۔ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ یہ مال نیک حجاج کو دے دیا جائے کہ یہ وفد الٰہی ہے جو اس کے گھر کی زیارت کو جاتا ہے [1]

یہ احتیاط حضرت ابن عمرؓ نے اپنے دور میں فرمائی جبکہ اس وقت لشکروں کا اسلام کے سوا اور کوئی علم نہ تھا حتیٰ کہ خوارج بھی اسلام ہی کی خاطر برسرپیکار تھے۔

اگر حضرت ابن عمرؓ یہ لشکر دیکھتے جن میں سرے سے اللہ کا کوئی نام ہی نہیں لیا جاتا جو اسلام کے نام پر نہیں لڑی جاتیں اور جس میں نہ نماز قائم ہوتی ہے اور نہ عبادت الٰہی کی

---

[1] تفسیر القرطبی: ج ۸، ص ۱۸۵

القرطبی نے اس واقعہ کو اس سیاق میں ذکر کیا ہے کہ حج بھی فی سبیل اللہ ہے۔ مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مطلق فی سبیل اللہ ہے جہاد مراد ہوتا ہے لیکن حضرت ابن عمرؓ نے اہلِ جہاد کے انحراف اور فساد کی بنا پر اس کو حج پر محمول فرمالیا۔

جاتی ہے، جس کے قائدین شراب وکباب میں منہمک ہوتے ہیں، جن کی راہنمائی اور تربیت پوری کی پوری لادینی SECULAR بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اللہ کا اور اللہ کی کتاب کا اور اس کے رسولؐ کا ذکر تک نہیں ہوتا، جہاں جاہلی شعارات بلند کیے جاتے اور دین کا اور داعیان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ... ہاں جب کبھی جوانوں کو جوش وجذبہ دلانا مقصود ہوا تو دین کا نام لے لیا ورنہ خیر ہے ــــــ اگر حضرت ابن عمرؓ ان لشکروں کو دیکھتے تو ان کی کیا رائے ہوتی!

غرض اسلام کے علاوہ جو بھی علم بلند کیا جاتے اور علاوہ اسلام کو جو بھی مطمح نظر ہو وہ غیر اسلامی جنگ ہے اور اسے فی سبیل اللہ کہنا دین کا مذاق اڑانا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جو شخص بہادری کے اظہار کے لیے جنگ کرے، جو شخص قومی حمیت کی خاطر جنگ کرے اور جو شخص دکھاوے کے لیے جنگ کرے ان میں سے کون سی جنگ فی سبیل اللہ ہے آپؐ نے فرمایا جو اس لیے جنگ کرے کہ کلمۃ اللہ غالب ہو اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے[1]

جہاد اسلامی اور معرکہ ہائے جاہلیت میں یہی بنیادی فرق ہے کہ جو اسلام کی سربلندی کے لیے اور دعوتِ اسلام کے لیے جنگ کرے اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے اور اس کے ماسوا ہر جنگ فی سبیل الطاغوت اور جاہلی جنگ ہے[2]

یہ مطلب ہے کہ لوگوں کے دلوں کو ٹٹول کر دیکھا جائے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ لڑنے والے افراد اور جماعتوں کے شعار کیا ہیں، عَلَم کیا ہیں ان کے عام مقاصد کیا ہیں؟ رہ گیا ان کی نیتوں کا معاملہ تو یہ تمام اللہ سبحانہٗ کے علم میں ہیں اور انسان ان کے جاننے کا مکلّف نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ یہ کہنا کہ اس دور کی کوئی بھی جنگ اسلامی نہیں ہے اس

---

[1] المنتقی، بحوالہ نیل الاوطار، ج ۷، ص ۲۲۶/۲۲۷۔ طبع حلبی۔

[2] ایضاً۔

لیے کردہ صحابۂ کرام کی جنگوں کی طرح فی سبیل اللہ نہیں ہے، درست نہیں ہے، درست نہیں ہے اور جیسا کہ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ مسلمانوں کے علاقوں میں ہونے والی ہر جنگ خواہ اس کے شعار، اس کے افکار اور اس کے مقاصد کوئی بھی ہوں فی سبیل اللہ اور اسلامی جنگ ہے۔

اس دور میں اس مسئلے میں فتویٰ دینے میں علمائے کرام کو احتیاط کرنی چاہیے اور تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ تاکہ مسلمانوں کے مال ان لوگوں کی اعانت میں ضائع نہ ہوں جو درحقیقت اسلام کے دشمن ہیں اور جو اسلام کو دورِ وحشت کا دستور العمل بتاتے اور داعیانِ اسلام کو رجعت پسند اور متاخر BACKWARD کہتے ہیں، کیونکہ یہ نام نہاد مسلمان اسلام کے لیے یہود و نصاریٰ سے زیادہ خطرناک ہیں۔

اِسلام کی حکمرانی کے قیام کی جدّوجہد بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے

ایک تنظیم دین دار لوگوں کی بنائی گئی اور اس نے یہ پروگرام بنایا کہ زکوٰۃ جمع کر کے اس جمعیت سے متعلقین پر صرف کیا جائے تاکہ وہ فروغِ اسلام کی جدّوجہد کریں اس پر سید رشید رضا مصری نے فرمایا کہ — فی سبیل اللہ کے زکوٰۃ کے حصّہ کا ایک مصرف اسلامی نظامِ حکمرانی کے قیام کی کوشش بھی ہے، بلکہ قیام کی کوشش، اس جدّوجہد سے زیادہ اہم ہے جو اسلام کے نظامِ حکمرانی کے قائم ہونے کی صورت میں اسے دشمنانِ اسلام سے بچانے کے لیے کی جاتی ہے اور اس فی سبیل اللہ کا ایک مصرف اسے اسلام کی دعوت پر صرف کرنا اور قلم سے اور زبان سے اس کی مدافعت کرنا بھی ہے، بالخصوص ان حالات میں جبکہ اسلام کا مسلح دفاع ممکن نہ ہو۔[1]

سید رشید رضا کی یہ رائے انتہائی بصیرت اور اسلام فہمی پر مبنی ہے اور اسی راستے کی پابندی کرنی چاہیے اور اس امر کی احتیاط کرنی چاہیے کہ نیک مسلمانوں کی زکوٰۃ کا سرمایہ ملحدین،

---

[1] تفسیر المنار: ج ۱۰، ص ۵۹۸۔ ط ثانیہ

اور آزاد روش کے حامل لادین طبقے پر نہ خرچ ہو جائے۔

سب سے اہم اور سب سے اوّلین فی سبیل اللہ کے حصۂ زکوٰۃ کا مصرف ایسی اجتماعی اور منظم جدّ و جہد ہے جو صحیح اسلامی زندگی کا آغاز چاہتی ہو، ایسی زندگی میں جس میں مکمّل طریقہ پر اسلامی احکام برپا ہوں جس میں اسلام کا نظام خلافت برپا ہو اور جس جدّ و جہد کے نتیجے میں اُمّت اسلامی اور تہذیب اسلامی کا احیاء ہو۔

یہ دائرہ کار فی الحقیقت بڑا موثّر، بڑا اہم اور بڑا لازمی ہے اور غیرت مند مسلمانوں کو اپنی زکوٰۃ اسی جدّ و جہد پر صرف کرنی چاہیے ___ لیکن افسوس ہے کہ مسلمان ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے کہ جب زکوٰۃ کے سارے مصارف منعدم ہو چکے ہوں تو اسلام کے احیاء کی منظم جدّ و جہد سے تعاون کرنا اور اس پر اپنا مال صرف کرنا اور اپنی جان اس مقصد کے لیے کھپانا کس قدر ضروری ہو گیا ہے۔

ہمارے عہد میں اسلامی جہاد کی متنوع صورتیں

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلامی جہاد کی بس ایک صورت نہیں ہے کہ مسلح جنگ کی جائے اور عسکری مدافعت کی جائے بلکہ جہاد اسلامی کی متنوع اور گوناگوں صورتیں ہیں۔ ہم اس دور کی ضرورتوں کے مطابق چند صورتیں بیان کرتے ہیں۔

لیکن ان کے بیان سے پہلے ایک حقیقت کی وضاحت لابدی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے آغاز ہی سے مسلح لشکر کی تیاری اور ان کے جملہ اخراجات کی ذمّے داری اسلامی ریاست کے عمومی خزانہ ___ بیت المال ___ پر رہی ہے اور یہ تیاری اموال زکوٰۃ پر نہیں کی گئی بلکہ لشکروں کی روانگی اور جنگی تیاریوں پر مال فئے اور خراج سے خرچ کیا جاتا رہا ہے اور زکوٰۃ محض تکمیلی امور پر صرف ہوتی ہے، مثلاً رضا کار مجاہدین پر زکوٰۃ سے صرف کیا گیا۔

موجودہ دور میں بھی یہی طریقہ ہے کہ مسلح افواج اور دفاعی انتظامات کے اخراجات عام بجٹ سے ادا ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ اس قدر بڑے اخراجات ہیں جو زکوٰۃ سے پورے نہیں ہو سکتے، اور اگر زکوٰۃ اس مصرف پر خرچ کی بھی جائے تو ساری زکوٰۃ صرف اسی ایک مصرف میں لگ جائے گی اور کافی نہ ہوگی۔

اس لیے ہماری رائے میں فی سبیل اللہ کے حصۂ زکوٰۃ کو نظریاتی، تربیتی اور اشاعتی جہاد پر صرف کرنا زیادہ بہتر ہے بشرطیکہ یہ جدوجہد خالصتاً اسلام کے لیے ہو اور اس میں قومیت اور وطنیت کا کوئی شائبہ نہ ہو اور نہ ایسے اسلام کی خدمت ہو جس کے پردے میں کسی خاص علاقے، کسی طبقے یا شخص کو ابھارنا اور فروغ دینا مقصود ہو۔ کیونکہ آج کل بہت سی تنظیمات اور اداروں کا اسلامی نام رکھ دیا جاتا ہے مگر وہ اندر سے لادینی ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کا سرچشمہ اسلام ہی ہونا چاہیے، اسلام ہی ان کا مقصود ہونا چاہیے اور اسلام ہی کی جانب ان کا رُخ ہونا چاہیے تاکہ ان کا انتساب الی اللہ درست کہا جا سکے۔

ہم متعدد مثالیں بیان کر سکتے ہیں جن پر عمل اسلام کا تقاضا ہے اور جنھیں فی سبیل اللہ جہاد شمار کیا جا سکتا ہے۔

صحیح اور حقیقی اسلام کی جانب دعوت کے مراکز قائم کرنا اور ان کے ذریعے دنیا کے گوشے گوشے میں دعوت اسلام پہنچانا درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ایسے اسلامی مراکز قائم کرنا جو اسلامی ملک کے اندر رہتے ہوئے مسلم نوجوانوں کی فکری راہنمائی کریں انھیں انحراف، الحاد اور اخلاقی بے راہ روی سے محفوظ رکھیں اور انھیں اسلام کی تائید و نصرت اور دشمنوں سے اسلام کی مدافعت کے لیے تیار کرنا بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ایسا اسلامی مجلہ جاری کرنا جو تباہ کن اور گمراہ کن لٹریچر کا توڑ کرے اور اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرے اور اسلام کے بارے میں دشمنانِ اسلام کے اٹھائے ہوئے شبہات کا جواب دے اور خالص اسلامی تعلیمات کا پرچار کرے یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ایسی اسلامی کتاب کی اشاعت جو محاسن اسلام کو اجاگر کرے ، جو اس کی تعلیمات کو منور کرے جو اس کے حقائق انتہائی واضح اور منقح اسلوب میں پیش کرے اور باطل افکار کو رد کر کے رکھ دے بلاشبہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

طاقتور، امانتدار اور صلاحیتوں کے حامل مخلص افراد کا اپنی صلاحیتیں اور قوتیں مذکورہ بالا

کا اعمال میں کھپا دینا، اسلام کی روشنی کو آفاق میں پھیلا دینا، خوابیدہ مسلمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنا اور دہر الحاد، دہریت اور فکری بے راہ روی کا مقابلہ کرنا سب سے بڑھ کر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اسلام کے ان سچے داعیوں کی حمایت و نصرت کرنا جو دشمنانِ اسلام کی سازشوں کا شکار ہیں اور ہر طرح کی تعذیبات سہہ رہے ہیں اور جلا وطنی، قید اور سزائے موت کے کرب و بلا سے گزر رہے ہیں۔ عظیم ترین جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ان تمام امور پر زکوٰۃ صرف کرنی چاہیے اور خاص طور پر اس عصرِ غربت میں جبکہ اسلام کا اللہ کے بعد ان فرزندانِ اسلام کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس کے احیاء کے لیے اپنی جانیں کھپا رہے ہیں۔

●

ساتویں فصل

ابن السبیل (مسافر)

جمہور فقہاء کے نزدیک ابن السبیل سے مراد مسافر ہے کیونکہ سبیل کے معنی راستے کے ہیں اور عربی زبان میں کسی چیز سے مستقل ربط رکھنے والے کو ابن لگا کر اس شئے کی جانب منسوب کر دیتے ہیں، جیساکہ کسی شاعر نے ابن الحرب (جنگجو) اس طرح استعمال کیا ہے۔

انا ابن الحرب ربتنی ولیدا
الی ان شبت واکتھلت لداتی

اسی طرح مستقل راستے میں رہنے والے کو ابن السّبیل (فرزند راہ) کہا گیا ہے [1]

امام طبری نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابن السبیل (مسافر) زکوٰۃ کا مستحق ہے خواہ وہ غنی ہو، بشرطیکہ وہ اپنے شہر سے دور ہو۔ اور ابن زید کہتے ہیں کہ ابن السبیل وہ مسافر ہے جس کا سفر خرچ ختم ہو گیا ہو یا اس پر کوئی افتاد پڑ جائے یا اس کے پاس کچھ باقی نہ رہے تو اس کا حق لازم ہے خواہ وہ غنی ہو یا فقیر [2]

ابن السبیل کا قرآن میں ذکر

قرآن کریم میں ابن السبیل کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر آٹھ مقامات پر آیا ہے۔

مکی قرآن میں اس طرح ذکر آیا ہے۔

---

[1] تفسیر الطبری، بتحقیق محمود شاکر، ج ۴، ص ۳۲۰۔

[2] ایضاً

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (الاسراء : ۲۶)

رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق، فضول خرچی نہ کرو۔

فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ (الروم : ۳۸)

پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اس کا حق) یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں۔

مدنی قرآن میں اللہ سبحانہ نے مصارف انفاق (خواہ فرض ہو یا نفلی) ان الفاظ میں بیان فرمائے۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ (البقرہ : ۲۱۵)

لوگ پوچھتے ہیں، ہم کیا خرچ کریں، جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر رشتے داروں پر یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔

آیت حقوق عشرہ میں بھی ابن السبیل (مسافر) سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

(النساء : ۳۶)

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے

ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں۔

خمس غنائم میں سے بیت المال میں ابن السبیل کا حق رکھا گیا۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال : ۴۱)

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے۔ اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

فئے میں بھی ابن السبیل کا حق مقرر کیا گیا۔

مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر : ۷)

جو کچھ بھی اللہ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اور مصارف زکوٰۃ میں ان کا حصہ مقرر کیا گیا۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ

(التوبہ : ۶۰)

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلوب

مطلوب ہو نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے اور راہِ خدا
میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔
ابن السبیل کا حصّہ علاوہ زکوٰۃ کے بھی افراد کے مال میں متعین کیا گیا اور اسے
تقویٰ کے عناصر میں سے قرار دیا۔

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ (البقرہ : ۱۷۷)

اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔

ابن السبیل کے ذکر کی حکمت

ابن السبیل (مسافر) کے ذکر اور اس جانب توجہ کی وجہ یہ ہے کہ اسلام متعدد اسباب کی بنا پر سیر و سفر کی ترغیب دی ہے۔

۱) ابتغاء رزق (تلاش معاش) کے لیے بھی سیاحت کی ترغیب دی ہے۔

فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ (الملک : ۱۵)

چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق۔

وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (المزمل :)

کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔

فرمانِ نبوت ہے۔

"سفر کرو غنی ہو جاؤ گے"

۲) طلب علم کے لیے بھی اسلام نے سیاحت کی ترغیب دی ہے اور اس لیے بھی

دعوت دی ہے کہ کائنات میں موجود اللہ کی نشانیوں میں غور و تامل کریں اور مخلوقات میں جاری سنت اللہ کا مشاہدہ کریں اور انسانی اجتماع میں جاری اللہ کی حکمتوں کا مشاہدہ کریں۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ

(العنکبوت : ۲۰)

ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔

اس آیت میں ارضی اور جغرافیائی تحقیقات اور تاریخ حیات انسانی کے مطالعہ کی جانب اشارہ ملتا ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (آل عمران : ۱۳۷)

تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج : ۴۶)

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

و جو شخص حصول علم کے راستے پر چلا اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ سہل فرما دے گا۔[1]

---

[1] المنذری : الترغیب والترہیب : مسلم نے اس روایت کو نقل کیا ہے (کتاب العلم، الترغیب فی الرحلۃ فی طلب العلم)

اور فرمایا کہ

"جو شخص حصول علم کے لیے نکلا وہ واپس آنے تک راہِ خدا میں ہے"۔[1]

یہی وجہ ہے کہ دورِ اوّل کے علماء نے طلب علم کے لیے سفر کی بڑی نادر اور تابناک مثالیں قائم کی ہیں اور مغرب و مشرق کے تمام مؤرخین ان مثالوں پر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہیں اور ان مثالوں کو طلب علم کی سعی کا عمدہ نمونہ قرار دیتے ہیں۔

۴) اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سفر کی بھی ترغیب دی ہے اور ہر وہ عمل فی سبیل اللہ ہے جس سے دارالاسلام کو تحفظ حاصل ہو، دعوتِ اسلام جاری رہے، کمزوروں کی حفاظت ہو اور سرکشوں کی تادیب ہوتی رہے۔

چنانچہ ارشاد ہوا۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(التوبہ : ۴۱)

نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

بعدازاں منافقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

(التوبہ : ۴۲)

اے نبی، اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے

---

[1] ترمذیؒ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔

پیچھے چلنے پر آمادہ ہوجاتے مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہوگیا اب وہ خدا
کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمھارے ساتھ چلتے وہ اپنے
آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اس کے بعد مجاہدین سے ثواب کا وعدہ کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے۔

وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ
وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ (التوبہ : ١٢١)

یہ بھی کبھی نہ ہوگا کہ وہ (راہ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ اٹھائیں اور
(سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا
جائے تاکہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔

اور فرمان نبوت ہے کہ

"راہ خدا میں صبح کا سفر یا شام کا سفر دنیا و مافیہا سے بہتر ہے" (بخاری)

۴) اسلام نے حج کی ممتاز بین الملی عبادت کے لیے بھی بیت اللہ کی جانب سفر کی
ترغیب دی ہے اور حج کو اسلام کا پانچواں رکن قرار دیا ہے۔

وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ
سَبِيلًا (آل عمران : ٩٧)

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس
کا حج کرے۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ
مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ
اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ
الْأَنْعَامِ (الحج : ٢٨،٢٧)

اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں۔ جو اس نے انہیں بخشے ہیں۔

سفر و سیاحت کی یہ وہ اقسام ہیں جن کی جانب اسلام نے متوجہ کیا ہے اور ان کی ترغیب دلائی ہے تاکہ اسلام کے مقاصد حاصل ہوں اور اس کی تعلیمات عام ہوں، اس کے علاوہ اور بھی اقسام سفر ہیں، بہر حال دینِ اسلام کا مقتضا یہی ہے کہ وہ مسافروں کی جانب خاص توجہ کرے اور بالخصوص ان مسافروں کو خیال رکھا جائے جن کا متاعِ سفر ختم ہو گیا ہو اور ان کا گھر اور وطن دور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ان کی عام اعانت کا حکم دیا ہے اور انھیں زکوٰۃ سے حصہ دیا ہے جو بذاتِ خود اچھے اور خیر کے کاموں کے لیے سفر اختیار کرنے کی ترغیب ہے، اور ان کی اجنبیت اور دور ہونے کی حالت میں مدد کرنا ہے اور اس حقیقت کو بروئے کار لانا ہے کہ اسلامی معاشرہ باہم ایک پیوست اور مربوط معاشرہ ہوتا ہے جس کے افراد باہم دگر تعاون اور مودت کا سلوک روا رکھتے ہیں اور وطن کی دوری کے باوجود ایک دوسرے کی دستگیری کرتے ہیں۔

اجتماعی کفالت کا ایسا جامع نظام جس کی دیگر اقوام اور نظام ہائے حیات میں کوئی مثال نہیں ملتی

اسلام نے اجنبی مسافروں اور اپنے وطن سے دور راہ نوردوں کی جانب جس قدر التفات کیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی نظام اور قانون میں نہیں ملتی — درحقیقت مسافروں کے حقوق اسلامی نظام کے وسیع اور جامع نظام کفالت کا ایک حصہ ہیں۔ یعنی اسلام نے صرف اسی امر پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ ایک ملک کے شہری کی ضروریات پوری ہو جائیں بلکہ اسلام نے انسانوں پر مختلف حالات میں پیش

آجانے والی ضرورتوں کی تکمیل کو مدنظر رکھا ہے اور مسافروں کی دشواریوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور بالخصوص اس دور میں جبکہ آج کی طرح ہوٹلوں وغیرہ کی آسائشات میسر نہیں تھیں۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے اپنے عہد میں ایک دار الدقیق بنوایا تھا جس میں آٹا، ستو، کھجور اور کشمش وغیرہ موجود رہتیں اور ان اشیاء سے گھر سے دور مسافروں کی امداد کی جاتی اور مہمان جو حضرت عمر رضؓ کے پاس آتے ان کی مہمان نوازی کی جاتی۔ آپؓ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان شاہراہ پر بھی ایسے مسافروں کے لیے بندوبست فرمایا تھا جن کا زادراہ ختم ہو گیا ہو اور سواری کا انتظام تھا جو ایک پانی سے دوسرے پانی تک پہنچا دیتی تھی[1]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ابن شہاب زہریؒ کو حکم دیا کہ سنت رسول اور خلفائے راشدین کے مطابق وہ صدقات کے مصارف لکھ دیں، انھوں نے ایک طویل تحریر مرتب کی جس میں تمام حصّوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا اور ابن السبیل کے حصّے کو اس طرح بیان کیا۔

اور مسافروں کا حصّہ اس انداز سے تمام راہوں پر تقسیم کر دیا جائے گا جس طرح لوگ ان پر سفر کرتے ہوں، اس حصّے میں سے ہر ایسے مسافر کو دیا جائے گا جس کے پاس کوئی ٹھکانا نہ ہو، نہ پناہ لینے کے لیے گھر بار اور رشتہ دار ہو۔ اس کے کھانے کا اس وقت تک انتظام کیا جائے گا تا آنکہ اسے ٹھکانا مل جائے یا وہ اپنی حاجت پوری کرے۔ یہ مسافروں کا حصّہ ایسے مقررہ اور جانے پہچانے مقامات پر ایسے امانت داروں کے پاس رکھوایا جائے کہ ایک مسافر بھی ان کے پاس سے ایسا نہ گزرے جس کی ضرورت ہو اور وہ اسے پناہ نہ دیں اسے کھلائیں پلائیں نہیں اور اس کے جانور کو چارہ نہ دیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ ان کے پاس اس مد میں سے کچھ بھی باقی

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۲۸۳ - بیروت۔

نہ رہے۔ انشاء اللہ[1]

جس قدر اسلام نے اہل ضرورت کی ہر موقع پر ضروریات پوری کی ہیں اس کی مثال کسی قوم اور کسی نظام میں نہیں ملتی۔

سفر کا آغاز کرنے والا اور سفر میں گھر سے دور نکل جانے والا مسافر

فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ابن السبیل کا اطلاق صرف اس مسافر پر ہوتا ہے جو اپنے وطن سے یا گھر سے دور نکل گیا ہو یا اس مسافر پر بھی مشتمل ہے جس نے ابھی سفر کا آغاز کیا ہو۔

جمہور فقہاء کی رائے

جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ سفر کا آغاز کرنے والا ابن السبیل میں داخل نہیں ہے۔

۱) اس لیے کہ ابن السبیل (فرزند راہ) تو وہی ہوگا جو مستقل سفر میں رہے، مثلاً جو رات کو زیادہ باہر نکلے اسے ابن اللیل (فرزند شب) کہا جاتا ہے اور جو شخص اپنے گھر میں مقیم ہے وہ راستے میں نہیں ہے اس لیے اس پر راستے میں ہونے اور ابن السبیل کے ہونے کا اطلاق نہیں ہوگا، اسی لیے سفر کے بغیر محض سفر کے ارادے سے سفر کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

۲) ابن السبیل کے مفہوم میں اجنبیت بھی شامل ہے، گھر میں اور اپنے وطن میں جو شخص موجود ہے خواہ وہ کتنا ہی حاجتمند ہو وہ غریب نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اس آیت میں مذکور ابن السبیل کو اس مسافر پر محمول کیا جائے گا جو غریب (اجنبی، وطن سے دور) ہو، ایسا مسافر اگرچہ فراخ دست ہو اس حصۂ زکوٰۃ میں سے لینے کا مستحق ہوگا کیونکہ وہ اپنے وطن پہنچ کر اپنے مال سے مستفید نہیں ہو سکتا اس لیے وہ مال اس کے حق میں نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔ اور اگر ابن السبیل تنگدست ہو تو اسے دو وجوہ

---

[1] الاموال، ص ۵۸۰۔

سے زکوٰۃ میں حصہ ملے گا یعنی ابن السبیل ہونے کی بنا پر بھی دیا جاتا ہے، کیونکہ مسافر کو سفر کی بنا پر دیا جاتا ہے اس لیے اس کے اخراجات کے مطابق دینا ضروری ہوگا۔[۱]

امام شافعیؒ کی رائے

امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ ابن السبیل سے مراد وہ مسافر بھی ہے جو غریب الدیار ہوگیا ہو اور اپنے وطن سے دور نکل گیا ہو اور وہ بھی مراد ہے جو سفر کا ارادہ رکھتا ہو لیکن زادِ راہ نہ ہو تو ان دونوں قسم کے مسافروں کو آمد و رفت کے مطابق دیا جائے گا کیونکہ جس شخص کا ارادہ سفر کسی ایسے کام کے لیے جو گناہ (معصیت) نہیں ہے تو وہ اسی مسافر کی طرح ہے جو غریب الدیار اور وطن سے دور ہو گیا ہو کیونکہ دونوں ہی کو سفر کی تیاری کی ضرورت ہے، اگرچہ ارادہ سفر کرنے والے پر ابن السبیل کا اطلاق مجازاً ہوگا۔[۲]

میری رائے

میری رائے یہ ہے کہ ابن السبیل کے لفظ کا اوّلین اور اکثری انطباق اسی مسافر پر ہوتا ہے جو غریب الدیار ہو اور یہی مفہوم شریعت کے اصولوں سے ہم آہنگ بھی ہے کہ ہر سفر کا اشتیاق رکھنے والا یا ارادہ کرنے والا خواہ اس کا مقصود اس کی ذاتی منفعت ہو یعنی تلاش معاش یا تفریح، وہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

البتہ امام شافعیؒ کی رائے پر اس صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جبکہ ارادہ سفر کرنے والا ایسے کام کے لیے سفر کرے جس سے عام مسلمانوں کو یا اسلام کو فائدہ پہنچے، مثلاً کوئی جماعت ایسی علمی یا عملی مہم پر جائے جس سے تمام مسلمانوں کو فائدہ ہو یا ایسی کوئی مہم ہو جس سے اسلام کو اور عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا ہو اور اس سلسلے میں ان کی رائے قابلِ قبول ہو گی جن کے علم اور معرفت پر مسلمانوں کو اعتماد ہو۔

اس لحاظ سے یہ مسافر اگرچہ بالفعل ابن السبیل نہیں ہے مگر اس اعتبار سے ہے کہ اس نے عزم کر لیا ہے اور اس کو دینے میں ملت کا اور اُمت کا

---

[۱] الشرح الکبیر، مع المغنی، ج ۲، ص ۷۰۲۔

[۲] المجموع، ج ۶، ص ۲۱۴۔ نہایۃ المحتاج، ج ۶، ص ۱۵۶۔

عمومی فائدہ ہے اس لیے یہ اعطاء فی سبیل اللہ کے مشابہ ہوگیا اور ان غارمین کے مشابہ ہوگیا جو لوگوں میں صلح کرانے کی خاطر ان کا مالی بوجھ برداشت کرلیں۔ اس طرح اس مسافر کو اگر زکوٰۃ سے حصہ دیا جانا از روئے نص صحیح نہ ہو تو از روئے قیاس صحیح ہوگیا۔

ہماری اس رائے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں ابن السبیل کا عطف فی سبیل اللہ پر کیا گیا ہے اور اس عطف کی بنا پر آیت اس طرح ہوگئی۔

فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ وَفِی ابْنِ السَّبِیْلِ

ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کریم نے بعض مصارف کو فی کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کے بجائے اس حصۂ زکوٰۃ کو اس مصلحت میں صرف کیا جائے گا، اور اگر ان میں سے کسی فرد کے پاس یہ حصۂ زکوٰۃ پہنچے گا تو وہ اسے اس عام مصلحت کے تحت لے گا جو شارع نے اس میں مقرر فرمائی ہے۔

اسی لیے ان چار مصارف میں جو فی کے ساتھ آئے ہیں تملیک شرط نہیں ہے یعنی

فی الرقاب —— الغارمین —— فی سبیل اللہ —— ابن السبیل

کیونکہ چاروں فی کے ساتھ آئے ہیں اور ان میں شخص مراد نہیں ہے بلکہ عمومی مصلحت مراد ہے۔ اسی لیے ضروری نہیں ہے کہ ابن السبیل کو خود ذاتی حیثیت میں دیا جائے بلکہ ہوائی کمپنی، یا بحری کمپنی، یا اس جامعہ کو جہاں وہ جا رہا ہے دے کر اس مصرف کی ادائیگی ہو سکتی ہے۔

پہلی رائے کے حامل فقہاء میں سے حنبلی مسلک کے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر ابن السبیل ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہا ہو تو اسے اس کی آمد و رفت کے مصارف دیئے جائیں گے، بشرطیکہ یہ سفر شریعت کے مطابق یعنی کسی عبادت کے لیے ہو، حج کے لیے یا جہاد کے لیے سفر ہو یا زیارت والدین کی خاطر سفر ہو یا مباح سفر ہو یعنی تلاش معاش کے لیے ہو یا برائے تجارت ہو اور اگر سفر برائے تفریح ہو تو اس کے بارے میں دو اقوال ہیں ایک یہ کہ اسے دے دیا جائے اس لیے کہ یہ ایک جائز سفر ہے اور ایک یہ ہے کہ اسے نہیں دیا جائے گا کہ اس سفر کی کوئی شرعی ضرورت موجود نہیں ہے[۱]

---

[۱] الشرح الکبیر: ج ۲، ص ۷۰۲ - ۷۰۳۔

اگر اپنے وطن سے دور مسافر کو اپنے مقصود تک پہنچنے کے لیے اعانت کی جا سکتی ہے حتی کہ اگر وہ تفریح کے لیے جا رہا ہو تب بھی اس کی اعانت بھی اس کی اعانت ہو سکتی ہے تو اسی توجیہ کی اساس پر اسلام اور مسلمانوں کے مقصد کی خاطر جو کام کر رہا ہو اس کی امداد بھی کی جا سکتی ہے۔

ابن السبیل کو مال زکوٰۃ سے دینے کی شرائط

ابن السبیل کو مال زکوٰۃ میں سے دینے کی چند شرائط ہیں جن میں سے کچھ متفق علیہ ہیں اور کچھ کے بارے میں اختلاف ہے۔

۱) جس جگہ ابن السبیل موجود ہے وہاں وہ حاجتمند ہو اور اس کے پاس وطن تک پہنچنے کے لیے کچھ نہ ہو تو اسے دیا جائے گا اور اگر اس کے پاس اپنے وطن تک پہنچنے کے لیے مال ہو تو اسے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ بخلاف مجاہد کے کہ اگر وہ جہاں موجود ہے وہاں بھی غنی ہو تو بھی لے سکتا ہے ۔ ماسوا فقہائے حنفیہ کے ۔ کیونکہ اس کو دینے کا مقصود دشمن پر ہیبت ڈالنا ہے اور مجاہد کو زکوٰۃ دینے سے وہ دشمن کے بالمقابل تیار ہو سکتا ہے۔

۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مسافر کا سفر گناہ (معصیت) کا سفر نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو قتل کرنے گیا ہو، یا حرام تجارت کے لیے نکلا ہو، یا اسی طرح کا کوئی گناہ کا کام ہو کہ ایسے مسافر کو زکوٰۃ میں سے دینا درست نہیں ہے، کیونکہ اس کو دینے سے مقصود اس کی اعانت ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مال سے گناہ میں اعانت نہیں کی جا سکتی، الا یہ کہ یہ مسافر توبہ کرے تو اس کے باقی سفر کے اخراجات اسے دیئے جا سکتے ہیں۔ البتہ اگر وہ اتنا مفلس ہو گیا ہو کہ اس کی موت کا اندیشہ ہو تو بغیر توبہ بھی اسے دیا جائے گا کہ کسی کو موت کے منہ میں چھوڑ دینا بھی گناہ ہے[1]۔

---

[1] حاشیۃ الدسوقی ج ۱ ص ۴۹۸۔ بعض مالکی فقہاء نے کہا ہے کہ اس مسافر کو اندیشہ موت ہونے کے باوجود بھی زکوٰۃ میں سے کچھ نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اس کی نجات خود اس کے ہاتھ میں ہے کہ وہ توبہ کرے۔ نیز دیکھئے حاشیۃ الصاوی ج ۱، ص ۲۳۳۔ اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اگر یہ معصیت ارتکاب قتل یا ہتک حرمت کی ہے تو اگرچہ موت کا اندیشہ ہو بغیر توبہ اسے کچھ نہیں دیا جائے گا۔

جس سفر میں کوئی گناہ نہیں ہے وہ ہے جو برائے عبادت ہو، برائے حاجت ہو یا برائے تفریح ہو۔

جو سفر برائے عبادت ہو جیسے حج، جہاد اور علم کے حصول کے لیے سفر اور مقدس مقامات کی زیارت کا سفر تو اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایسے مسافر کو زکوٰۃ میں سے اعانت دی جائے گی کہ اطاعت پر اعانت شرعًا مطلوب ہے۔

جو سفر دنیاوی ضرورت کے لیے ہو جیسے سفر برائے تجارت اور طلب رزق، تو اس بارے میں ان فقہاء کی رائے یہ ہے جو کہتے ہیں کہ ابن السبیل وہ ہے جو وطن سے دور ہو کہ اسے زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا کہ یہ اس کی جائز دنیاوی ضرورت پوری کرنا ہے۔

اور فقہائے شافعیہ کے نزدیک جو ابن السبیل کو اس مسافر کے معنی میں بھی لیتے ہیں جس نے ابھی سفر کا آغاز کیا ہو، دو آراء ہیں، ایک یہ کہ اسے نہیں دیا جائے گا کہ اسے سفر کی ضرورت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ اسے دیا جائے گا اس لیے کہ سفر کے ساتھ شریعت اسلامیہ نے جو رخصتیں وابستہ کی ہیں اس میں شریعت نے سفر اطاعت اور سفر مباح میں کوئی فرق نہیں کیا ہے یعنی ہر سفر میں نماز میں قصر اور روزہ کی رخصت موجود ہے۔

جبکہ برائے تفریح سفر میں خاصا اختلاف ہے بالخصوص مسلک شافعیؒ اور مسلک حنبلی کے فقہاء میں کہ بعض کی رائے یہ ہے کہ اسے دیا جائے کہ یہ سفر جائز ہے اور بعض کہتے ہیں نہ دیا جائے کہ اس سفر کی اسے ضرورت نہیں ہے اور ایک طرح سے فضول ہے۔[1]

۳) تیسری شرط یہ ہے کہ مسافر جس جگہ موجود ہے وہاں اسے قرض دینے والا کوئی نہ ہو اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کے پاس وطن میں اس قدر مال ہو کہ وہ قرض ادا کر سکے[2] اور یہ شرط بعض مالکی اور شافعیؒ فقہاء نے لگائی ہے جبکہ دونوں مسلکوں کے دیگر فقہاء نے اس کی مخالفت کی ہے۔

---

[1] المجموع للنووی: ج ۶، ص ۲۱۴، ۲۱۵۔ الشرح الکبیر المطبوع مع المغنی ج ۲، ص ۷۰۱، ۷۰۲۔

[2] شرح الخرشی علی خلیل: ج ۲، ص ۲۱۹۔ نہایۃ المحتاج للرملی: ج ۶، ص: ۱۵۶۔

ابن العربی نے "احکام القرآن" میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس امر کو ترجیح دی ہے کہ ابن السّبیل کی زکوٰۃ میں سے امداد کی جاسکتی ہے خواہ اسے قرض مل سکتا ہو، کیونکہ جب اللہ کا احسان (زکوٰۃ) موجود ہے تو اُسے دوسرے انسان کا ممنون احسان بنوانے کی حاجت نہیں ہے۔[1]

امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر ابن السبیل کو ایسا شخص مل جائے جو اسے اس کی منزل تک پہنچنے کے لیے قرض دے دے تو اس پر یہ لازم نہیں کیا جائے گا کہ وہ اس سے قرض لے بلکہ اسے زکوٰۃ میں سے دینا درست ہوگا۔[2]

فقہائے احناف کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ اگر ابن السبیل قرض لے سکے تو قرض لے لے لیکن اس پر قرض لینا لازم نہیں ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے وہ بعد میں ادائے قرض سے عاجز ہو جائے۔[3]

یہ اس وجہ کے علاوہ جو ابن العربی اور القرطبی نے ذکر کی ہے ایک مزید وجہ ہے۔ بہر حال ان دونوں وجوہ کی بنا پر ابن السبیل پر قرض لینا لازم نہیں ہے۔

پہلی وجہ: یہ کہ قرض لے کر وہ زیرِ احسان آجائے گا جس کا اللہ نے مکلف نہیں ٹھیرایا ہے۔

دوسری وجہ: یہ کہ وہ قرض کی ادائیگی سے عاجز بھی آسکتا ہے جس سے اس کا بھی نقصان ہوگا اور قرض دہندہ کا بھی۔

ابن السّبیل کو کس قدر دیا جائے؟

۱) ابن السبیل کو اخراجات اور لباس مقدار میں دیا جائے جو اس کے لیے کافی ہو سکے

---

[1] احکام القرآن۔ القسم الثانی: ص ۹۵۸۔ تفسیر القرطبی: ج ۸، ص ۱۸۷۔

[2] المجموع، ج ۶، ص ۲۱۶۔

[3] فتح القدیر، ج ۲، ص ۱۸۔ ردالمحتار، ج ۲، ص ۶۴۔

اور وہ اپنی منزل پر پہنچ سکے، یا وہاں تک پہنچ سکے جہاں اس کا مال موجود ہے اگر راہ میں اس کا کوئی مال موجود ہو۔ یہ مسئلہ اس صورت میں ہے جب اس کے پاس بالکل مال نہ ہو، اگر اس کے پاس مال ہو مگر بقدر کفایت نہ ہو تو اسے اتنا دیا جائے گا جس سے اس کی کفایت ہو جائے۔

۲) اگر اس کا سفر طویل ہو تو اسے سواری بھی مہیا کی جائے گی اور اس سفر کی مقدار وہی ہے جس میں نماز میں قصر واجب ہو جاتا ہے یعنی اسّی کلومیٹر۔ یا مسافر اس قدر کمزور ہو کہ پیدل نہ چل سکتا ہو تو اسے سواری کا بندوبست کر کے دیا جائے گا۔ اور اگر مسافر مضبوط ہو اور سفر مسافت قصر سے کم ہو تو اسے سواری نہیں دی جائے گی البتہ اس کے معمول کے مطابق سامان کو پہنچانے کا بندوبست کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں فقہاء نے کہا ہے کہ اگر گنجائش ہو گی تو اسے سواری خرید کر دی جائے ورنہ کرایہ پر لے کر دی جائے گی کیونکہ اس زمانے کے نقل وحمل کے ذرائع جانور ہی تھے اسی لیے فقہاء نے یہ بات کہی ہے کہ سواری یا تو خرید کر دی جائے گی یا کرایہ پر لے کر دی جائے گی۔ لیکن چونکہ آج وسائل نقل وحمل ترقی یافتہ ہو گئے ہیں، اس لیے خرید کر دینے کے بجائے صورت حال کے مناسب کرائے کا بندوبست کیا جائے گا یعنی اگر ریل اور بس یا بحری جہاز سے سفر ممکن ہو تو ہوائی جہاز کا بار برداشت نہیں کیا جائے گا کہ اس طرح مال زکوٰۃ پر بلاجواز بوجھ پڑے گا۔

۳) ابن السبیل کی سفر کی تمام ضرورتوں کی کفالت کی جائے گی۔ یہ نہیں ہے کہ اسے صرف ان زحمتوں ہی کے مطابق دیا جائے جو سفر کی بنا پر پیش آگئی ہیں، اور یہی رائے صحیح ہے۔

۴) اگر وہ اپنے وطن واپس جانا چاہے تو بھی اس کی کفایت کے بقدر دیا جائے گا اگر اس کی جائے مقصود پر اس کا مال موجود نہ ہو۔

بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اگر وہ سفر کے دوران ہی سے واپس ہونا چاہے تو زکوٰۃ میں سے اس کی اعانت نہیں کی جائے گی اور بعض نے کہا ہے کہ اگر اس کا ارادہ منزل پر پہنچ کر واپس ہونے کا ہو تو اس کی امداد کی جائے گی اور اگر اس کا ارادہ قیام کا ہو تو اس کی

اعانت نہیں ہوگی۔ لیکن پہلی رائے صحیح ہے۔

۵) منزل پر پہنچ کر ابن السبیل کے قیام کے بارے میں فقہائے شافعیہ نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر پہنچنے اور روانہ ہونے کے دو دن کے علاوہ اس کا قیام چار روز سے کم ہو تو وہ مسافر کے حکم میں ہوگا اور اسے زکوٰۃ کی مد سے دیا جائے گا اور اس کو روزہ افطار کرنے، نماز میں قصر کرنے اور سفر کی دیگر رخصتیں حاصل رہیں گی اور اگر پہنچنے اور روانہ ہونے کے علاوہ چار روز سے زائد قیام کیا تو اسے مدِ زکوٰۃ سے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ اب وہ مسافر ابن السبیل باقی نہیں رہا اور سفر کی رخصتیں اس سے ختم ہو چکی ہیں۔ بخلاف غازی کے کہ خواہ اس کا سرحدی قیام کتنا ہی لمبا ہو جائے وہ غازی ہی رہے گا کیونکہ قیام سے غازی کا مفہوم ختم نہیں ہوتا بلکہ اور موکد ہو جاتا ہے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ غازی فتح ہونے تک ٹھہرنے کا محتاج ہے۔ اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اگر ابن السبیل کسی ضرورت کے تحت ٹھہرا ہے تو اس کے قیام کے طویل ہو جانے کے باوجود اسے زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا[1]

۶) اگر ابن السبیل گھر واپس پہنچ جائے اور جو زکوٰۃ میں اسے امداد ملی تھی وہ کچھ بچ رہے تو کیا وہ اس سے واپس لی جائے گی یا نہیں؟

فقہائے شافعیہ کہتے ہیں کہ یہ رقم اس نے خود سختی اٹھا کر بچائی ہو یا ویسے ہی بچی ہو اس سے واپس لے لی جائے گی۔ اور ایک رائے یہ ہے کہ اگر اس نے تنگی اٹھا کر رقم بچائی ہو تو وہ اس سے واپس نہ لی جائے گی۔ بخلاف غازی کے کہ اگر وہ اپنے آپ پر تنگی کر کے کچھ بچا لے تو اس سے واپس نہیں لیا جائے گا کیونکہ غازی جو کچھ لیتا ہے وہ اس کی خدمت کا معاوضہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی خدمت کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور وہ یہ خدمت انجام دے چکا ہے اور ابن السبیل اپنی ضرورت کے لیے لیتا ہے اور اس کی ضرورت پوری ہو چکی ہے[2]

---

[1] المجموع: ج ۶، ص ۲۱۵، ۲۱۶۔ الشرح الکبیر، ص ۷۰۱، ۷۰۲۔

[2] المجموع: ج ۶، ص ۲۱۶۔

فقہائے حنفیہ کہتے ہیں کہ ابن السبیل کے پاس زکوٰۃ کی اعانت میں سے جو کچھ باقی رہ جاتے لازمی نہیں ہے کہ وہ اپنے مال پر قدرت ہوجانے کے بعد اسے واپس کرے ۔جیسے فقیر اگر غنی ہوجائے اور اس کے پاس مال زکوٰۃ ہو تو اس پر بھی اس کا صدقہ کرنا لازم نہیں ہے [1]

کیا ہمارے دور میں ابن السبیل موجود ہے؟

بعض علمائے معاصرین کی یہ رائے ہے کہ ہمارے اس عہد میں ابن السبیل موجود نہیں ہے کیونکہ ذرائع مواصلات آسان ترقی یافتہ اور آسانی کے حامل ہوگئے ہیں، اب پوری دنیا ایک ملک کی طرح بن چکی ہے اور ایسی آسانیاں فراہم ہوگئی ہیں کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو بنکوں کے ذریعے خود اپنے مال سے مستفید ہوسکتا ہے [2]

شیخ احمد مصطفیٰ المراغی نے اپنی تفسیر میں یہی تحریر کیا ہے۔ لیکن ہماری رائے اس کے برخلاف ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ تمام تر تمدنی سہولتوں کے باوجود ابن السبیل مختلف صورتوں میں موجود ہے۔

ابن السبیل کی واقعی صورتیں

ا) کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اگرچہ غنی ہوتے ہیں مگر بنکوں میں ان کا کوئی اثاثہ موجود نہیں ہوتا، اب اگر ایسا شخص حالات اور اسباب کے تحت کسی دور دراز بستی یا کسی شہر نہ پہنچ سکے اور اپنا مال کسی طرح حاصل نہ کرسکے تو ظاہر ہے کہ یہ شخص ابن السبیل ہوگا کیونکہ وہ اپنے مال سے دور ہونے کی بنا پر اعانت کا مستحق ہوگیا۔
ہر چند کہ یہ صورت نادر الوقوع ہے لیکن بہر حال ممکن ہے۔

---

[1] فتح القدیر: ج ۲، ص ۱۸ - ردالمحتار: ج ۲، ص ۶۴۔

[2] تفسیر المراغی: ج ۲۸ - سورۃ الحشر آیت نمبر ۶

سیاسی پناہ حاصل کرنے والے اور جلاوطن افراد

۲) بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جنھیں بیرونی حملہ آور، سرکش حکمران اور اہل خیر و صلاح پر ظلم وستم روا رکھنے والے نافرمان اور ملحد حکام انھیں ان کے ہر مال و دولت سے محروم کر کے ترک وطن پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان کو بغیر کسی حق کے صرف اس جرم میں کہ وہ ایک اللہ کو ماننے والے ہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہیں اور یہ لوگ اپنے دین کی سلامتی کی خاطر ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے رہتے ہیں اور ان کے وطن میں جو رقم بینکوں میں اور جو مال گھروں میں ہوتا ہے اس پر ان کی دسترس باقی نہیں رہتی، جیسا کہ بالعموم سیاسی پناہ حاصل کرنے والے مجبور لوگوں کی کیفیت ہوتی ہے۔

تو ان کو فقہی اصطلاح میں کیا کہا جائے گا؟ ان کے پاس مال موجود ہے مگر وہ ان کی دسترس میں نہیں ہے اور وہ اس مال تک پہنچ نہیں سکتے یعنی باعتبار ملکیت تو دولت مند ہیں لیکن باعتبار قبضہ وہ تہی دست ہیں اور یہی حالت ابن السبیل کی ہوتی ہے

جس شخص کے پاس مال ہو لیکن وہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی اس سے متمتع نہ ہو سکے

۳) بعض مسلک حنفی کے فقہاء نے ابن السبیل کے ساتھ اس شخص کو بھی ملحق کیا ہے جو اپنے مال سے متمتع نہ ہو سکے اور اسے اپنے ملک میں رہتے ہوئے اپنی ملکیت پر قدرت نہ ہو کیونکہ مستحق زکوٰۃ ہونے میں حاجت کا اعتبار ہے جو کہ اس صورت میں موجود ہے کہ یہ شخص اگرچہ ظاہراً غنی ہے لیکن عملاً فقیر کے حکم میں ہے[1]
یہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کسی تاجر کا لوگوں پر قرض ہو اور وہ اسے حاصل نہ کر سکے اور خود اس کے پاس کچھ نہ رہے تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے کہ وہ ابن السبیل کی

---

[1] رد المختار: ج ۲، ص ۶۴۔ البحر الرائق: ج ۲، ص ۲۶۰۔

طرح عملاً فقیر ہے[1]

کسی اجتماعی مفاد کے لیے سفر کرنے والے

۴) اگر ہم امام شافعیؒ کے اس مسلک کو مدِ نظر رکھیں کہ انھوں نے ابن السبیل میں اس شخص کو بھی داخل کیا ہے جو سفر کا ارادہ کرے اور اس کے پاس اخراجات نہ ہوں اور ہم نے اس میں اس شرط کو ترجیح دی تھی کہ اگر یہ سفر عام مسلمانوں کے یا اسلام کے مفاد میں ہو۔ اس امر کے مدِ نظر ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم اس ابن السبیل کی مد میں ذہین طلبہ کو مختلف صنعتوں میں مہارت حاصل کرنے والوں کو اور پیشہ ورانہ صلاحیت حاصل کرنے والوں کو ایسا مفید علم حاصل کرنے اور ایسی تربیت حاصل کرنے باہر بھیجیں جس سے دین اسلام اور امت مسلمہ کو فائدہ پہنچے۔

ٹھکانے سے محروم لوگ

۵) بعض حنبلی فقہاء نے ابن السبیل کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو مانگنے کے لیے لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کریں[2] اور اس مفہوم کے لحاظ سے آج بھی بہت سے لوگ ابن السبیل کے زمرے میں داخل ہیں۔

ہماری جبین تو یہ دیکھ کر بھی عرقِ انفعال سے تر ہو جاتی ہے کہ اسلامی ملکوں میں تو ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو سرے سے رہائش اور سکونت کی نعمت ہی سے محروم ہیں اور فٹ پاتھ ان کا ٹھکانا ہے، جس کی مٹی ان کا بستر اور جس کی ہوا ان کی چادر ہے — یہ فی الواقع ابناء السبیل (فرزندانِ راہ) ہیں کہ راستہ ہی ان کی ماں ہے کہ

---

[1] البحر الرائق : ج ۲، ص ۲۶۰۔

[2] الانصاف : ج ۳، ص ۲۳۷۔

وہیں وجود میں آئے اور راستہ ہی ان کا باپ ہے کہ وہی ان کا ٹھکانا بن گیا!
یہ لوگ جس معاشرے میں موجود ہیں اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں... تو کیا تعجب ہے کہ ابن السبیل سے یہی مراد ہوں اور قرآن نے فقراء اور مساکین کے علاوہ ان کا مستقل ذکر کر کے زکوٰۃ میں ان کا جداگانہ حصہ متعین کیا ہو۔
اگر ان لوگوں کو ابن السبیل متصور کر کے اس مصرف کی زکوٰۃ ان پر صرف کی جائے تو کیا درست نہ ہوگا؟ اور اس لیے بھی ان پر زکوٰۃ صرف کی جا سکتی ہے کہ علاوہ ابن السبیل ہونے کے یہ فقراء بھی ہیں۔ اس لحاظ سے سب سے پہلے انھیں زکوٰۃ کی مد میں سے موزوں رہائش مہیا کی جائے پھر ان کی کفایت کے بقدر ان کی معیشت کا بندوبست کیا جائے تاکہ وہ بلا اسراف اور بغیر بے حد تنگی کے اپنی انسانی ضروریات پوری کرسکیں۔

یافتہ بچے

۶) سید رشید رضا اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یافتہ بچگان کو ابن السبیل کے مفہوم میں داخل کیا جا سکتا ہے بلکہ بعض معاصر دانشوروں نے تو کہا ہے کہ ابن السبیل سے یہی یافتگاں (اٹھائے ہوئے بچے) مراد ہیں۔
رشید رضا نے بھی اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ ابن السبیل کے لفظ میں اس کی گنجائش موجود ہے، نیز یہ کہ قرآن کریم نے متعدد بار یتیم بچے سے حسن سلوک کی تاکید کی ہے کیونکہ یتیم بچہ باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے بے سہارا رہ جاتا ہے اس کی تربیت عمدہ طریقہ پر نہیں ہوتی اور وہ جاہل رہ جاتا ہے اور جہالت انسانی عقل کے خلاف ایک بڑا جرم ہے، اسی طرح اس میں اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو کہ اس کے وجود کے خلاف جرم ہیں اور اس جہالت اور بداخلاقی کی بنا پر یہ بچہ انسانی معاشرے میں دیگر بچوں کے لیے ایک بری مثال کے طور پر پرورش پاتا ہے، اور اس کا بگاڑ دوسرے بچوں میں سرایت کر جاتا ہے۔
جب یتیم بچے کی جانب اسلام نے اس قدر توجہ کی ہے تو یافتہ بچہ تو اس سے

بھی زیادہ مستحق عنایت ہے کہ حکمت اور تفقہ کا تقاضا یہی ہے

قدیم مفسرین نے یافتہ بچوں کا بیان اس لیے نہیں کیا کہ قدیم دور میں اس جرم کا ارتکاب بہت کم ہوتا تھا اور بعد کے مفسرین نے اس جانب اس لیے توجہ نہیں دی کہ وہ پچھلے مفسرین ہی سے نقل کرتے رہے [۱]

بہر حال اگر یافتہ بچے ابن السبیل کے زمرے میں داخل نہ ہوں تو فقراء اور مساکین کے مصرف میں تو لامحالہ داخل ہیں کیونکہ بڑا ہو یا چھوٹا جو تنگدست ہے وہ فقیر ہے اور اس کا زکوٰۃ میں استحقاق ثابت ہے۔

---

[۱] المنار: ج ۵/ ص ۹۴۔

آٹھویں فصل

مستحق زکوٰۃ اصناف کے بارے میں عمومی مباحث

زکوٰۃ کو تمام مصارف پر تقسیم کرنے کے بارے میں فقہی مسالک

اللہ سبحانہ نے قرآن کریم میں آٹھ مصارف زکوٰۃ بیان فرمائے ہیں جن کی وضاحت اور تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب یہاں پر ایک مسئلہ باقی ہے کہ کیا زکوٰۃ تقسیم کنندہ ــــ مالک ہو یا حاکم ــــ اس امر کا پابند ہے کہ وہ زکوٰۃ کو آٹھوں مصارف میں مساوات کے ساتھ تقسیم کرے؟

بعض فقہاء کی یہی رائے ہے اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور انھوں نے "الام" میں اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

النووی اپنی کتاب المجموع میں کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ اگر خود مالک یا اس کا وکیل زکوٰۃ تقسیم کرے تو عامل کا حصہ ساقط ہو جائے گا اور اس حصہ کو باقی سات اصناف میں تقسیم کرنا لازم ہوگا بشرطیکہ موجود ہوں ورنہ جو اصناف موجود ہوں ان میں تقسیم کی جائے گی، بہرحال جو صنف بھی موجود ہو اس کا ترک کرنا جائز نہیں ہے، اگر زکوٰۃ دہندہ نے کوئی مصرف چھوڑ دیا تو اس کے حصہ کی زکوٰۃ دوبارہ دے گا (یعنی ضامن ہوگا) اور یہی استیعاب مصارف کے قائل عکرمہ، عمر بن عبدالعزیزؒ زہری اور داؤد ہیں[1]

امام احمدؒ سے بھی ایک روایت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق مروی ہے،

---

[1] المجموع: ج ۶ / ص ۱۸۵۔

یعنی یہ کہ ان کے نزدیک بھی تمام مصارف زکوٰۃ میں برابر تقسیم کرنا لازم ہے اور یہ کہ ہر صنف میں تین سے زائد افراد کو زکوٰۃ ادا کرے اس لیے کہ جمع کا کم سے کم عدد تین ہے ماسوا عامل کے، کیونکہ عامل اپنی اجرت لیتا ہے اس لیے اسے ایک ہی کو دینا جائز ہے۔ اور یہ حنبلی فقہا میں سے ابو بکر کی رائے ہے [1]

مالکی مسلک کے فقہا میں سے اصبغ نے تمام مصارف میں تقسیم کو مستحب قرار دیا ہے تاکہ ان کے استحقاق کا علم نہ مٹ جائے اور اس لیے کہ اس میں تمام مختلف مصالح جمع ہو جاتے ہیں کہ بھوک اور احتیاج کا بھی مداوا ہو جاتا ہے، جہاد کی بھی مدد ہو جاتی ہے اور قرض بھی ادا ہو جاتا ہے اور سب مستحقین کی دعائیں زکوٰۃ دہندہ کے حق میں ہو جاتی ہیں [2]

ابن العربی کہتے ہیں کہ اس امر پر اتفاق ہے کہ تمام زکوٰۃ عاملین علیہا کو نہیں دی جائے گی [3] کیونکہ اس طرح زکوٰۃ کا مقصود ہی ختم ہو جائے گا کہ زکوٰۃ کا مقصود اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، جیسا کہ علامہ طبریؒ نے فرمایا ہے۔

مسلک شافعیؒ کے فقہا کی دلیل یہ ہے کہ مصارف کا آغاز لام سے ہوا ہے جو تملیک پر دلالت کرتا ہے یعنی کہا گیا للفقراء وغیرہ اس لیے ضروری ہے کہ تمام اصناف کو مالک بنا کر دیا جائے اور سب کو شامل کر کے دیا جائے [4]

نیز ابو داؤد نے زیاد بن الحارث الصدائی سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور آپ سے بیعت کی، آپ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کی کہ مجھے زکوٰۃ میں سے کچھ دیجیے تو آپ نے فرمایا کہ صدقات کے

---

[1] الکافی لابن قدامہ: ج ۱، ص ۱۴۶۔

[2] الصاوی: ج ۱، ص ۲۳۴۔

[3] احکام القرآن: لابن العربی: ج ۲، ص ۹۴۷۔

[4] ایضاً۔

بارے میں اللہ نے پسند نہیں فرمایا کہ کوئی نبی یا غیر نبی اس کا فیصلہ فرمائے بلکہ خود فرما دیا کہ یہ آٹھ مصارف ہیں، اگر تم ان آٹھ میں سے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔

بہرحال امام شافعیؒ کا مسلک امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے خلاف ہے کہ ان ائمہ کے نزدیک تقسیم میں تمام اصناف کو شامل کرنا واجب نہیں ہے۔ ان فقہاؒ کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں لام تملیک کے لیے نہیں ہے، بلکہ لام اجل (مقصود) ہے جیسے آپ کہیں اَلْبَابُ لِلدَّارِ۔ اور اَلسَّرْجُ لِلدَّابَّةِ

نیز اس آیت

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۝

میں ماسوا فقراء کے کوئی مصرف ذکر نہیں کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں جہاں صَدَقَہ کا لفظ مطلق آتا ہے اسے فرض زکوٰۃ ہی مراد ہوتی ہے۔

اور آپؐ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے دولتمندوں سے صدقات لے کر تمہارے فقراء کو لوٹا دوں۔

مذکورہ بالا قرآن اور سنت کی نصوص میں صرف فقراء کا ذکر آیا ہے[1]

ابوعبید نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"اگر تم زکوٰۃ کو اس کی مقررہ مدوں میں سے کسی ایک مد میں خرچ کردو تو وہ درست ہے، کہ اللہ سبحانہٗ کے اس فرمان انما الصدقات للفقراء والمساکین کا یہ مطلب ہے کہ ان اصناف کے علاوہ لوگوں کو زکوٰۃ نہ دی جائے"

ابن شہاب کہتے ہیں کہ

"زکوٰۃ کے سب سے زیادہ مستحق وہ ہیں جو تعداد میں زیادہ اور فقر و احتیاج کے لحاظ سے بہت تنگ حال ہو"

---

[1] ابن العربی : احکام القرآن، ج ۲، ص ۹۴۷۔

ابراہیم کہتے ہیں کہ

"لوگ صرف فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر ہی سوال کرتے تھے۔"

سفیان اور اہل عراق (امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب) کہتے ہیں کہ

"اگر زکوٰۃ آٹھ مصارف میں سے کسی ایک میں صرف کر دی جائے تو جائز ہے۔"

ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ

"اگر مال وافر ہو تو تمام مدوں میں بانٹ دو لیکن اگر تھوڑا ہو تو ایک ہی مد میں دے دو۔"

ابراہیم کے اس قول کی تائید عطا سے بھی مروی ہے[1]

ابو ثورؒ کہتے ہیں کہ اگر مال کا مالک خود دے تو کسی ایک مد میں دینا جائز ہے اور اگر امام (حکومت) تقسیم کرے تو تمام اصناف کو دینا چاہیے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تقسیم زکوٰۃ کا معاملہ حکمراں کی صوابدید پر موقوف ہے، یعنی جو اصناف زیادہ حاجتمند ہوں اور جن کی تعداد زیادہ ہو اُسے اپنے اندازے کے مطابق دے، اور ہو سکتا ہے کہ چند سالوں بعد اس صنف سے زکوٰۃ دوسری صنف میں منتقل ہو جائے، اس لیے جہاں بھی اہل حاجت اور ضرورتمند ہوں انہی کو ترجیح دی جائے گی۔ اور یہی اہلِ علم کی رائے ہے[2]

ہمارے نزدیک بھی نخعی، ابو ثورؒ اور مالکؒ کے اقوال راجح ہیں اور یہ ایک دوسرے کی توضیح کرتے ہیں۔

الروضۃ الندیہ کے مصنف کی تحقیق

اس سلسلے میں الروضۃ الندیہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ

اللہ سبحانہٗ نے صدقہ کو آٹھ اصناف سے مختص کیا ہے جو ان کے علاوہ لوگوں کیلیے

---

[1] ابو عبید: الاموال، ص ۵۷۶، ۵۷۸۔

[2] احکام القرآن: ج ۲، ص ۹۴۸۔

موزوں نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ خاص ہیں اور ان کے درمیان اس کی برابر تقسیم لازم نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کم وبیش جو زکوٰۃ ملے اس میں ان کے حصے بنائے جائیں، بلکہ مفہوم یہ ہے کہ جنس صدقات ان اصناف کی جنس میں صرف کی جائیں۔ یعنی اگر کسی پر کسی نوع کا کوئی صدقہ لازم ہے اور اس نے ان اصناف کی نوع کو دے دیا تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ مال کے مالک پہ لازم ہے کہ وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اسے جملہ آٹھ اصناف میں برابر تقسیم کر دے، اس فرض کے ساتھ کہ یہ تمام اصناف موجود ہیں — تو اس میں حرج اور مشقت لازم آئے گی اور یہ عمل سلف اور خلف کے برخلاف ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ اس قدر معمولی ہو کہ اگر جملہ آٹھ اصناف میں تقسیم کی جائے تو کسی کے لیے بھی کار آمد نہ رہے، اگرچہ وہ شئے نوع واحد ہو اور عدد نہ ہو (کہ عدد میں یہ دشواری زیادہ ہو جائے گی، مثلاً اگر زکوٰۃ کا ایک اونٹ ہو تو وہ آٹھ مصارف میں کیوں کر تقسیم ہوگا)

جہاں تک زیاد بن حارث کی اس حدیث کا تعلق ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے زکوٰۃ کو آٹھ حصوں میں تقسیم فرمایا ہے — تو اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ زیر بحث مسئلہ میں دلیل بنتی ہے تو اس کی سند میں گفتگو کی گئی ہے (فی اسنادہ مقال)

دراصل حدیث کی منشا یہ ہے کہ مصارف صدقات آٹھ ہیں جیسا کہ قرآن نے بیان کیے ہیں اور یہ مراد نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے آٹھ حصے ہیں کیونکہ اگر یہ مراد ہوتی ہے تو ہر حصہ زکوٰۃ کو وہیں صرف کرنا لازم ہوتا جس کے لیے وہ حصہ زکوٰۃ نکالا گیا ہے حالانکہ یہ بات اجماع مسلمین کے برخلاف ہے۔

اور اگر اس امر کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب تمام صدقات جمع ہو کر امام (حکومت) کے پاس پہنچ جائیں اور کسی ایک فرد کے صدقہ کا اعتبار نہ رہے۔ اس لیے یہ حدیث تقسیم پر دلالت نہیں کرتی بلکہ درحقیقت یہ جائز ہے کہ بعض مستحقین زکوٰۃ کو زکوٰۃ میں سے جس قدر حصہ چاہے دے دیا جائے اور باقی حصہ دیگر مستحقین کو دے دیا جائے۔

اگر علاقے کے تمام صدقات امام کے پاس جمع ہو جائیں اور اس کے پاس مستحقین

زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بھی موجود ہوں تو وہ ہر صنف کو اس کے حق کے مطابق ادا کرے گا اور یہ تقسیم بھی برابری کی بنیاد پر نہیں ہوگی بلکہ امام کسی صنف کو زیادہ اور کسی کو کم دے سکتا ہے، مثلاً صدقات کی آمد کے موقع پر جہاد کا مرحلہ پیش آگیا، دارالاسلام کو کافروں اور باغیوں سے محفوظ رکھنا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کرنی ہے تو وہ تمام مصارف پر مجاہدین کو ترجیح دے سکتا ہے بلکہ تمام مصارف کو ترک کرکے پوری زکوٰۃ فی سبیل اللہ کے مصرف میں لگا سکتا ہے۔ اور اسی طرح حالت امن میں فی سبیل اللہ کا حصہ دوسرے مصارف میں دے سکتا ہے[1]

ابو عبیدؒ کی ترجیح اسی رائے کو ابو عبیدؒ نے ترجیح دی ہے۔ انھوں نے پہلے اس تحریر کا ذکر کیا جو امام زہری نے سنت کے مطابق زکوٰۃ کے واجبات اور اس کے مصارف کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے لیے تیار کی۔

بعدازاں انھوں نے آٹھوں مصارف زکوٰۃ کی تفصیل بیان کی اور ہر صنف کو زکوٰۃ دینے کے طریقۂ کار کی وضاحت کی اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

"یہ ہیں مصارف زکوٰۃ جبکہ انھیں تمام مدوں میں جدا جدا تقسیم کیا جائے اور جو شخص ایسا کر سکے تو صحیح طریقہ یہی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ صورت علاوہ امام کے کسی پر لازم نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی زکوٰۃ جمع ہوتی رہتی ہے اور اس پر ان تمام اصناف کے حقوق کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے، نیز اس کے پاس ایسے اعوان و انصار بھی ہوتے ہیں جو یہ خدمت اس کے لیے ممکن بنا سکتے ہیں، لیکن جس کو یہ سہولتیں حاصل نہ ہوں اور وہ صرف اپنی زکوٰۃ ہی کا ذمہ دار ہو تو اگر وہ اسے دیگر مدوں کو چھوڑ کر کسی ایک مد میں بھی خرچ کر دے تو بقول ان علماء کے جن کے نام ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

اس ضمن میں بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے کہ جس میں آپؐ نے

---

[1] الروضۃ الندیۃ: ج ۱/ص ۲۰۷، ۲۰۹۔ (کچھ تصرف کے ساتھ)

زکوٰۃ کا ذکر فرماتے ہوئے کہا: یہ ان کے امیروں سے لی جائے گی اور ان کے فقیروں کو لوٹائی جائے گی۔ یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ ہی کی ایک صنف بیان فرمائی۔ پھر جب اس کے بعد مال آیا تو آپ نے اسے محتاجوں کے علاوہ دوسری صنف مولفۃ القلوب میں دے دیا، جو اقرع بن حابس، عیینۃ بن حصن علقمۃ بن علاثہ اور زید الخیل پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں میں حضورؐ نے وہ سونے کا ڈلا تقسیم کر دیا جو حضرت علیؓ نے یمن والوں کے اموال میں سے بھیجا تھا اور اہلِ یمن سے جو مال لیا جاتا تھا وہ صدقہ ہوتا تھا، بعد ازاں آپ کے پاس کچھ اور مال آیا تو آپ نے اُسے تیسری مد میں دے دیا جو مقروض اور تاوان رسیدہ (الغارمین) کی تھی۔

اس سلسلے میں آپ نے قبیصۃ بن مخارق سے اس تاوان کے متعلق جو اس نے اپنے ذمے لیا تھا یہ فرمایا کہ ــــ تم ٹھہرو تاکہ ہمارے پاس صدقہ آجائے پھر یا تو ہم اس بار کو کم کرانے میں تمہاری مدد کریں گے یا پورا اپنے ذمے لے لیں گے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ دینے میں بعض اصناف کو بعض دیگر پر ترجیح دی تھی۔

الغرض امام کو اختیار ہے کہ وہ ان تمام اصناف زکوٰۃ کو تقسیم کرے یا ان میں سے بعض کو دوسری مدوں پر ترجیح دے دے بشرطیکہ یہ عمل پوری معلومات حاصل کرنے اور پوری کوشش کر لینے کے بعد کیا گیا ہو اور جس نے اس میں اپنی مرضی کو داخل نہ کیا ہو اور نہ حق سے انحراف کیا ہو۔ یہی صورت امام کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے بلکہ دوسرے کے لیے تو اس میں اور بھی زیادہ وسعت موجود ہے۔[1]

سید رشید رضا کی رائے

سید رشید رضا اپنی تفسیر المنار میں لکھتے ہیں کہ

---

[1] الاموال، ص ۵۸۱۔

آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کی تقسیم کے بارے میں فقہاء کا اختلاف اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی متفق علیہ سنّت عملی مروی نہیں ہے اور خلفائے راشدین سے بھی کوئی طے شدہ عمل مروی نہیں ہے اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کا تعلق اولوالامر (حکمراں) کی صوابدید پر ہے کہ وہ یہ جائزہ لے کہ مستحق کس درجے کے ہیں اور صدقات کی آمدنی کس قدر ہے اور کس کو دینا زیادہ موزوں ہے۔

اس بارے میں جو اقوال مروی ہیں ان میں امام مالکؒ اور ابراہیم نخعیؒ کے اقوال زیادہ مبنی بر مصلحت ہیں۔ اور سب سے زیادہ نصؒ سے دور اور مصلحت کے برخلاف قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے[1] الا یہ کہ مال صدقہ بہت ہی کم ہو کہ اگر ایک کو دیا جائے تو وہ اس کے لیے قابل انتفاع ہو اور اگر متعدد اشخاص کو دے دیا جائے تو وہ قابل انتفاع نہ رہے۔

لیکن زکوٰۃ کا کثیر مال مستحقین کی کسی ایک ہی مد میں ایک ہی شخص کو دے دینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے تمام اصناف کو جمع کے صیغے کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اس لیے امام ابو حنیفہؒ کا یہ کہنا موزوں نہیں ہے کہ ایک ہی صنف میں ایک ہی شخص کو زکوٰۃ دے دینا بھی درست ہے۔

اہل حل وعقد کی ایک جماعت شوریٰ مجتمع ہو کر یہ فیصلہ دے کہ اگر صدقات ناکافی ہوں تو موجودہ دور میں مستحقین زکوٰۃ کی بلحاظ اہمیت یہ ترتیب ہے تاکہ ان مصارف میں بادشاہ اور حاکم اپنی مرضی سے تصرف نہ کرسکیں کیونکہ بعض اصناف بعض زمانوں میں موجود ہوتی ہیں اور بعض زمانوں میں موجود نہیں ہوتیں اور ان کے درجات میں بھی اختلاف ہوتا ہے[2]

---

[1] ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ابو عبیدؒ نے ابن عباسؓ سے اور حذیفہؓ سے اس کے مثل ہی روایت کیا ہے اور ایک صنف پر خرچ کردینے کے جواز سے مصلحت اور ضرورت کی رعایت کی نفی نہیں ہوتی اگرچہ اس کا تعلق ضمیر مسلم سے ہے۔

[2] تفسیر المنار، ج ۱۰، ص ۵۹۳ - ط- ثانیہ۔

جملہ اصناف پر تقسیم زکوٰۃ کے مسئلہ کا خلاصہ

ان تمام آراء تحقیقات اور ترجیحات کا خلاصہ یہ نکلا کہ

۱) اگر مال زکوٰۃ وافر مقدار میں موجود ہو اور تمام اصناف موجود بھی ہوں اور ان کی ضرورتیں تقریباً یکساں ہوں تو مال زکوٰۃ کو جملہ اصناف میں تقسیم کرنا زیادہ بہتر ہے اور استحقاق اور حاجت کی موجودگی کے باوجود کسی ایک صنف کو محروم رکھنا درست نہیں ہے۔ اور یہ معاملہ امام اور اقتدار شرعی سے متعلق ہے جو زکوٰۃ کے جمع کرنے اور اس کو مستحقین میں تقسیم کرنے کی ذمے داری انجام دیتا ہو۔

۲) جملہ آٹھ اصناف میں زکوٰۃ کی تقسیم میں مساوات لازمی نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ ضرورت اور تعداد مستحقین پر موقوف ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی علاقہ میں فقیر تو ہزاروں ہوں مگر غارم اور ابن السبیل دس ہوں تو جو مال ہزاروں کو دیا جائے گا ظاہر ہے کہ وہ دس کو کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں مناسب رائے وہی ہے جو امام مالکؒ اور ابن شہاب نے اختیار کی ہے کہ اس صنف کو ترجیح دی جائے گی جس میں تعداد زیادہ ہو اور ضرورت زیادہ ہو[ا]۔ بخلاف امام شافعیؒ کے مسلک کے۔

۳) کسی ایسی مصلحت کے مدِ نظر جسے شریعت قبول کرتی ہو بعض اصناف کو ترجیح دینا درست ہے جیسا کہ آٹھوں اصناف میں تقسیم کے وقت ان میں برابری لازم نہیں ہے بلکہ ان کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان میں فرق کیا جا سکتا ہے کیونکہ افراد کے مابین ضرورتوں کا اختلاف ہوتا ہے۔

بہر حال جب بھی مستحقین میں کمی بیشی کی جائے وہ اپنی مرضی سے نہ ہو بلکہ کسی

ا۔ الدردیر شرح الصغیر میں کہتے ہیں کہ محتاج کو دوسروں پر ترجیح دینا مستحب ہے اور صورت حال کے تقاضہ کے مطابق اس میں اضافہ کیا جائے۔ اس لیے کہ مقصود حاجت دور کرنا ہے۔ ج ۱، ص ۲۳۴۔

اور یہ صورت اس وقت تک ہے جب تک خاص حالات پیدا کر کے اور خاص انتظام کر کے فقر اور مسکنت کا علاج نہ کر دیا جائے ۔

۵) ان عاملین پر خرچ کرنے کے لیے جو زکوٰۃ وصول کرتے اور صرف کرتے ہوں ایک زیادہ سے زیادہ مقدار کا تعین ضروری ہے جیسا کہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے کہ اس کی مقدار مال زکوٰۃ کا آٹھواں حصہ ہے اور اس پر زیادتی درست نہیں ہے۔

جدید دور کے ٹیکسوں کے نظام پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ ٹیکسوں کے ذریعے وصول ہونے والے مالیہ کا ایک بڑا حصہ ٹیکس کے نظام دفاتر اور ساز و سامان پر خرچ ہو جاتا ہے اور سرکاری خزانہ میں محصولات کا بہت کم حصہ پہنچتا ہے، کیونکہ ٹیکسوں کے نظام کی پیچیدگی اور تعویق کار کی بنا پر بڑے بڑے مناصب، پُر رونق دفاتر، اور شاندار تنخواہوں پر زر کثیر صرف ہو جاتا ہے، حالانکہ درحقیقت یہ مال غریب عوام سے حاصل کیا گیا تھا اور اسے انہی کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونا چاہیے تھا۔ اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت بجٹ میں خسارے کی صورت میں پھر نئے ٹیکس عوام پر عائد کر دیتی ہے۔

۶) اگر مال زکوٰۃ کم ہو، مثلاً ایک ہی شخص کی زکوٰۃ ہو جس کی مقدار کم ہو تو وہ ایک ہی صنف میں دے سکتا ہے جیسا کہ نخعی اور ابو ثور کی رائے ہے بلکہ ایک ہی فرد کو دے سکتا ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کیونکہ زکوٰۃ کی اس قلیل مقدار کو متعدد اصناف میں اور متعدد افراد پر تقسیم کر دینے سے اس کی افادیت ختم ہو جائے گی۔

اور فقراء اور مساکین کے مصرف کے بیان میں ہم امام شافعیؒ کی یہ رائے بیان کر چکے ہیں کہ فقیر کو اتنی زکوٰۃ دی جائے کہ وہ غنی ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ متعدد افراد کو چند چند سکے تقسیم کر دینے سے بہتر ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ جو لوگ موجود ہوں اور ان کو شدید ضرورت ہو تو مصارف میں فرق کرنا زیادہ اولیٰ اور زیادہ عمدہ ہے۔

نویں فصل

وہ اصناف جن پر زکوٰۃ خرچ نہیں کی جائے گی

زکوٰۃ ایک مخصوص ٹیکس ہے اور انسان کی انفرادی زندگی اور حیاتِ اجتماعی کے لیے اس میں خاص مقاصد کی تکمیل مضمر ہے۔ اس لیے اگر کوئی انسان مستحق زکوٰۃ نہ ہو اس کا زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے اور مال کا مالک اور حاکم اگر کوئی مصرف زکوٰۃ نہ پائے تو اپنی صوابدید پر خرچ کر سکتے ہیں۔

اس لیے فقہاء نے شرط لگائی ہے کہ زکوٰۃ لینے والا ان اصناف میں سے نہ ہو جن کے بارے میں نصوص وارد ہیں کہ انھیں زکوٰۃ لینا حرام ہے اور یہ کہ وہ زکوٰۃ کا صحیح مصرف نہیں ہیں۔

جن پر زکوٰۃ لینا حرام ہے وہ بالاجمال یہ ہیں۔

۱) اغنیاء (مالدار)

۲) قوی مکتسب (ایسا مضبوط شخص جو کمانے کی قدرت رکھتا ہو)

۳) ملحد، کافر، اور محارب جو اسلام کے خلاف برسرِ پیکار ہوں، بالاجماع — اور ذمی جمہور فقہاء کے نزدیک۔

۴) زکوٰۃ دہندہ کا باپ، اس کی اولاد اور اس کی بیوی — باقی رشتہ داروں میں اختلاف اور تفصیل ہے۔

۵) آلِ نبیؐ یعنی بنی ہاشم — یا بنی ہاشم اور بنی مطلب۔ جیسا کہ اس امر میں اختلاف ہے۔

اب ذیل میں ہم ان کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

بحث اوّل

اغنیاء

فقراء اور مساکین کی بحث میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ فقہائے اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ فقراء اور مساکین کے حصّہ سے کسی غنیؔ (مالدار) شخص کو نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ فرمانِ نبوتؐ ہے کہ

"کسی غنیؔ کو صدقہ حلال نہیں ہے"[1]

اور آپؐ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ

"ان کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء کو لوٹائی جائے گی"[2]

نیز یہ کہ فقہائے کرام نے فرمایا کہ اغنیاء کو دینے سے اس کے وجوب کی حکمت ضائع ہو جاتی ہے اور وہ ہے فقراء کو اغنیاء بنانا، اس لیے اغنیاء کو زکوٰۃ دینا ناجائز ہے۔

البتہ اس غنیؔ (مالداری) کی تحدید میں اختلاف ہے جس کی موجودگی میں زکوٰۃ لینا حرام ہے اور ممنوع ہے جس کی تفصیل ہم فقراء اور مساکین کے مصرف کے بیان میں ذکر کر چکے ہیں۔

باقی اصناف کے بارے میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے چنانچہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک کسی غنیؔ کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی اگرچہ وہ فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتا ہو یا اس نے ذات البین (باہمی نزاع) کی اصلاح کی خاطر کوئی مالی بار اٹھایا ہو کیونکہ

---

[1] ان کی تخریج گزر چکی ہے۔

[2] ایضاً۔

حضرت معاذؓ والی حدیث اور دوسری حدیث مطلق ہے۔

اس اصول سے صرف عامل مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ زکوٰۃ نہیں لیتا بلکہ اپنے عمل کی اجرت لیتا ہے۔ اور مؤلفۃ القلوب بھی اس اصول سے مستثنیٰ ہے جس کے بارے میں فقہائے اسلام نے کہا ہے کہ وہ اسلام کی اشاعت کے بعد ساقط ہوگیا ہے[1] جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک حدیث معاذ میں صرف فقراء پر اقتصار کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا اہم مقصود فقراء کو غنی بنانا ہے۔ کیونکہ اگر صرف فقراء اور مساکین ہی کو زکوٰۃ دینا ہوتی تو آیت صدقات میں باقی چھ مصارف نہ بیان کیے جاتے۔

فقہاء نے جس طرح عامل زکوٰۃ کو اور ابن السبیل کو اگرچہ وہ اپنے شہر میں غنی ہو اس مندرجہ بالا اصول سے مستثنیٰ کیا ہے اسی طرح انھوں نے ایسے غازی کو بھی مستثنیٰ قرار دیا ہے جس کا لشکر میں کوئی وظیفہ مقرر نہ ہو اور اسی طرح وہ شخص جس نے باہمی نزاع میں صلح کرانے کی خاطر مالی بوجھ برداشت کرلیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت مصارف کے ذیل میں مستحقین کی یہ دونوں اصناف آتی ہیں۔

۱) پہلی نوع: وہ مسلمان جو حاجتمند ہوں، یعنی فقراء، مساکین، فی الرقاب، الغارمون (مقروض) ابن السبیل —— ان کو ان کی ضرورت کے بقدر زکوٰۃ دی جائے گی۔

۲) دوسری نوع: جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہو، مثلاً عاملون علیہا (زکوٰۃ کے عامل) مؤلفۃ القلوب الغارمون (جو دوسرے لوگوں کی صلح کرانے کی بنا پر مالی بار اٹھا چکے ہوں) اور فی سبیل اللہ۔

ان لوگوں کو ہر حال میں زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا خواہ فقیر ہوں یا غنی۔

اور اس کی تشریح اس حدیث میں موجود ہے۔ کہ

---

[1] فتح القدیر علی الہدایہ۔ ج ۲، ص ۲۱۔

وکسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے، ماسوا ان پانچ کے، فی سبیل اللہ غازی کو، عامل علیہا کو، غارم کو، اس شخص کو جس نے صدقہ کی کوئی شئے اپنے مال سے خریدلی ہو، یا اس شخص کو جس کا پڑوسی مسکین ہو اور وہ مسکین کو صدقہ کردے اور مسکین اسے ہدیہ کردے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے یا صحیح ہے اور ابوداؤد نے اُسے مُرسل اور موصول دونوں طرح روایت کیا ہے[۱]

بیٹے کے غنیٰ سے باپ غنی متصوّر ہوگا کسی غنی کو چونکہ بحیثیت فقیر اور مسکین کو زکوٰۃ حلال نہیں ہے تو غنیٰ (مالداری) کی بھی دو صورتیں ہیں کہ آدمی اپنے آپ بھی غنی ہوتا ہے اور دوسرے کی وجہ سے بھی غنی ہوتا ہے۔

باپ اگر غنی ہو تو اس کا چھوٹا بچہ غنی متصور ہوگا اور اس میں مذکر اور مؤنث کا فرق نہیں ہے لیکن اگر بیٹا بالغ تو وہ باپ کے غنی ہونے سے غنی متصور نہیں ہوگا اگرچہ اس کے اخراجات اس کے باپ کے ذمے ہوں، جیسے فقیر بیٹی جس کا شوہر نہ ہو اور فقیر بیٹا جو کسب (کمانے) سے عاجز ہو[۲]

فقیر (تنگدست) بیوی شوہر کی فراخی سے غنی متصور ہوگی کیونکہ بیوی از روئے شریعت اور از روئے رواج شوہر ہی کے ساتھ منسوب ہوتی ہے اس لیے شوہر کا اپنی بیوی کو زکوٰۃ

---

۱ المجموع (ج ۶، ص ۲۰۶) میں امام نووی فرماتے ہیں کہ اس کی سند ہر دو طریقہ پر جید ہے، بیہقی نے اس کی روایات کے طرق کو جمع کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ امام مالک اور ابن عیینہ نے اسے مُرسل نقل کیا ہے اور معمر اور ثوری جو کہ حافظ ہیں، انھوں نے موصول نقل کیا ہے، اور اگر کوئی حدیث مُرسل اور موصول دونوں طرح مروی ہو تو وہ مفصل ہی متصور ہوگی۔

۲ الهدایۃ و فتح القدیر، ج ۲، ص ۲۴۳۔

دینا درست نہ ہوگا کہ درحقیقت شوہر کا خود اپنے آپ کو دینا ہو جائے گا۔

حنفی فقہاء کی ظاہری روایت یہ ہے کہ مالدار شوہر کا اپنی فقیر بیوی کو زکوٰۃ دینا درست ہے خواہ اس کے لیے نفقہ واجب ہو یا نہ ہو۔ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے کیونکہ اس کے مالدار شوہر پر اس کا نفقہ لازم ہے اور وہ اس کے لیے کافی ہے خواہ وہ خود فقیر ہو یا غنی۔ اس لیے اسے شوہر کا زکوٰۃ دینا ایسا ہی ہے جیسا باپ کا اپنے چھوٹے بچے کو دینا۔[۱]

حنفی فقہاء نے غنی کی بیوی اور اس کے بیٹے میں یہ فرق بھی کیا ہے کہ بیوی کا نفقہ کا وجوب اجرت کے درجے میں ہے جبکہ بیٹے کا نفقہ اس بنا پر ہے کہ وہ باپ کا جزء ہے اس لیے بیٹے کو زکوٰۃ دینا خود اپنے آپ کو زکوٰۃ دینا ہوگا۔[۲]

بعض شافعی فقہاء کے نزدیک غنی کا اپنی فقیر بیوی کو اور فقیر بیٹے کو زکوٰۃ دینا درست ہے حالانکہ باپ اور شوہر پر نفقہ بھی لازم ہے، جبکہ دیگر فقہاء نے اس رائے کے برخلاف رائے دی ہے اور جو چند اقوال پر مشتمل ہے۔[۳]

جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ جس شخص کا نفقہ غنی پر واجب ہے وہ اسے زکوٰۃ نہیں دے سکتا خواہ وہ بیٹا ہو یا بیوی اور کوئی قریبی رشتہ دار کیونکہ اس کے نفقہ سے اسے کفایت حاصل ہو گئی اور کفایت ہی غنیٰ ہے۔[۴]

مالکی فقہاء کے نزدیک جس فقیر کا نفقہ غنی پر لازم ہو اس پر زکوٰۃ حرام ہے اگرچہ نفقہ بالفعل دینا شروع نہ کیا ہو کیونکہ وہ بذریعہ عدالت اور فیصلہ اسے لے سکتا ہے۔ البتہ اس حکم سے انھوں نے اس صورت کو مستثنیٰ کیا ہے جب غنی پر دعویٰ کرنا ممکن نہ ہو یا اس

---

[۱] ایضاً۔ وشرح العنایۃ علی ہامش الهدایہ۔

[۲] ایضاً۔ ۲۴۔

[۳] المجموع، ج ۶، ص ۱۹۱۔

[۴] شرح المخرشی علی خلیل، ج ۲، ص ۲۱۴۔

کے خلاف فیصلہ لینا درست نہ ہو۔[1]

میری رائے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ انسان کا کم عمر بچہ اور اس کی بیوی دونوں باپ اور شوہر کے غنی ہونے سے غنی متصور ہوں گے کہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ اور بیوی اپنے شوہر کے ساتھ ایک ہی شئے ہے اور ان کا نفقہ بلحاظ کتاب و سنت لازم ہے اور اس طرح ان کو دائمی کفالت حاصل ہے اور انھیں زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے اور نہ انھیں لینا جائز ہے۔ بخلاف دیگر رشتہ داروں کے کہ حکومت ان پر زکوٰۃ سے اور دیگر ذرائع سے خرچ کرنے کی پابند ہے اور اس طرح وہ اپنے رشتہ داروں کے نفقات سے مستغنی ہو جاتے ہیں اور مسلمان افراد کو بھی چاہیے کہ نفقہ سے زائد جو ان کی ضروریات رہ جائیں وہ ان کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ دیں یا ان کو اس قدر زکوٰۃ دیں کہ وہ نفقہ سے مستغنی ہو جائیں اور بالخصوص ان فقہاء کے مسلک کے حساب سے جو کہتے ہیں کہ فقیر اور مسکین کو عمر بھر کی کفایت کے بقدر دینا چاہیے۔[2] جو کہ رشتہ داروں کے نفقہ سے زیادہ وسیع اور گہری شئے ہے۔

●

---

[1] شرح الخرشی علی خلیل، ج ۲، ص ۲۱۴۔
[2] دیکھیے پچھلی فصل۔ فقیر اور مسکین کو کس قدر زکوٰۃ دی جائے۔

بحث دوم

کسب کے قابل مضبوط افراد

جو شخص مضبوط اور قوی ہو اور اس کا جسم آفات سے محفوظ ہو، اس پر بھی غنی کی طرح ازروئے حدیث زکوٰۃ لینا حرام ہے کیونکہ اس سے شریعت کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اپنے عمل (کسب) سے اپنی کفایت حاصل کرے اور بیٹھ کر صدقات پر بھروسہ کر کے زندگی نہ گزارے۔ لیکن اگر قوی تو ہو مگر معذور ہو اور اس وجہ سے کسب سے عاجز ہو تو جب تک اسے اس کے لائق کام میسر نہ آئے اس کی زکوٰۃ سے اعانت کی جائے گی۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ

"زکوٰۃ میں غنی اور قوی مکتسب کا کوئی حصہ نہیں ہے۔"[1]

بہر حال یہ بحث فقراء اور مساکین کے مصرف کے بیان میں گزر چکی ہے۔

حنفی فقہاء کی رائے اس کے برخلاف ہے اور ان کے نزدیک جو شخص زکوٰۃ سے کم نصاب کا مالک ہو اسے زکوٰۃ دینا درست ہے اگرچہ وہ صحیح اور مکتسب ہو، کیونکہ وہ فقیر ہے اور فقراء مصارف زکوٰۃ میں داخل ہیں، نیز یہ کہ حقیقی حاجت کا پتہ لگانا دشوار ہے اس لیے نصاب زکوٰۃ کے مالک نہ ہونے کو حاجتمند ہونے کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔

ابن الہمام کہتے ہیں کہ بیشتر فقہاء کے نزدیک کمانے والے کو زکوٰۃ لینا درست نہیں ہے کیونکہ ہم یہ فرمان نبوتؐ اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

---

[1] البحر (ج ۲، ص ۱۷۵) میں امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ فقیر میں ضعف اور بڑھاپا شرط ہے اور یہ کہ وہ سوال نہ کرے۔ مگر یہ حدیث اس رائے کے خلاف ہے۔ اور ابن العربی نے کہا ہے کہ اپاہج پر اس کو موقوف کرنا درست نہیں ہے۔

"زکوٰۃ غنی کو اور صحت مند قوی آدمی کو حلال نہیں ہے"

اور آپؐ نے ان دونوں اشخاص سے فرمایا جنھوں نے آپؐ سے زکوٰۃ مانگی اور بظاہر وہ تندرست تھے کہ

"اس میں تمھارا کوئی حق نہیں ہے، پھر بھی اگر تم کہتے ہو تو دے دیتا ہوں"

اس کا جواب انھوں نے یہ دیا ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ان کا سوال کرنا حرام ہے کیونکہ آپؐ نے فرمایا کہ

"اگر تم چاہو تو دے دیتا ہوں"

اور اگر اس کا لینا بھی حرام ہوتا تو آپؐ یہ نہ فرماتے۔[1]

یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے اور وہاں اس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ

"اگر تم چاہو تو میں تمھیں دے دوں لیکن غنی اور قوی مکتسب کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے"

اور آپؐ نے یہ ان سے اس لیے فرمایا کہ آپؐ کو ان کی حقیقی حالت کا علم نہیں تھا کیونکہ ہر مکتسب اور قوی کو اس کی کفایت کے بقدر نہیں ملتا، اس لیے آپؐ نے انھیں یہ سمجھا کر کہ غنی اور کمانے والے مضبوط آدمی کا کوئی حصہ نہیں ہے، انھیں عطا فرمایا۔

ابو عبید کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپؐ نے مالدار اور کمانے کی قوت رکھنے والے کو برابر کی حیثیت دی، خواہ قوی مالدار نہ ہو بہر حال دونوں برابر ہیں، الا یہ کہ اس طاقتور کے کمائی کے ذرائع موجود نہ ہوں اور وہ امکانی سعی کے باوجود محروم رہتا ہو اور اپنے بچوں کے گزارہ لائق نہ کما پاتا ہو۔ ان حالات میں اسے مندرجہ ذیل آیت قرآنی کی رو سے مسلمانوں کے مال میں سے لینے کا حق ہوگا۔[2]

وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ (الذاریات : ۱۹)

ان کے اموال میں سائل اور محروم کے لیے حق ہے۔

---

[1] الھدایہ و فتح القدیر : ج ۲، ص ۲۸۔

[2] الاموال، ص ۵۵۷۔

بحث سوم

کیا زکوٰۃ غیر مسلم کو دینا جائز ہے؟

زکوٰۃ ملحد، مرتد اور محارِب اسلام کو نہیں دی جائے گی

فقہائے اسلام کا اس امر پر اجماع ہے کہ اس کافر کو جو اہلِ اسلام سے برسرِ پیکار (محارِب) ہو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی[1] اور اس کی وجہ یہ فرمانِ الٰہی ہے۔

اِنَّمَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (الممتحنہ : ۹)

وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

کیونکہ محارِب (دشمن اسلام) اسلام سے اور مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہے حق کا اور اہلِ حق کا دشمن ہے اور اس کو امداد دینے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو قتل کرنے اور انھیں نقصان پہنچانے کے لیے امداد دی جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بات نہ قرینِ عقل ہے اور نہ اسلام کے مطابق ہے کہ دشمنانِ اسلام کی اعانت کی جائے تاکہ وہ اس اعانت سے بھی اسلام کو

---

[1] البحر الزخار : ج ۲/ص ۱۸۵۔

نقصان پہنچائیں، مسلمانوں کو قتل کریں اور ان کی مقدس حرمتوں کو پامال کریں۔

وہ ملحد جو اللہ کا، نبوتؐ کا اور آخرت کا منکر ہو وہ بھی کافر محارب ہی کی طرح ہے اور اسے بھی زکوٰۃ میں سے دینا اس کی دین دشمنی میں تعاون کرنا ہے۔

جو شخص مرتد ہو کر دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا ہو وہ تو اسلام کی نظر میں زندگی ہی کا مستحق نہیں ہے چہ جائیکہ اس کی زکوٰۃ کی مد میں سے اعانت کی جائے۔ اس نے اس قدر بڑا جرم کیا ہے اور اسلام سے اور مسلمانوں سے اس قدر عظیم خیانت کی ہے کہ وہ معاشرے میں زندہ رہنے کا حق کھو بیٹھا ہے۔ چنانچہ فرمانِ نبوتؐ ہے کہ

"جو شخص اپنا دین تبدیل کر دے اُسے قتل کر دو" [۱]

ذمیوں کو زکوٰۃ دینا ذمی اور اہلِ کتاب اور جو افراد ان کے زمرے میں آتے ہوں اور جو مسلم معاشرے میں رہتے بستے ہوں اور جنھوں نے اس اسلامی معاشرہ کی ذمہ داریوں کو قبول کر کے نظامِ اسلام کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیا ہو، اس بات پر آمادگی کا اظہار کر دیا ہو کہ تمدنی زندگی میں وہ اسلامی احکام کو قبول کرتے ہیں اور دارالاسلام کے باشندے بن جانا تسلیم کرتے ہیں یا آج کی زبان میں اسلامی مملکت کی "قومیت" اختیار کرتے ہیں —— ان کو زکوٰۃ دینے اور ان پر صرف کرنے کے بارے میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

نفلی صدقہ میں سے دینا اگر کوئی مسلمان رابطہ انسانیت کے تحت ذمی کو نفلی صدقات دے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ مسلمانوں میں اور ذمیوں میں معاہدہ ہوتا ہے اور اس طرح اس معاہدہ کی پاسداری ہوتی ہے اور اسلام سے انکار ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے مانع نہیں ہے تا وقتیکہ وہ اسلام کے برخلاف برسرِ پیکار نہ ہو جائیں، چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے۔ کہ

لَا یَنۡھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ

---

[۱] حضرت ابن عباسؓ سے احمد، بخاری اور اصحاب السنن نے روایت کی ہے۔

يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الممتحنہ : ۸)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی تھی جب بعض مؤمنین اپنے مشرک رشتہ داروں سے حسن سلوک کو تقویٰ کے خلاف تصوّر کرنے لگے تھے۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام اپنے مشرک رشتہ داروں پر صدقہ کا خرچ کرنا بُرا سمجھنے لگے تھے اس بارے میں جب سوال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس امر کی رخصت دی گئی۔[1]

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ

(البقرہ : ۲۷۲)

اے نبیؐ، لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمّے داری تم پر نہیں ہے ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور راہ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو تو جو کچھ مال تم راہِ خیر میں خرچ کروگے اس کا پورا پورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

ابن کثیرؒ[2] فرماتے ہیں کہ اگر صدقہ کرنے والا صرف رضائے الٰہی کی خاطر یہ کار خیر انجام

---

[1] ابن کثیر ج ۴، ص ۳۴۹۔

[2] ابن کثیر ج ۱، ص ۳۲۴۔

دے تو اسے ضرور خدا کے یہاں سے صلہ ملے گا، خواہ جس کو دیا ہو وہ نیک ہو یا بدکار مستحق ہو یا غیر مستحق، دینے والے کو ہر صورت میں اس کے ارادے اور نیت کا ثواب ہوگا، کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

اور ایک اور مقام پر اللہ نے اپنے نیک بندوں کی اس طرح تعریف فرمائی۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا

(الدھر : ۸)

اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت اسیر مشرک ہی تھے جیسا کہ حسن وغیرہ سے مروی ہے[۱]

صدقہ فطر سے دینا

صدقہ فطر اور کفارہ اور نذر کا صدقہ نفل صدقہ کے مانند ہے اور امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور بعض فقہاء نے اسے ذمیوں پر صرف کرنا جائز کہا ہے، کیونکہ اس سلسلے میں وارد دلائل عام ہیں، مثلاً صدقات کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ۔

(البقرہ : ۲۷۱)

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے تمہاری بہت سی برائیاں اس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔

اور کفاروں کے بارے میں فرمایا کہ

فَكَفَّارَتُهٗ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۴، ص ۳۹، ۴۰۔

أَهْلِيكُمْ (المائدہ : ۸۹)

کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو۔

فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا (المجادلہ : ۴)

اور جس میں یہ قدرت نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

ان آیات میں فقیر اور مسکین کے الفاظ عام ہیں، اس لیے یہ حکم کافر فقیر اور کافر مسکین کو بھی شامل ہے۔ اور نیز اس لیے بھی کہ یہ محض حُسنِ سلوک ہے جس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود فقہاء نے کہا ہے کہ ان صدقات کو فقراء مسلمین پر صرف کرنا افضل ہے، کیونکہ یہ ایک طرح سے اللہ کی اطاعت میں ایک مُسلم کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ غیر مُسلم دشمن اسلام اور محارب نہ ہو، کیونکہ اس کو دینے میں اسلام سے جنگ میں اس کی اعانت کرنا ہو جائے گا، جو کہ جائز نہیں ہے[1]

ابوعبید اور ابن ابی شیبہ نے بعض تابعین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ راہبوں کو صدقۂ فطر دینا جائز ہے[2]

زکوٰۃ میں سے دینا جمہور کے نزدیک جائز نہیں ہے

زکوٰۃ یعنی عشر، نصف عشر اور رُبع عُشر

جمہور فقہاء کے نزدیک غیر مسلم کو دینا درست نہیں ہے اور ابن المنذر نے کہا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ ذِمّی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے البتہ زکوٰۃ فطر میں اختلاف ہے[3]

---

[1] بدائع الصنائع : ج ۲، ص ۴۹۔

[2] الاموال، ص ۶۱۳/۶۱۴۔ المصنف : ج ۴، ص ۳۹۔

[3] المجموع : ج ۶، ص ۲۲۸۔ یہ مذکورہ اجماع مؤلفۃ القلوب کے علاوہ مصارف میں ہے۔

جمہور فقہاء کی سب سے مضبوط دلیل حضرت معاذ رضؓ کی یہ حدیث ہے کہ

"اللہ نے مسلمانوں کے مالوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقیروں کو لوٹائی جائے گی"

آپؐ نے اس حدیث میں حکم دیا کہ جن کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جائے انہی کے فقیروں کو دی جائے اور ظاہر ہے کہ وہ مسلمان ہوں گے۔ اس لیے زکوٰۃ غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے۔

دعویٰ اجماع کا جائزہ ابن المنذر نے اس موقع پر جس اجماع کا ذکر کیا ہے، وہ قابل قبول نہیں ہے جبکہ ابن سیرینؒ اور زہریؒ کی یہ رائے ہے کہ کافروں پر زکوٰۃ کا صرف کرنا درست ہے۔[1]

سرخسی المبسوط میں بیان کرتے ہیں کہ امام زفرؒ ذمی کو زکوٰۃ دینا جائز تصور کرتے ہیں اس پر سرخسی کہتے ہیں کہ تقاضائے قیاس بھی یہی ہے کہ مقصود زکوٰۃ اس عبادت کے ذریعہ فقیر محتاج کو غنی بنانا ہے مگر حدیث معاذ رضؓ اس رائے کے خلاف ہے۔[2]

ابن ابی شیبہ نے جابر بن زید سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کس کو صدقہ دیا جائے تو انھوں نے فرمایا اپنے اہلِ ملت مسلمانوں اور ذمیوں کو، اور بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ اور خمس ذمیوں میں تقسیم فرماتے۔[3]

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال فرض صدقہ (زکوٰۃ) کے بارے میں تھا، لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نفلی صدقہ کے بارے میں ہو مگر اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو صدقات جمع ہوا کرتے تھے وہ زکوٰۃ ہی ہوتے تھے۔ بہر حال یہ حدیث مرسل ہے۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے حضرت عمر رضؓ روایت کیا ہے کہ انھوں نے انما الصدقات

---

[1] ایضاً۔

[2] المبسوط، ج ۲، ص ۲۰۲۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۴، ص ۴۰۔

للفقراء کے بارے میں فرمایا کہ اہل کتاب کے اپاہج اور معذور مراد ہیں [1]

اور یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے ایک بوڑھے یہودی کا مسلمانوں کے بیت المال سے وظیفہ مقرر کردیا تھا اور دلیل انما الصدقات للفقراء، والمساکین کو بنایا اور کہا کہ یہ اہل کتاب کے مساکین ہیں [2]

الروض النضیر کے مصنف [3] ابن ابی شیبہ کا نقل کردہ حضرت عمرؓ کا یہ استدلال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک زکوٰۃ اہل کتاب پر صرف کرنا جائز تھا۔

المنار کے مصنف نے زیدیہ مسلک کے فقہاء کی یہی رائے نقل کی ہے۔ اور البحر [4] نے زہری اور ابن سیرین کا یہی قول نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی دلیل لفظ فقراء کا عموم ہے۔

طبری [5] نے عکرمہ سے إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ کے بارے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مسلمان فقراء کو مساکین نہ کہو، کہ مساکین اہل کتاب

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۴، ص ۴۰۔

[2] کتاب الخراج، ص ۱۲۶۔ ط۔ السلفیہ۔ البلاذری نے اپنی تاریخ میں (ص ۱۷۷) اسی قسم کا واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ دمشق کی سرزمین میں الجابیہ کے مقام سے گزرے تو آپؓ کو کچھ جذامی عیسائی نظر پڑے، آپؓ نے انھیں صدقات دینے کا حکم فرمایا اور ان کے روزینے جاری کرنے کا حکم دیا — یہاں بظاہر صدقات فرض زکوٰۃ ہی مراد ہے کیونکہ زکوٰۃ والی کے پاس ہوتی ہے اور وہی اس سے روزینہ جاری کرتا ہے۔

[3] ج ۲، ص ۴۲۶۔

[4] البحر الزخار: ج ۲، ص ۱۸۵۔

[5] تفسیر الطبری: بتحقیق محمود شاکر ج ۱۴، ص ۳۰۸۔

کے مساکین ہیں [1]

بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے کے لیے کوئی مسلمان مستحق نہ ملے تو ذمی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ جیسا کہ یہی قول جصاصؒ [2] نے عبید اللہ بن الحسن سے نقل کیا ہے اور یہی بعض اباضیہ کا قول ہے [3]

موازنہ اور ترجیح ہم کہتے ہیں کہ جمہور فقہاء کے مسلک کی بہت ہی قوی دلیل حضرت معاذؓ کی حدیث ہے جس کی صحت پر اتفاق ہے لیکن اس مسلک پر اس کی دلالت قطعی نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہو کہ زکوٰۃ جس علاقے کے لوگوں سے لی جائے گی اسی علاقے کے فقیروں پر صرف کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے کہا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔

فقہائے احناف نے جو دلائل ذکر کیے ہیں اور جن میں عموم ہے اور مسلمان فقیر اور غیر مسلم فقیر میں فرق نہیں کیا گیا ہے ان سے حضرت عمرؓ، زہریؒ، ابن سیرینؒ، عکرمہ، جابر بن زیدؒ اور زفرؒ سے مروی اقوال کی تائید ہوتی ہے۔ اور اسی پر سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

---

[1] ابو زہرہ، عبدالرحمٰن حسن اور خلاف نے اس تفسیر پر کہا ہے کہ مساکین سے اہلِ کتاب کے مساکین مراد لینے سے دو فائدے ہیں:

۱) ایک یہ کہ فقیر اور مسکین دو علیحدہ علیحدہ صنفیں ہیں، اور ایک کو ذکر کر دینا دوسرے کے ذکر سے مستغنی نہیں کرتا۔

۲) ذمی مسکینوں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ مطلقاً عاجز ہیں، کیونکہ قدرت والوں سے تو جزیہ لیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں ہے کہ ایک طرف ان سے جزیہ لیا جائے اور دوسری جانب انھیں زکوٰۃ دی جائے۔

ملاحظہ کیجیے: حلقۃ الدراسات الاجتماعیہ ص ۲۵۲۔

[2] احکام القرآن۔ ج ۳، ص ۱۵ ۳۔ الآستانہ۔

[3] شرح النیل: ج ۲، ص ۱۲۳۔

لَا یَنْہٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ ۔

یہ فقہاء کہتے ہیں کہ اس نصّ کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے کیونکہ زکوٰۃ دینا ان کے ساتھ حُسنِ سلوک ہے لیکن بہرحال حدیث معاذ رضؓ اس کی معارض ہے[1]

لیکن یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ حدیث معاذ رضؓ دوسری نصوص کے عموم کے مقابلہ کی نہیں ہے اور حضرت عمر رضؓ کی یہ رائے ذکر کی جا چکی ہے کہ ان کے نزدیک انما الصدقات کا عموم مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو مشتمل ہے ۔

ان دلائل کے موازنے سے میری رائے یہ ہوتی ہے کہ اصولاً زکوٰۃ مسلمان فقراء کو دی جائے ، کیونکہ خصوصیت کے ساتھ زکوٰۃ مسلمانوں ہی پر فرض ہے لیکن اگر مال زکوٰۃ کثیر مقدار میں موجود ہو تو زکوٰۃ میں سے ذمیوں کو دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے ، او بشر طیکہ انھیں دینے میں مسلمان فقراء کا نقصان نہ ہو۔ اور اس بارے میں آیت کا عموم ، حضرت عمر رضؓ کا فعل اور فقہاء کے اقوال کافی دلیل ہیں۔ اور یہ درگزر اور غیر مذہب کے لوگوں سے حسنِ سلوک کی اس قدر عمدہ مثال ہے کہ کوئی مذہب ایسی مثال نہیں پیش کر سکا۔

یہ مسئلہ اس صورت میں ہے جبکہ ذمیوں کو فقیر اور حاجتمند ہونے کی بنا پر زکوٰۃ دی جائے لیکن اگر انھیں بطور تالیف قلب ، اسلام کی محبت پیدا کرنے اور اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کی تائید پر آمادہ کرنے کے لیے زکوٰۃ دی جائے تو اس کا جواز کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول صؐ کے واضح دلائل سے ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں۔

اگرچہ ہم نے اس امر کو ترجیح دی ہے کہ مؤلفۃ القلوب کو ان کا حصّہ دینا اسلامی حکومت کی ذمّے داری ہے افراد کی نہیں ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومتیں

---

[1] البدائع ، ج ۲ ، ص ۴۹ ۔

اس سلسلے میں اسلامی حکومت کی قائمقامی کریں۔

یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جن فقہاء کے نزدیک ذمی کو زکوٰۃ سے دینا جائز نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذمی اگر فقیر ہو تو اسلامی حکومت اُسے بھوکا ننگا چھوڑ دے گی، بلکہ اسلامی حکومت بیت المال کے دیگر موارد فئے خمس غنائم، معادن اور خراج سے اس کی امداد کرے گی۔

ابو عبید نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی ایک تحریر کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے بصرہ کے عامل کو لکھا کہ

"ان ذمیوں کا خیال رکھو جو بوڑھے ہو گئے ہوں اور ان کے کمانے کے ذرائع مسدود ہو گئے ہوں ان کے لیے بیت المال سے مستقل روزینہ مقرر کر دو۔"[1]

اسلام کی خوبی ملاحظہ کیجیے کہ خلیفۂ اسلام نے اس امر کا انتظار نہیں کیا کہ مجبور و کمزور ذمی خود مطالبہ کرے بلکہ انھوں نے اپنے والی کو لکھا کہ وہ معلوم کرے کہ اس کی گورنری کی حدود میں کوئی بے سہارا اور ضعیف ذمی تو نہیں ہے اگر ہو تو بیت المال سے اس کی ضروریات پوری کرے۔ یہ ہے عدلِ اسلام!

کیا فاسق کو زکوٰۃ دی جائے گی؟

فاسق جب تک دائرۂ اسلام میں داخل رہے اُسے زکوٰۃ دینا جائز ہے تاکہ وہ اپنی حالت کی اصلاح کر سکے اور اس لیے کہ اقرارِ آدمیت کا تقاضا بھی ہے اور اس لیے بھی کہ فاسق مالدار سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے تو فاسق فقیر کو دینی بھی چاہیے۔ تاکہ اس حدیث کا عموم مکمل ہو جائے کہ

"زکوٰۃ ان کے مالداروں سے لی جاتی ہے اور ان کے فقراء کو لوٹائی جاتی ہے۔"[2]

---

[1] الاموال، ص ۴۶۔

[2] البحر الزخار، ج ۲، ص ۱۸۶۔

شرط یہ ہے کہ فاسق زکوٰۃ لے کر اسے فسق کے کاموں میں صرف نہ کرے مثلاً اسے شراب خریدے یا کوئی ناجائز کام کرے کیونکہ اللہ کا یہ مال اس لیے نہیں ہے کہ اس سے معصیت کے کاموں میں امداد بہم پہنچائی جائے۔ اور اس بارے میں غلبۂ ظن (گمان غالب) کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی لیے بعض مالکی فقہائے نے کہا ہے کہ اہل معاصی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اگر یہ گمان ہو کہ وہ اسے معاصی میں صرف کریں گے اور اگر یہ گمان نہ ہو تو جائز ہے۔[1]

مسلک زیدیہ کے فقہا کے نزدیک فاسق کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اور نہ اس پر صرف کرنا درست ہے ماسوا اس کے کہ وہ عامل ہو یا مؤلفۃ القلوب میں سے ہو۔[2]

میری رائے یہ ہے کہ وہ فاسق جس کے فسق مسلمانوں کو تکلیف نہ پہنچتی ہو اور اپنے فجور سے اور معاصی سے مسلمانوں کے ساتھ مجادلہ نہ کرے تو اسے دینا جائز ہے اگرچہ صالح اور صاحبِ استقامت مسلمانوں کو زکوٰۃ دینا زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر فاسق کھلم کھلا بدکار ہو اور اپنے فسق اور گناہوں کا برملا اظہار کرتا ہو تو اُسے زکوٰۃ کا مال اس وقت تک نہیں دینا چاہیے جب تک وہ اس سے توبہ نہ کرے، کہ ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ الحُبُّ فی اللّٰہ والبُغضُ فی اللّٰہ ہو۔[3]

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ : ۷۱)

---

[1] الشرح الکبیر و حاشیۃ الدسوقی: ص ۴۹۲- یہ رائے امام جعفر کے مسلک کے مطابق ہے جیسا کہ فقہ الامام جعفر ج ۲، ص ۹۳ میں ہے اور اباضیہ کی رائے کے مطابق ہے۔ جیسا کہ النیل اور اس کی شرح میں ہے (ج ۲، ص ۱۳۱-۱۳۲)

[2] شرح الازہار- ج ۱، ص ۵۲۰، ۵۲۱-

[3] اس حدیث کا مفہوم احمد اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے اور السیوطی نے اسے الجامع الصغیر میں حسن کہا ہے۔

مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

اس کا مقتضا یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کسی ایسے شخص کی اعانت نہ کرے جو اپنے معاصی سے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہو، گناہوں کا برملا اظہار کر رہا ہو اور اس طرح معاشرے کے عام شعور کو متأثر کر رہا ہو۔

اس سلسلے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ فسق اور معصیت کے مرتکب افراد کے ساتھ سختی کا برتاؤ ہے اور انھیں ہلاکت کی نذر کرنا ہے حالانکہ اسلام معافی، درگزر اور رحم کرتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ عفو و درگزر ان امور میں موزوں ہے جن میں معاصی ذاتی دائرے میں ہوں، لیکن اگر معاصی سے معاشرہ متأثر ہوتا ہو یا دین پر اور اہل دین پر اثر پڑتا ہو تو یہ جُرم قابلِ معافی نہیں ہے۔ کہ رحم کا مستحق وہی ہوتا ہے جو خود اپنے اوپر رحم کرے اور توبہ سے آدمی رحم کا مستحق ہو جاتا ہے اور جو شخص برابر معصیت کرتا رہے، شیطان کی اطاعت پر اصرار کرتا رہے اور معاشرے کو اور اس کی قدروں اور اخلاقی اصولوں کو پامال کرتا چلا جائے تو وہ کسی امداد کا مستحق نہیں ہے بلکہ مر ہی جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ جو خود اپنے آپ کی توہین کرے اس کی تکریم کیونکر کی جا سکتی ہے۔

وہ شخص کیونکر رحم اور معونت کا مستحق ہو سکتا ہے جو بھوکا ننگا مر جانا پسند کرے مگر توبہ نہ کرے، نماز نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے اور شراب اور بُرے کاموں کو ترک نہ کرے بلکہ اپنی اصلاح کا عزم بھی ظاہر نہ کرے!

اگر اس فاسق کا خاندان اسی کی عیالت کر رہا ہو تو اس کے خاندان کو اعانت کی جائے اور اس فاسق کی وجہ سے اس کے خاندان کو محروم نہیں رکھا جائے گا۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (الانعام : ۱۶۴)

ہر شخص کو جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمے دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اُٹھانے والا

دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

حضرت امام ابن تیمیہؒ سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا اہل بدعت کو اور نماز نہ پڑھنے والے کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے تو آپؒ نے فرمایا کہ زکوٰۃ دیتے وقت ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دینی چاہیے جو دیندار ہوں احکام دین کے پابند ہوں اور فقیر و مسکین اور غارمین وغیرہ ہوں جبکہ بدعت کا مرتکب اور اظہار فجور کرنے والا اس سزا کا مستحق ہے کہ اس سے ترک تعلق کیا جائے اور اسے توبہ کی نصیحت کی جائے، اس بنا پر اس کی اعانت نہیں کرنی چاہیے[1]

اور تارکِ صلوٰۃ کے بارے میں فرمایا کہ اسے نماز کا حکم دیا جائے گا اگر وہ توبہ کرے اور نماز کا وعدہ کرے اور پڑھنا شروع کر دے تو اس کی اعانت کی جائے گی ورنہ نہیں[2]

اور الاختیارات میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ

جو شخص زکوٰۃ لے کر اس سے اطاعت آلٰہی میں مدد نہ لے اسے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی کہ مقصود زکوٰۃ یہی ہے کہ مؤمنین فقراء اور غارمین کی احتیاج پوری کی جائے یا ان لوگوں کی اعانت کی جائے جو مسلمانوں کی مدد کرتے ہیں جیسے عاملین علیہا اور مجاہدین فی سبیل اللّٰہ اگر حاجتمندوں میں سے کوئی نماز نہیں پڑھتا تو اسے اس وقت تک کچھ نہیں دیا جائے گا جب تک وہ توبہ نہ کرلے اور ادائے صلوٰۃ کا التزام نہ کرے[3]

سیّد رشید رضا کی رائے مصلحِ اسلام سیّد رشید رضا نے اپنی تفسیر میں اس موضوع کے بارے میں بڑی عمدہ رائے کا اظہار فرمایا ہے[4]

جہاں جہاں تعلیم مغرب اور تہذیب فرنگ پہنچی ہے اخلاق کو اور اسلامی تربیت کو دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے اور الحاد کو اور زندقہ کو رواج دے دیا۔ اسلام کی نظر میں مرتد

---

[1] مجموعہ فتاوی ابن تیمیہ : ج ۲۵ ، ص ۸۷۔

[2] ایضاً ص ۸۹۔

[3] الاختیارات ، ص ۶۱۔

[4] المنار : ج ۱۰ ، ص ۵۹۶ ، ۵۹۷۔

حقیقی کافر سے بھی زیادہ اسلام کے لیے خطرناک ہے۔ اس لیے ایسے کسی شخص کو زکوٰۃ دینا ناجائز ہے (جیساکہ جمہور فقہاء کی رائے ہے)

ملاحدہ کی کئی قسمیں ہیں: بعض کھلم کھلا خدا کا انکار کرتے اور کائنات کے خالق کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور عبادت میں شریک کرتے ہیں۔

بعض وحی کا، رسالت کا، قرآن کا اور جزاء کا اور آخرت کی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔ اور بعض اسلام کو ایک سیاسی قومیت تصور کرتے ہیں اور ان کے نزدیک شراب پینا، زنا کرنا اور نماز ترک کرنا جائز ہے، اور وہ ارکان اسلام اور فرائض اسلام میں سے کسی حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔ عام مسلمانوں کے بالمقابل ان افراد کی بہت ہی معمولی تعداد ہے اس لیے ان میں سے کسی کو بھی زکوٰۃ نہ دی جائے بلکہ زکوٰۃ دہندہ کو زکوٰۃ دیتے وقت یہ جائزہ لینا چاہیے کہ جن کا عقیدہ صحیح ہو اور وہ اسلام کے امر و نہی پر پختہ یقین رکھتے ہوں، کیونکہ گناہ ہر مسلمان سے سرزد ہو سکتا ہے اور مسلمان جب گناہ کرتا ہے تو وہ اس پر توبہ بھی کر لیتا ہے۔

اہل السنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ وہ کسی کو کافر قرار نہیں دیتے اور کسی بھی اہل قبلہ پر گناہ کی وجہ سے عملی یا اعتقادی بدعت کی وجہ سے کفر کا فتویٰ نہیں لگاتے کہ وہ متأول ہے نص کا انکار کرنے والا ہے۔ اور جو مسلمان اللہ کے احکام اور ممنوعات کو تسلیم کرتا ہو اور اس سے گناہ سرزد ہو جائے اس میں اور اس شخص میں جو فرائض کے ترک کو اور فواحش کے ارتکاب کو جائز قرار دے بہت بڑا فرق ہے، کیونکہ جائز قرار دینے والا تو یہ سمجھتا ہی نہیں ہے کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہے جس پر اسے توبہ کرنی چاہیے۔

جس مسلمان کے اسلام میں شک ہو اسے زکوٰۃ نہیں دینی چاہیے ــــ جو لوگ ماہِ رمضان میں جمعہ کے روز عین مسجد جمعہ کے سامنے ہوٹلوں میں بیٹھے کھا پی رہے ہوتے ہیں، ان کو کس زمرے میں شمار کیا جائے وہ گناہ گار مسلمان ہیں، یا بے دین ملحد ہیں؟ بہرحال زکوٰۃ دہندہ کو چاہیے کہ وہ دیندار شخص کو زکوٰۃ دے لیکن اگر یہ خیال ہو کہ فاسق کی امداد سے اس کی اصلاح ہو جائے گی تو انھیں مؤلفۃ القلوب کی حیثیت

میں دے سکتا ہے۔

اہل اسلام کے مختلف فرقوں کو زکوٰۃ دینا

اہل السنت والجماعت دوسرے فرقوں کو جوان سے جُدا ہو گئے ہیں دو اصناف میں تقسیم کرتے ہیں۔

اہل البدع۔

اہل الاہواء۔

بدعت کی دو قسم ہیں ایک وہ بدعت جس کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے، جس میں بہت انتہا پسند بھی ہوتے ہیں اور ذرا درمیانے درجے کے لوگ بھی۔

اور دوسری بدعت وہ ہے جس سے انسان فاسق ہو جاتا ہے اور اس کے فکر اور اعتقاد میں فسق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کو فسق تاویل کہا جاتا ہے اور یہ عمل و سلوک کا فسق نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں اہل السنت کی رائے یہ ہے کہ جو فرقے الیسی بدعتوں کے مرتکب نہ ہوں جن سے انسان کافر ہو جاتا ہے[1] ان کے علاوہ تمام اہل قبلہ کو زکوٰۃ دینا جائز ہے بشرطیکہ ان میں نیکی اور استقامت موجود ہو۔ بلا شبہ زکوٰۃ دینے میں متبع سُنّت کو ترجیح دی جائے گی اگرچہ وہ انہی کی جانب منسوب ہو اور یہ گفتگو جواز اور عدم جواز کی ہے۔

شیعہ امامیہ جعفریہ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ لینے والا شیعہ اثنا عشری ہو، کیونکہ امام جعفر کا قول ہے۔

'اپنے ساتھیوں کو صدقہ اور زکوٰۃ دو'

اس شرط سے صرف مؤلفۃ القلوب مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر تو کفر اور نفاق کی موجودگی فرض کر لی گئی ہے اسی طرح عام مصلحت یا خاص حاجت کے لیے دی گئی زکوٰۃ بھی اس سے مستثنیٰ ہے۔

---

[1] حاشیۃ ابن عابدین : ج ۲، ص ۷۵۔

شیخ مغنیہ اپنی کتاب "فقہ الامام جعفر" میں لکھتے ہیں کہ یہ شرط زکوٰۃ کے ساتھ خاص ہے جبکہ باقی مستحب صدقات ہر شخص کو دینا جائز ہے [1]

جس نص پر شیخ نے اعتماد کیا ہے اس میں امام جعفر نے صدقہ اور زکوٰۃ دونوں کو اپنے ساتھیوں (اصحاب) کو دینے کا حکم فرمایا اور دونوں کو عطف کے ساتھ ذکر کیا اس لیے یہاں پر صدقہ کو فرض زکوٰۃ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اس طرح اس پر زکوٰۃ کے عطف کے کوئی معنی باقی نہیں رہیں گے۔ نیز یہ کہ اس فرمان میں ساتھیوں (اصحاب) کا جو لفظ آیا ہے اس سے تمام مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ اس قول کا انتساب امام جعفرؒ کی جانب درست ہو۔ چنانچہ آل بیت سے ایسی روایات بھی مروی ہیں جن سے اس عموم کی تائید ہوتی ہے۔

البحرانی "الحدائق" میں حضرت امام جعفرؒ کے بارے میں یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور عرض کی یہ پانچ سو درہم میرے مال کی زکوٰۃ ہے آپ اسے جہاں چاہیں صرف کر دیں، آپ نے کہا تم خود ہی اپنے پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور اپنے مسلمان بھائیوں میں تقسیم کر دو [2]

اس نص سے معلوم ہوا کہ محض دو امور کو دیکھنا ہے ایک ضرورت اور دوسرے اسلام۔ کہ اسلام کا رشتہ ہر رشتہ سے بلند تر ہے، کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اباضیہ کے یہاں ان کے مسلک کے برخلاف عام مسلمانوں کو زکوٰۃ دینے کے بارے میں اختلاف ہے۔

بعض کا کہنا یہ ہے کہ اگر فقیر ہو اور اس کے مسلک کے موافق یا مخالف ہونے کے بارے میں کوئی علم نہ ہو تو اسے زکوٰۃ دینا درست ہے اور بعض دیگر نے کہا ہے کہ مسلک کے مخالف کو بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک قول یہ ہے کہ اگر مخالف انہی میں رہتا ہو تو جائز ہے

---

[1] فقہ الامام جعفر الصادق: ج ۲، ص ۹۳۔

[2] فقہ الامام جعفر الصادق: ج ۲، ص ۹۳۔

اور ایک اور قول یہ ہے کہ اگر دہندہ کا رشتہ دار ہو تو جائز ہے۔

شرح النیل میں ہے کہ صرف مسلک کے افراد ہی کو زکوٰۃ دینا صحیح ہے اگر وہ نہ ہو تو جو اس معاملہ میں توقف اختیار کیے ہوئے ہو، یہ بھی نہ ہو تو وہ جو محض برأت کا اظہار کرے، اگر وہ بھی نہ ہو تو مخالف مسلک کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے مسلک میں صاحب تقویٰ ہو۔ اس کے بعد جو ہمارے مسلک پر گرفت نہ کرے اسے زکوٰۃ دی جائے اور اس کے بعد اسے دی جائے جس کی گرفت کم ہو اور اس کے بعد زیادہ گرفت کرنے والے کو دی جا سکتی ہے اور اگر ان میں سے کوئی موجود نہ ہو تو نصرانی، یا صابی یا یہودی یا مجوسی یا بُت پرست کو دے دی جائے یعنی اس صورت میں کہ دہندہ کی قوت قریب ہو اور کوئی مستحق زکوٰۃ اس کے پاس نہ ہو اور نہ ہی بھیجنے کا کوئی ذریعہ ہو تو وہ ان میں سے جو بھی موجود ہو اسے دے دے[1]

اس تفصیل سے یہی معلوم ہوا کہ اباضیہ مسلک میں بھی مسلک سے باہر افراد کو زکوٰۃ دینا زیادہ سے زیادہ دشوار ہے۔

زیدیہ مسلک کے مجموع الفقہ الکبیر میں ہے کہ

زید بن علیؒ نے فرمایا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ قدریہ[2]، مرجئہ[3]، حروریہ[4] اور آل محمدؐ سے برسرپیکار

---

[1] شرح النیل، ج ۲، ص ۱۳۳۔

[2] القدریہ: وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ محض اتفاق ہوتا ہے اور اللہ کو اس کا پہلے سے علم نہیں ہوتا بلکہ بعد ہی میں علم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات جہنی نے کہی جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ قدریہ کے لفظ کا اطلاق معتزلہ پر بھی ہوتا ہے لیکن یہاں مراد پہلا ہی گروہ ہے اور گمان یہی ہے کہ امام زیدؒ کے زمانے میں یہ لوگ وجود میں آ چکے تھے۔

[3] المرجئہ: اوّلاً ان لوگوں کو کہا گیا جو فاسقوں کی وعید نہیں بیان کرتے تھے، پھر ان لوگوں کو کہا گیا جو ایمان بلا عمل کے قائل تھے اور یہ کہ گناہ سے ایمان پر اثر نہیں پڑتا جس طرح کہ حالت کفر میں اطاعت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ویسے از روئے لغت ارجاء کے معنی تاخیر کے ہیں۔ یعنی ایمان کو عمل سے مؤخر کر دینا۔ اور غالباً یہی امام زید کی ہے۔

[4] حروراء کی طرف نسبت ہے جو کوفہ کے باہر ایک بستی تھی جہاں پہلے پہل خوارج جمع

(بقیہ آگے دیکھیے)

لوگوں کو نہ دو۔[1]

الروض النضیر میں ہے کہ مسلک امام یہ ہے کہ تاویل کی بنیاد پر فسق اختیار کرنے والے پر زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں ہے اور یہی قول الہادی، القاسم اور الناصر کا ہے۔

اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اغنیائکم کا خطاب مؤمنین سے ہے اور مقصود اس سے یہ ہے تاکہ زکوٰۃ کے مال سے ارتکاب معصیت میں مدد نہ ملے۔

لیکن سلف کی ایک جماعت جواز کی قائل ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں فضیل کی یہ روایت مروی ہے کہ انھوں نے ابراہیم نخعیؒ سے اصحاب اہوا کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: "وہ بھی حاجتمند ہونے ہی کی بنا پر سوال کرتے ہیں"

اور یہی رائے المؤید باللہ اور امام یحییٰ اور فقہائے احناف، اور شافعیہ کی ہے اس لیے کہ لفظ فقراء عام ہے اور اس لیے کہ زکوٰۃ عام مسلمانوں کے مالداروں سے لی جاتی ہے اور انہی کے فقراء پر تقسیم کی جاتی ہے۔

امام یحییٰ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا ایک قول یہ ہے کہ جس فاسق کے فسق عام مسلمانوں کو نقصان پہنچے اسے زکوٰۃ نہ دی جائے مثلاً محارب اور باغی وغیرہ کو اس طرح انھیں مسلمانوں کی ایذا رسانی میں امداد ہو جائے گی[2]

(بقیہ آگے) ہوئے، بعدازاں ہر خارجی کو ضروری کہا جانے لگا انھیں محکمہ اور شراۃ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سب حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کو کافر سمجھتے تھے۔

[1] جنھوں نے آل محمدؐ سے جنگ کی انھیں قتل کیا اور ان پر سختیاں کیں۔ یہ صورت حال خاندان سادات کے علاوہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی پیش آتی رہی ہے بلاشبہ خاندان سادات کے ساتھ زیادہ سختیاں زیادہ ہوئی ہیں۔ لیکن اجتہادی مسائل میں ان کے اختلاف رائے پر اجماع کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور بعض مسائل اصول دین جن میں جانبین کا شبہ زیادہ قوی ہو تو وہ خارج نہیں ہے۔ الروض النضیر: ج ۲، ص ۸۹، ۹۰۔

[2] الروض النضیر، ج ۲، ص ۴۲۳۔

بحث چہارم

کیا زکوٰۃ شوہر، والدین اور رشتہ داروں کو دی جا سکتی ہے؟

اگر دور کا رشتہ دار ہو اور اس کا نفقہ زکوٰۃ دہندہ کے ذمے نہ ہو، تو اسے زکوٰۃ دینا درست ہے خواہ خود زکوٰۃ دے یا اپنی زکوٰۃ امام یا نائب کے توسط سے دلوائے یعنی تقسیم زکوٰۃ کے ادارے سے دلوائے اور خواہ فقراء کے حصہ سے دے یا مساکین کے حصے سے دے۔

قریبی رشتہ دار مثلاً والدین، اولاد، بھائی، بہن، چچا، اور پھوپھیوں کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے بارے میں تفصیل ہے۔

اگر یہ قریبی رشتہ دار زکوٰۃ کا مستحق ہو اس لحاظ سے کہ عامل ہو، یا فی الرقاب یا الغارمین یا فی سبیل اللہ میں سے ہو، تو قریبی رشتہ دار اسے زکوٰۃ دے سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ وہ زکوٰۃ کا اس طرح مستحق ہے کہ اس میں قرابت اثر انداز نہیں ہوتی جب کہ قریب پر قرابت کے حوالے سے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس کا تاوان ادا کرے یا اس کے فی سبیل اللہ کے اخراجات برداشت کرے۔ وغیرہ

اسی طرح اگر قریبی رشتہ دار ہو تو اس کے اخراجات سفر دینا جائز ہے۔

مولفۃ القلوب کو انفرادی سطح پر دینا افراد کے لیے درست نہیں ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں حکومت کا کام ہے۔

اگر قریبی رشتہ دار فقیر یا مسکین ہو تو کیا اسے زکوٰۃ کے فقراء اور مساکین کے حصے سے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے اس کے جواب کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ مُعطی (دہندہ) کون ہے؟

اگر زکوٰۃ تقسیم کنندہ امام یا اس کا نائب ہو یا ہماری جدید تعبیر کے لحاظ سے حکومت

وقت ہو، یعنی حکومت خود ہی زکوٰۃ لیتی اور تقسیم کرتی ہو تو وہ ہر حاجتمند اور صاحب استحقاق کو دے سکتی ہے خواہ حکومت جس کو دے وہ زکوٰۃ دہندہ کا بیٹا، یا باپ یا اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو[1] کیونکہ صاحب زکوٰۃ حکومت کو دے کر بری الذمہ ہو جاتا ہے اور اس کی تقسیم کی ذمے داری حکومت پر آجاتی ہے کہ ادائیگی کے بعد مالک کا کوئی صلہ اور رشتہ مالک سے نہیں رہا اب یہ مال اللہ اور مال مسلمین بن چکا ہے۔

اور اگر قریبی رشتہ دار فقیر یا مسکین ہو اور دینے والا خود ہی دے تو قرابت داری کے درجے کو دیکھنا لازمی ہے اگر فقیر دہندہ کا باپ یا اس کی ماں ہو یا بیٹا ہو یا بیٹی ہو اور اس کا نفقہ اس پر لازم ہو تو یہ دینا درست نہیں ہے۔

ابن المنذرؒ فرماتے ہیں۔ کہ فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ والدین کو دینا جائز نہیں ہے اس صورت میں کہ ان کا نفقہ اس کے ذمے ہو، کیونکہ انھیں زکوٰۃ دینے سے وہ اس کے نفقہ سے مستغنی ہو جائیں گے جس کا فائدہ خود اسی کو پہنچے گا اور یہ اپنی زکوٰۃ خود اپنے آپ کو دینا ہو جائے گا جو کہ جائز نہیں ہے جیسے کسی شخص کو اپنی زکوٰۃ سے اپنا قرض ادا کرنا جائز نہیں ہے[2] نیز اس لیے بھی کہ اولاد کا مال باپ ہی کا مال ہے، اسی لیے سنن اور مسند میں مختلف طریقوں سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ —— "تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے"[3] جیسا کہ قرآن نے بیٹوں کے گھروں کو باپ کے گھر تصور کیا ہے، اور فرمایا کہ وَلَا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ

---

[1] ابن العربی: احکام القرآن، ص ۹۶۵۔

[2] ابن قدامہ: المغنی، ج ۲، ص ۶۴۷۔

[3] تفسیر ابن کثیر: ج ۲، ص ۳۰۵ —— اس حدیث کو احمد نے اپنی مسند میں بسند عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ تین طریقوں سے روایت کی ہے اور شیخ شاکر نے صحیح کہا ہے۔ دیکھیے احادیث نمبر ۶۶۷۸، ۶۹۰۲، اور ۷۰۰۱، ج ۱۱ و ۱۲۔ ابن ماجہ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقات ہیں، اور طبرانی نے سمرہ سے اور ابن مسعود سے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ دیکھیے المناوی: التیسیر، ج ۱، ص ۳۷۸۔

اَنْ تَأْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ (النور : ٦١) یہاں بیوت ابنائکم (تمھارے بیٹوں کے گھر)[1] مراد ہیں کیونکہ بقیہ رشتہ داروں کی طرح یہاں ان کا ذکر نہیں ہے اور اس لیے کہ انسان کا اپنے گھر سے کھانا ایسی بات نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور ارشاد نبوت ہے۔

"آدمی کا پاکیزہ کھانا اس کا اپنے ہاتھ کا کسب ہے اور اس کا بیٹا بھی اس کا کسب ہے"[2]

اسی بنا پر فقہائے احناف نے کہا ہے کہ والدین اور اولاد کی املاک متصل ہیں، اس لیے دونوں میں سے اگر کوئی فقیر ہو تو اس کو دینا مکمل تملیک نہیں ہوگی بلکہ ایک طرح سے زکوٰۃ کا خود اپنے اوپر صرف کرنا ہوگا اور ان کے مابین اس مضبوط تعلق ہی کی بنا پر ایک کی دوسرے کے حق میں گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔[3]

اولاد کو زکوٰۃ دینا بھی درست نہیں ہے کہ وہ باپ کا ایک جز ہیں اور انھیں دینا بھی خود اپنے آپ کو دینا ہے اور اس پر اس حدیث سے کوئی اثر نہیں پڑتا جو بخاریؒ اور احمدؒ نے معن بن یزید سے روایت کی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ نے کچھ دینار نکالے اور مسجد میں موجود ایک شخص کو صدقہ دینے لگے، میں پہنچا اور میں نے لے لیے، میرے باپ بولے کہ میرا تمھیں دینے کا ارادہ نہیں تھا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ مسئلہ لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا۔ اے یزید تم نے جو نیت کی وہ تمھاری پوری ہو گئی اور اے معن جو تم نے لیا وہ تمھارا ہو گیا۔

---

[1] تفسیر القرطبی: ج ۱۲، ص ۳۱۴۔

[2] ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے اور اس کی سند کو ترمذیؒ نے حسن کہا ہے اور ابو حاتم نے صحیح کہا ہے، جیسا کہ التیسیر (ج ۱، ص ۳۱۱) میں ہے اور احمدؒ نے بھی اسی طرح کی روایت بسند صحیح نقل کی ہے، جو حدیث نمبر ۶۶۷۸ اور ۷۰۰۱ کا حصہ ہے۔

[3] بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۴۹۔

کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نفلی صدقہ کا ذکر ہے اور فرض زکوٰۃ کا ذکر نہیں ہے جیساکہ شوکانی نے بیان کیا ہے[1]

اس کے برخلاف رائے صرف محمد بن الحسن سے مروی ہے اور شیعوں میں سے ابوالعباس سے یہ مروی ہے کہ والد اور والدہ کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اور متأخرین زیدیہ فقہائے نے اس کی تائید کی ہے، اور انھوں نے تمام اصول اور فصول اور تمام ذی رحم رشتہ داروں میں زکوٰۃ کی تقسیم کو جائز کہا ہے، اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ یہ رشتہ دار بھی فقراء اور مساکین کے عموم میں داخل ہیں اور کوئی خاص کر دینے والی نصّ موجود نہیں ہے[2]

جیساکہ امام مالکؒ سے مروی ہے کہ ان کے نزدیک پوتوں کو اور پردادا اور پردادی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے[3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن المنذر نے اور البحر نے جو اجماع نقل کیا ہے تو ان کے نزدیک یہ روایات صحیح نہیں ہیں کیوں کہ انھوں نے اس امر پر اجماع بیان کیا ہے کہ والد، والدہ، دادا اور دادی اور اسی طرح بیٹوں اور پوتوں کو زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے[4]

اس اجماع کی ابن المنذر نے یہ دلیل بیان کی ہے کہ ان قریبی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینے سے اس پر لازم ان کا نفقہ ساقط ہو جاتے گا جس کا فائدہ دہندہ کو پہنچے گا اور یہ خود اس کا اپنے آپ کو دینا ہو جائے گا۔

مگر ابن المنذر نے اس اجماع کی یہ شرط بیان کی ہے کہ جن قریبی رشتہ داروں کو دہندہ زکوٰۃ دے رہا ہے ان کا نفقہ اس پر لازم ہو۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو مثلاً بیٹا تنگ دست ہو اور نصاب کا مالک ہو جاتے اور اس میں اس پر زکوٰۃ عائد ہو جائے تو امام نوویؒ فرماتے

---

[1] نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۸۹۔

[2] الروض النضیر: ج ۲، ص ۴۲۱۔

[3] نیل الاوطار: ج ۲، ص ۱۸۹۔

[4] البحر الزخار: ج ۲، ص ۱۸۶۔

ہیں کہ اگر بیٹا یا باپ فقیر یا مسکین ہو اور اس پر نفقہ لازم نہ ہو تو باپ اور بیٹا ایک دوسرے کو فقراء اور مساکین کے حصہ سے زکوٰۃ دے سکتے ہیں، کہ اس صورت میں دہندہ مانند اجنبی ہوگا۔[1]

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اگر والد اور اس سے اوپر کی شاخ اور بیٹا اور اس سے نیچے کی شاخ فقیر ہوں اور زکوٰۃ دہندہ ان کے نفقہ سے عاجز ہو تو انھیں زکوٰۃ دے سکتا ہے کیونکہ زکوٰۃ کا مقتضا ضرورت اور فقر ہے جو یہاں موجود ہے اور کوئی شرعی مانع بھی موجود نہیں ہے۔

نیز ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں جو کہ مسلک احمدؒ میں ان کا ایک قول ہے کہ اگر ماں فقیر ہو اور اس کے چھوٹے بچے ہوں جن کے پاس مال ہو اور اس کے نفقہ سے بچوں کو نقصان ہو تو ان کی زکوٰۃ اسے دی جا سکتی ہے۔[2]

بیوی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے

والدین اور اولاد کے بارے میں جو امور بیان ہوئے وہی بیوی سے بھی متعلق ہیں۔ اسی لیے ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ فقہاء کا اس امر پر اجماع ہے کہ شوہر کا اپنی بیوی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے کیونکہ شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے جو اسے زکوٰۃ لینے سے مستغنی بناتا ہے، اس لیے اسے دینا بھی جائز نہیں ہے اور یہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسے وہ زکوٰۃ بطور نفقہ دے دے۔[3]

نیز یہ کہ بیوی شوہر کا ایک حصہ ہے فرمایا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (الروم : ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے

---

[1] المجموع : ج ۶، ص ۲۲۹۔

[2] اختیارات ابن تیمیہ، ص ۶۱/۶۲۔

[3] المغنی : ج ۲، ص ۶۴۹، نیل الاوطار : ج ۴، ص ۱۸۸۔

بیویاں بنائیں۔

اور شوہر کا گھر اس کا گھر ہے چنانچہ ارشاد ہُوا ہے۔

لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ (الطلاق : ۱)

نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو۔

اور بعض فقہاء نے جو کہا ہے کہ شوہر بیوی کو زکوٰۃ دے سکتا ہے[۱] تو یہ رائے قابلِ اعتبار نہیں ہے کہ فی الحقیقت شوہر کا بیوی کو دینا سیدھے ہاتھ سے دے کر الٹے ہاتھ سے لینا ہے۔

کیا بیوی اپنے فقیر شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے؟

امام ابوحنیفہؒ اور بعض دیگر فقہاء کے نزدیک بیوی کا اپنے فقیر یا مسکین شوہر کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے کیونکہ شوہر بھی بیوی کے لیے ہے اور شوہر کا اپنی فقیر بیوی کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اس لیے یہ بھی جائز نہیں ہے۔

لیکن بیوی کے دینے کو شوہر کے دینے پر قیاس کرنا نہ عقلاً درست ہے اور نہ نقلاً۔ از رُوئے عقل تو اس لیے کہ شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے اگرچہ بیوی مالدار ہو اور بیوی پر شوہر کا نفقہ لازم نہیں ہے اگرچہ شوہر تنگدست ہو۔ اور یہ یقیناً بہت بڑا فرق ہے[۲]

ابن قدامہ جواز کی وجہ بیان کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ شوہر کا نفقہ بیوی پر لازم نہیں ہے اس لیے بیوی ایک اجنبی کی طرح شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے، بخلاف شوہر کے بیوی کو زکوٰۃ دینے کے کہ بیوی کا نفقہ شوہر پر لازم ہے۔ اور نیز اس لیے کہ اصول زکوٰۃ دینے کا جواز ہے اور شوہر ان اصناف کے عموم میں داخل ہے جو زکوٰۃ کی بیان کی گئی ہیں اور کوئی نَصّ یا اجماع ایسا موجود نہیں ہے جو شوہر کے اس عموم کے داخل ہونے

۱۔ المجموع : ج ۶، ص ۲۲۹، ۲۳۰ - نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۸ - الروض النضیر ج ۲، ص ۴۲۰۔

۲۔ الاموال، ص ۵۸۸۔

سے مانع ہو، اور شوہر کو اس بات پر قیاس کرنا کہ چونکہ وہ بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اس لیے وہ لے بھی نہیں سکتا صحیح قیاس نہیں ہے اس لیے کہ ہر دو صورتوں میں فرق ہے اور اس طرح بیوی کا فقیر شوہر کو زکوٰۃ دینے کا جواز باقی اور ثابت ہے [۱]

از روئے نقل دلیل یہ ہے کہ احمدؒ اور بخاریؒ اور مسلمؒ نے عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ زینب سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے خواتین، صدقہ کیا کرو، خواہ اپنے زیورات میں سے کرو، میں اپنے شوہر عبداللہ کے پاس آئی اور ان سے کہا کہ آپ تنگدست ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کا حکم دیا ہے۔ آپ جا کر پوچھیں کہ کیا میری طرف سے جائز ہے، ورنہ میں کسی اور کو دے دوں، عبداللہ بولے نہیں تم خود ہی جاؤ، چنانچہ میں گئی، دیکھا کہ ایک انصاری عورت بابِ نبوتؐ پر موجود ہے اور اس کا بھی وہی مسئلہ ہے جو میرا تھا، دربارِ رسالت کا ہم پر بڑا رعب تھا ــ بلالؓ باہر آئے تو ہم نے ان سے کہا کہ وہ دربارِ نبوتؐ میں عرض کریں کہ دو عورتیں آئی ہیں اور یہ پوچھ رہی ہیں کہ کیا وہ اپنے شوہروں کو صدقہ دے سکتی ہیں اور ان یتیموں کو دے سکتی ہیں جو ان کی زیرِ پرورش ہوں، آپ یہ نہ بتلائیے کہ ہم کون ہیں، بلالؓ اندر گئے اور پوچھا، آپؐ نے فرمایا کہ ایک انصاری عورت ہے اور زینب ہیں، آپؐ نے پوچھا کہ کون سی زینب ہیں؟ بلالؓ نے عرض کی عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ۔ آپؐ نے فرمایا کہ دونوں کے لیے دو اجر ہیں رشتہ داری کا اجر اور صدقہ کا اجر۔" (احمدؒ، بخاریؒ، مسلمؒ)

بخاریؒ نے الفاظ کے تھوڑے سے فرق سے یہ روایت بیان کی ہے اور اس میں حضرت زینب کی جانب سے یہ الفاظ ہیں کہ

---

[۱] المغنی : ج ۲، ص ۶۵۰

کیا میری جانب سے یہ جائز ہے کہ میں اپنے شوہر پر خرچ کروں اور ان یتیموں پر خرچ کروں جو میرے زیرِ پرورش ہیں [1]

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ دے سکتی ہے اور یہی قول ثوریؒ امام شافعیؒ اور ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا ہے اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت یہی مروی ہے، اور الہادی الناصر اور المؤید باللہ کی یہی رائے ہے۔

اور مسئلہ کی یہ صورت صدقہ کو فرض صدقہ (زکوٰۃ) تصور کرنے کی شکل میں ہے جس کی المازری نے یقینی طور پر تائید کی ہے اور خود الفاظ حدیث کہ کیا میری طرف سے جائز ہے اسی پر دلالت کرتے ہیں، جب کہ بعض فقہاء نے اس حدیث کو نفل صدقہ پر محمول کیا ہے کہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ خواہ تم اپنے زیورات میں سے دو، اور ان حضرات نے کیا میری طرف سے جائز ہے (ایجزیٔ عنی) کی یہ تاویل کی ہے کہ کیا اس ذریعے میں آگ سے بچ سکتی ہوں۔ گویا انھیں اندیشہ تھا کہ اگر اپنے شوہر کو دیا تو ثواب ملنے اور عذاب سے محفوظ رہنے کا مقصود حاصل نہیں ہوگا۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر بیوی کا اپنے شوہر کو زکوٰۃ دینا جائز ہے کیونکہ اوّلاً: اس میں کوئی مانع موجود نہیں ہے اور جو عدمِ جواز کا قائل ہو دلیل اسے پیش کرنی چاہیے۔

ثانیاً: نیز یہ کہ سوال میں تفصیل کو ترک کرنا عموم پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں یہ تفصیل نہیں ہے کہ نفلی صدقہ جائز ہے یا فرض صدقہ جائز ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ فرض اور نفل ہر دو صدقات جائز ہیں [2]

---

[1] نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۸۷ - ۱۸۸

[2] نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۸۸ -

باقی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا

باقی رشتہ داروں مثلاً بھائی بہن، چچا پھوپی اور ماموں اور ممانی وغیرہ کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے بارے میں فقہاء میں کافی اختلاف ہے بعض فقہاء کے نزدیک ان سب رشتہ داروں کو دینا جائز ہے، بعض کے نزدیک کسی کو بھی دینا جائز نہیں ہے اور بعض دیگر کے نزدیک کچھ رشتہ داروں کو دینا جائز ہے اور کچھ کو دینا جائز نہیں ہے۔

جن کے نزدیک ناجائز ہے ان کے درمیان عدم جواز کی وجہ میں اختلاف ہے۔

کسی نے یہ وجہ مدِ نظر رکھی کہ وہ قریبی رشتہ دار عملاً خاندان کا ایک حصہ ہو یعنی اگر زکوٰۃ دہندہ نے اسے اپنے گھر والوں میں شامل کیا ہوا ہے تو اُسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

کسی نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ حکومت نے اسے اس کے نفقہ کا پابند کر دیا ہو، یعنی جس کا نفقہ عدالتی حکم کے ذریعہ دہندہ پر لازم ہو گیا ہو اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

اور کسی نے اس امر کو مدِ نظر رکھا ہے کہ از رُوئے شریعت جس کا نفقہ مزکّی (زکوٰۃ دہندہ) پر لازم ہے اسے زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے اور جس کا نفقہ شرعاً لازم نہیں ہے اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اس بارے میں پھر یہ اختلاف ہے کہ کون سے رشتے دار قریبی رشتے دار ہیں کہ ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

ابو عبید بیان کرتے ہیں کہ ابراہیم بن ابی حفصہ راوی ہیں کہ میں نے سعید بن جبیرؓ سے دریافت کیا کہ کیا میں اپنی خالہ کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں تو انھوں نے کہا، ہاں تا وقتیکہ تم اس پر دروازہ بند نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھارے عیال میں شامل نہ رہے۔

حسن فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی زکوٰۃ ان رشتہ داروں کو دے سکتا ہے جو اس کے عیال میں شامل نہ ہوں۔

عطاء کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے رشتہ دار اس کے عیال میں شامل نہ ہوں جن کی وہ پرورش کرتا ہو تو محتاج رشتہ دار دوسروں کے مقابلے میں اس کی اعانت کے زیادہ مستحق ہیں۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ اگر تم زکوٰۃ میں کسی ایسے شخص کو نہ دو جو تمھارے

عیال میں شامل ہو تو پھر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن اور ابن داؤد کا یہی مسلک ہے[1]

زیادہ مشہور رائے ان فقہاء کی ہے جنھوں نے ممانعت کی وجہ از روئے شریعت نفقہ کے لازم ہونے کو قرار دیا ہے، یعنی از روئے شریعت جس کا نفقہ لازم ہے اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اور اس کی انھوں نے دو وجوہ بیان کی ہیں۔

ایک یہ کہ جب اسے نفقہ مل گیا تو وہ خود غنی ہو گیا۔

دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دہندہ اسے زکوٰۃ دے کر خود فائدہ حاصل کرے گا کہ اس سے نفقہ ساقط ہو جائے گا۔[2]

یہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب ہے اور امام احمدؒ کی بھی ایک روایت یہی زید بن علی، الہادی، القاسم الناصر اور المؤید باللہ کی رائے ہے۔ اگرچہ ان کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ قریبی رشتے دار کون کون سے ہیں جن کے نفقہ لازم ہیں۔

زید بن علی اور احمد بن حنبل کی رائے ہے کہ مورث کا نفقہ وارث پر ہے؟ اور امام زید نے کہا ہے کہ وہ شخص بھی اس کو زکوٰۃ نہیں دے گا جس کا نفقہ امام نے اس پر لازم کیا ہو۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام کس پر نفقہ لازم کر سکتا ہے؟ تو ان کی رائے یہ ہے کہ ہر وارث پر۔[3]

امام شافعیؒ کے نزدیک نفقہ صرف اصول پر لازم ہے خواہ وہ کتنے ہی بلند ہوں اور فروع کے لیے ہے خواہ وہ کتنے ہی نیچے کے ہوں۔

نفقہ کے وجوب کے بارے میں امام مالکؒ کے مسلک میں سب سے زیادہ تنگی ہے کہ ان کے نزدیک صرف باپ پر اس کی مذکر اولاد کا نفقہ واجب ہے جو اس کی

---

[1] الاموال: ص ۵۸۲، ۵۸۳۔

[2] النووی المجموع، ج ۶، ص ۲۲۹، ابن العربی: احکام القرآن، ج ۲، ص ۹۶۰۔

[3] الروض النضیر: ج ۲، ص ۴۲۱۔ المغنی: ج ۲، ص ۶۴۷۔

صُلب (پُشت) سے ہو، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں[1] اور اس کی بچیوں کا نفقہ اس وقت تک لازم ہے جب تک ان کی شادیاں ہو جائیں اور اپنے شوہروں کے پاس جا چکی ہوں، بخلاف پوتے کے کہ اس کا نفقہ دادا پر لازم نہیں ہے جس طرح کہ ان پر ان کے دادا کا نفقہ لازم نہیں ہے۔ فقیر ماں باپ کا نفقہ بیٹے پر لازم ہے جس طرح کہ شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہے اور اس کے ایک (خادم) ملازم کا خرچہ بھی لازم ہے لیکن بھائی، بہن ذی قرابت اور ذی رحم رشتہ دار کا نفقہ لازم نہیں ہے[2] اس لحاظ سے جن فقہاء نے والدین اور اولاد کو قریبی رشتہ داروں میں شمار کیا ہے ان کے نزدیک مسلک مالکؒ میں انھیں زکوٰۃ دینا جائز ہے[3]

رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے قائل فقہاء

دیگر فقہاء کے نزدیک رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، سوائے ان فقہاء کے جن کے نزدیک والدین اور اولاد مستثنیٰ ہیں ان میں سے بعض کے نزدیک نفقہ قریبی رشتہ دار پر الزام اور اجبار (لازمی اور جبری) کے طور پر عائد نہیں ہوتا بلکہ بطور صلہ اور حسن سلوک لازم ہوتا ہے، اور بعض کے نزدیک نفقہ لازم ہوتا ہے لیکن یہ لزوم ادائے زکوٰۃ سے مانع نہیں ہوتا۔ اور یہ امام ابو حنیفہ رحؒ ان کے اصحاب اور امام یحییٰ کا مسلک ہے اور یہی امام احمدؒ کی ظاہر روایت ہے، اور

---

[1] شیخ علیش مالکی سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی طالب علم بالغ ہو اور کسب پر قادر ہو، کیا اسے اس کا باپ اپنے مال کی زکوٰۃ دے سکتا ہے، تو انھوں نے کہا کہ جائز ہے کیوں کہ اس کے بالغ اور کسب پر قادر ہو جانے کے بعد اس پر اس کا نفقہ لازم نہیں رہا ہے اور وہ علم میں مشغول ہونے کی بنا پر زکوٰۃ کا مستحق ہو گیا ہے۔ فتح العلی المالک: ج ۱، ص ۱۲۹۔

[2] المدونۃ الکبریٰ: ج ۱، ص ۲۵۶، ۱۳۲۴ھ

[3] ایضاً۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ ان سے ایک جماعت نے یہی رائے نقل کی ہے، اور ایک روایت میں اسحاق بن ابراہیم اور اسحاق بن منصور کا بھی نام لیا ہے اور ان سے جب پوچھا گیا کہ کیا بھائی بہن اور خالہ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ ماسوا والدین اور بیٹے کے ہر رشتہ دار کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ یہی اکثر فقہاء کی رائے ہے۔ اور یہی ابو عبید نے کہا ہے اس لیے کہ فرمانِ نبوّت ؐ ہے کہ

و مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے اور ذی رحم کو صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے [۱]

آپؐ نے اس فرمان میں نفل اور فرض کی کوئی شرط نہیں لگائی اور وارث وغیرہ میں کوئی فرق نہیں کیا اور نیز اس لیے کہ یہ رشتہ دار اجنبی کے مشابہ ہیں [۲]

ابن ابی شیبہ نے اور ابو عبید نے یہی رائے صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے نقل کی ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے رشتہ دار محتاج ہوں تو وہ انھیں زکوٰۃ دے گا۔

ابراہیم کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ نے ان سے اپنے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہا۔ کیا میں یہ زکوٰۃ اپنے یتیم بھتیجوں کو دے سکتی ہوں جو میری نگرانی میں ہیں، انھوں نے کہا کہ ”ہاں“۔

سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ میری زکوٰۃ کا مستحق میری زیرِ پرورش یتیم اور میرا قریبی رشتہ دار ہے۔

حسن سے کسی نے پوچھا کہ کیا میں اپنے بھائی کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں، انھوں نے کہا کہ بڑی خوشی سے۔

---

[۱] ماسوا ابوداؤد کے پانچوں محدثین نے روایت کیا ہے۔

[۲] المغنی، ج ۲، ص ۶۴۸۔

ابراہیم سے پوچھا گیا کہ ایک عورت کے پاس کچھ مال ہے کیا وہ اس کی زکوٰۃ اپنی بہن کو دے دے انھوں نے فرمایا، ہاں۔

ضحاک کہتے ہیں کہ تمہارے تنگدست رشتہ دار تمہاری زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں۔

مجاہد کہتے ہیں کہ جب اپنا ذی رحم رشتہ دار محتاج ہو تو کسی اور کو زکوٰۃ دینی قبول نہیں ہوتی۔[۱]

موازنہ اور ترجیح صحابۂ کرام تابعین اور بعد کے فقہائے کرام کے ان رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے بارے میں جو والدا ور بیٹے کے علاوہ ہوں اقوال ذکر کرنے کے بعد ہم اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں جس کو ابو عبید نے ترجیح دی ہے۔

اور اس ترجیح کے یہ دو دلائل ہیں۔

پہلی دلیل: فقراء کو زکوٰۃ دینے کے حکم پر مشتمل نصوص عام ہیں اور ان میں قریب اور اجنبی کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ مثلاً آیت صدقات (إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ) اور یہ حدیث کہ ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقیروں پر صرف کی جائے گی یہ عموم تمام رشتہ داروں کو شامل ہے اور کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ خاص ہو جائیں اور اس عموم سے خارج ہو جائیں بخلاف بیوی، والدین اور اولاد کے کہ ان رشتہ داروں کی تخصیص بذریعہ اجماع ہوئی جس کا ذکر ابن المنذر ابو عبید اور البحر کے مصنف نے کیا ہے اور جس کے دلائل ہم نے ذکر کیے ہیں۔

دوسری دلیل: صدقہ کے بارے میں رشتہ داروں کو خصوصی طور پر شامل رکھنے کے بارے میں احادیث موجود ہیں، مثلاً یہ فرمان نبوتؐ۔

ومسکین پر صدقہ، صدقہ ہے اور ذی رحم رشتہ دار پر صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔[۲]

صدقہ کا اطلاق جیسا کہ بیان ہوا یہاں زکوٰۃ ہی پر ہے۔

---

[۱] یہ اقوال دیکھیے: مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۴، ص ۴۷، ۴۸۔ الاموال ص ۵۸۱، ۵۸۲۔

[۲] احمدؒ نسائیؒ، ترمذیؒ، ابن حبانؒ، حاکم، دارقطنی، اور ترمذی نے حسن کہا ہے۔ نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۸۹۔

اور فرمایا۔کہ

"سب سے عمدہ صدقہ اپنے بہت ہی قریبی رشتہ دار کو جو آپ کے ساتھ اپنے دل میں دشمنی رکھتا ہو کو صدقہ دینا ہے"۔[1]

طبرانی اور بزاز نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے (وہی حدیث جو ہم پہلے بروایت احمد بخاری و مسلم نقل کر چکے ہیں) کہ —— اُن کی اہلیہ نے حضرت بلالؓ سے کہا کہ نبیؐ کو ایک مہاجر عورت کا سلام کہنا اور انھیں نہ بتانا اور ان سے یہ پوچھنا کہ

"کیا وہ اپنے شوہر کو صدقہ دے دے جو مہاجر ہے اور اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور اس کے یتیم بھتیجے اس کے زیرِ کفالت ہیں —— بلالؓ خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کو دہرا اجر ملے گا، رشتہ داری کا اجر اور صدقہ کا اجر"۔[2]

اصول فقہ اسلامی ISLAMIC JURISPRUDENCE کے ماہرین نے ایک اصول بیان کیا ہے کہ جہاں تفصیل کا احتمال موجود ہو اور اس کا بیان نہ کیا جائے تو وہ بات عموم پر دلالت کرتی ہے۔

اب رہ گیا یہ اشکال کہ زکوٰۃ دہندہ کا اپنے رشتہ دار کو زکوٰۃ دینا خود اس کے حق میں

---

[1] احمد نے روایت کی ہے اور طبرانی نے ابوایوب سے روایت کی ہے اور ان دونوں نے حکیم بن حزام سے بھی روایت کی ہے، اور اسے مجمع الزوائد میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔ اور الطبرانی نے الکبیر میں ام کلثوم بنت عقبہ سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ الروض النضیر، ج ۲، ص ۴۲۲۔

[2] طبرانی نے اس روایت کو اوسط میں نقل کیا ہے اور اسی کے مثل البزاز نے روایت کی ہے جس میں حجاج بن نصر ہے اور جسے ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے اگرچہ اس میں کلام ہے اور بزاز کی روایت کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۱۱۶۔ صحیح ابن حبان میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ الروض النضیر، ج ۲، ص ۴۲۲۔

باعث منفعت بن جائے گا اور اس کے اوپر سے نفقہ کا حق ساقط ہوجاتے گا تو اس حق کو بیوی اولاد اور والدین کے لحاظ سے مدِ نظر رکھا جائے گا۔ اس لیے کہ ان کے درمیان منفعتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں، وہ مال میں باہم شریک ہوتے ہیں اور کتاب وسنت کے ذریعے ان کا نفقہ واجب ہے۔

باقی رشتہ داروں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ان کا نفقہ کسی شخص پر اس وقت لازم ہوتا ہے جب بیت المال میں زکوٰۃ فئے خمس اور دیگر اموال موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں قریبی فراخ دست رشتہ دار پر نفقہ لازم ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس رشتہ دار کو بھوکا ننگا نہیں چھوڑا جا سکتا۔

اسی طرح اگر ایسی اسلامی حکومت موجود نہ ہو جو زکوٰۃ جمع کرنے اور پھر فقراء کی زندگی کی ضمانت قبول کرنے پر تیار ہو تو ظاہر ہے کہ قریبی مالدار شخص پر اپنے فقیر رشتہ دار کی کفایت کرنا لازم ہوگا، اور اسے بھوک اور درماندگی کا شکار نہیں چھوڑا جاتے گا۔ اور اس امر میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنی اس ذمے داری کو زکوٰۃ کی مد سے پورا کرے۔

کیونکہ اصل فرض یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کی خبر گیری کی جائے، اس کی بھوک کا مداوا کیا جاتے اور اس کی تکالیف دور کی جائیں تاکہ صلہ رحمی کے تقاضے پورے ہوں اور اس کے حقوق ادا ہوجائیں، اور ظاہر ہے کہ وہ بھی فقراء پر صرف کرے گی جن میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ گویا حکومت کے اس ذمے داری کو پورا نہ کرنے کی صورت میں ہر مسلمان فرد اس ذمے داری کو خود پورا کرے گا اور امام کی نیابت کے طور پر اپنے قریبی رشتہ داروں کی کفالت اور کفایت کرے گا اور جس زکوٰۃ کو جمع کرنا اور تقسیم کرنا امام کی ذمے داری تھی اس ذمے داری کو وہ خود پورا کرے گا۔

علاوہ بریں بعض فقہاء کے نزدیک کسی رشتہ دار کے نفقہ کے لزوم میں اور اسے زکوٰۃ دینے میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اور ان کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ نفقہ بھی لازم ہے اور انہی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا بھی جائز ہے۔

اور یہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے ہے کہ ان کے نزدیک نفقہ

کا لزوم زکوٰۃ دینے سے مانع نہیں ہے بلکہ اصل مانع یہ ہے کہ زکوٰۃ دہندہ اور جسے زکوٰۃ دی جارہی ہے دونوں کی ملکیتوں کے منافع باہم ایک ہوں اور اس طرح تملیک وجود میں نہ آئے جو کہ ان کے یہاں زکوٰۃ کا رکن ہے، اور یہ ایسی صورت ہو جائے گی جیسے زکوٰۃ دہندہ نے خود اپنے آپ کو زکوٰۃ دی ہو۔ اور یہ صورت صرف ایک انسان، اس کی اولاد، اس کے والدین میں ہی پیش آتی ہے، اور اسی وجہ سے ان کی ایک دوسرے کے حق میں شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ بخلاف باقی رشتہ داروں کے کہ انھیں دینے سے تملیک مستحق ہو جاتی ہے، کیونکہ ان کی ملکیتوں کے منافع جدا جدا ہیں اور اسی بنا پر ان کے ایک دوسرے کے حق میں شہادت بھی درست ہے[1]

متأخرین زیدیہ میں سے الروض النضیر کے مصنف کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ رشتہ دار کو زکوٰۃ دینے سے اس کا جو نفقہ دہندہ پر لازم آئے گا وہ ساقط ہو جائے گا تو یہ وجہ اس لیے قابل قبول نہیں ہے کہ یہ احادیث کے معارض ہے جن میں رشتہ داروں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ وجہ اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ نفقہ وقتاً فوقتاً لازم ہوتا ہے اور زکوٰۃ دینے سے نفقہ ساقط نہیں ہوتا[2]

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ اصل عدم مانع ہے (کسی مانع کا وجود نہ ہونا اصل ہے) اگر کوئی کہتا ہے کہ قرابت یا نفقہ کا وجوب مانع ہے تو اُسے دلیل دینی چاہیے اور کوئی دلیل موجود نہیں ہے[3]

●

---

[1] بدائع الصنائع: ج ۲، ص ۴۹، ۵۰۔

[2] الروض النضیر: ج ۲، ص ۴۲۳۔

[3] نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۸۶۔

بحث پنجم

آلِ محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

آلِ محمدؐ پر صدقہ کے حرام ہونے کے بارے میں احادیث

احمد اور مُسلم نے روایت کیا ہے کہ مطلب بن ربیعہ اور فضل بن عبّاس رسول اللہ صلّی علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ایک نے عرض کی یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہم آپؐ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ آپؐ ہمیں بھی صدقات کا کام دے دیں۔ اور ہم بھی اس سے وہی فائدہ اٹھائیں جو لوگ اُٹھاتے ہیں اور جس طرح وہ آپ کو لاکر دیتے ہیں ہم بھی آپؐ کو لاکر دے دیں، آپؐ نے فرمایا کہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے لیے صدقہ موزوں نہیں ہے کہ یہ لوگوں کا میل کچیل ہے۔

اور ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ صدقہ محمدؐ کو اور آلِ محمدؐ کو حلال نہیں ہے[1]

ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور ترمذیؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ ابو رافع جو آپؐ کے خادم (مولی) تھے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بنی مخزوم کے ایک شخص کو والی بنایا، اس نے ابو رافع سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ آجاؤ تمھیں بھی حصّہ ملے گا، مَیں نے کہا کہ مَیں آپؐ سے اجازت لے لوں، مَیں نے آپؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا گھر کا خادم بھی خاندان کا ایک فرد ہوتا ہے اور ہم اہل بیت کو صدقہ حلال نہیں ہے[2]

امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے (باب مایذکر فی الصدقۃ للنبیؐ وآلہ) روایت کیا

---

[1] نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۷۵۔

[2] المجموع: ج ۶، ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ حسنؓ بن علیؓ ابھی بچے ہی تھے انھوں نے صدقہ کی ایک کھجور اٹھاکر منہ میں رکھ لی، آپؐ نے فرمایا تھو تھو تاکہ وہ منہ سے نکال دیں اور فرمادیا، تمھیں نہیں معلوم کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے" مسلم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

حافظ نے مسلم کی روایت میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ — "ہمیں صدقہ حلال نہیں ہے"۔ اور معمر کی روایت میں ہے کہ "آل محمدؐ کو صدقہ حلال نہیں ہے"۔

اسی طرح احمدؒ اور طحاوی نے خود حسنؓ بن علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا کہ میں نے کھجور کی ایک کھلیان سے کھجور اٹھاکر منہ میں رکھ لی، آپؐ نے اسے تھکوادی اور اس کا پانی تک تھکوادیا اور فرمایا کہ ہم آل محمدؐ کو صدقہ حلال نہیں ہے" اس روایت کی سند قوی ہے[1]

یہ تمام مذکورہ احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آل محمدؐ کون ہیں؟ کون سا صدقہ انھیں حلال نہیں ہے؟

ان دونوں امور میں فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل ہم یہاں بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد راجح رائے بیان کریں گے۔

آل محمدؐ کون ہیں؟

حافظ (ابن حجر) نے الفتح میں اور شوکانی نے النیل میں اختلاف فقہاء کا ذکر اس طرح کیا ہے[2]

امام شافعیؒ اور فقہاء کی ایک جماعت کے نزدیک بنو ہاشم اور بنو مطلب آل محمدؐ ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ذوی القربیٰ کے حصے میں بنی ہاشم کے ساتھ بنی المطلب کو بھی شامل فرمایا اور ان کے علاوہ قریش کے کسی اور قبیلہ کو یہ حصہ نہیں دیا، اور یہ حصہ عوض تھا صدقہ کے حصہ سے محرومی کا جیسا کہ امام بخاریؒ نے حضرت جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے کہ وہ

---

[1] الفتح: ج ۳، ص ۲۲۸۔

[2] فتح الباری: ج ۳، ص ۲۲۷۔ نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۸۲، ۱۸۴۔

بیان کرتے ہیں کہ

"میں اور عثمانؓ بن عفان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ نے خمس خیبر میں سے بنو المطلب کو حصہ دیا اور ہمیں چھوڑ دیا، حالانکہ ہم اور وہ ایک ہی درجے میں ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو المطلب اور بنو ہاشم ایک ہی شئے ہیں"

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بنو المطلب اور بنو ہاشم کو آپؐ نے اپنی موالات (ساتھ دینے) کی بنا پر دیا تھا، صدقہ کے معاوضہ کے طور پر نہیں دیا تھا۔

امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور ھادویہ مسلک کے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ صرف بنو ہاشم ہی آل محمدؐ ہیں۔ امام احمدؒ سے بنو المطلب کے بارے میں دو اقوال ہیں (کہ آل محمدؐ ہیں اور یہ کہ آل محمدؐ نہیں ہیں)۔

دیگر فقہاء کا یہ قول ہے کہ بنو غالب بن فہر مراد ہیں، جیسا کہ الفتح میں ہے۔

بنی ہاشم سے مراد حضرت علی، حضرت عقیل، حضرت جعفر، حضرت عباس اور حرث کی اولاد ہیں اور ابولھب کی اولاد ان میں داخل نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی حیاتِ طیبہ میں اسلام نہیں لایا تھا۔ لیکن جامع الاصول میں ہے ابولھب کے دو بیٹے عتبہ اور معتب فتح مکہ کے موقع پر اسلام لے آئے تھے اور آپؐ نے ان کے اسلام پر اظہار مسرت فرمایا، ان کے لیے دعا کی، اور یہ دونوں آپؐ کے ساتھ حنین اور طائف کے معرکوں میں شریک ہوئے اور ان کی اولاد چلی۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بنی ہاشم کو زکوٰۃ حلال نہیں ہے، اور یہ کہ ابو طالب اہل بیت سے ہیں، اس قول کو البحر میں بھی نقل کیا گیا ہے اور ابن ارسلان نے اس کو اجماع کے طور پر بیان کیا ہے۔

الطبریؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے جواز نقل کیا ہے کہ اگر انہیں ذوی القربیٰ نہ مل رہا ہو تو زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ اس قول کو طحاوی نے بھی نقل کیا ہے۔ اور مالکی مسلک کے بعض فقہاء نے الابہری سے ان کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ اور الفتح میں کہا ہے کہ یہی رائے مسلک

شافعیؒ کے بعض فقہاء کے نزدیک درست ہے۔

امام ابو یوسفؒ سے یہ رائے منقول ہے کہ اہل بیت ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، اور البحر میں زید بن علی، المرتضیٰ ابوالعباس اور امامیہ فقہاء کا یہی قول نقل کیا گیا ہے اور الشفاء میں ابن الہادی اور ابن القاسم العیانی کا یہی قول درج ہے۔

حافظ (ابن حجر) کہتے ہیں کہ مالکی مسلک کے فقہاء کے یہاں اس سلسلے میں چار اقوال ہیں۔ کہ جائز ہے، ناجائز ہے، نفل صدقہ جائز ہے زکوٰۃ جائز نہیں ہے اور زکوٰۃ جائز ہے نفل صدقہ جائز نہیں ہے۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ جو احادیث عموم کے ساتھ حرمت پر دلالت کرتی ہیں وہ ان سب اقوال کو رد کرتی ہیں، جبکہ کہا گیا ہے کہ یہ احادیث معناً متواتر ہیں اور ان آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ اگر آپؐ زکوٰۃ اپنی آل کے لیے جائز رکھتے تو یہ طعن (الزام) کا ایک سبب بن سکتا تھا۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى

(الشوریٰ : ۲۳)

کہہ دو کہ میں اس کام پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (ص : ۸۶)

(اے نبیؐ) ان سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ : ۱۰۳)

(اے نبیؐ) تم ان کے اموال میں صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں انھیں بڑھاؤ۔

اور آپؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ

"زکوٰۃ لوگوں کا میل کچیل ہے" (مسلم[1])

جن فقہاء نے کہا ہے کہ ہاشمی، ہاشمی سے زکوٰۃ لے سکتا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے الحاکم کی تخریج کردہ حضرت عباسؓ کی اس حدیث کو دلیل بنایا ہے جسے انھوں نے علوم الحدیث کی سینتیسویں[۳۷] نوع میں ذکر کیا ہے اور اس کی پوری سند بنی ہاشم کی ہے کہ

"حضرت عباس بن عبد المطلب نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آپؐ نے فرمایا، ہاں"

اس حدیث کے بعض راوی 'متہم' کہے گئے ہیں۔

ابن حجرؒ اور شوکانیؒ کے ان اقوال کے بعد ہم یہاں پر مسالکِ اربعہ کی کتب سے اتمام فائدہ کے لیے مزید اقوال نقل کرتے ہیں۔

فقہ حنفی کی کتاب مجمع الانہر میں ہے کہ

امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ اہلِ بیت کو نفلی اور فرض صدقہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور انھیں زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

امام محمدؒ کے آثار میں ہے کہ امام سے ہر دو روایات ہیں اور ہم جواز کے قائل ہیں کیونکہ تحریم کا تعلق زمانۂ نبوتؐ سے تھا۔

المنتقی میں ہے کہ امام سے یہ مروی ہے کہ ہاشمی، ہاشمی کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔ اور

---

[1] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے نفل صدقہ کا جواز مستنبط ہوتا ہے نہ کہ فرض کا، جو کہ اکثر فقہائے احناف کا مسلک ہے اور جسے مسلک شافعیؒ اور حنبلیؒ کے فقہا نے صحیح کہا ہے۔ اور اس کے برعکس یعنی فرض جائز ہے اور نفل جائز نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ فرض سے کوئی ذلت لازم نہیں آتی بخلاف نفل کے۔ اور بنی ہاشم اور غیر بنی ہاشم میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ ممانعت کا سبب یہ ہے کہ ادنیٰ کا اعلیٰ پر بلند نہ ہو لیکن اگر اعلیٰ کا اعلیٰ پر بلند ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ الفتح ج ۳، ص ۲۲۷۔

اسی سے ہمارے زمانے میں مطلق جواز کی رائے لی گئی ہے، الطحاوی کہتے ہیں کہ یہی ہماری رائے ہے اور قہستانی وغیرہ نے اسی کی تائید کی ہے [۱]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس امر کو ترجیح دی ہے کہ بنی ہاشم، بنی ہاشم سے زکوٰۃ لے سکتے ہیں [۲] اور یہی رائے مسلک جعفری کی بھی ہے [۳]

ان مسالک میں سب سے سخت رائے مسلک زیدیہ کے فقہاء کی ہے کہ ان کے نزدیک ہاشمی کا ہاشمی کو زکوٰۃ دینا بھی جائز نہیں ہے اور ان کے نزدیک ہاشمی کا مردار کھا لینا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت زکوٰۃ کھانے کے، اور اگر مردار کھانے سے اُسے نقصان کا اندیشہ ہو تب وہ زکوٰۃ قرض کے طور پر لے سکتا ہے اور جب ممکن ہو اسے واپس کر دے۔ اور یہ مسئلہ اس مضطر (مجبور) سے متعلق ہے جو تلف ہو جانے، ہلاک ہو جانے اور بھوک، پیاس سے مرجانے کے قریب ہو [۴]

غنائم اور فئے سے محرومی کی صُورت میں حکم

یہاں ایک اہم سوال یہ در پیش ہے کہ اگر بیت المال میں غنیمت اور فئے کا مال نہ ہو، یا بیت المال ایسے لوگوں کے قبضہ میں ہو جو اہل بیت کو اس میں سے نہ دے . . . تو مسلک مالکؒ کے بعض فقہاء نے کہا ہے کہ انھیں زکوٰۃ کے نہ دینے کا حکم اسی صورت میں ہے جب انھیں بیت المال سے ان کا حق مل رہا ہو، اگر بیت المال سے ان کا حق نہ ملے اور کم مائیگی انھیں پریشان کرے تو انھیں زکوٰۃ میں سے دیا جا سکتا ہے پھر اس میں بہتر یہ ہے کہ ہاشمی ہاشمی کو زکوٰۃ دے۔

---

[۱] مجمع الانہر: بحاشیہ درا لمنتقی: ص ۲۲۴۔

[۲] مطالب اولی النہی: ج ۲، ص ۱۵۷۔

[۳] فقہ الامام جعفر: ج ۹، ص ۹۴، ۹۵۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مستحب زکوٰۃ تمام لوگوں کی طرف سے جائز ہے، جیسے زکوٰۃ تجارت جائز ہے، علاوہ گندم، جو، چھوارا اور کشمش فصلوں اور پھلوں میں سے۔

[۴] شرح الازھار و حواشیہ: ج ۱، ص ۵۲۰، ۵۲۴۔

بعض فقہاء کے نزدیک یہ اعطاء (زکوٰۃ کا دینا) ضرورت کے ساتھ مقید ہے اور ضرورت (اضطرار) کی وہ حالت ہے جب اکل میتہ حلال ہو جائے ۔ اس تعبیر کا مطلب یہ ہوا کہ تحریم باقی ہے اور ضرورت کے وقت جائز ہے، جیسا کہ حالتِ اضطرار میں دوسرے محرمات جائز ہو جاتے ہیں۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ بعد کے زمانوں میں یقین کمزور پڑ گیا ہے، اس لیے انھیں زکوٰۃ دینا زیادہ سہل ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ (ہاشمی) کسی ذمی کافر اور فاجر کی خدمت کریں۔[1]

فقہائے احناف کے اقوال ہم نقل کر چکے ہیں۔

فقہائے شافعیہ میں سے ابو سعید اصطخری کہتے ہیں کہ اگر انھیں ان کا خمس کا حق نہ دیا گیا ہو تو انھیں زکوٰۃ دینا جائز ہے کیونکہ جب وہ خمس الخمس میں سے اپنے حصے سے محروم ہیں تو انھیں زکوٰۃ میں سے دیا جانا جائز ہے۔

امام نوویؒ امام رافعیؒ سے ذکر کرتے ہیں کہ امام غزالیؒ کے صاحب (تلمیذ) محمد بن یحیٰی کا یہی فتویٰ تھا۔[2]

اسی طرح ابن تیمیہؒ، حنابلہ میں سے قاضی یعقوب نے اس امر کو ترجیح دی ہے کہ اگر انھیں غنائم اور فئے کا خمس نہ ملے تو انھیں زکوٰۃ لینا جائز ہے اس لیے کہ یہ محل حاجت اور ضرورت ہے۔[3]

اور یہی امامیہ اور جعفریہ کا مسلک ہے۔[4]

بہر حال جمہور فقہاء اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ بنی ہاشم کو (صرف انھیں یا بنی المطلب

---

[1] حاشیۃ الصاوی: ج ۱، ص ۲۳۲ - فتح العلی المالک، ج ۱، ص ۱۴۱۔

[2] المجموع: ج ۶، ص ۲۲۷، ۲۲۸۔

[3] مطالب اولی النہی: ج ۲، ص ۱۵۷۔

[4] فقہ الامام جعفر: ج ۲، ص ۹۵۔

کو بھی) زکوٰۃ دی جاتے، اگرچہ انھیں خُمس نہ ملے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ سے انھیں اس لیے محروم رکھا گیا ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عزت حاصل ہے[۱]

موازنہ اور ترجیح میری رائے یہ ہے کہ موجودہ دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو دینا زیادہ بہتر اور عمدہ ہے کیونکہ اب وہ غنائم اور فئے کے خُمس سے محروم ہیں۔ جس کے ذریعے عہدِ نبوت میں اللہ نے ان کی صدقہ سے محرومی کا بدل پیدا فرما دیا تھا۔

'ذوی القربیٰ' کے حصّہ کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ

(الانفال: ۴۱)

اور تمھیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

مَا اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ

(الحشر: ۷)

جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔ تاکہ وہ تمھارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

---

[۱] المجموع: ج ۶، ص ۲۲۷۔

یہ کہنا کہ ذوی القربیٰ پر زکوٰۃ لینا اس لیے حرام ہوئی ہے کہ وہ شرف والے ہیں، زیادہ مضبوط رائے نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع فرمایا اور آپؐ کی نصرت (مدد) کی اور مسلم اور کافر اس میں شریک رہے اور اس سے امام شافعیؒ کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ بنی المطلب بھی اس حکم میں بنی ہاشم میں شامل ہیں، کیونکہ ان سب نے بھوک اور تکلیف برداشت کی اور شعب (ابی طالب) میں محصور رہے، قریش کا مقابلہ اور ان کا مقاطعہ برداشت کیا۔

اب اگر ذوی القربیٰ کا حصہ کسی وجہ سے انھیں نہ ملے، مثلاً بیت المال خالی ہو، یا حکام اس پر قابض ہوں تو لازم ہے کہ انھیں زکوٰۃ سے محروم نہ رکھا جائے، ورنہ ان کی بہ خوبی ان کے لیے باعثِ مضرت بن جائے گی۔

اگرچہ بیشتر فقہاء اس امر کے قائل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ذوی القربیٰ کا حصہ ختم ہو گیا ہے اور آپؐ کے بعد یہ حصہ خلیفہ کے قرابت داروں کا حصہ بن گیا یا اُسے جہاد میں صرف کیا جائے[1] تو اس صورت میں اس کا عوض یعنی زکوٰۃ بحال ہونا چاہیے۔

اس کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء نے جن احادیث سے اس

---

[1] ابو عبیدؒ اور ابو یوسفؒ نے الخراج میں اور ابن جریرؒ نے آیت انفال کی تفسیر میں حسن بن محمد بن الحنفیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ سے سہم رسولؐ اور سہم ذوی القربیٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان دونوں حصوں میں اختلاف ہو گیا، اور کچھ لوگوں نے کہا کہ قرابت داروں کا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کا ہے اور کسی نے کہا کہ یہ خلیفہ کے قرابت داروں کا ہے اور بعد ازاں اس امر پر اجماع ہو گیا کہ ان دونوں حصوں کو فی سبیل اللہ جہاد کی تیاری پر صرف کیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں یہی طریقہ رہا۔ الاموال ص ۳۳۲، بدایۃ المجتہد ص ۳۹۰، ۳۹۱۔ بلکہ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے بھی یہی طریقہ برقرار رکھا (الاموال۔ ایضاً)

امر پر استدلال کیا ہے کہ تاقیامت بنی ہاشم پر زکوٰۃ حرام ہے وہ احادیث قطعی الدلالت نہیں ہے، جبکہ بعض فقہاء نے بنی ہاشم کے زمرے میں بنو المطلب کو بھی شامل کیا ہے اور ان کے غلاموں اور آزاد کردہ غلاموں کو بھی شامل کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان احادیث پر اگر تقلید سے بالاتر ہو کر اور فقہاء کی جلالت شان کے تاثر سے نکل کر نظر ڈالی جائے تو ہمارے سامنے حقیقت اس کے برعکس آتی ہے جو فقہاء نے رائے اختیار کی ہے۔

۱) مطلب بن ربیعہ کی حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بنی ہاشم کے دو نوجوانوں نے یہ ارادہ کیا کہ انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم صدقات کا والی مقرر کر دیں اور وہ بھی اس سے اور لوگوں کی طرح مستفید ہوں آپؐ نے ان پر یہ دروازہ بند کر دیا اور آپؐ نے یہ ارادہ فرمایا کہ آپؐ کے آل بیت اور آپؐ کے اقارب لوگوں کے لیے قربانی اور خرچ کرنے میں نمونہ بنیں، غنیمت اور حصول منفعت میں نمونہ بنیں۔ چنانچہ آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر انہیں سدانۃ (کعبۃ اللہ کی نگرانی) اور سقایت (پانی پلانے کی خدمت) کی خدمت سپرد کی اور فرمایا کہ میں تمہیں وہ کام دیتا ہوں جس سے تمہیں مشقت ہو ایسا کام نہیں دیتا جس سے تم دوسروں کو مشقت میں ڈالو۔[1]

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں (ترجمہ)

"صدقہ آل محمدؐ کے لیے موزوں نہیں ہے"

اور یہ الفاظ کراہت تنزیہ اور اس عمل سے دور رکھنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں تاکہ ناجائز سے لینے کی تہمت کا نشانہ نہ بنیں جیسا کہ ابن اللتیہ نے کیا تھا۔ اسی لیے حضرت ابو عبادۃ بن الصامت وغیرہ نے صدقات کی ولایت کے قبول کرنے سے انکار کیا کہ اس میں ناجائز کام میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ موجود تھا۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام: ج ۴، ص ۳۲۔ بتحقیق محمد محیی الدین عبد الحمید۔

بہرحال صدقات کے کام کی ذمّے داری کا تعلق چونکہ اجتماعی مال سے ہے اور یہ محتاج مسلمانوں کا حق ہے اور ان لوگوں کا حق ہے جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اس لیے اس میں شدّت برتی گئی ہے، کیونکہ عامل اپنے استحقاق سے زائد جو کچھ وصول کریں گے وہ فقراء اور محتاج کے حقوق میں مزاحمت اور اجتماعی مال کو باطل طریقے پر کھانا ہوگا۔

ان احادیث کے باوجود قابل اتباع مسالک کے بیشتر فقہاء نے یہی کہا ہے کہ عامل بنی ہاشم میں سے ہو سکتا ہے جیسا کہ عاملین علیہا کے ذکر میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور ابو رافع والی حدیث اسی مفہوم کی مؤید ہے اور بتاتی ہے کہ آلِ بیت اور قرابت داروں کا صدقات کے معاملات سے دور رکھنا ان کی شرافت نسب کی بنا پر نہیں ہے بلکہ تہمت دور کرنے کی خاطر ہے، اور اس لیے ہے کہ افترا پردازوں کی زبانیں بند ہو جائیں اور اُسوۂ حسنہ قائم ہو جائے اور آلِ محمد اور ان کے موالی (غلاموں) کی تربیت اس طرح ہو کہ وہ ذمہ داریوں (مَغَارم) کو تو قبول کریں مگر ان میں غنیمتوں (مغانم) کے حصول کا لالچ نہ ہو، کیونکہ اگر یہ ممانعت بربنائے شرف ہوتی تو موالی اس حکم میں داخل نہیں ہوتی۔

۲) حسن رضؓ بن علیؓ کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا "تمھیں نہیں معلوم کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے" اور مُسلم کی روایت کے الفاظ کہ ہمیں صدقہ حلال نہیں ہے۔ مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ آپؐ نے یہ بات سربراہِ مملکت اور اسلامی جماعت کے امیر ہونے کی حیثیت میں فرمائی، کیونکہ بلاشبہ جو صدقات آپؐ کے پاس جمع ہوئے تھے وہ مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہونے کی بنا پر نہ آپؐ کے لیے حلال تھے اور نہ آپؐ کے اہلِ بیت کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے جب غلطی سے صدقہ کا دودھ پی لیا تھا تو آپؐ نے اس کی قے فرما دی تھی۔[1]

---

[1] امام مالکؒ نے اسے الموطا میں کتاب الزکوٰۃ میں ذکر فرمایا ہے۔

اسی لیے البحر میں یہ مسئلہ لکھا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح امام کے لیے بھی صدقہ سے مستفید ہونا حلال نہیں ہے اور اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فتوے فرمادی تھی [1]

(۳) ان تمام اسباب اور واقعات سے صرفِ نظر کر کے اگر ہم احادیث کے الفاظ پر نظر کریں تو اب یہ غور کرنا ہے کہ کیا آلِ محمدؐ سے صرف بنی ہاشم ہی مراد ہیں یا ان کے ساتھ تاقیامت بنی المطلب بھی شامل ہیں۔

اس امر کی کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ آلِ محمدؐ اسی طرح ہے جس طرح آلِ ابراہیم ہے اور آلِ عمران ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ (آل عمران : ۳۳)

اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ آلِ عمران سے مراد حضرت مریمؑ اور ان کے فرزند حضرت عیسیٰؑ ہیں اور آلِ ابراہیمؑ سے مراد حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور اسباط مراد ہیں، اور تاقیامت چلنے والی ان کی ذریت مراد نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاقؑ کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے کہ

وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ

(القصص : ۸)

اور ان کی اولاد میں احسان کار بھی تھے اور اپنے آپ پر کھلا ظلم کرنے والے بھی تھے۔

دنیا میں فساد پھیلانے والے یہودی بھی انہی حضرت ابراہیم کی اولاد ہوئے ہیں۔

---

[1] البحر الزخار : ج ۲، ص ۱۸۴۔

اور فرمایا۔

فَالْتَقَطَهٗٓ آلُ فِرْعَوْنَ (القصص : ۸)

آل فرعون نے اسے اٹھالیا۔

وَاَغْرَقْنَآ آلَ فِرْعَوْنَ (البقرہ : ۵۰)

اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔

وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ (غافر : ۴۵)

اور آل فرعون کو بدترین عذاب نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کیا یہاں پر آل فرعون سے وہ خود اس کے گھر والے اور اس کے مخصوص قریبی لوگ شمار نہ ہوں گے؟ اور یہاں بھی آل محمدؐ سے آپؐ کے اہل بیت، آپؐ کی ازواج، آپؐ کی اولاد اور آپؐ کے قریب ترین رفقھا ہوں گے اور یہ حکم آپؐ کی حیات کے ساتھ مخصوص ہوگا، جیسا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے اور یہی رائے محمد بن الحسنؒ نے اختیار کی ہے اور البحر الزخار کے قول کے مطابق امام مالکؒ سے بھی یہی رائے مروی ہے کیونکہ تہمت سے بچنے کے لیے زکوٰۃ انھیں حرام ہوئی تھی جو آپؐ کی وفات سے زائل ہوگئی۔[1]

اسی سے شوکانی نے جو قل لا اسئلکم علیہ اجراً کو دلیل بنایا ہے ساقط ہوگئی کہ اگر زکوٰۃ جائز ہوتی تو اس پر اعتراض ہوتا جو کہ آپؐ کی وفات کے بعد ختم ہوگیا اور آپؐ کی اولاد اور اہل بیت دوسرے مسلمانوں کی طرح ہوگئے کہ ان کے مالداروں سے زکوٰۃ لے کر ان کے فقیروں پر صرف کی جائے۔

اور اس کی دو وجوہ ہیں:۔

پہلی: یہ کہ اسلامی شریعت نے اپنے تمام احکام میں نبیؐ کے قرابت داروں اور دیگر مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں بلکہ اسلام نے تو تمام انسانوں کو کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر قرار دیا اور حقوق و فرائض اور مغارم اور عقوبات سب میں تمام انسانوں کو برابر

---

[1] ج ۲، ص ۱۸۴۔

قرار دیا ہے اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ

وقسم بخدا اگر فاطمہ بنت محمدؐ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ قطع کر دیتا۔[1]

اور آپؐ نے فرمایا کہ

وجس کا عمل مؤخر ہو گیا اس کا نسب اسے مقدم نہیں کر سکتا۔[2]

دوسرے: یہ کہ زکوٰۃ اسلام میں ایک لازمی فرض ہے اور ایک معلوم حق ہے اور ایک متعین ٹیکس ہے جسے امام لے کر مستحقین پر صرف کرے گا اور اس میں کسی پر کوئی احسان نہیں ہے اور جب لینے والا اپنا حق لیتا ہے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ بعض فقہاء نے ہاشمیوں کو فرض زکوٰۃ دینا جائز قرار دیا ہے لیکن ان کے لیے نفل صدقات کو جائز قرار دیا ہے حالانکہ اس میں احسان کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ حالانکہ اگر

تاقیامت صدقہ کے آل محمدؐ پر حرام ہونے کی رائے صحیح تسلیم کی جائے تو یہ صدقہ نفل ہونا چاہیے اور حافظ نے یہی قول بعض فقہاء کا نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ فرض صدقہ کے لینے میں اہانت کا پہلو نہیں ہے جبکہ نفلی صدقہ میں اہانت کا پہلو ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ پر اجماع نہیں ہے کہ اہلِ بیت کو زکوٰۃ دینے کا قائل اجماع کی خلاف ورزی کا مرتکب سمجھا جائے۔

جبکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ دینا جائز ہے اور یہی امام محمدؒ کی رائے ہے، بعض شافعیؒ فقہاء کی یہی رائے ہے اور مسلک مالکیؒ کے کچھ فقہاء کی بھی یہی رائے ہے۔

اور منقولہ روایات میں بھی ایسی روایات موجود ہیں جن سے مطلق جواز کے قائلین کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً البحر میں ہے کہ نبیؐ نے بنی عبد المطلب کی بیواؤں کو صدقہ دیا۔

---

[1] بخاری و مسلم

[2] بخاری و مسلم

اور صاحب البحر نے یہ تبصرہ کیا کہ یہ صدقہ نفل تھا۔[۱]

ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

'میرے والد نے مجھے نبیؐ کے پاس بھیجا، ان اونٹوں کے بارے میں جو آپؐ نے انھیں صدقہ میں سے دیئے تھے'

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ

'میں ان کے بدلے میں لے کر آؤں'[۲]

امام نوویؒ نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔

پہلا: یہ کہ بنی ہاشم کے لیے پہلے صدقہ لینا حرام قرار دیا گیا اور بعدازاں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

دوسرا: یہ کہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے حضرت عباسؓ سے فقراء کے لیے اونٹ لیے تھے یہ اونٹ انھیں صدقہ میں سے واپس کر دیئے اور ایک اور روایت میں اس کی تائید بھی موجود ہے اور یہی جواب الخطابی نے بھی دیا ہے۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ تاویلات کے برعکس حدیث کے ظاہر کو اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اور نسخ سے زیادہ موزوں ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں امام بخاریؒ کے نزدیک کوئی صریح الدلالت اور صحیح السند حدیث موجود نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ

'باب ما یذکر فی الصدقۃ للنبیؐ وآلہٖ'

---

[۱] البحر: ج ۲، ص ۱۸۴۔

[۲] ابوداؤد نے اس روایت کو باب الصدقۃ علی بنی ہاشم میں نقل کیا ہے اور نسائیؒ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ (مختصر السنن: ج ۲، ص ۲۴۶)

[۳] المجموع: ج ۶، ص ۲۲۷۔

اس عنوان میں مایذکر کا لفظ تضعیف اور شک پر دلالت کرتا ہے۔

یہ بات تواتر روئے نقل ہے اور اگر ہم حکمتِ تشریع کے لحاظ سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ رسالتؐ میں آپؐ کے اقربا کے لیے زکوٰۃ کی تحریم کی حکمت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؐ کے آل اور آپؐ کے قرابت دار تعفف اور دنیا سے اجتناب کی ایک اعلیٰ ترمثال قائم کریں اور اس اصول کی تطبیق کریں کہ

"دستِ بالا نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" [1]

کہ بغیر عوض اور بغیر منفعت مال دینے میں ایک طرح کا احسان ضرور ہے اور دینے والے کو لینے والے پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یہ احسان عام لوگوں کو اس وقت محسوس نہیں ہوتا جب امام مالداروں سے زکوٰۃ لے کر خود اسے صرف کرے لیکن خود امام جو مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کر کے ان کے فقراء پر تقسیم کر رہا ہے اسے چاہیے کہ وہ خود اس احسان سے گراں بار نہ ہو اور اس سلسلے میں اس کے اہل بیت بھی اسی کے درجے میں ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام زکوٰۃ میں سے اپنے لیے یا ان لوگوں کے لیے جو اس کے مخصوص اور قریب ہوں زکوٰۃ میں سے کچھ لے گا تو کہنے والے اس کے حق میں وہ کچھ کہیں گے جو مناسب نہیں ہوگا اس لیے اس دروازہ کو بالکل بند ہو جانا چاہیے تاکہ وہ اس اتہام سے بچ جائیں اور خیر کے امور کے قریب ہو جائیں [2] مگر تا قیامت آلِ محمدؐ پر زکوٰۃ کی تحریم کی کوئی وجہ نمایاں نہیں ہے۔

تعجب ان فقہاء پر ہے جو اس صورت میں بھی بنی ہاشم اور بنی المطلب پر زکوٰۃ کی تحریم کے قائل ہیں جبکہ وہ خمس الخمس سے محروم ہوں، خواہ اس وجہ سے کہ خمس موجود ہی نہ ہو، جیسا کہ آج کل کے زمانے میں موجود نہیں ہے یا اس وجہ سے کہ حکمرانوں نے اسے

---

[1] البخاریؒ نے حکیم بن حزام سے یہ روایت کتاب الزکوٰۃ کے باب الاستغناء عن المسئلہ میں ذکر کی ہے۔

[2] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲، ص ۵۱۲۔

اپنے قبضے میں لے لیا ہو جیسے کہ پہلے ادوار میں ہُوا ہے —— اس صُورت میں بنی ہاشم کے جو فقرا، ہوں گے ان کی امداد کا کیا طریقہ ہوگا، کیا آلِ بیت کا یہی اکرام ہے کہ انھیں زکوٰۃ میں سے فقرا، کا مقررہ حصّہ نہ دیا جائے اور انھیں بھُوکا اور ننگا رہنے دیا جائے۔

اسی لیے مسالکِ اربعہ کے فقہائے اور دیگر فقہائ نے اس امر کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر اہلِ بیت خمس سے محروم ہوں تو انھیں زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ اس لیے کہ وہ محل حاجت اور ضرورت ہیں[1] بلکہ بعض مالکی مسلک کے فقہائ نے کہا ہے کہ اس صورت میں انھیں دینا دوسرے لوگوں کو دینے سے افضل ہے۔

●

---

[1] شرح غایۃ المنتہی : ج ۲، ص ۱۵۷۔

بحث ششم

غلط مصرف میں زکوٰۃ دے دینا

اگر زکوٰۃ دہندہ مصرف زکوٰۃ میں غلطی کرے تو کیا حکم ہے؟

اگر زکوٰۃ دہندہ نے غلطی

سے اپنی زکوٰۃ کسی ایسی جگہ (یا شخص) پر صرف کر دی جو زکوٰۃ کا صحیح مصرف نہیں تھا پھر اسے اپنی غلطی کا علم ہوا تو کیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور دہندہ کا فرض ساقط ہو جائے گا؟ یا زکوٰۃ بدستور اس کے ذمے قرض رہے گی اور اسے از سرِ نو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہوگی؟

اس بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ، محمد بن الحسن اور ابو عبیدؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا اس طرح غلطی سے دیا جانا درست ہے اور دوبارہ اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

معن بن یزید سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے کچھ دینار نکالے اور انھیں مسجد میں موجود ایک شخص کو صدقہ دینا چاہا۔ میں نے وہ لے لیے، میرے والد نے کہا قسم بخدا میں تمھیں دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے عرض کی تو آپؐ نے فرمایا، یزید تمھیں تمھاری نیت کا ثواب مل گیا اور اے معن تم نے جو کچھ لیا وہ تمھارے لیے درست ہے۔ (بخاریؒ واحمدؒ)

اس حدیث میں یہ احتمال ہے کہ صدقہ سے نفلی صدقہ مراد ہو لیکن فرمانِ نبوتؐ میں "ما" (جو) ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے یہ ارادہ کیا کہ میں رات کو صدقہ کروں گا، اس نے رات کو صدقہ دیا

اور کسی چور کو دے دیا، اور اسے علم نہیں تھا، صبح کو لوگوں نے باتیں کیں کہ فلاں شخص نے چور کو صدقہ دے دیا، وہ بولا، اے اللہ تو ہی ہر ستائش کا مستحق ہے۔ میں آج پھر صدقہ کروں گا، اس شب اس نے صدقہ ایک زانیہ کو دے دیا، اگلی صبح لوگوں نے پھر باتیں کیں کہ فلاں شخص نے زانیہ کو صدقہ دے دیا ہے، اُس نے یہ سن کر کہا کہ اے اللہ تمام محامد آپ ہی کے لیے ہیں، میں آج پھر صدقہ کروں گا، چنانچہ اُس نے صدقہ کیا اور کسی مالدار کو دے دیا، اگلی صبح لوگوں نے باتیں کیں کہ فلاں شخص نے رات مالدار شخص کو صدقہ دے دیا ہے، تو وہ بولا، ہر تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ میں نے چور کو، زانیہ کو اور مالدار کو صدقہ دے دیا — اس پر اس نے خواب میں دیکھا کہ تو نے چور کو صدقہ دے دیا، ہو سکتا ہے کہ وہ چوری سے باز آجائے، ہو سکتا ہے زانیہ زنا ترک کر دے اور ہو سکتا ہے کہ مالدار شخص کو نصیحت ہو جائے اور وہ بھی راہِ خدا میں خرچ کرنے لگے۔ (احمدؒ، بخاریؒ و مسلمؒ)

اور اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جس نے آپؐ سے صدقہ کا سوال کیا یہ فرمایا کہ اگر تم ان مستحقین میں سے ہو تو میں تمھیں دے دیتا ہوں۔ اور آپؐ نے ان دو نوں مضبوط نوجوانوں کو دے دیا، اور فرمایا تم چاہتے ہو تو میں تمھیں اس مال میں سے دیتا ہوں مگر اس میں کسی غنی اور کسب کے قابل قوی کا حصّہ نہیں ہے۔ اگر آپؐ مالداری کی حقیقت کا اعتبار فرماتے تو ان کے قول کو کافی نہ سمجھتے — جیسا کہ المغنی میں ہے[۱]

اس کے برعکس بعض فقہاء کی یہ رائے ہے کہ اگر کسی شخص نے غیر مستحق کو زکوٰۃ دے دی اور بعد میں اُسے علم ہُوا تو یہ زکوٰۃ اس کی جانب سے ادا نہیں ہُوئی بلکہ یہ دوبارہ مستحق کو ادا کرے گا، کیونکہ غیر مستحق کو دے کر وہ بری الذمہ نہیں ہُوا جیسا کہ انسانوں کا قرض ہو تو جس کا قرض ہو اس کے علاوہ کسی اور شخص کو دے کر قرض سے بریٔ الذمہ نہیں ہو گا۔

امام شافعیؒ کا مسلک بھی اسی کے قریب قریب ہے جیسا کہ الروضہ[۲] میں ہے۔

---

[۱] المغنی ج ۲، ص ٦٦٧۔

[۲] الروضۃ ج ۲، ص ۳۲۸۔

اور امام احمدؒ کے مسلک میں اس صورت میں کہ کسی کو فقیر سمجھ کر زکوٰۃ دی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غنی تھا دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ جائز ہے اور دوسری یہ کہ یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی اور اگر زکوٰۃ دینے کے بعد معلوم ہوا کہ جسے زکوٰۃ دی ہے وہ غلام تھا، یا کافر تھا، یا ہاشمی تھا، یا دینے والے کا ایسا قرابت دار تھا جسے اس کا زکوٰۃ دینا درست نہیں تھا، تو ایک ہی رائے ہے اور وہ یہ کہ یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی کیونکہ فقیر اور غنی کا امتیاز تو دشوار ہوتا ہے لیکن اور کسی کے بارے میں معلوم کرنا دشوار نہیں ہے [1] جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

(البقرہ : ۲۷۳)

ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ یہ مالدار ہیں۔

بعض فقہاء نے مختلف صورتوں میں فرق کر کے بعض صورت میں کہا ہے کہ زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے اور بعض صورتوں میں کہا ہے کہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ہے۔

فقہائے احناف کی رائے

اگر کسی نے صحیح مصرف کی جستجو کے بعد زکوٰۃ دی اور یہ سمجھ کر دی کہ زکوٰۃ صحیح مصرف میں دی جا رہی ہے، بعد میں اسے معلوم ہوا کہ جس شخص کو اس نے زکوٰۃ دی وہ غنی ہے یا اس کا والد ہے یا اس کا بیٹا ہے یا اس کی بیوی ہے یا ہاشمی ہے، تو اس کی زکوٰۃ ادا ہو گی اور اس پر اعادہ لازم نہیں ہے کہ اس نے حسبِ طاقت صحیح مصرف میں دینے کی سعی کی ہے۔

لیکن اگر بعد میں یہ معلوم ہوا کہ جس شخص کو زکوٰۃ دی وہ حربی تھا، خواہ مستامن ہو، تو امام ابو حنیفہؒ سے یہی مروی ہے کہ اسے دینا درست ہے اور اعادہ نہیں ہے اور ایک اور روایت ہے جو کہ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ جائز نہیں ہے، کیونکہ حربی کے ساتھ یہ حسنِ سلوک شرعاً نیکی (برّ) نہیں بنتا، اور اسی بنا پر وہ نفلی صدقہ بھی نہیں بنتا اور اسے کارِ ثواب نہیں قرار دیا جاتا بلکہ اس کا بھی اعادہ لازم ہوتا ہے۔

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۶۸۔

اور اگر اس نے صحیح مصرف میں دینے کی جستجو کے بغیر ہی زکوٰۃ دے دی بلکہ یہ خیال ہی نہیں کیا کہ جہاں زکوٰۃ دے رہا ہے وہ مصرف زکوٰۃ ہے بھی یا نہیں پھر اس کی خطا ظاہر ہو کہ اس نے صحیح مصرف میں زکوٰۃ نہیں دی تو یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی اور اس پر اعادہ لازم ہو گا، اس لیے کہ اس نے صحیح مصرف کے معلوم کرنے میں کوتاہی برتی ہے۔ لیکن اگر اسے نہیں معلوم کہ جہاں اس نے زکوٰۃ دی وہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں تھا تو بہر حال جائز ہے۔

لیکن اگر یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ یہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے یا اس میں شک ہوتے ہوئے زکوٰۃ دے دی تو یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی تا آنکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ صحیح مصرف میں زکوٰۃ دی گئی ہے کہ اگر یہ معلوم ہو گیا کہ صحیح مصرف میں زکوٰۃ دی گئی ہے تو ادا ہو جائے گی۔

جس شخص کو زکوٰۃ دی وہ فقراء کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، یا ان کا سا لباس پہنے ہوئے تھا یا اس نے دست سوال دراز کیا تھا تو یہ باتیں تحرّی (صحیح مصرف کی جستجو) شمار ہوں گی اور اگر بعد میں اس شخص کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ مالدار تھا تو اعادہ لازم نہیں ہو گا۔

زکوٰۃ دہندہ نے جو زکوٰۃ غلط مصرف میں دے دی ہے کیا اسے واپس لے گا؟ اگر حربی کو دی ہے تو واپس نہیں لے گا اور اگر ہاشمی کو دی ہے تو دو اقوال ہیں کہ واپس لے سکتا ہے اور یہ کہ واپس نہیں لے سکتا۔ اور اگر بیٹے کو اور مالدار کو دی ہے تو واپس لے گا۔

اور کیا جس کو دی ہے اس کے لیے درست ہو جائے گی اس بارے میں بھی اختلاف ہے ایک یہ کہ درست ہے اور ایک یہ کہ درست نہیں ہے اور اس صورت میں اسے چاہیے کہ وہ بھی صدقہ کر دے اور یہ بھی قول ہے کہ دہندہ کو دے دے[1]

فقہائے مالکیہ کی رائے اگر صحیح مستحق تک زکوٰۃ پہنچانے کی سعی کی اور پھر غیر مستحق کو دے دی، مثلاً غنی کو دے دی یا کافر کو دے دی اور یہ سمجھ کر دی کہ یہ مستحق ہے، اگر ممکن ہو تو اس سے واپس لے لے بشرطیکہ اس کے پاس باقی ہو، یا اگر اس نے اس کو صرف کر دیا ہے تو اس کا عوض لے لے خواہ اس حالت میں

---

[1] الدر المختار وحاشیۃ: ج ۲، ص ۷۳، ۷۴۔

لینے والے نے اسے دھوکہ دیا ہو یا نہ دیا ہو۔

اور اگر اس کے پاس کسی آسمانی سبب کی بنا پر ضائع ہو گئی تو اگر لینے والے نے دہندہ کو کوئی دھوکہ دیا ہے یعنی اس پر یہ ظاہر کیا کہ وہ فقیر ہے حالانکہ وہ غنی تھا، یا یہ بتلایا ہے کہ وہ مسلمان ہے حالانکہ وہ کافر تھا، تو اس پر اس کا عوض لوٹانا لازم ہوگا اور اگر اس نے دھوکہ نہیں دیا تو اس پر کچھ لازم نہیں ہے اور دہندہ پر دوبارہ زکوٰۃ دینا لازم ہے کہ پہلی زکوٰۃ اس کی صحیح نہیں ہوتی اس لیے کہ زکوٰۃ فقراء مسلمین کو نہیں پہنچی جو کہ مصرف زکوٰۃ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صورت اس حالت سے متعلق ہے جب افراد خود زکوٰۃ ادا کریں۔

لیکن اگر امام (حکومت) یا اس کا نائب خود زکوٰۃ لے اور غیر مستحق کو دے دے تو یہ جائز ہے اور امام پر اس کی طرف سے فقراء کو دینا لازم نہیں آئے گا۔ کیونکہ بہر حال اس نے مسلمانوں کی مصلحت پر غور کر لیا تھا اور امام کے اجتہاد پر نظر ثانی نہیں ہے یہاں تک کہ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اگر واپس لینا بھی ممکن ہو تو بھی امام واپس نہیں لے گا۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ مسلک مالکیؒ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حاکم غیر مستحق کو زکوٰۃ دے دے اور اس سے واپس لینا ممکن ہو تو اس سے واپس لی جائے گی اور یہی ظاہر ہے اس لیے کہ زکوٰۃ اغنیاء کے پاس رہنے دی جائے اور ان سے نہ لی جائے یہ کیسے درست ہوگا؟

یعنی امام وصی اور قاضی کی طرح ہے کہ ان پر اتفاق ہے کہ ان کے حق میں جائز ہے کہ وہ بغیر اس کے کہ ان پر کوئی تاوان عائد ہو واپسی سے معذرت کر سکتے ہیں۔ اور اگر واپسی ممکن ہو تو بالاتفاق واجب ہے۔[1]

زیدیہ مسلک کے فقہاء کی رائے

جس نے اپنی زکوٰۃ ایسے شخص کو دی جو بالاتفاق غیر مستحق ہو تو یہ شخص دوبارہ زکوٰۃ دے گا، اور پہلی مرتبہ کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اور جو افراد بالاجماع غیر مستحق ہیں وہ کافر، اصول (باپ دادا وغیرہ)

---

[1] الشرح الکبیر و حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۱۰۵، ۵۰۲۔

اور فصول (بیٹا پوتا وغیرہ) اور غنی ہیں۔ اگر ان کو زکوٰۃ دی تو اعادہ لازم ہے خواہ انھیں زکوٰۃ دیتے وقت اسے یہ علم ہو کہ انھیں زکوٰۃ دینا جائز ہے یا اُسے علم نہ ہو۔ اور خواہ اس نے کافر کو مسلم سمجھ کر باپ اور بیٹے کو اجنبی سمجھ کر غنی کو فقیر سمجھ کر دی ہو یا اس کا یہ گمان نہ ہو، ہر حال میں اس پر اعادہ لازم ہے۔

جن مستحقین کے بارے میں اختلاف ہے وہ قرابت دار ہے جس کا نفقہ لازم ہو اور وہ غنی ہے جس کے غنی ہونے میں اختلاف ہو، اگر اس نے ان کو زکوٰۃ دے دی اور اس کا مسلک یہ تھا کہ انھیں زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اور یہ جانتے ہوئے دی کہ وہ قرابت دار ہیں اور ان کے مسلک میں اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے تو اس پر اعادہ لازم ہے۔

اور اگر انھیں زکوٰۃ دی اور اسے تحریم کا علم نہیں تھا یا اسے اپنے مسلک کا علم نہ ہو یا وہ انھیں اجنبی سمجھ رہا ہو یا اس نے غنی کو فقیر سمجھا ہو تو اس پر اعادہ لازم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اختلافی مسائل سے ناواقف ناسی (بھول جانے والے) کی طرح اور مجتہد مخطی کی طرح معذور ہے[1]

میری رائے یہ ہے کہ جس نے مستحق کا پتہ کر کے اور تحقیق کر کے زکوٰۃ دی، اور اس کے باوجود اس نے غلط مصرف میں دے دی تو وہ معذور ہے اور اس پر اس کی ذمے داری نہیں ہے کہ اس نے اپنی پوری کوشش کی ہے، اور اللہ نے کسی نفس پر اس کی استطاعت سے زیادہ ذمے داری نہیں ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ: ۲۸۶)

اللہ کسی جان پر اس کی قدرت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

جیسا کہ فقہائے احناف کی رائے ہے اور اس کا اجر ضائع نہیں ہوگا، جیسا کہ حدیث میں اس شخص کے بارے میں آیا ہے جس نے زکوٰۃ زانی، چور اور غنی کو دے دی تھی۔

لیکن اگر اس نے صحیح مصرف کی تحقیق میں کوتاہی برتی اور لاپرواہی اختیار کی اور

---

[1] شرح الازھار وحواشیہ: ج ۱، ص ۵۲۶، ۵۲۷۔ البحر ج ۲، ص ۱۸۷۔

غلط مصرف میں زکوٰۃ دے دی تو اس پر اس غلطی کی ذمے داری آئے گی کہ اس نے یہ غلطی کوتاہی اور غفلت کی وجہ سے کی ہے، اور اس پر زکوٰۃ کا اعادہ لازم ہوگا اور اسے صحیح مصرف میں زکوٰۃ دینی ہوگی، کہ زکوٰۃ فقرا مساکین اور دیگر مستحقین میں اور وہ اپنی ذمے داری سے اسی وقت عہدہ برآ ہوگا، جب ان کو زکوٰۃ دے گا، یا ان کے نائب یعنی امام کو دے کر بری الذمہ ہوگا۔

دونوں صورتوں میں لینے والے پر لازم ہے کہ اگر وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تو وہ زکوٰۃ واپس کردے یا اس کا عوض دے دے، اگر زکوٰۃ اس کے پاس صرف ہوگئی ہو اور مستحق کا حق کھا کر اپنے پیٹ میں آگ نہ بھرے۔ اور یہ اس وقت ہے جب لینے والا یہ سمجھے کہ فی الواقع وہ اس زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے، ورنہ وہ اس کے لیے جائز ہوگی جیسے اگر اسے یہ علم نہ ہو کہ یہ زکوٰۃ ہے۔

اور حدیث معن جس میں یہ آیا ہے کہ "اے معن جو تمھیں ملا وہ تمھارا ہے" تو ہو سکتا ہے کہ معن فی الواقع مستحق ہوں اور ان کے والد انھیں نہ دینا چاہتے ہوں۔

اور اگر مصرف زکوٰۃ میں امام غلطی کرے تو اس پر تاوان نہیں ہے کیونکہ وہ مستحق کی مصلحت پر امین ہے لیکن اگر زکوٰۃ اس شخص کے پاس موجود ہو تو اس سے واپس لینا لازم ہے جیسا کہ مالکی فقہاء نے کہا ہے۔

پانچواں باب

ادائے زکوٰۃ کا طریقہ

۱) حکومت کا زکوٰۃ سے تعلق
۲) زکوٰۃ میں نیت کی اہمیت
۳) زکوٰۃ میں قیمت کا دینا
۴) زکوٰۃ کا دوسرے شہر انتقال
۵) زکوٰۃ کی تعجیل اور تاخیر
۶) ادائے زکوٰۃ سے متعلق متفرق مباحث

گزشتہ ابواب میں یہ امور بیان ہو چکے ہیں۔ زکوٰۃ کی فرضیت، کس پہ فرض ہے، کون سے اموال پہ فرض ہے کتنی مقدار فرض ہے، مستحق کون ہیں اور مصارف زکوٰۃ کیا ہیں اور وہ اصناف کون سی ہیں جہاں زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

اب یہ امر بیان کرنا باقی رہ گیا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی کیفیت کیا ہو؟ کیا مکلف خود مستحق کو ادا کرے یا حکومت اور حکمران یہ ذمے داری سنبھالیں؟۔ اور کیا حکومت کی یہ ذمے داری ہر طرح کے اموال زکوٰۃ میں ہے یا چند اموال میں ہے؟ اور اگر حکومت اس ذمے داری کو پورا نہ کرے یا ظالم یا کافر حکومت ہو تو کیا حکم ہے؟

کیا زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیت شرط ہے؟ اور اگر زکوٰۃ دہندہ کی نیت کے بغیر حکومت زبردستی لے لے تو کیا حکم ہے؟ کیا حکومت یا دہندہ زکوٰۃ کو دوسرے شہر منتقل کر سکتا ہے؟ اور اس کی کیا حدود ہیں؟۔

کیا قیمت زکوٰۃ دینا جائز ہے؟ یا وہی عینِ شئے دینا لازم ہے جو شئے بذریعہ نص لازم ہوتی ہے؟

زکوٰۃ جس وقت لازم ہوتی ہے کیا اس وقت دینا لازم ہے یا اس وقت سے مؤخر کی جا سکتی ہے اور تاخیر کا کیا حکم ہے؟ کیا تاخیر زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی؟ اور تعجیل کا کیا حکم ہے؟ کیا زکوٰۃ چھپانا جائز ہے اور اس کی سزا کیا ہے؟ اور زکوٰۃ سے بھاگنے اور اس کے اسقاط کے حیلے کرنے کا کیا حکم ہے؟۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر مباحث جو زکوٰۃ سے اور ادائے زکوٰۃ سے متعلق ہیں آئندہ فصلوں میں ہم انہی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

پہلی فصل

زکوٰۃ کا ریاست سے تعلّق

معاملات زکوٰۃ کے ضمن میں ریاست کی ذمّے داری

زکوٰۃ ایک ثابت شدہ اور مقررہ حق اور فریضہ الٰہی ہے اور دراصل یہ فریضہ افراد ہی پر موقوف نہیں ہے کہ وہی اسے انجام دیں اور اس کے صلے میں ثواب آخرت کے متمنّی ہوں اور اگر کسی کو آخرت پر کامل یقین نہ ہو یا اس میں اس قدر خشیت الٰہی موجود نہ ہو تو وہ زکوٰۃ نہ دے اور حبِ مال کے جذبے کو پرورش کرتا رہے۔

غرض زکوٰۃ کی ادائیگی انفرادی حسن سلوک کے درجے کی شئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی ادارہ ہے جس کا انتظام ریاست کی ذمّے داری ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ کی وصولیابی اور مستحقین پر اس کے صرف کا ایک مضبوط اور جامع نظام قائم کرے۔

اس رائے پر قرآن سے استدلال

اس رائے کے حق میں سب سے واضح دلیل قرآن کریم میں موجود ہے کہ قرآن نے "عاملین علیہا" کا ذکر کیا اور ان کا باقاعدہ زکوٰۃ میں ایک حصّہ متعین کیا تاکہ وہ فکر معاش سے بے پروا ہو کر دلجمعی اور حسن کارکردگی سے امور زکوٰۃ کو انجام دے سکیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (التوبہ : ۶۰)

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا دانا و بینا ہے۔

اس واضح نص کی موجودگی میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس آیت میں جملہ مصارف زکوٰۃ کو فریضۂ الٰہی قرار دیا گیا ہے اور انہی مصارف میں سے ایک عاملین علیہا بھی بیان ہوا ہے۔

نیز اسی سورۂ توبہ میں یہ آیت وارد ہوئی ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ

(التوبہ : ۱۰۳)

اے نبیؐ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں جمہور سلف اور خلف کے نزدیک اس آیت میں صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مانعین زکوٰۃ نے اس آیت کو دلیل بنایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے زکوٰۃ لیتے تھے اور اس کے بدلے ان ان پر صلوٰۃ (دعا) بھیجتے تھے، لیکن صحابہ کرام میں سے کسی نے ان کی اس رائے کو رد نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ یہ آیت فرض زکوٰۃ سے متعلق نہیں ہے اور تمام آئمہ کا یہی مؤقف رہا کہ اس آیت میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد آنے والے اُمت کے تمام حکمرانوں سے ہے کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کریں۔

احادیث نبویؐ

بخاریؒ اور مسلمؒ میں یہ روایت ہے جو متعدد صحابہؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ فرمایا تو آپ نے ان سے کہا کہ انھیں یہ بتلانا کہ اللہ نے ان کے اموال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔ اگر وہ اطاعت کریں تو درست ہے اور دیکھو ان کے بہترین اموال سے بچنا۔ اور مظلوم کی پکار سے بچنا کہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ایسا فریضہ ہے جو لوگوں کے دولتمندوں سے لے کر ان کے حاجتمندوں کو دیا جائے گا یعنی اسے ان کی مرضی پر نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ اس کے لینے والے ہوں گے اور اس کے لوٹانے والے ہوں گے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی وصولیابی اور اس کا صرف کرنا امام یا اس کے نائب کی ذمے داری ہے اور اگر کوئی زکوٰۃ نہ دے تو یہ اختیار حکومت اس سے لی جائے۔[1]

شوکانی نے بھی علامہ ابن تیمیہؒ کی اس رائے کو نقل کیا ہے۔[2]

غرض متعدد احادیث موجود ہیں جن میں عاملین زکوٰۃ کی راہنمائی کی گئی ہے اور جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، نیز ایسی بھی احادیث موجود ہیں جن میں زکوٰۃ وصول کنندگاں کے حق میں دہندگان کی ذمے داریاں بیان کی گئی ہیں، اس سلسلے میں ہم چند احادیث کا ذکر کریں گے۔

نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین کی سُنّت

قولی سُنّت کی تائید سُنّت عملی سے بھی ہوتی ہے اور تاریخی حقائق بھی اس کے مؤید ہیں اور خلفائے راشدین کا عمل بھی اسی کے مطابق رہا ہے۔

---

[1] الحافظ ابن حجر: فتح الباری، ج ۳، ص ۲۲۳، باب اخذ الصدقۃ من الاغنیاء و ترد الی الفقراء حیث کانوا۔

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۲۴۔

حافظ ابن حجرؒ، امام رافعیؒ کی تخریج کا ذکر کرتے ہوئے التلخیص میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کا زکوٰۃ وصول کنندگان کو روانہ کرنا ایک مشہور بات ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے صدقہ کے لیے روانہ فرمایا۔

صحیحین میں ابو حمید سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابن اللتیبہ نامی ایک ازدی کو زکوٰۃ پر مامور کیا۔

صحیحین میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابن السعدی کو اخذ زکوٰۃ پر مامور کیا۔

ابو داؤد سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو مسعود کو اخذ زکوٰۃ پر مامور فرمایا۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے ابو جہم بن حذیفہ کو صدقات پر مامور فرمایا۔

نیز روایت ہے کہ آپ نے عقبۃ بن عامر کو زکوٰۃ کی وصولیابی کے لیے بھیجا۔

قرۃ بن دعموص سے مروی ہے کہ آپ نے ضحاک بن قیس کو زکوٰۃ کی وصولیابی کے لیے روانہ فرمایا۔

المستدرک میں ہے کہ آپ نے قیس بن سعد کو زکوٰۃ کی وصولی پر مامور فرمایا۔

حضرت عبادۃ بن صامت سے مروی ہے کہ آپ نے انھیں زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا اور ولید بن عقبہ کو بنی المصطلق کی طرف زکوٰۃ وصول کرنے روانہ فرمایا۔

بیہقی نے امام شافعیؒ سے روایت کیا ہے کہ ابو بکرؓ و عمرؓ زکوٰۃ کی وصولی کے لیے کارندے روانہ فرمایا کرتے تھے۔

امام شافعیؒ نے ابراہیم بن سعد سے اور انھوں نے زہریؒ سے یہ روایت نقل کی ہے، اور یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ ہر سال اس وصولی میں تاخیر نہیں کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے قحط کے سال زکوٰۃ کو مؤخر کر دیا اور پھر دو سال کی زکوٰۃ وصول فرمائی۔

ابن سعدؒ کی طبقات میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ کے محرم کو زکوٰۃ وصول کنندگان کو روانہ فرمایا۔ اور الواقدی کی المغازی میں اس کی سند بالتفصیل

مروی ہے [1]

ابن سعدؒ نے ان زکوٰۃ وصول کرنے والوں کے نام اور جن قبائل کی جانب یہ بھیجے گئے ان کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ

آپؐ عیینۃ بن حصن کو بنی تمیم سے زکوٰۃ وصول کرنے روانہ کیا۔

بریدۃ بن الحصیب کو، یا ایک روایت کے مطابق کعب بن مالک کو اسلم و غفار کی جانب بھیجا۔

عباد بن بشر الاشہلی کو سُلیم اور مُزینہ سے زکوٰۃ لینے بھیجا۔

رافع بن مکیث کو جہینہ کی جانب روانہ کیا۔

عمرو بن العاص کو فزارہ کی طرف روانہ کیا۔

ضحاک بن سفیان الکلابی کو بنی کلاب کی جانب روانہ کیا۔

بُسر بن سفیان الکعبیؓ کو بنی کعب کی جانب بھیجا۔

ابن اللتبیہ ازدی کو بنی ذبیان سے زکوٰۃ لینے روانہ کیا۔

سعد ھذیم کے ایک شخص کو ان کی زکوٰۃ لانے کے لیے بھیجا۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ آپؐ نے ان زکوٰۃ وصول کنندگان کو حکم دیا کہ وہ لوگوں سے ان کے فاضل مال لیں اور ان کے بہترین مال ان کے پاس رہنے دیں۔[2]

ابن اسحاق نے کچھ اور افراد کے نام ذکر کیے ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ وصول کرنے جزیرۂ عرب کے اور قبائل اور اقالیم کو بھیجا۔

چنانچہ آپؐ نے مہاجر بن امیہ کو صنعاء بھیجا جہاں اسود عنسی نے ان سے مزاحمت کی۔

اور آپؐ نے زیاد بن لبید کو حضرموت، عدی بن حاتم کو طی اور بنی اسد اور مالک بن نویرہ کو بنی حنظلہ روانہ فرمایا اور زبرقان بن بدر اور قیس بن سعد کو بنی سعد کے صدقات کی

---

[1] التلخیص، ج ۲، ص ۱۵۹/۱۶۰۔ القاہرہ۔

[2] طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۱۶۰۔ بیروت۔

وصولی کے لیے بھیجا اور علاء بن الحضرمی کو بحرین اور حضرت علیؓ کو نجران بھیجا تاکہ آپؐ ان کے صدقات لے کر آئیں [1]

الکتانی نے التراتیب الاداریہ میں ابن حزم کی جوامع السیر، ابن اسحاق اور الکلاعی کی سیرت اور ابن حجر کی الاصابہ سے ان صحابہؓ کے مزید نام دیئے ہیں جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی وصولی یا اس کی تحریر پر مامور فرمایا تھا۔

ابن حزم اپنی کتاب جوامع السیر میں کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب زبیر بن العوام تھے اگر وہ غیر موجود ہوتے یا انھیں کوئی مصروفیت ہوتی تو جہم بن الصلت اور حذیفہ بن الیمان آپؐ کی جانب سے تحریر لکھتے [2]

الاصابہ میں ارقم بن ابی الارقم الزہری کے ذکر میں ہے کہ طبرانی نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں زکوٰۃ کی وصولی پر مامور کیا [3]

اسی میں کافیۃ بن سبع الاسدی کے بارے میں ہے کہ واقدی بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے انھیں اپنی قوم کے صدقات کی وصولی پر مامور فرمایا۔

حذیفہ بن الیمان کے ذکر میں ابن سعد کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ آپؐ نے انھیں ازد سے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے روانہ کیا اور کہل بن مالک ھذلی کو بنو ھذیل سے زکوٰۃ وصول کرنے بھیجا، اور اسی طرح خالد بن البرصاء کو زکوٰۃ وصول کرنے روانہ فرمایا۔

ابوداؤد اور نسائی نے بروایت معمر از زہری از حضرت عائشہؓ روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہم بن حذیفہ کو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا اور خالد بن سعید بن العاص اموی کو حج سے زکوٰۃ وصول کرنے بھیجا۔

خزیمۃ بن عاصم العکلی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ابن قانع نے سیف بن عمر سے

---

[1] زاد المعاد، ج ۲، ص ۲۷۴۔

[2] التراتیب الاداریہ، ص ۳۹۸۔

[3] بحوالۂ مذکور، ص ۳۹۶، ۳۹۸۔

ازمیر بن عبداللہ بن عدس نے روایت کیا ہے کہ عدس اور خزیمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے خزیمہ کو احلاف پر والی بنایا۔ اور انھیں یہ تحریر لکھ کر دی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خزیمہ بن عاصم کے نام کہ میں نے تمھیں تمھاری قوم کی جانب زکوٰۃ وصول کنندہ مقرر کیا ہے، اس طرح کہ نہ وہ تنگ دل ہوں اور نہ ان پر ظلم ہو۔"

رشاطی نے اس کا ذکر کر کے کہا ہے کہ ابو عمر نے اسے مہمل کہا ہے۔

سہم بن منجاب تمیمی کے ذکر میں طبری سے نقل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ وہ بنی تمیم سے صدقات کی وصولی پر نبیؐ کی جانب سے مامور تھے اور آپؐ کی وفات تک اس کام کو انجام دیتے رہے۔ عکرمۃ بن ابی جہل کے ذکر میں طبری سے نقل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی وفات کے سال انھیں ہوازن سے زکوٰۃ وصولی پر مامور فرمایا تھا۔

مالک بن نویرہ تمیمی کے ذکر میں لکھا ہے کہ انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی تمیم سے زکوٰۃ وصول کرنے بھیجا اور مرداس بن مالک غنوی کو ان کی قوم سے زکوٰۃ کی وصولی پر مامور کیا۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں اپنے زکوٰۃ وصول کرنے والے بھیجے تاکہ وہ زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین میں تقسیم کریں[1]۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عاملین زکوٰۃ کو روانہ فرماتے تو ان کو نصیحتیں کرتے

---

[1] مجلہ حضارۃ الاسلام دمشق میں سیرت نبویؐ کے اہم پہلو نقشوں کی مدد سے اجاگر کیے گئے ہیں انھی میں ایک نقشہ عاملین زکوٰۃ سے متعلق ہے، اسی سے ہم نے یہ اسماء نقل کیے ہیں، اگرچہ یہ نقشہ مکمل نہیں ہے اور اس میں صرف وہ نام دیئے گئے ہیں جو ابن اسحاق نے ذکر کیے ہیں، لیکن نقشہ میں قبائل کے تعین سے وضاحت ہو جاتی ہے۔

اور دولتمندوں سے معاملے کے بارے میں ضروری ہدایات دیتے اور نرمی اور آسانی کی تلقین اور حق اللہ میں رو رعایت نہ کرنے کی تاکید فرماتے۔ آپؐ ان عاملین کو تنبیہ فرماتے کہ اس مالِ عام سے بغیر حق کوئی شئے نہ لیں خواہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو اور بعض موقعوں پر آپؐ باز پرس بھی فرماتے، جیساکہ آپؐ نے ابن اللتبیہ سے باز پرس فرمائی۔

ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی یہ باز پرس اس امر کی دلیل ہے کہ اگر عامل یا حاکم خائن ہو تو اسے معزول کیا جائے اور اس کا احتساب کیا جاتے[1]

یہ امور واضح کرتے ہیں کہ عہدِ نبوتؐ میں زکوٰۃ کے معاملات سرکاری معاملات تھے اور اسی لیے آپؐ ہر قوم اور ہر قبیلے میں عامل روانہ فرماتے تاکہ وہ ان کے دولتمندوں سے زکوٰۃ لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کر دے۔

اور اسی بنا پر فقہائے نے کہا ہے کہ

"امام (سربراہِ حکومت) کی ذمے داری ہے کہ زکوٰۃ وصول کنندگان بھیجے اس لیے کہ آپؐ نے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے نے کارندے روانہ فرمائے اور نیز اس لیے بھی کہ دولتمند لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جنھیں یہ معلوم نہ ہو کہ کس قدر زکوٰۃ ان پر واجب ہوتی ہے اور بعض بخیل بھی ہو سکتے ہیں جو از خود دینے پر آمادہ نہ ہوں، اس لیے زکوٰۃ لینے والوں کو بھیجنا ضروری ہے۔"[2]

قوم کے دولتمند لوگوں پر بھی لازم ہے کہ وہ ان زکوٰۃ وصول کنندگان کی مدد کریں اور ان سے تعاون کریں اور جس قدر زکوٰۃ لازم ہو وہ انھیں دے دیں اور ان سے اپنے زکوٰۃ کے مال نہ چھپائیں — کہ یہی حکم ہے سرکار دو عالمؐ کا اور یہی ان کے اصحابؓ کا طریقہ رہا ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ کچھ اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] زاد المعاد، بحوالۂ مذکور۔

[2] المجموع، ج ۶، ص ۱۶۷۔ الروضۃ، ج ۲، ص ۲۱۰۔

پاس آئے اور عرض کی کہ زکوٰۃ وصول کنندگان آتے ہیں اور زیادتی کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا اپنے زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو خوش رکھو۔ (مسلم)

حضرت جابر بن عتیک سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے پاس ایسے سوار آئیں گے جنھیں تم پسند نہیں کروگے، جب وہ آئیں تو انھیں مرحبا کہو اور انھیں زکوٰۃ لینے دو اگر وہ انصاف سے کام لیں گے تو ان کے حق میں بہتر ہوگا اور اگر وہ زیادتی کریں گے تو ان کے حق میں بُرا ہوگا، اور تمہارا پوری زکوٰۃ دینا ہی ان کی رضامندی ہے اور وہ تمہارے لیے دُعا بھی کریں گے۔[1]

---

[1] بروایت ابوداؤد، بحوالہ نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۵۔ ط۔ العثمانیہ۔

المناوی۔ الفیض میں کہتے ہیں کہ بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی ناانصافی کرنے والے کو عامل نہیں بنایا بلکہ آپؐ کے مقرر کردہ زکوٰۃ وصول کنندگان، جن میں حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ جیسے افراد تھے بے حد عادل تھے۔ اس لیے اس حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ چونکہ حُب مال انسانی سرشت میں موجود ہے اس لیے جب میرے عمال آئیں گے تو ہوسکتا ہے کہ تم یہ خیال کرو کہ یہ ناانصافی کررہے ہیں حالانکہ فی الواقع ایسا نہ ہو، گویا ان ظلمتم کا لفظ اسی خیال پر مبنی ہے اور اس پر اِنْ شرطیہ جوکہ تقدیر اور فرض کے لیے آتا ہے دلالت کرتا ہے۔

المظہری کہتے ہیں کہ کیونکہ حکم تمام زمانوں پر عام ہے اس لیے فرمایا کہ اگر وہ ناانصافی بھی کریں تو بھی انہی کو دو کہ ان کی مخالفت حکومت (سلطان) کی مخالفت ہے کہ فتنہ اور شورش کا باعث بن سکتی ہے۔

المناوی نے اس رائے کو اس طرح رد کیا ہے کہ اگر اس کی وجہ محض مخالفت سے بچنا ہوتا تو پھر مال کا چھپا لینا درست ہوتا لیکن ایسا کرنا جائز نہیں ہے کہ روایت میں ہے کہ جب یہ کہا گیا کہ ہم اپنے مال میں سے ان کی مقدار کے بقدر چھپالیں تو فرمایا کہ نہیں۔ بہرحال غیر منصف کو ناراض کردینا ہی ضروری ہے اور اس کو ظلم پر راضی کرنا حرام ہے۔

(فیض القدیر: ج ۱، ص ۴۷۵)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی اگر میں زکوٰۃ آپؐ کے نمائندے کو دے دوں تو تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظر میں اپنے فرض سے بری ہو جاؤ گے اور تمھیں اس کا اجر ملے گا اور جو اس میں ردوبدل کرے وہ خود گناہگار ہوگا۔[1]

صحابہ کرامؓ کے فتاوی

سہل بن ابی صالح اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ میرے پاس بقدر نصاب زکوٰۃ اخراجات جمع ہو گئے میں نے سعد بن ابی وقاصؓ، ابن عمرؓ، ابو ہریرہؓ اور ابو سعید خدریؓ سے پوچھا کہ اس (زکوٰۃ) کو میں خود تقسیم کر دوں یا سلطان کو ادا کر دوں، سب نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں سلطان (حکومت) کو دے دوں اور کسی کی رائے میں اختلاف نہیں ہوا۔

ایک روایت میں ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ یہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ آپ کے سامنے ہے (عہد بنی امیہ) تو کیا میں پھر بھی اسے زکوٰۃ دے دوں؟ سب نے کہا، ہاں اس کے باوجود بھی حکومت ہی کو دو۔

اس روایت کو امام سعید بن منصور نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔[2]

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ اپنی زکوٰۃ ان لوگوں کو دو جن کو اللہ نے تمہارے معاملات کا والی بنایا ہے اگر وہ نیکوکار ہیں تو اپنے لیے ہیں اور اگر گناہگار ہیں تو خود بھگتیں گے۔

قزعہ، مولی زیاد بن ابیہ سے مروی ہے کہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اپنی زکوٰۃ حکمرانوں کو دو خواہ وہ شراب پیتے ہوں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں روایات بیہقی نے سند صحیح اور حسن کے ساتھ روایت کی ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت مغیرۃ بن شعبہ نے اپنے مولی سے جو کہ طائف میں ان کے مال کا متولی تھا، کہا کہ تم میرے مال کا کیا کرتے ہو، اس نے کہا کہ کچھ میں خود صدقہ کر دیتا ہوں

---

[1] المنتقی میں اس حدیث کو احمد کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ نیل الاوطار، بحوالہ سابق۔

[2] النووی، المجموع۔

اور کچھ حکومت (سلطان) کو دے دیتا ہوں، آپؓ نے فرمایا تم ایسا کس طرح کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ یہ لوگ (حکمران) تو زمین خریدتے اور شادیاں کرتے ہیں، آپ نے کہا کہ انہی کو دیا کرو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں انہی کو دینے کا حکم دیا ہے۔

(البیہقی: السنن الکبیر[1])

ان صحیح احادیث اور ان قطعی فتاوی کی روشنی میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت کی اصل یہ ہے کہ مسلم حکومت زکوٰۃ کے معاملات کو خود سنبھالے اور متمول حضرات سے زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین کو دے اور افراد اُمت پر لازم ہے کہ وہ نظم قائم رکھنے، اسلام کے مضبوط بنانے اور بیت المال کی تقویت کے لیے حکومت وقت سے تعاون کریں۔

اس قانون کے اہم پہلو

اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذاہب کا کام یہ ہے کہ وہ ضمائر کو بیدار کریں اور قلوب میں زندگی دوڑائیں اور انسانوں کی نگاہوں کے سامنے اعلیٰ ترین مثالیں رکھ کر ان میں اللہ سے حصول اجر و ثواب کا اشتیاق پیدا کریں اور اس کی ناراضگی کا خوف دلائیں اور تحدید، تنظم اور مطالبہ و سزا کے امور ہیئت مقتدرہ کے لیے چھوڑ دیں کہ اس کا تعلق سیاسی اقتدار سے ہے مذہبی راہنمائی سے نہیں ہے۔

ہوسکتا ہے یہ رائے دیگر مذاہب کی حد تک درست ہو لیکن اسلام کے بارے میں بالکل درست نہیں ہے اس لیے کہ اسلام عقیدہ و نظام، اخلاق و قانون اور قرآن اور سُلطان (اقتدار) کا جامع ہے۔

اسلام نے انسان کو دو جُدا حصوں میں تقسیم نہیں کیا ہے کہ اس کا ایک حصّہ برائے دین ہو اور ایک حصّہ برائے دنیا ہو اور زندگی کا ایک پہلو قیصر کے لیے ہو اور دوسرا پہلو خُدا کے لیے ہو، بلکہ اسلام میں پُوری زندگی پُورا انسان اور ساری کی ساری کائنات اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

---

[1] النووی: المجموع، ج ۶، ص ۱۶۲، ۱۶۴۔

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات اور ایک جامع نظامِ زندگی ہے۔ اس کے مقاصد میں سے یہ ہے کہ فرد آزاد ہو اور اس کی تکریم کی جائے اور حکومت اور عوام کو حق اور ضمیر کی جانب متوجہ کیا جائے اور ساری انسانیت کو اللہ کی عبادت اور اس کی بندگی کی دعوت دی جائے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ایک دوسرے کو اللہ کے سوا ارباب نہ بنالیں۔

نظامِ زکوٰۃ بھی اسلام کے اس پورے نظام کا ایک حصہ ہے اور اسی لیے یہ انفرادی معاملہ نہیں بلکہ اسلامی حکومت کی ایک ذمے داری ہے اور اسی لیے اسلام نے حکومت پر لازم کیا ہے کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے اور اس کو مستحقین میں تقسیم کرے اور اس کی متعدد وجوہ ہیں جن کو مدِنظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔

اوّل: بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں اور ان کے شعور بیمار ہو جاتے ہیں اور انھیں کسی ضرورتمند کی ضرورت کا احساس تک باقی نہیں رہتا، اس قسم کے لوگوں پر زکوٰۃ کو چھوڑ دینا معاشرے کے تنگدست افراد کو ضائع کر دینا ہے۔

دوم: تنگدست شخص کا مالدار سے لینا اس کی انا کو مجروح کرے گا جبکہ حکومت سے لینے میں اس کی ذات احسان کی گزند سے اور اس کے احساسات مالدار شخص کے سامنے بے وقعت ہونے کی جراحت سے محفوظ رہیں گے۔

سوم: زکوٰۃ کا معاملہ انفرادی ہو جانے سے اس کی تقسیم میں بے ربطی پیدا ہو جائے گی کہ ہو سکتا ہے کہ ایک سے زائد دولتمند افراد ایک ہی شخص کو زکوٰۃ دے دیں اور دوسرا اس سے محروم رہ جائے حالانکہ وہ تنگدستی میں پہلے سے بڑھا ہوا ہو۔

چہارم: زکوٰۃ کا مصرف فقراء، مساکین اور مسافر ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کی ایسی عمومی مصالح بھی زکوٰۃ کا مصرف ہیں جن کا اندازہ کرنا افراد کا کام نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی شوریٰ اور اولوالامر کی ذمّے داری ہے جیسے مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ دینا ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کرنا ہے اور دنیا میں تبلیغ اسلام کے لیے وفود بھیجنا ہے۔

پنجم: اسلام دین بھی ہے ریاست بھی، قرآن بھی ہے اور سلطان بھی، اور اس ریاست و سلطنت کے لیے مال ضروری ہے اور اسلام کے نظامِ حکومت میں زکوٰۃ

بیت المال کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ ہے[1]

زکوٰۃ کا جداگانہ بیت المال

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظام میں اصولاً زکوٰۃ کا علیحدہ خاص بجٹ ہونا چاہیئے جس کی آمدنی بھی جدا ہو اور جس کے مصارف بھی مخصوص و متعین انسانی ہمدردی پر مبنی مصارف ہوں اور زکوٰۃ کی آمدنی کو عام سرکاری آمدنی سے جدا رکھا جائے۔

چنانچہ سورۂ توبہ کی جس آیت میں مصارف زکوٰۃ بیان ہوئے ہیں وہاں اس اصول کا تعین بھی ہو جاتا ہے کہ عاملین اپنی تنخواہیں زکوٰۃ ہی کی مد سے وصول کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زکوٰۃ ایک مستقل میزانیہ ہوگا اور اس کے انتظام اور انصرام پر اسی میں سے صرف کیا جائے گا، جیساکہ ہم مصارف زکوٰۃ میں بیان کر چکے ہیں۔ اور یہی مفہوم ہمیشہ سے مسلمان سمجھتے آئے ہیں اور انھوں نے زکوٰۃ کو علیحدہ ایک بیت المال قرار دیا ہے اور فقہائے حنفیہ نے بیت المال کی چار اقسام کی ہیں۔

۱) صدقات (زکوٰۃ) سے متعلق بیت المال جس میں انعام سائمہ اور اراضی کے عشور شامل ہیں اور اسی میں وہ عشور (چنگی) بھی شامل ہے جو عاشر گزرنے والے مسلمان تاجروں سے وصول کرے۔

۲) جزیہ اور خراج کا خاص بیت المال۔

۳) غنیمت اور رکاز سے متعلق بیت المال (جن فقہاء کے نزدیک رکاز (دفینہ) میں زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ اسے زکوٰۃ کے مصارف میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔)

۴) ضوائع (گم شدہ اشیاء) کا بیت المال یعنی جس مال کے مالک کا علم نہ ہو، جیسے ترکہ ہو جس کا کوئی وارث نہ ہو یا وارث ہو لیکن اُسے ترکہ نہ مل سکتا ہو جیسے میاں بیوی میں سے کوئی ایک، اور اس مقتول کی دیت جس کا کوئی ولی نہ ہو اور وہ گم شدہ اشیاء

---

[1] الدکتور یوسف القرضاوی : مشکلۃ الفقر و کیف عالجہا الاسلام۔ ص ۹۴، ۹۵۔

(لقطات) جن کے مالک کا علم نہ ہو[1]

اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ میں زکوٰۃ کی ذمّے داری

فقہاء نے جن اموال پر زکوٰۃ ہے ان کی دو قسمیں کی ہیں۔

اموال ظاہرہ اور

اموال باطنہ

اموالِ ظاہرہ سے مراد وہ مال ہیں جن کا علم اور اس کی مقدار کا علم مالک کے علاوہ دوسرے افراد کو ہو سکے۔ اس میں تمام زرعی پیداوار خواہ وہ غلّے ہوں یا پھل داخل ہیں اور اسی طرح ہر قسم کی حیوانی ثروت گائے بکری وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔

اموالِ باطنہ سے مُراد نقُود (زرِ نقد۔ کرنسی) اور سامانِ تجارت ہے۔ زکوٰۃ فطر کو بعض فقہاء نے اموال ظاہرہ میں شمار کیا ہے اور بعض دیگر نے اموال باطنہ میں شمار کیا ہے۔

اموالِ ظاہرہ کے بارے میں تقریباً اتفاق ہے کہ اس کا وصول کرنا اور اس کا تقسیم کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے افراد کی ذمّے داری نہیں ہے اور اس مال کی زکوٰۃ کو افراد کے قلب و ضمیر پر نہیں چھوڑا جائے گا۔

اس بارے میں بے شمار روایات موجود ہیں کہ آپؐ اپنے قاصد اور عمال اور کارکن بھیجتے اور وہ جا کر لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتے اور اسی مال کی زکوٰۃ کی ادائیگی پر مسلمانوں کو مجبور کیا گیا اور اس سے باز رہنے والوں سے جہاد کیا گیا[2]۔

اور اسی مال کی زکوٰۃ کے بارے میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر عرب کے یہ قبائل عہدِ نبوتؐ میں ایک رسی بھی زکوٰۃ میں دیتے تھے اور وہ اب دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے قتال کروں گا۔

---

[1] المبسوط، ج ۳، ص ۱۸، البدائع، ج ۲، ص ۶۸، ۶۹، الدر المختار و حاشیۃ رد المختار علیہ۔ ج ۲، ص ۵۹، ۶۰۔

[2] الاموال۔ ۵۳۱۔

دوسری قسم کے مال یعنی اموال باطنہ ــــ نقود اور سامان تجارت وغیرہ ــــ کے بارے میں بھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ بھی حکومت ہی لے گی اور وہی اس کی تقسیم بھی کرے گی ــــ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان اموال کی زکوٰۃ لینے کے لیے حکومت لوگوں پر جبر کر سکتی ہے اور نہ دینے والوں سے اس طرح قتال کر سکتی ہے جس طرح کہ حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا۔ اس سلسلے میں اہم اقوال درج ذیل ہیں۔

حنفی فقہاء کی رائے فقہائے احناف کے نزدیک اموال ظاہرہ کی ولایت امام (حکومت) کو حاصل ہے مالکوں کو نہیں ہے کیونکہ فرمان الٰہی ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ : ۱۰۳)

اور اس لیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا اور منکرین زکوٰۃ سے قتال کیا۔ اور نیز اس لیے کہ جس شئے پر امام بحکم ولایت قبضہ کر سکتا ہو اسے مولیٰ علیہ کو دینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ ولی یتیم کی صورت میں ہے[1]

اموالِ باطنہ مالکوں کے سپرد ہیں۔ اوّلاً ان کی ولایت بھی امام ہی کو حاصل تھی لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد میں یہ طریقہ ترک ہو گیا اور انھوں نے مصلحت یہی خیال فرمائی کہ یہ اموال مالکوں پر چھوڑ دیئے جائیں اور صحابۂ کرام نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور ان اموال میں مالک امام کے وکیل کے طور پر ہو گئے اگرچہ ان پر زکوٰۃ لینے کا امام کا حق بالکلیہ ختم نہیں ہوا، اسی لیے اگر امام کو یہ معلوم ہو کہ فلاں علاقے کے لوگ اموال باطنہ کی زکوٰۃ نہیں دے رہے ہیں تو وہ ان سے مطالبہ کر سکتا ہے ورنہ نہیں کہ عام حالات میں اموال باطنہ کی زکوٰۃ کا حکومت کا مطالبہ خلافِ اجماع ہوگا۔[2]

مالِ تجارت اگر اپنی جگہ پر موجود ہو تو مال باطنہ ہے اور جب اس کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے لے جایا جائے اور تاجر اسے لے کر عاشر (چنگی لینے والے) کے پاس سے گزرے تو اس وقت یہ مال ظاہرہ متصور ہو گا اور مالک پر اس کی زکوٰۃ عاشر کو دینا لازم ہوگا۔

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۴۳ - ط المنار

[2] حاشیۂ ابن عابدین - ج ۲، ص ۵ -

اسلامی حکومت (امام) راستوں کے ناکوں پر تجارتی سامان پر صدقات کی وصولی کے لیے جو آدمی مقرر کرتی ہے وہ عاشر (عشور ۱/۱۰ لینے والا) کہلاتا ہے۔

فقہاء نے کہا ہے کہ ان عاشروں کی مذمت کے بارے میں جو روایات وارد ہیں وہ ظلماً وصول کرنے والوں کے بارے میں ہیں[1]

مسلک مالکؒ کے فقہاء کی رائے

مسلک مالکؒ کے فقہاء کہتے ہیں کہ زکوٰۃ لازماً امام عدل کو دی جائے گی اور وہ اس کو وصول کرنے اور صرف کرنے کا مجاز ہوگا اگرچہ وہ ان معاملات کے سوا دیگر معاملوں میں ظالم ہو۔ اور زکوٰۃ خواہ مویشی کی صورت میں ہو یا زرعی پیداوار کی صورت میں یا بصورت نقد ہو اور جب امام عدل طلب کرے اور کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے زکوٰۃ دے دی ہے تو اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔

ایسے امام کو (جو زکوٰۃ کے معاملے میں عادل اور دیگر معاملات میں ظالم ہو) دینا لازم ہے یا جائز ہے؟

الدردیر اپنی الشرح الکبیر میں کہتے ہیں کہ واجب ہے اور الدسوقی نے اپنے حاشیہ میں کہا ہے کہ مکروہ ہے جیسا کہ التوضیح وغیرہ میں ہے۔

بہرحال اس امر پر اتفاق ہے کہ جو امام تمام معاملات میں عادل ہو اس کو دینا واجب ہے[2]

القرطبی فرماتے ہیں کہ اگر امام زکوٰۃ کے لینے اور صرف کرنے میں عادل ہو تو نقدین مالک کو از خود صرف کرنا درست نہیں ہے۔ اور ایک قول یہ بھی کہ زر نقد کی زکوٰۃ مالک ہی کے ذمے ہے اور ابن الماجشون کہتے ہیں کہ یہ اجازت بایں صورت ہے کہ مالک فقراء اور مساکین ہی پر صرف کرے اور اس کے علاوہ صرف کرنا درست نہیں ہے۔

---

[1] بحوالۂ مذکورہ، ص ۴۱، ۴۲۔

[2] الشرح الکبیر بحاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۳، ۵۰۴۔

بلکہ امام ہی تقسیم کرے گا۔[1]

مسلک شافعیؒ کے فقہاء کی رائے

مسلک شافعیؒ کے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اموالِ باطنہ (سونے چاندی اور سامانِ تجارت) میں زکوٰۃ مالک خود ہی تقسیم کرے گا اور اسی طرح زکوٰۃ الفطر میں جبکہ اس زکوٰۃ کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ اموالِ ظاہرہ میں سے ہے۔

اموالِ ظاہرہ، پیداواریں اور کانیں وغیرہ تو ان میں مالک کے خود تقسیم کرنے کے بارے میں دو اقوال ہیں، پہلا قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اور بعد کا قول یہ ہے کہ جائز ہے بلکہ اگر امام عادل ہو تو اسے دینا واجب ہے اور اگر امام ظالم ہو تو دو صورتیں ہیں یعنی یہ کہ جائز ہے اور یہ کہ لازم نہیں ہے اور صحیح قول یہ ہے کہ امام کو دینا ہی لازم ہے اس لیے کہ اس کا حکم نافذ ہے اور وہ معزول نہیں ہوا ہے۔

ان فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ اگر اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ کا امام مطالبہ کرے تو بلا اختلاف اس مطالبہ کو تسلیم کیا جانا چاہیے اور جو لوگ باز رہیں ان سے امام مزاحمت کر سکتا ہے اگرچہ وہ از خود ادا کر رہے ہوں اور اگر امام مطالبہ نہ کرے اور کوئی زکوٰۃ وصول کرنے والا نہ آئے تو مالک اس وقت ادائے زکوٰۃ کو مؤخر کرے جب تک زکوٰۃ وصول کرنے والے کے آنے کی توقع ہو اور جب یہ توقع باقی نہ رہے تب از خود تقسیم کر دے۔

اموالِ باطنہ کے بارے میں الماوردی کہتے ہیں کہ ان اموال میں حکمرانوں کو کوئی اختیار نہیں ہے اور مالک اس کے زیادہ حقدار ہیں اور اگر وہ از خود صرف کر دیں تو حکمراں کو ان کی بات قبول کرنی چاہیے لیکن اگر کسی کے بارے میں امام کو یہ علم ہو کہ وہ از خود زکوٰۃ نہیں دیتا تو کیا امام کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اسے حکم دے کہ یا تو خود زکوٰۃ ادا کرے یا امام کو دے تاکہ وہ اسے مستحق لوگوں کو دے سکے، اس میں وہی دو صورتیں ہیں جو نذر اور کفارے کے مطالبہ میں ہیں۔

اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ امام کے اس اختیار کو تسلیم کیا جائے تاکہ

---

[1] تفسیر القرطبی، ج ۸، ص ۱۷۷۔

زکوٰۃ نہ دینے کے منکر کا ازالہ ہو سکے[1]

حنبلی فقہاء کی رائے

حنبلی مسلک کے فقہاء کے نزدیک اس زکوٰۃ کا امام کو دینا لازم نہیں ہے لیکن امام کو لینے کا اختیار ہے اور مسلک میں اس بارے میں بقول المغنی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام کو دینا جائز ہے خواہ امام عادل ہو یا نہ ہو اور خواہ اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ ہو یا اموال باطنہ کی اور دینے والا امام کو دے کر بری الذمہ ہو جائے گا خواہ امام اس کو تلف کر دے یا اسے مصرف زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور مصرف میں لگا دے، جیسا کہ صحابہ کرام سے مروی ہے۔ اس لیے کہ امام ان کا شرعاً نائب ہے اور اسے دے کر دینے والا بری الذمہ ہو جائے گا، جیسے یتیم کا مال اگر امام اپنی تحویل میں لے لے تو ولی بری الذمہ ہو جائے گا، بہرحال مسلک میں اس بارے میں بھی اختلاف نہیں ہے کہ مال کا مالک زکوٰۃ از خود بھی تقسیم کر سکتا ہے۔

البتہ مسلک میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ کون سا مسلک عمدہ اور افضل ہے کہ اگر امام مطالبہ نہ کرے تو مالک خود ہی اپنی زکوٰۃ دے دے یا امام عادل کو دے دے تاکہ وہ اس کو صرف کرے۔

ابن قدامہ المغنی میں کہتے ہیں کہ

مستحب یہ ہے کہ مالک اپنی زکوٰۃ خود ہی دے تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کی زکوٰۃ مستحق تک پہنچ گئی ہے خواہ یہ اموال ظاہرہ ہوں یا باطنہ ہوں۔

امام احمد کہتے ہیں کہ مالک کا خود زکوٰۃ دینا زیادہ بہتر ہے لیکن اگر امام کو دے دے تو وہ بھی جائز ہے۔

حسن، مکحول، سعید بن جبیر اور میمون بن مہران کہتے ہیں کہ مالک خود ہی ادا کرے۔

ثوریؒ کہتے ہیں کہ اگر افراد حکومت زکوٰۃ صحیح مصرف میں صرف نہ کریں تو انہیں نہ دی جائے۔

---

[1] الروضہ: ج ۲، ص ۲۰۶/۲۰۵۔

عطاء کہتے ہیں کہ اگر افراد حکومت زکوٰۃ کو صحیح مصرف صرف کریں تو انھیں دی جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو انھیں زکوٰۃ نہ دی جائے۔

شعبی اور ابو جعفر کہتے ہیں کہ اگر والی عادل نہ ہو تو زکوٰۃ خود ہی اہل ضرورت کو دے دی جائے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ اقوال ظالم حکمرانوں کے بارے میں ہیں اور ان سے المغنی کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔

امام احمدؒ سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ زمین کی زکوٰۃ میں میرے نزدیک بہتر یہی ہے کہ سلطان کو دی جائے اور مویشی جیسے اموال کی زکوٰۃ مالک خود ہی فقراء اور مساکین کو دے دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام احمدؒ کے نزدیک عُشر امام کو دینا مستحب ہے۔ اس لیے کہ بعض فقہاء کے نزدیک خراج کی طرح عُشر بھی زمین کی مؤونت ہے بخلاف دیگر اموال زکوٰۃ کے۔

الجامع میں ان کی یہ رائے ہے کہ صدقۂ فطر سلطان کو دینا پسندیدہ ہے۔

امام احمدؒ کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ سے کہا گیا کہ حکمراں زکوٰۃ کے مال سے کُتے پالتے اور شراب پیتے ہیں، اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا پھر بھی زکوٰۃ حکومت ہی کو دینی چاہیئے۔

ابن ابی موسیٰ اور ابو الخطاب کہتے ہیں کہ امام عادل کو زکوٰۃ دینا افضل ہے اور یہی رائے امام شافعیؒ کے اصحاب کی ہے۔

بعد ازاں ابن قدامہ نے ان فقہاء کے اقوال درج کیے ہیں جن کے نزدیک تمام اموال کی زکوٰۃ امام (حکومت) ہی کو دی جانی چاہیے اور ان فقہاء کا قول جن کے نزدیک اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ امام کو دینا لازم ہے، جیسا کہ امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور ابو عبیدؒ وغیرہ اور ان اصحاب کی دلیل مذکورہ بالا آیت (خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ) اور حضرت ابو بکرؓ کا مانعین زکوٰۃ سے قتال کرنا ہے۔

اس کی ابن قدامہ اس طرح تردید کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مالک کے از خود مستحق کو

زکوٰۃ دینے کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مستحق کو اس کا حق پہنچا دیا ہے جیسا کہ قرض دے دیا جائے، اور جس طرح کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ بھی مالک خود دیتا ہے اور اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ بھی اموال باطنہ کی ہی طرح ہے کہ بہر حال وہ بھی زکوٰۃ ہے۔

جہاں تک آیتِ قرآنی کا تعلق ہے تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام (حکومت) زکوٰۃ لے سکتی ہے اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے اور حضرت ابوبکرؓ کے قتال کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سرے سے زکوٰۃ ہی نہیں دی، اگر وہ مستحقین کو زکوٰۃ دے دیتے تو حضرت ابوبکرؓ ان سے مقابلہ نہ فرماتے، اس لیے کہ زکوٰۃ کے ازخود دینے کا مسئلہ اختلافی ہے اور اس پر مقابلہ نہیں ہو سکتا اور امام کا مطالبہ مستحقین کی ولایت اور نیابت کے طور پر ہوتا ہے، اس لیے اگر دہندہ خود ہی مستحقین کو دے دے تو جائز ہونا چاہیے، کیونکہ دہندہ صاحب عقل ہے بخلاف یتیم کے۔

اور جہاں تک مستحقین کو خود زکوٰۃ دینے کے مستحب ہونے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح مستحق کا حق اس کو پہنچ جاتا ہے اور عاملینِ زکوٰۃ کی اُجرت بچ جاتی ہے اور مستحقین کا حق خیانت سے محفوظ ہو جاتا ہے اور مستحق کی تکلیف براہِ راست دور ہو جاتی ہے اور رشتہ داروں اور قرابت داروں کی حق رسی اور صلہ رحمی ہو جاتی ہے اس لیے ازخود مستحقین کو زکوٰۃ دینا زیادہ افضل ہے جیسا کہ اس صورت میں افضل ہے جب لینے والا اہل عدل میں سے نہ ہو۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ اگر امام عادل ہو تو پھر تو خیانت کا اندیشہ نہیں ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ امام ازخود زکوٰۃ وصول نہیں کرتا بلکہ اس کے مقرر کردہ وصول کنندگان کرتے ہیں اور ان سے خیانت کا اندیشہ ہے اور یہ بھی خطرہ ہے کہ زکوٰۃ مستحق کو نہ پہنچے، جب کہ مالک اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں موجود مستحقین سے بخوبی واقف ہے، اور وہ اس کے صلہ اور ہمدردی کے زیادہ مستحق ہیں [1]

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۴۱، ۶۴۴۔

مسلک زیدیہ کے فقہاء کی رائے

زیدیہ مسلک کے فقہاء کے نزدیک امام کو اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دونوں پر ولایت حاصل ہے اور امام عادل کی موجودگی میں مالک کو کوئی ولایت حاصل نہیں ہے۔

ان کے نزدیک مویشی، پھل، فطرہ، خراج اور خمس اموال ظاہرہ ہیں۔ اور سونا اور چاندی اور تجارتی مال اموال باطنہ ہیں۔

ان کا استدلال (خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ) سے اور (زکوٰۃ اغنیاء سے لے کر ان کے فقیروں کو لوٹائی جاتی ہے۔) والی حدیث سے اور آپ کے زکوٰۃ وصول کنندگان کے روانہ کرنے والی احادیث سے ہے، اور عمل خلفائے راشدین دلیل ہے۔

ان کے نزدیک کفارے، نذریں اور مظالم میں امام کو ولایت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ افراد کا اپنا معاملہ ہے اِلّا یہ کہ لوگ یہ ذمے داریاں پوری نہ کریں تو امام ان پر ان کو پورا کرنا لازم قرار دے دے۔

اور فرق ان دونوں امور میں یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت تو من جانب اللہ ہے جبکہ کفارہ وغیرہ میں خود مکلف اس کے لزوم کا سبب بنا ہے۔

جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ زکوٰۃ کا معاملہ امام کے سپرد ہے تو اگر کوئی شخص امام کے زکوٰۃ کے مطالبہ کے بعد اپنی زکوٰۃ امام کے علاوہ کسی اور کو دے دے تو اسے جائز نہ ہوگا اور اس پر اس کا اعادہ لازم ہوگا اگرچہ بوقت ادائیگی اسے علم نہ ہو کہ امام نے مطالبۂ زکوٰۃ کیا ہے یا زکوٰۃ امام ہی کو دینی ہے۔ اس لیے کہ اس کا اس واجب (فریضہ) سے ناواقف ہونا عذر نہیں بن سکتا۔

اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ جس واجب (فریضہ) کی ناواقفیت عذر نہیں بنتی وہ ایسا واجب ہوتا ہے جس پر اجماع ہو جبکہ اختلافی مسئلہ میں ناواقفیت اجتہاد کی طرح ہوتی ہے اور اموال میں امام کی ولایتِ زکوٰۃ اختلافی مسئلہ ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ عدم واقفیت کی صورت میں مالک کا خود ادا کرنا جائز ہو۔

اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ مذکورہ اختلاف امام کی جانب سے مطالبہ

ہونے کی صورت میں ہے اگر امام کا مطالبہ ہو تو یہ امر اجماعی ہے اور اسے زکوٰۃ دینا لازمی ہے۔[1]
اگر امام موجود نہ ہو یا موجود ہو لیکن مالک اس کی زیر ولایت نہ رہتا ہو تو عاقل بالغ مالک اپنی زکوٰۃ خود ہی مستحقین کو دے گا اور بچے، مجنون اور بے ہوش وغیرہ کی زکوٰۃ اس کا ولی دے گا، اور نیت ضروری ہوگی۔[2]

مسلک اباضیہ کے فقہاء کی رائے

مسلک اباضیہ کے فقہاء کے نزدیک اگر امام ظاہر ہو تو زکوٰۃ امام ہی کو دی جائے گی اور مالک از خود اپنی زکوٰۃ تقسیم نہیں کرے گا اگر کر دے تو لوٹا دے گا الا یہ کہ امام یا اس کا نائب اسے خود دینے کا حکم دیں تو پھر وہ خود دے سکتا ہے۔
ایک قول یہ بھی ہے بغیر حکم امام بھی دینا جائز ہے اور ایک اور قول یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے الا یہ کہ امام مطالبہ کرے تو اس صورت میں امام کو دوبارہ دے گا اگرچہ امام نے اس علم کے بعد مطالبہ کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ دے چکا ہے۔
اس آخری قول کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنی بیوی سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا، اگر ان کا بغیر اجازت امام دینا جائز نہ ہوتا تو وہ ان سے مطالبہ نہ کرتے۔ اور اہلیہ نے جو یہ کہا کہ نہیں جب تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ لوں تو اس کی وجہ ان کی یہ رائے تھی کہ کہیں عورت کا اپنے شوہر اور اپنے بیٹوں کو زکوٰۃ دینا ناجائز نہ ہو۔
امام کو زکوٰۃ دینے کے قائلین کی دلیل حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا یہ فرمان ہے کہ اگر وہ مجھے وہ ایک رسی نہ دیں گے جو عہد نبوتؐ میں دیا کرتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا۔ یعنی حضرت ابوبکر رضؓ نے ان سے مقابلہ کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ لازمی بتایا اور اس منع زکوٰۃ میں مطلقاً نہ دینا، یا اپنے رشتہ داروں کو از خود دینا یا دینے کا ارادہ کرنا سب صورتیں شامل ہیں

---

[1] شرح الازہار، وحواشیہ، ج ۱، ص ۵۲۷، ۵۲۹۔
[2] شرح الازہار، ج ۱، ص ۵۳۴، ۵۳۵۔

کہ مانعینِ زکوٰۃ نے یہی کہا تھا کہ ہم اپنے اموال میں شریک نہیں بناتے۔ یہاں اعتبار عموم لفظ کا ہے خصوص سبب کا نہیں ہے اور یہاں پر قتال کو صرف منع سے متعلق کیا گیا ہے، اور یہ عام ہے (یعنی اس منع کی خواہ کوئی صورت ہو) [۱]

الشعبی، الباقر، ابوزرین اور الاوزاعی کی رائے

شعبی، باقر، ابوزرین اور اوزاعی کی رائے بھی یہی ہے کہ زکوٰۃ امام کو دی جائے گی کیونکہ امام ہی کو مصارفِ زکوٰۃ کا علم ہے اور اسے دینا (دینے والے کو) ظاہری اور باطنی طریقے پر بری الذمہ کر دیتا ہے، جبکہ از خود فقیر کو دینے سے وہ باطناً بری نہیں ہوتا اس لیے کہ اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ اس نے غیر مستحق کو زکوٰۃ نہ دے دی ہو، اور یہ کہ اختلافی صورت سے اجتناب ہو جاتا ہے۔ اور تہمت (نہ دینے کی) بھی باقی نہیں رہتی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس جب حضرت ابن زبیرؓ کے زکوٰۃ وصول کنندگان آتے تو انھیں زکوٰۃ دیتے اور جب نجدہ حروری آتے تو انھیں زکوٰۃ دے دیتے تھے۔

سہیل ابو صالحؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس گیا اور ان سے عرض کی کہ میرے پاس مال ہے اور میں اس کی زکوٰۃ دینا چاہتا ہوں اور ان لوگوں کا جو حال ہے وہ آپؓ کے سامنے ہے تو آپؓ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ انھی کو دے دو، اس کے بعد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور ان سے یہی بات کہی اور آپ نے بھی یہی جواب دیا۔ پھر میں حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس گیا انھوں نے بھی یہی جواب دیا، پھر میں ابو سعیدؓ کے پاس آیا تو انھوں نے بھی یہی کہا۔ اور یہی رائے حضرت عائشہؓ سے مروی ہے [۲]

موازنہ اور ترجیح

ان اقوال اور ان مسالک کے مابین ترجیح اور موازنہ سے پہلے میں اس امر کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات اور اختلافات کے باوجود فقہاء ان دو بنیادی امور میں متفق ہیں۔

---

[۱] شرح النیل، ج ۲، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

[۲] المغنی، ج ۲، ص ۶۴۲، ۶۴۳-ط-المنار۔

۱) امام (حکومت) کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے ہر قسم کے مال۔ ظاہرہ اور باطنہ۔ کی زکوٰۃ کا مطالبہ کرے اور بالخصوص اس صورت میں جبکہ کسی علاقے (شہر) کے لوگ ادائے زکوٰۃ میں سستی برتتے ہوں اور یہی بات علمائے احناف نے تاکید کے ساتھ کہی ہے۔

بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف کا تعلق امام کے عدم مطالبہ کی صورت سے ہے لیکن مطالبہ کی صورت میں امام کو زکوٰۃ دینے پر اجماع ہے[1]

اور اگر اس میں کوئی اختلاف ہے تو وہ امام کے مطالبہ سے رفع ہو جاتا ہے کیونکہ امام کا حکم ایک امر اجتہادی ہے اور اس پر بناء کرنے سے یہ اختلاف رفع ہو جاتا ہے اور اس کی حیثیت قضاء قاضی (عدالتی فیصلہ) کی سی ہو جاتی ہے[2]

۲) یہ بلاشبہ ایک اختلافی اور قطعی امر ہے کہ اگر امام خود ہی زکوٰۃ کی وصولیابی کو نظر انداز کر دے اور لوگوں سے اس کا مطالبہ نہ کرے تو ظاہر ہے کہ مال کے مالکوں سے زکوٰۃ کی ذمے داری ساقط نہ ہوگی بلکہ باقی رہے گی اور ان پر از خود مستحقین کو دینا لازم ہوگا اس لیے کہ زکوٰۃ ایک لازمی فریضہ اور عبادت ہے۔ بلکہ اگر کوئی حاکم یہ اعلان کر دے کہ زکوٰۃ معاف کر دی گئی ہے تو اس کا یہ اعلان کالعدم اور بے حقیقت متصور ہوگا اور ہر مسلمان پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم رہے گی۔

ان دونوں امور کی وضاحت کے بعد اب صرف اموال باطنہ کی زکوٰۃ کے بارے میں یہ اختلاف باقی رہ گیا کہ اس کی زکوٰۃ امام کو دی جائے یا نہ دی جائے؟

میری اس سلسلے میں رائے یہ ہے کہ جن نصوص اور شرعی دلائل سے زکوٰۃ امام اور حکومت کے معاملات میں سے قرار دی گئی ہے۔ ان نصوص میں مال ظاہر اور مال باطن میں کوئی فرق نہیں کیا ہے اور مسلم حکومت کا لازمی فرض یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کی ذمے داری

---

[1] شرح الازھار، ج ۱، ص ۵۲۹۔

[2] البحر، ج ۲، ص ۱۹۰۔

قبول کرے اور یہی "ادارۂ زکوٰۃ" کی اصل صورت ہے جیساکہ امور درج ذیل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ا) امام رازیؒ اپنی تفسیر میں "انما الصدقات" کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے اور اسے تقسیم کرنے کی ذمے داری امام پر ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عاملین (زکوٰۃ کے کارندوں) کا جدا حصہ متعین کیا گیا ہے، جو اس امر کی دلیل ہے کہ ادائے زکوٰۃ کے لیے عامل ضروری ہے اور عامل وہ ہے جسے امام زکوٰۃ کی وصولیابی پر مامور کرے اس کا مطلب یہ ہُوا کہ امام ہی زکوٰۃ وصول کرے اور (خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً) سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ جبکہ اموالِ باطنہ میں مالک کے از خود زکوٰۃ ادا کرنے کے جواز کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے۔ (وَفِی اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ) کیونکہ یہ حق سائل اور محروم کا ہے اس لیے اسے ابتداءً ہی دینا چاہیے۔[1]

مگر امام رازیؒ کا یہ استدلال درست نہیں ہے اس لیے کہ سائل اور محروم کا حق تو اموالِ ظاہرہ میں بھی موجود ہے اور یہ دلائل موجود ہیں کہ زکوٰۃ امام کا معاملہ ہے انفرادی معاملہ نہیں ہے جیساکہ خود انھوں نے بیان کیا ہے۔

ب) حنفی محقق کمال الدین بن الہمام کہتے ہیں کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً کا ظاہر یہی بتاتا ہے کہ اموال ظاہرہ اور اموالِ باطنہ دونوں وصولِ زکوٰۃ کا حق امام کو حاصل ہے۔ اور یہی سُنّت عہدِ رسالتؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں رہی ہے لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہُوئے اور لوگوں میں تبدیلی آگئی تو انھوں نے یہ غیر مناسب خیال کیا کہ لوگوں کے پوشیدہ اموال کی تفتیش کے لیے سُعَاۃ (کارندے) روانہ فرمائیں تو انھوں نے مالکوں کو یہ نیابت سونپ دی اور صحابۂ کرامؓ نے ان پر اس بارے میں اعتراض نہیں کیا مگر اس سے (اموال باطنہ میں) امام کے مطالبہ کا حق ساقط نہیں

---

[1] الرازی: التفسیر الکبیر، ج ۱٦، ص ۱۱۴۔

ہُوا، اسی لیے اگر اسے یہ علم ہو کہ اہلِ بلد اپنی زکوٰۃ نہیں دیتے تو وہ ان سے مطالبہ کر سکتا ہے۔[1]

ج) نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ خود ہی وصول فرمایا کرتے تھے، چنانچہ ابو عبید ترمذیؒ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عمرؓ کو زکوٰۃ وصول کنندہ مقرر فرمایا، آپ حضرت عباسؓ کے پاس آئے اور ان سے زکوٰۃ طلب کی، انھوں نے کہا کہ میں پہلے ہی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دو سال کی زکوٰۃ دے چکا ہوں، حضرت عمرؓ نے یہ بات آپؐ کی خدمت میں عرض کی آپؐ نے فرمایا کہ میرے چچا درست کہہ رہے ہیں ہم نے ان سے دو سال کی زکوٰۃ پہلے ہی لے لی ہے۔[2]

متعارف یہی ہے کہ حضرت عباسؓ تاجر تھے اور ان کا مال مویشی اور زرعی پیداوار کی صورت میں نہیں تھا۔

د) اس سے ملتی جلتی ایک روایت یہ ہے کہ

"نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ساعی (وصول کنندگان) روانہ فرمائے بعض طعنہ گو افراد نے کہا کہ ابن جمیل، خالد بن ولیدؓ اور عباسؓ بن عبد المطلب نے زکوٰۃ نہیں دی ہے، اس پر آپؐ نے خطاب فرمایا اور عباس اور خالد بن ولیدؓ کی صفائی بیان فرمائی اور ابن جمیل پر اس طعنہ کو درست قرار دیا اور کہا کہ خالدؓ پر لوگ زیادتی کر رہے ہیں دراصل خالدؓ نے اپنی زرہیں رکھوا دی تھیں اور میں انھیں فی سبیل اللہ قرار دیتا ہوں، اور عبّاسؓ کی زکوٰۃ ان کے ذمّے ہے اور اس کے مثل بھی ہے۔

---

[1] ابن الہمام: فتح القدیر، ج ۱، ص ۴۸۷ ۔ ط۔ بولاق۔

[2] الاموال، ص ۵۸۹ ۔ یہ حدیث کئی سندوں سے مروی ہے جو ضعف سے خالی نہیں ہیں مگر متعدد سندیں مل کر قوی ہو جاتی ہیں (فتح الباری ۳ ۔ ۲۱۴) اس حدیث سے فقہاء نے تعجیل زکوٰۃ پر استدلال کیا ہے۔

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان کی زکوٰۃ میرے اوپر ہے اور اس کے مثل بھی ہے۔[1]

۵) اس کی مؤید ابوداؤد کی نقل کردہ حضرت علیؓ کی یہ حدیث بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ربع عشور (۱/۴۰) لے آؤ یعنی ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم۔"[2]

آپؐ کا یہ فرمانا کہ "لے آؤ" نقود کی زکوٰۃ کے مطالبہ اور اس کے امام کو دینے پر دلیل ہے۔

۶) متعدد روایات، اس مفہوم کی بھی موجود ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہ "عطاء" یعنی فوجیوں اور دیوان وغیرہ مرتب کرنے والوں کی تنخواہوں میں سے بھی زکوٰۃ لیا کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ جب کسی کو عطا دیتے تو اس سے پوچھتے کہ تمہارے پاس اور بھی مال ہے اگر وہ کہتا کہ ہاں ہے تو اس عطا میں سے اس کے مال کی زکوٰۃ لے لیتے ورنہ اسے اس کی عطا سپرد کردیتے۔

حضرت ابن مسعودؓ عطیات (تنخواہوں) میں سے ہر ہزار پر پچیس وضع کرلیتے، کیونکہ ان کا مسلک یہی تھا۔ کہ مال مستفاد کی زکوٰۃ کے لیے سال گزرنا شرط نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ جب عطا جاری کرتے تو جملہ اموال تجارت جمع فرماتے اور اس میں فوری اور مؤخر زکوٰۃ کا حساب کرکے موجود اور غیر موجود سے زکوٰۃ لے لیتے۔[3]

قدامہ سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب حضرت عثمان بن عفان کے

---

[1] الاموال ص ۵۹۲، ۵۹۳، اس حدیث کو احمدؒ اور بخاریؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔ نیل الاوطار، ج ۴، ۱۴۹۔

[2] معالم السنن، ج ۲، ص ۱۸۸، ۱۸۹۔ و ابن القیمؒ: تہذیب سنن ابی داؤد۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۴، ص ۴۴۔

پاس اپنی عطا لینے جاتا تو آپ پوچھتے کہ کیا تمھارے پاس ایسا مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو؟ اگر میں کہتا کہ ہاں تو وہ میری عطا (تنخواہ) میں سے اس مال کی زکوٰۃ لے لیتے۔ اور میں کہتا کہ نہیں تو پھر پوری عطا دے دیتے[۱]

۳) جو فتاوی حضرت ابن عمرؓ وغیرہ صحابۂ کرامؓ سے مروی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امراء خواہ ظالم ہی ہوں زکوٰۃ انھی کو دی جائے اور اس میں مال ظاہر اور مال باطن کا کوئی فرق نہیں ہے۔

ابو عبیدؒ کی رائے اور ان کا نقد

فقہاء نے اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ میں فرق کی دلیل سنّت عملی سے یہ دی ہے کہ ہمیں کوئی متواتر روایت یا مشہور روایت ایسی نہیں پہنچی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نقود یا سامان تجارت پر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے اپنے عمال بھیجے ہوں کہ ان اموال کی زکوٰۃ لے کر آئیں یا وہاں کے مستحقین میں تقسیم کریں جیسا کہ آپؐ نے اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ میں عمال بھیجے۔

اسی لیے جن فقہاء نے یہ کہا ہے کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ بھی امام کو دینا جائز ہے انھوں نے اس کی یہ شرط لگائی ہے کہ امام تقویٰ شعار ہو اور زکوٰۃ کو اس کے مقام پر صرف کرے اور کسی کی اور رعایت نہ کرے۔ بہرحال زکوٰۃ دہندہ جو بھی صورت اختیار کرے گا اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

ابو عبید کہتے ہیں کہ

ہمارے نزدیک اہل حجاز و عراق وغیرہ کے محدثین و فقہاء کا نقدی سیم وزر کے متعلق یہی قول ہے اس لیے کہ اس بارے میں مسلمانوں کو اسی طرح امین متصور کیا جائے گا جیسے کہ نماز ادا کرنے میں انھیں امین سمجھا جاتا ہے

باقی رہا مویشیوں، غلوں اور پھلوں کی زکوٰۃ کا معاملہ سو ان اشیاء کی زکوٰۃ حکام ہی

---

[۱] الشافعیؒ: الام، ج ۲، ص ۱۴۔ بولاق۔

وصول کریں گے اور ان اشیاء کے مالکوں کو یہ حق نہیں کہ وہ ان کی زکوٰۃ ان حکام سے چھپائیں اور اگر مالک ان اشیاء کی زکوٰۃ نکال کر مستحقین میں بانٹ دے تو اس عمل سے اس کی فرض زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اور اسے دوبارہ ان کی زکوٰۃ حکام کو دینا ہوگی آثار و روایات میں ان دونوں قسموں کی زکوٰۃ میں فرق ملحوظ ہے۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے مہاجرین و انصار کی موجودگی میں مویشیوں کی زکوٰۃ روکنے پر مرتدین سے جنگ کی تھی، لیکن سونے چاندی کی زکوٰۃ نہ دینے پر ایسا نہیں کیا۔[1]

بعدازاں ابو عبید نے متعدد آثار ذکر کیے ہیں اور ان سے یہ استدلال کیا ہے کہ افراد خود ہی اپنے مال باطن کی زکوٰۃ نکالیں گے۔

ان آثار کا جائزہ لینے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ مال باطن کی زکوٰۃ کے از خود ادا کرنے کا جواز فی الواقع اصل اصول سے استثناء ہے اور اس کا فتویٰ صحابہ کرامؓ نے اس وقت دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفاء کی سنت سے انحراف پیدا ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ اس رائے کا اظہار اس وقت ہوا جب یہودی سازشیں مسلم معاشرے پر چھا گئیں اور عبداللہ بن سبا کے تیار کردہ گروہ کے ہاتھوں حضرت عثمان غنیؓ شہید ہو گئے۔

ابو عبید نے اپنی سند سے ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ

"زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی جاتی تھی یا پھر اسے دی جاتی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مامور ہوتا آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو دی جاتی یا جسے وہ مامور کر دیتے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کو دی جاتی یا جسے وہ مامور کر دیتے ان کے بعد حضرت عثمانؓ کو دی جاتی یا جسے وہ مامور کر دیتے پھر اس بارے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بارے میں لوگوں میں

---

[1] الاموال، ص ۵۷۳۔

اختلاف پیدا ہوگیا لوگوں میں سے کچھ تو اپنی زکوٰۃ حکام ہی کو دیتے رہے اور کچھ اپنے طور پر اسے تقسیم کر دیتے، جو لوگ حکام کو دیتے تھے ان میں حضرت ابن عمرؓ بھی تھے۔

حضرت ابن عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ جب تک یہ حکام نماز قائم کرائیں انھیں زکوٰۃ دیتے رہو۔

ان سے مروی بعض اقوال میں یہ قید بھی موجود نہیں ہے بلکہ انھوں نے کسی پوچھنے والے کے جواب میں کہا کہ

"انہی حکمرانوں کو زکوٰۃ دیتے رہو خواہ وہ اس سے اپنے دسترخوانوں پر کتوں کا گوشت تقسیم کریں"

ایک اور شخص سے آپ نے کہا کہ

"انہی حکمرانوں کو زکوٰۃ دو خواہ وہ اس سے کپڑے اور خوشبو لے لیں"

لیکن بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس رائے سے رجوع فرمالیا تھا اور کہا تھا کہ

"زکوٰۃ کو زکوٰۃ کے مقامات پر صرف کردو"

حضرت ابن عمرؓ کے ایک دوست نے ان سے بحث کی اور ان سے کہا کہ تم زکوٰۃ کے بارے میں کیا کہتے ہو یہ لوگ تو زکوٰۃ کو اس کے مقامات پر صرف نہیں کرتے تو حضرت ابن عمرؓ نے انھیں کہا، حکمرانوں ہی کو دو، اس شخص نے کہا کہ اگر یہ وقت پر نماز نہ پڑھیں تو کیا تم ان کے ساتھ نماز پڑھو گے انھوں نے فرمایا نہیں۔ اس شخص نے کہا کہ زکوٰۃ بھی نماز ہی کی طرح ایک فریضہ ہے۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ان حکمرانوں نے جس طرح ہمارے معاملات کو الجھایا ہے خدا ان کے معاملات الجھا دے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس شخص کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا۔

اسی طرح ابراہیم نخعیؒ اور حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ
"زکوٰۃ کو زکوٰۃ کے مقامات پر صرف کردو اور حکمرانوں سے مخفی رکھو"

میمون بن مہران نے کہا کہ

"تھیلیوں میں رکھ کر اپنے جاننے والوں کو دے دو اور مہینہ ختم ہونے سے پہلے تقسیم کر دو"

ابو یحییٰ الکندی بیان کرتے ہیں کہ

"میں نے سعید بن جبیر سے زکوٰۃ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ولی امر کو دے دو، جب سعید اُٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہولیا اور ان سے کہا کہ آپ نے کہا ہے کہ زکوٰۃ حکمرانوں کو دے دو اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سامنے ہے، تو انھوں نے فرمایا جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے اس طرح زکوٰۃ دے دو، تم نے سب کے سامنے پوچھا تھا اس لیے میں نے یہ بات نہیں بتائی تھی"

ابو عبید نے یہ آثار اور فتاوی پیش کر کے اسی امر پر استدلال کیا ہے کہ یہ اس زمانہ سے متعلق ہیں جب اسلامی ضمیر اموی حکمرانوں پر عام ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا کہ انھوں نے خلفائے راشدین کے طریقوں اور سُنّت کو بدل ڈالا تھا۔

بہر حال اگر اموال باطنہ اور اموال ظاہرہ کی تفریق تسلیم کر لی جائے اور یہ بات مان لی جائے کہ آپؐ نے سیم و زر پر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے وصول کنندگان نہیں روانہ فرمائے تھے تو اس کی دو وجوہ تھیں:۔

۱) لوگ جذبۂ ایمانی کے زیر اثر اور اطاعت اور اپنی خوشی کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کے مقرر کردہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔

۲) نیز یہ کہ مال باطنہ کا شمار اور حساب صرف مالک ہی کر سکتا ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ ان کے ذمّے کر دی گئی تاکہ اسلام کی پیدا کردہ بیداریٔ ضمیر کے تحت وہ زکوٰۃ دیں۔

یہ صورتِ حال حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں برقرار رہی مگر حضرت عمرؓ کے عہد میں دائرۂ خلافت وسیع ہو گیا اور اسلامی ریاست کی حدود وسیع ہو گئیں اور مالیاتی امور کی تنظیم ضروری ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے بے مثال اجتماعی کفالت

کا نظام قائم کر دیا یہاں تک کہ آپؓ نے ہر پیدا ہونے والے بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا اور یہ
اجتماعی کفالت اس قدر وسیع ہوئی کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اس میں غیر مسلم ذمی بھی داخل
ہو گئے، تو لا محالہ زیادہ آمدنی کی حاجت ہو گئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو پابند فرما دیا کہ
وہ اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ سب کی زکوٰۃ وصول کریں تاکہ اس اجتماعی کفالت کے وسیع تر
نظام کے لیے آمدنی فراہم ہو سکے اور مسلمانوں کا بیت المال قوی ہو جائے۔

حضرت عمرؓ نے وصولی زکوٰۃ کا نظام وضع کیا اور وصول کنندگان کو 'عاشرین' کا نام دیا کہ
یہ عاشرین دار الحرب کے تاجروں اور مسلمان تاجروں سے عُشر اور ذمی تاجروں سے نصف عُشر
وصول کیا کرتے تھے (کہ اس پر حضرت عمرؓ نے ان سے مصالحت کی تھی) اور تجارت پر مسلمان
تاجروں سے رُبع عُشر ($\frac{1}{40}$) وصول کیا کرتے تھے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے انھیں ہدایات
دی تھیں، اس طرح اس نظام میں زکوٰۃ کی شرحیں عُشر ($\frac{1}{10}$) نصف عُشر ($\frac{1}{20}$) اور رُبع عُشر
($\frac{1}{40}$) تھیں [1]

حضرت عمرؓ فاروق کا عمل اموال باطنہ کے مالکوں کی سہولت پر مبنی تھا کہ بجائے اس
کے کہ وہ دراز کے علاقوں سے زکوٰۃ جمع کرانے آئیں ان کے پاس عاشر بھیج دیئے جائیں اور
فقہاء نے حضرت عمرؓ کے اسی عمل کو مدِنظر رکھا ہے۔

اگرچہ وسعت سلطنت کی بنا پر حضرت عمرؓ کا طریقہ دورِ نبوتؐ اور دورِ صدیقؓ
سے مختلف تھا مگر بہر حال ان کے عہد میں اموال ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ جمع کی
جاتی رہی ہے۔

جب حضرت عثمانؓ کا عہد آیا تو بیت المال میں فئے، غنیمت، خراج، جزیہ، عُشور
اور صدقات کی آمدنیوں کی بے حد کثرت ہو گئی تھی اور فتوحات کی بنا پر دولت کی کثرت
ہو گئی تھی، اس لیے حضرت عثمانؓ کی یہ رائے ہوئی کہ صرف اموال ظاہرہ ہی کی زکوٰۃ جمع کریں،
اور اموالِ باطنہ کا معاملہ ان کے مالکوں پر چھوڑ دیں تاکہ ان پر اعتماد کیا جائے اور انھیں تفتیش

---

[1] الاموال: ۵۳۱، ۵۶۷، ۵۷۳۔

اور تحصیل کی زحمتوں سے بچایا جائے اور وصولیابی اور تقسیم پر ہونے والے اخراجات میں کمی کی جائے۔ یہ حضرت عثمانؓ کا اجتہاد تھا لیکن اس کا نتیجہ بعد میں یہ ظاہر ہوا کہ لوگوں کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ میں سستی برتنی شروع کردی، کیونکہ اب ان کے جذبۂ دینی میں کمی آگئی تھی اور ان کا یقین کمزور پڑ گیا تھا۔

بعض فقہاء نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ مال کے مالکین نے ادائے زکوٰۃ میں حضرت عثمانؓ کی نیابت کی، جیسا کہ الکاسانی البدائع میں کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ خود زکوٰۃ لیا کرتے تھے، جب حضرت عثمانؓ کا عہد آیا تو مال و دولت کی بڑی فراوانی ہوگئی اور حضرت عثمانؓ نے یہ مناسب خیال کیا کہ اجماع صحابہؓ کے ذریعے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ مالکوں کے سپرد کردی جائے، اس طرح مال کے مالک امام کے وکیل بن گئے اور انھوں نے فرمایا کہ جس پر قرض ہو تو وہ اس کو ادا کردے اور باقی مال کی زکوٰۃ دے دے؛ گویا اس ارشاد سے انھوں نے مال کے مالک کو وکیل بنا دیا، اور اس سے حق امام ختم نہیں ہوا، اسی لیے ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ اگر امام کو یہ علم ہو کہ فلاں شہر کے لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کررہے ہیں تو وہ ان سے مطالبہ کرسکتا ہے[1]

اس سے معلوم ہوا کہ عام اصول یہی ہے کہ امام (حکومت) اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ خود ہی وصول کرے، لیکن چونکہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ جمع کرنا مشقت طلب ہوگیا اور بیت المال ہر طرح کے مال و دولت سے بھر گیا تو انھوں نے بطور نیابت مال کے مالکوں پر اس امر کو چھوڑ دیا، لیکن جب لوگ اس نیابت کے طریقہ کو پورا نہ کررہے ہوں اور اپنے مال میں سے اللہ کا حق ادا نہ کررہے ہوں تو اصول کے مطابق امام (حکومت) خود ہی زکوٰۃ وصول کرے گا۔

---

[1] بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۷۔

ہمارے عہد میں زکوٰۃ کون وصول کرے گا؟

دمشق میں ۱۹۵۲ء میں عرب یونین کی جانب سے منعقدہ زکوٰۃ کے بارے میں سیمینار میں ہمارے اساتذہ عبدالوہاب خلاف عبدالرحمٰن حسن اور محمد ابوزہرہ نے مقالات پڑھے اور انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ

یہ بات طے ہے کہ ولی امر (حکمراں) تمام اموال ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ وصول کرے گا اور اس کی دو وجوہ ہیں:-

۱) یہ کہ لوگ اب تمام اموال ظاہرہ اور باطنہ کی زکوٰۃ ترک کر چکے ہیں اور اب وہ وکالت باقی نہیں رہی جو حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد آنے والے حکمرانوں کی طرف سے عام مسلمانوں کو ملی تھی۔ کیونکہ فقہاء اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ اگر حکمراں کو معلوم ہو کہ فلاں علاقے کے لوگ زکوٰۃ نہیں دے رہے ہیں تو وہ ان سے بااختیار حکومت زکوٰۃ لے سکتا ہے اور اس میں اموال باطنہ اور اموال ظاہرہ کا کوئی فرق نہیں ہے ـــــ اب اس اساس پر یہ وکالت ختم ہو چکی ہے، اس لیے دوبارہ اصل اصول کو اختیار کرنا لازم ہو گیا ہے۔

۲) اب بیشتر اموال، اموال ظاہرہ بن چکے ہیں۔ تجارتی سامان کی آمدنی کا حساب سالانہ شمار کیا جاتا ہے اور چھوٹے بڑے تاجر کے پاس نفع نقصان اور آمدنی کا مکمل حساب موجود ہوتا ہے۔ تو جن طریقوں سے حکومت کے ٹیکسوں کے لیے آمدنی معلوم کی جاتی ہے انھی طریقوں سے زکوٰۃ کے حصول کے لیے بھی آمدنی معلوم کی جا سکتی ہے۔

نقد مال، کرنسی وغیرہ آج کل بینکوں میں رکھی جاتی ہے جس کا معلوم کرنا بہت آسان ہے اور جو لوگ اپنا روپیہ پیسہ اپنے گھروں میں رکھتے ہیں وہ فی الواقع ایسے زیادہ مالدار نہیں ہوتے اور ان کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اس لیے ایسے لوگوں کا معاملہ ان کے دین پر چھوڑا جا سکتا ہے۔

فقہاء نے کہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا فیصلے کے باوجود عاشرین برقرار رہے اور جب اموالِ باطنہ ظاہر ہو جاتے تو وہ اس پر زکوٰۃ لیتے اور زرِ نقد کے اور سامانِ تجارت کے ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونے پر زکوٰۃ لیتے کیونکہ اس طرح اموالِ باطنہ اموالِ

"ہرہ بن جاتے تھے الا یہ کہ مالک یہ ثبوت دے دیتا کہ وہ پہلے ہی حاجتمندوں کو دے چکا ہے یا کسی اور غارم کو اسی سال ادائیگی کر چکا ہے۔[1]

یہ گفتگو اس قدر مدلل اور وزنی ہے کہ اس کے بعد اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر اسلامی حکومت کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایک ادارہ یا محکمہ قائم کرے جو معاملات زکوٰۃ کی نگرانی کرے اور وصولی زکوٰۃ اور تقسیم زکوٰۃ کے فرائض انجام دے، جیساکہ ہم عاملین علیہا کے مصرف زکوٰۃ میں بیان کر چکے ہیں۔

لیکن میری رائے یہ ہے کہ چوتھائی یا تہائی زکوٰۃ کی ایک متعین شرح مالک کے پاس رہنے دی جائے تاکہ وہ اسے اپنے اختیار سے اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو دے سکیں جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم فرمایا کہ وہ تہائی یا چوتھائی مالکوں کے پاس چھوڑ دیں تاکہ وہ اپنی زکوٰۃ از خود بھی ادا کر سکیں، جیساکہ یہ اس فرمان کی ایک تشریح ہے۔

اس طرح ہم ہر دو طریقوں کی خیر کو جمع کر لیں گے اور وہ فوائد بھی حاصل ہو جائیں گے جو مسلک حنبلی کے فقہائے نے مالک کے از خود زکوٰۃ تقسیم کرنے کے بارے میں ذکر کیے ہیں۔

یہ سب اس صورت میں ہے جبکہ اسلامی حکومت ہو، جو اسلام کو اپنے حکم (اقتدار) کی اساس قرار دیتی ہو، اسلام ہی ریاست کا دستور ہو اور اس کے تمام ثقافتی، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی معاملات کا منہاج ہو، اسلام ہو، اگرچہ کہیں جزوی طور پر احکام شریعت کی خلاف ورزی کرتی ہو، جیساکہ ہم آگے بیان کریں گے۔

لیکن جو حکومت اسلام کو ریاست کی اساس اور دستور حکمرانی تسلیم نہ کرتی ہو اور مغرب یا مشرق کے کسی نظریہ پر حکومت کی بنیاد قائم ہو تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ لے ورنہ وہ اللہ کی اس وعید کی مستحق ہوگی۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ

---

[1] حلقة الدراسات الاجتماعية للجامعة العربية - الدورة الثالثة - بحث الزكوٰة

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرہ : ۸۵)

تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

زکوٰۃ چھپانے نہ دینے یا ادائیگی کا دعویٰ کرنے کے بارے میں مسالک کے اقوال

زکوٰۃ کے بارے میں حکومت کی مسئولیت پر یہ امر بھی دلالت کرتا ہے کہ تمام مسالک اسلامیہ کے فقہاء نے زکوٰۃ سے باز رہنے والے اور نہ ادا کرنے والے کی سزا مقرر کی ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی شخص برضا و رغبت زکوٰۃ نہ دے تو اس سے جبراً زکوٰۃ لی جائے گی نیز بعض فقہاء نے اس شخص کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں جو نصاب کا مالک نہ ہونے کا دعویٰ کرے یا سقوطِ زکوٰۃ کا دعویٰ کرے۔

فقہائے احناف کی رائے

فقہائے احناف کہتے ہیں کہ اگر عاشر کسی سے اس کے مال کی زکوٰۃ طلب کرے اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کا سال پورا نہیں ہوا یا یہ دعویٰ کرے کہ اس پر نصاب کے بقدر قرض ہے یا اس قدر قرض ہے جس سے زکوٰۃ کا نصاب باقی نہیں رہتا، یا وہ یہ کہے کہ میں نے کسی اور عاشر کو زکوٰۃ دے دی ہے، تو اس سے حلف لیا جائے گا اور اگر وہ حلف اٹھائے تو اسے سچا سمجھا جائے گا۔

ایک قول یہ ہے کہ وہ پہلے عاشر کو دینے کی رسید پیش کرے لیکن اس رائے پر یہ

اعتراض کیا گیا کہ خط باہم مل بھی سکتے ہیں[1] خط کی نقل بھی کی جا سکتی ہے جعل سازی ہو سکتی ہے یا یہ کہ رسید بعد میں ضائع ہو سکتی ہے اس لیے اس پر اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا قول مع قسم کے قابل قبول ہو گا۔

گر اس نے جھوٹی قسم کھائی اور اس کا جھوٹ سالوں بعد ظاہر ہوا تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی اس لیے کہ زکوٰۃ کی وصولی کا حق موجود ہے اور وہ جھوٹی قسم سے ختم نہیں ہوا۔

اگر اس نے یہ کہا کہ میں نے زکوٰۃ خود ہی مستحقین میں تقسیم کر دی ہے اور اس نے یہ حلف بھی اٹھا لیا، ماسوا مویشیوں کی زکوٰۃ کے، کیوں کہ ان کی زکوٰۃ کا حق بہر حال حکومت کو حاصل ہے اور وہ اس کو باطل کرنے کا حق نہیں رکھتا، اور اسی طرح ان اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ (حکومت کا حق ہے) جسے وہ کسی اور شہر میں لے کر جا رہا ہو اس لیے کہ اس لے جانے سے وہ اموالِ ظاہرہ بن گئے اور امام کو یا امام کے نائب کو اس پر زکوٰۃ لینے کا حق حاصل ہو گیا،[2] اسی طرح ارضی پیداوار بھی اموالِ ظاہرہ

---

[1] آج کل یہ بات ثابت ہو چکی کہ تحریریں گرچہ باہم ملتی جلتی بھی ہوتی ہیں، لیکن فی الواقع ہر تحریر جُدا ہوتی ہے اور ہر لکھنے والے کی تحریر کی جُداگانہ خصوصیات، علامات اور نشانیاں ہوتی ہیں، جنھیں ماہرین تحریر بخوبی پہچان سکتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ کے احکام غلبۂ ظن سے ثابت ہو جاتے ہیں اور آج تحریر پر اعتماد ایک لابدی امر بن چکا ہے اور سرکاری عہدہ داروں کے پاس مہریں ہوتی ہیں، اور دھوکا دہی کرنے والوں کے لیے قوانین بھی موجود ہیں۔

[2] الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین علیہ، ج ۲، ص ۴۲، ۴۳۔ المیمنیہ۔

ہیں[1] اور امام ان تمام اموال پر جبراً زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ اور اگر مالک زمین نے از خود زکوٰۃ ادا کر دی تو اس سے فرض ساقط ہو جائے گا مگر فقہاء کی یہ رائے بھی ہے کہ اس پر اسے ثواب عبادت ملے گا اور امام کے لینے پر اسے اس کے مال کے فی سبیل اللہ صرف ہونے کا ثواب ملے گا۔[2]

مالکی مسلک کے فقہاء کی رائے

جو شخص زکوٰۃ نہ دے اس سے جبراً زکوٰۃ وصول کی جائے گی اگر اس کے پاس مال ظاہر ہو اور اس کو تعزیری سزا بھی دی جائے گی۔ اگر اس کے پاس مال ظاہر نہ ہو کہ اس کے پاس مال ہے تو اسے حبس میں رکھا جائے گا یہاں تک وہ اپنا مال ظاہر کر دے، اگر اس کا کچھ مال

---

[1] یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اکثر فقہائے احناف عُشر کو علاوہ زکوٰۃ کے کوئی اور شئے متصور کرتے ہیں کہ یہ محض عبادت نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے زمین کی اُجرت بھی ہے اور اس میں بالاتفاق سال گزرنے کی شرط نہیں ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک (پیداوار کا بقدر) نصاب ہونا بھی شرط نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مالک نے وصیت نہ کی ہو پھر بھی اس کے ترکہ سے عُشر لیا جاتا ہے، قرض کے باوجود لازم ہوتا ہے اور صغیر، مجنون اور وقف کی زمین پر عائد ہوتا ہے۔ اسی لیے ان فقہاء نے کہا ہے کہ عُشر کو زکوٰۃ کہنا بطور مجاز ہے۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ صرف صاحبین کے قول کے مطابق یہ زکوٰۃ ہے اور محقق ابن الہمام نے اس کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ بلاشبہ یہ زکوٰۃ ہے جیسا کہ ہم زرعی پیداوار پر زکوٰۃ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔ (ص ۳۴۲) صحیح یہی ہے، جس کی تائید ہم کئی مرتبہ کر چکے ہیں، کہ زکوٰۃ محض عبادت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں نیابت جاری ہوتی اور جبراً لی جاتی ہے اور صبی اور مجنون وغیرہ کے مال پر بھی عائد ہوتی ہے (کہ مختار رائے یہی ہے)۔

[2] بحوالہ مذکور، ص ۴۵۔

ظاہر ہوا اور کچھ کے بارے میں یہ تہمت باقی رہی کہ وہ اس نے چھپالیا ہے تو امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کی تصدیق کی جائے گی اور اس سے حلف نہیں لیا جائے گا کہ اس نے کچھ نہیں چھپایا ہے اگرچہ چھپانے کی تہمت موجود ہو، بہرحال جن فقہاء نے حَلف لینے کی رائے اختیار کی ہے وہ غلط ہے۔

اور اگر بغیر قتال اس کا لینا ممکن نہ ہو تو امام اس سے مقابلہ کرے گا بغیر اس کو مار ڈالنے کا ارادہ کیے۔ اگر خود اس نے کسی کو قتل کیا ہوا ہو گا تو اس کے بدلے میں اسے قتل کیا جائے گا اور اگر کوئی اسے قتل کر دے گا تو یہ ھَدر ہوگا[1]

شافعیؒ مسلک کے فقہاء کی رائے

المہذب میں ہے کہ

جس شخص پر زکوٰۃ فرض ہوا اور وہ ادا نہ کرے تو یہ دیکھا جائے گا کہ

کیا وہ فرضیت زکوٰۃ ہی کا منکر ہے اگر ایسا ہے تو وہ کافر ہے اور اُسے کفر کی سزا میں قتل کیا جائے گا جس طرح کہ مرتد کی سزا قتل ہے کیونکہ اللہ کے دین میں زکوٰۃ کا فرض ہونا لازمی طور پر معلوم ہے، اور اس کی فرضیت کا انکار کرنے والا اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو جھٹلانے والا ہے، اس لیے اس کے کفر کا حکم ہوگا۔

اور اگر بطور بخل اس سے باز رہا تو اس سے جبراً زکوٰۃ لی جائے گی اور اس کو تعزیری سزا دی جائے گی۔

اور امام شافعیؒ کی قدیم رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ بھی لی جائے گی اور مال میں سے بھی کچھ حصّہ لیا جائے گا کیونکہ بَہز بن حکیم سے از والد خود از جد خود مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو زکوٰۃ نہیں دے گا ہم اس سے زکوٰۃ لیں گے۔ اور اس کا کچھ مال بھی ہم اپنے رب کے فیصلے کے طور پر لیں گے جس میں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلّم

---

[1] الشرح الکبیر بحاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۳۔

کا کوئی حصہ نہیں ہوگا [1] لیکن پہلی رائے زیادہ صحیح ہے۔

اگر بخل کی بنا پر زکوٰۃ نہ دینے والا اظہار طاقت بھی کرے تو امام اس کا مقابلہ کرے گا

---

[1] اس حدیث کو احمدؒ، ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے روایت کیا ہے اور اس پر ہم پہلے باب میں (ص ۷۷، ۸۷) گفتگو کر چکے ہیں۔ حاکمؒ نے بھی المستدرک میں اس حدیث کو روایت کیا ہے (ج ۱، ص ۳۹۸) اس کی سند صحیح ہے اور الذھبی نے اس سے اتفاق کیا ہے یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے جبکہ بہز سے کمتر درجے کے راوی بھی ثقہ سمجھے گئے ہیں۔ امام احمدؒ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم اور سند کو انھوں نے درست قرار دیا۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ بہز قابل احتجاج نہیں ہے ابن حبان کہتے ہیں کہ اگر بہز کی یہ حدیث نہ ہوتی تو میں انھیں ثقافت میں شامل کرتا، ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ ان کی عدالت غیر مشہور ہے، ابن الطلاع نے مجھول کہا ہے اور انھوں نے ائمہ حدیث کی ان کی توثیق پر گرفت کی ہے، ابن عدی نے کہا کہ میں نے ان کی کوئی منکر حدیث نہیں دیکھی، الذھبی کہتے ہیں کہ انھوں نے کسی عالم کو نہیں چھوڑا لیکن ان کی حدیث کو دلیل بنانے میں تامل کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شطرنج کھیلتے تھے مگر ابن القطان کہتے ہیں کہ اس سے ان کی شخصیت کو کوئی گزند نہیں پہنچتا، کہ شطرنج کا جواز مشہور فقہی مسئلہ ہے۔ امام بخاریؒ نے کہا ہے کہ ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اکثر ان کی حدیث کو دلیل نہیں بناتے، حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، ترمذیؒ نے ان کی کئی احادیث کو حسن کہا ہے اور ان کی توثیق کی ہے اور احمدؒ اور اسحٰق نے ان کی احادیث کو دلیل بنایا ہے اور امام بخاریؒ نے علاوہ صحیح کے دلیل بنایا ہے اور اس پر تعلیق کی ہے، اور ابوداؤد سے مروی ہے کہ ان کے نزدیک وہ حجت ہیں۔

(نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۲۲۔ العثمانیہ۔ تہذیب التہذیب، ج ۱، ص ۴۹۸، ۴۹۹ ترجمہ ۹۲۴۔ میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۳۵۳، ۳۵۴۔ ترجمہ ۱۳۲۴۔

عبادات کے ترک پر نہیں لیا جاتا۔

ج) حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مانعین زکوٰۃ موجود تھے اس کے باوجود کسی سے یہ مروی نہیں ہے کہ کسی سے علاوہ زکوٰۃ کے کچھ لیا گیا یا یہ رائے ظاہر کی گئی۔

بہز کی حدیث کے بارے میں بیہقی نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ فقہاء کے نزدیک اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ بھی لی جائے اور زکوٰۃ کو چھپانے پر نصف اونٹ بھی لے لیے جائیں، اگر یہ بات ثابت ہوتی تو ہم بھی اس کے قائل ہوتے۔

بیہقی امام شافعیؒ کے اس قول کی تائید کی ہے کہ بہز کی روایت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نہیں بیان کی ہے مگر یہ امر کسی حدیث کو ضعیف قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ کتنی ہی صحیح حدیثیں ہیں جو بخاریؒ اور مسلمؒ نے روایت نہیں کی ہیں اور بیہقی اور دیگر ائمہ جس سے استدلال کررہے ہیں وہ بھی انہی میں سے ہے۔

بعدازاں بیہقی کہتے ہیں کہ چوری پر دگنا تاوان ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہوگیا اور اس کے نسخ پر امام شافعیؒ نے براء بن عازب سے مروی اس واقعہ سے استدلال کیا ہے جس میں ان کی اونٹنی مرگئی تھی اس میں آپؐ نے تاوان دگنا نہیں فرمایا بلکہ صرف ضمان کا حکم دیا۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ حدیث اس کی ناسخ ہو۔[1]

الماوردی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ

"مال میں ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے"

اس حدیث کو ایک لازمی حکم سے ایک زجر اور تنبیہ میں بدل دیتی ہے، جیسے آپؐ کا یہ فرمان کہ

"جو کوئی اپنے غلام کو قتل کرے اسے ہم قتل کردیں گے"[2]

---

[1] السنن الکبریٰ، ج ۴، ص ۱۰۵۔

[2] صحاح خمسہ نے روایت کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حسن اور غریب ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے، کیونکہ یہ روایت حسن از سمرہ ہے اور اس کے ظاہر کے بعض فقہاء قائل ہیں۔ نیل الاوطار، ج ۷، ص ۱۵۰ ط الحلبی۔

حالانکہ آزاد شخص غلام کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاتا ہے[1]

امام نووی الروضۃ میں فرماتے ہیں۔

سنن ابوداؤد وغیرہ میں جو نصف مال لینے کی حدیث وارد ہے، اسے امام شافعیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے اور اہل علم کی یہ رائے نقل کی ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے، اور یہی جواب موزوں ہے اور منسوخ کہہ دینا موزوں نہیں ہے کہ نسخ کے لیے دلیل ضروری ہے جو یہاں پر موجود نہیں ہے۔[2]

اسی طرح مجموع میں ہے کہ اصحاب (فقہاء) نے کہا ہے کہ بہز کی حدیث منسوخ ہے اور اس کا تعلق اس دور سے ہے جب سزا کا تعلق مال سے ہوتا تھا مگر یہ جواب دو وجوہ سے ضعیف ہے۔

۱) کہ ابتدائے اسلام میں سزا مالی ہوتی تھی ثابت نہیں ہے اور نہ ہی متعارف ہے۔

۲) نسخ کی رائے کے اختیار کے لیے تاریخ کا علم ضروری ہے جو یہاں نہیں ہے۔

اس لیے اس حدیث کا موزوں جواب یہی ہوگا کہ یہ ضعیف ہے[3]

موازنہ اور ترجیح

ہماری رائے یہ ہے کہ بہز کی حدیث پر کوئی قابلِ اعتبار طعن موجود نہیں ہے بلکہ ـــ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے[4] ـــ یہ ایک تعزیری سزا پر مشتمل ہے جو امام کی رائے اور اس کے اندازے پر موقوف ہے۔ اور یہ منجملہ ان احادیث کے ہے جو آپ سے امامت اور ریاست کی حیثیت میں وارد ہیں، جیسا کہ قرافی اور دہلویؒ نے کہا ہے[5]

---

[1] الاحکام السلطانیہ، ص ۱۲۱۔

[2] الروضۃ، ج ۲، ص ۲۰۹۔

[3] المجموع، ج ۵، ص ۳۳۴۔

[4] ص ۷۷۔

[5] ص ۲۳۰، ۲۳۲۔

یہ حدیث موجودہ قوانین سے پہلے کی ہے جن میں ٹیکس نادہندگان پر مالی سزائیں عائد کی گئی ہیں۔

جنھوں نے بہز کی حدیث کو رد کیا ہے انھوں نے ان تین امور پر استناد کیا ہے۔

۱) حدیث مرفوع ہے کہ مال پر ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے اور مذکورہ حدیث اس کے معارض ہے۔[۱]

۲) مذکورہ حدیث ایک مالی سزا ہے جو اوائل اسلام دی جاتی تھی پھر منسوخ ہو گئی۔

۳) بعض نے کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لیے کہ بہز ضعیف ہے اور اسی پر نووی نے اعتماد کیا ہے۔

پہلے نکتہ کے بارے میں ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ اسلام میں ماسوا زکوٰۃ کے اور بھی حقوق موجود ہیں، جیسا کہ آیات کریمہ اور صحیح احادیث میں وارد ہے، اس لیے بہز کی حدیث اور دیگر احادیث میں تعارض نہیں ہے۔

دوسرے نکتہ کا جواب یہ ہے کہ مالی سزا منسوخ نہیں ہوتی، چنانچہ ابن القیمؒ نے الطرق الحکمیہ میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے پندرہ فیصلے ایسے موجود ہیں جن میں مالی سزائیں دی گئی ہیں۔[۲]

جہاں تک حدیث کے ضعیف ہونے کا معاملہ ہے تو بظاہر اس کی سند ضعیف نہیں ہے بلکہ حدیث کے مضمون کی بنا پر اس میں ایک طرح کی علت پیدا ہو گئی ہے اس لیے یہ بھی پہلے ہی دو نکات پر مبنی ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض محدثین نے اس حدیث ہی کی بنا پر بہز کو ضعیف کہا ہے اور بہز کی وجہ سے حدیث کو ضعیف نہیں قرار دیا ہے چنانچہ ابن حبان کہتے ہیں کہ اگر اس حدیث کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو میں بہز کو ثقہ کہتا۔

ابن القیمؒ سنن ابی داؤدؒ کی تہذیب میں بہز کے بارے میں ائمہ کا کلام نقل کرتے

---

[۱] البحر الزخار: ج ۲ ص ۱۹۰ - المغنی: ج ۲، ص ۵۷۳ - الماوردی: الاحکام السلطانیہ ۱۲۱۔

[۲] الطرق الحکمیہ، ص ۲۸۷ - ط المدنی۔

کے بعد اور یہ بیان کرنے کے بعد کہ احمدؒ، اسحاقؒ اور ابن المدینی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے کہ اس حدیث کو رد کرنے والوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کے نسخ کا دعویٰ درست نہیں ہے، کہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ نیز مالی سزاؤں کی شرعیت LEGISLATION کے بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اور کسی بھی دلیل سے ان کا نبیؐ سے نسخ ثابت نہیں ہے بلکہ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاءؓ اس پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اور اس حدیث کا حضرت براء کی اونٹنی والے قصہ کی حدیث کے معارض ہونا کمزور ہے، اس لیے کہ زیر بحث سزا اس صورت سے متعلق ہے جب ملزم فرض کی عدم ادائیگی یا ممنوع امر کی انجام دہی کا عادی ہو، لیکن اگر کسی سے بلا قصد یہ جرم سرزد ہو جائے تو اس کے لیے یہ سزا نہیں ہے۔ اور اس کو بجائے حقیقی مفہوم کے محض وعید پر محمول کرنا اور بھی زیادہ غلط ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے منزہ ہے۔ اور ابن حبان کا یہ کہنا کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں بہز کو ثقات میں شمار کرتا، بالکل غیر مناسب بات ہے اس لیے کہ بہز کو ضعیف قرار دیا گیا اس حدیث کی بنا پر اور حدیث کو ضعیف کہا گیا بہز کی وجہ سے تو یہ ایک باطل دَور UN-NATURAL CIRCLE ہے حالانکہ اس روایت میں ایسا کوئی امر نہیں ہے جس کی بنا پر بہز کو ضعیف قرار دیا جائے کہ یہ روایت ثقہ راویوں کے برخلاف نہیں ہے[1]

یہ عجیب بات ہے کہ فقہ کی قابل اعتماد کتابوں کے مصنفین نے، مثلاً الشیرازی نے المہذب میں، الماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں اور ابن قدامہؒ نے المغنی میں، بہز کی صحیح حدیث کو، یا جس کی صحت میں اختلاف ہے، کو اس حدیث سے رد کیا ہے جس کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے یعنی یہ حدیث کہ

"مال میں ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے"

در اصل احادیث کا درجہ اور ان کا مقام ان کے جاننے والے محدثین سے معلوم کرنا چاہیے۔

---

[1] تہذیب السنن، مع مختصر المنذری، والعالم، ج ۲، ص ۱۹۴۔

وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ (فاطر: ۱۴)

حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمھیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

حنبلی مسلک کے فقہاء کی رائے

حنبلی مسلک کے فقہاء کی بھی وہی رائے ہے جو مسلک شافعیؒ کے فقہاء کی رائے ہے۔ ابن قدامہ مانعین زکوٰۃ کے بربنائے انکار وتکذیب ارتداد کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص فرضیت زکوٰۃ کا قائل ہوتے ہوئے زکوٰۃ نہ دے اور امام اس سے زکوٰۃ لینے پر قدرت رکھتا ہو تو وہ زکوٰۃ لے گا اور اسے تعزیری سزا دے گا اور اکثر فقہاء کی رائے کے مطابق زکوٰۃ سے زائد کچھ نہیں لے گا۔ اور اسی طرح اگر وہ اپنا مال چھپا لے تاکہ امام زکوٰۃ نہ لے سکے لیکن بعد میں امام کو معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس مال ہے۔

اسحٰق بن راہویہ اور ابوبکر بن عبدالعزیز بہز بن حکیم کی روایت کی بنا پر کہتے ہیں کہ اس سے زکوٰۃ بھی لی جائے اور اس کا نصف مال لے لے۔

اگر زکوٰۃ نادہندہ امام (حکومت) کی دسترس سے باہر ہو تو امام اس سے مقابلہ کرے گا جیسا کہ صحابہ کرام نے مانعین زکوٰۃ سے مقابلہ فرمایا اگر امام ان پر گرفت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو بلا اضافہ صرف زکوٰۃ وصول کرے گا اور ان کے بچے قیدی نہیں بنائے جائیں گے اس لیے کہ ان کا کوئی گناہ نہیں ہے اور اس لیے کہ خود زکوٰۃ نادہندہ قیدی نہیں بنائے جاتے تو ان کی اولاد کیوں کر قیدی بنائی جائے گی، اور اگر امام نے زکوٰۃ نادہندہ پر بغیر اس کے مال کے دسترس حاصل کی تو اسے زکوٰۃ دینے کے لیے کہے گا اور تین مرتبہ اس سے توبہ کرائے گا، اگر وہ زکوٰۃ نہ دے اور توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے گا لیکن اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا۔

امام احمدؒ سے مروی ہے کہ جب زکوٰۃ نادہندہ سے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے قتال کرنا پڑے تو اسے کافر قرار دے دیا جائے گا اور میمونی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر وہ زکوٰۃ نہ دیں جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مانعین زکوٰۃ نے زکوٰۃ نہیں دی اور اس نہ دینے پر مزاحمت کی تو انھیں نہ مسلمانوں کی وراثت ملے گی اور نہ ان پر جنازہ

پڑھا جائے گا چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تارک زکوٰۃ مسلمان نہیں ہے۔

اور اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کی اور جنگ ان کے خلاف چلی گئی تو وہ کہنے لگے کہ ہم زکوٰۃ ادا کردیں گے، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، نہیں جب تک تم یہ گواہی نہ دو کہ ہمارے مقتول جنتی ہیں۔ اور تمہارے مقتول دوزخی ہیں ——— اور صحابۂ کرام میں سے کسی نے اس کی تردید نہیں کی جو ان کے کفر پر دلالت کرتا ہے۔

پہلی رائے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ نے ابتدائً قتال (جنگ) کی رائے نہیں دی، اگر وہ ان کے کفر کی رائے رکھتے ہوتے تو وہ ان سے مقابلہ میں توقف نہ کرتے، بعدازاں یہ صحابہ قتال پر متفق ہوگئے اور کفر کا مسئلہ اصل انکار پر موقوف رہا ——— نیز یہ کہ زکوٰۃ دین کی فروع میں سے ایک فرع ہے اور اس کے تارک کو محض اس کے چھوڑ دینے پر کافر قرار نہیں دیا جائے گا، جس طرح کہ حج کے تارک کو کافر نہیں قرار دیا جاتا، اور جب ترک پر کافر نہیں ہوا تو قتال سے بھی اسے کافر نہیں قرار دیا جائے گا، جس طرح کہ اہلِ بغاوت سے قتال (مقابلہ) کیا جاتا ہے مگر انھیں کافر نہیں قرار دیا جاتا۔

اور حضرت ابوبکرؓ نے جن مانعینِ زکوٰۃ سے مذکورہ قول کہا تھا ہوسکتا ہے کہ وہ زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر ہوں ——— نیز چونکہ ان کا یہ قول ایک مخصوص صورتحال سے متعلق ہے اس لیے ان لوگوں کا تحقق ممکن نہیں ہے جن سے حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات کہی ہو ——— کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ مرتد ہوں اور ہوسکتا ہے کہ وہ فرضیت زکوٰۃ کے منکر ہوں، اور ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات اس لیے کہی ہو کہ انھوں نے کبائر کا ارتکاب کیا اور بغیر توبہ مرگئے اور ان کے ظاہر کے لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ نے انھیں جہنمی قرار دیا، اور مجاہدین کے مقتولین کو جنتی کہا لیکن اس سے ان کا دائمی جہنمی ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ فرمانِ نبوتؐ ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ جہنم میں جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ انھیں جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمادے گا[1]

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۵۷۳، ۵۷۵۔

فقہائے زیدیہ کی رائے

الازھار اور اس کی شرح میں ہے کہ اگر مالک یہ دعوے کرے کہ اس سے زکوٰۃ ساقط ہے اور وہ نصاب کا مالک نہیں ہے تو اس کے قول کا اعتبار ہوگا لیکن امام (حکومت) یا اس کا نائب اس شک کی صورت میں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اس سے حلف لے سکتا ہے، اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کی عدالت (پارسائی) ظاہر نہ ہو لیکن اگر اس کی عدالت ظاہر ہو تو اس سے حلف نہیں لیا جائے گا۔[1]

اگر مالک یہ کہے کہ اس پر زکوٰۃ تو واجب ہے لیکن اس نے امام کے مطالبہ سے قبل ہی از خود مستحقین میں تقسیم کر دی ہے اور زکوٰۃ وصول کنندہ کو اس کی تحقیق نہ ہو، تو تقسیم کرنے کا مدعی اس کا ثبوت پیش کرے گا، اس لیے کہ اصل یہی متصور ہوگا کہ اس نے زکوٰۃ نہیں دی ہے اور وہ یہ ثبوت بھی دے گا کہ اس نے امام کے مطالبہ سے قبل ہی زکوٰۃ تقسیم کر دی تھی۔ اگر وہ یہ دونوں امور نہ ثابت کر سکے تو اس کی عدالت ظاہر ہونے کے باوجود زکوٰۃ وصول کنندہ اس کے قول کو تسلیم نہیں کرے گا اور اس سے زکوٰۃ لے گا۔[2]

ظالم حکمراں کو زکوٰۃ دینا

اس بحث کا تتمہ فقہاء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا ظالم حکمراں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں ہے، اس بارے میں تین آراء ہیں:-

۱) جائز ہے۔

۲) جائز نہیں ہے۔

۳) بعض صورتوں میں جائز ہے اور بعض میں جائز نہیں ہے۔

جواز کے قائلین کی رائے

جواز کے قائلین نے اپنے مسلک کے حق میں صریح احادیث سے استدلال کیا ہے جو

---

[1] شرح الازھار، وحواشیہ، ج ۱، ص ۵۳۰۔ البحر، ج ۲، ص ۱۹۰-۱۹۱۔

[2] بحوالۂ مذکور۔

المنتقی میں مذکور ہیں[1]

ا) حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں آپؐ کے قاصد کو زکوٰۃ دے دوں تو میں اللہ اور رسولؐ کے یہاں بری ہو جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا، ہاں اگر تم میرے قاصد کو دے دو تو تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظر میں بری ہو جاؤ گے اور تمھیں اس کا اجر ملے گا اور اس کے بدلنے والے پر اس کا گناہ ہوگا[2]

ب) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد خود غرضی پیدا ہو جائے گی اور ایسے امور پیش آ جائیں گے جنھیں تم ناپسند کرو گے، صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر آپؐ کا کیا حکم ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جو حق تم پر لازم ہے اسے ادا کرو اور اس کا صلہ خدا سے مانگو۔ (بخاری و مسلم)

ج) حضرت وائل بن حجر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آپؐ سے عرض کی کہ اگر ہمارے حکمراں ایسے آ گئے جو اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اور ہمارے حقوق ادا نہ کریں آپؐ نے فرمایا کہ سنو اور اطاعت کرو، ان کا بوجھ انھیں اٹھانا ہے اور تمھارا بوجھ تمھیں اٹھانا ہے[3]

یہ احادیث بڑے اہم معنی کی حامل ہیں اور وہ یہ کہ 'اجتماعی کفالت' کے نظام کے جاری رکھنے کے لیے اسلامی ریاست ہر وقت اور مسلسل مال کی محتاج ہے کہ اسی سے ہر عام مصلحت بروئے کار آ سکتی ہے اور کلمۂ اسلام بلند ہو سکتا ہے۔ اگر لوگ حکومت کو ضروری مال فراہم کرنے سے ہاتھ روک لیں تو ریاست کا نظام بگڑ جائے گا، امت میں انتشار پیدا ہو جائے گا اور دشمنانِ اسلام سرگرم ہو جائیں گے۔ اس لیے تقاضائے حکمت یہ ہے کہ لوگ بہرحال زکوٰۃ دیتے رہیں اور ظالم حکمرانوں کو زکوٰۃ دینا اسلام کے بتلائے ہوئے ظلم کے خلاف ڈٹے

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۶۴، ۱۶۵۔

[2] احمد، نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۵۔ ط۔ العثمانیہ۔

[3] مسلم اور ترمذی۔ اور ترمذی نے صحیح کہا ہے۔

جانے کے اصول کے خلاف نہیں ہے۔

اس لیے مسلم افراد پر لازم ہے کہ جو مالی حقوق ان پر لازم ہیں وہ انھیں ادا کریں اور حکمرانوں کو نصیحت کریں اور دین اسلام کے معاملے میں نصیحت فی الدین کے فریضہ کو ادا کریں، حق اور صبر کی وصیت کریں اور اچھائیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں۔

لیکن اگر حکمرانوں میں ایسا کھلم کھلا کفر دیکھیں جس کے کفر ہونے پر ان کے پاس دین اسلام کے مطابق دلیل موجود ہو تو مسلم جماعت کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اطاعت نہ کریں۔

اسی طرح ایک مسلم فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اسے کسی کھلی معصیت کے ارتکاب کا حکم دیا جائے تو وہ اس کے کرنے سے انکار کر دے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ

"مسلمان کا کام ہے کہ جو اسے پسند ہو اور جو اسے ناپسند ہو وہ اس میں احکام کو سنے اور اطاعت کرے، ماسوا اس کے کہ اسے کسی معصیت کا حکم دیا جائے اگر اسے کسی معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ اطاعت کرنا ہے"[1]

عدم جواز کے قائل اور ان کے دلائل

امام شافعیؒ کا ایک قول یہ ہے کہ حکام جور (ظالم حکمرانوں) کو زکوٰۃ نہ دی جائے اور یہی رائے المہدی نے اہل بیت سے (البحر میں) نقل کی ہے کہ ظالموں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے اس لیے کہ فرمان الٰہی ہے۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (البقرہ : ۱۲۴)

میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔

علامہ شوکانی نے اس استدلال کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ آیت کا یہ عموم اس باب میں وارد ہونے والی احادیث سے خاص ہو گیا ہے اور اختلافی مسئلہ میں اس آیت سے استدلال بجائے خود محل نظر ہے[2]

---

[1] الجامع الصغیر۔ حضرت ابن عمر سے ایک جماعت نے اس کو روایت کیا ہے۔

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۶۵۔

زکوٰۃ کا اس سے چھپانا ممکن نہ ہو، اور جس کے لیے اس کے بغیر دینا ممکن ہے اس کے لیے اُسے دینا جائز نہیں ہے۔ ابن القاسم اور ابن نافع کہتے ہیں کہ اگر وہ اس پر حلف لے تو اسے دینا جائز ہے اور اشہب کی رائے ہے کہ جب زکوٰۃ دینے پر مجبور کیا جائے تو دینا جائز ہے مگر اس کا اعادہ مستحب ہے، اور ابن عبدالحکم نے بھی والیٔ مدینہ کو زکوٰۃ دی تھی۔ اور ابن رشد فرماتے ہیں کہ ایسے حکمراں کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے بارے میں اختلاف ہے جو نہ اس میں عدل کرے اور نہ اسے اس کے مقام پر صرف کرے۔ المدونۃ کا مسلک یہ ہے اور اصبغ اور ابن وھب کی رائے یہ ہے اور یحییٰ سے منقول ابن القاسم کا ایک قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے۔ اور مشہور قول یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ دہندہ کو مجبور کیا جائے تو جائز ہے، کہ ظالم کا حساب اللہ لینے والا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اسے زکوٰۃ ہی کے نام سے اور اس کے طریقوں کے مطابق لے۔[۱]

یعنی اگر زکوٰۃ ٹیکس، یا چنگی وغیرہ کے نام سے لی گئی تو مسلک کے فقہاء میں سے کسی کے نزدیک بھی جائز نہ ہوگی۔

فقہائے احناف کے نزدیک

اگر باغی اور ظالم حکمراں اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ یا خراج لے لیں اور اس کو مصارفِ زکوٰۃ میں صرف کریں تو مال کے مالک پر اعادہ نہیں ہے اور اگر اس کے محل میں صرف نہ کریں، تو اس پر اس کے اور اس کے خدا کے مابین، زکوٰۃ کا اعادہ لازم ہے نہ کہ خراج، کہ وہ خود خراج کا مصرف ہیں کہ خراج لڑنے والوں کا حق ہوتا ہے اور وہ اہل حرب سے قتال کرتے ہیں۔

اموالِ باطنہ میں بھی اختلاف ہے کہ بعض نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے کہ ظالم حکمراں کو اموال باطنہ پر زکوٰۃ لینے کا حق نہیں ہے اور اس لیے اسے دینا درست نہیں ہے کیونکہ اسے اختیار صحیح حاصل نہیں ہے۔

---

[۱] شرح الرسالۃ، ج ۱، ص ۳۴۰، ۳۴۱۔

المبسوط میں ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ درست ہے اگر دینے والے نے ظالم حکمرانوں کو دینے میں ان کو صدقہ کرنے کی نیت کی کیونکہ ان پر عام مسلمانوں کی جو ذمے داریاں ہیں، ان کے لحاظ سے وہ فقیر ہیں[1]

حنبلی فقہاء کے نزدیک

فقہائے حنابلہ کی رائے المغنی میں ابن قدامہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اگر خوارج اور باغی بھی زکوٰۃ لے لیں تو مالک کی طرف سے زکوٰۃ درست ہو جائے گی، اسی طرح حکمرانوں میں سے جو بھی لے لے اس کی طرف سے جائز ہو جائے گی خواہ وہ عادل ہوں یا ظالم اور خواہ وہ جبراً لے لیں یا مالک از خود دے دے۔

ابو صالح کہتے ہیں کہ میں نے سعد بن ابی وقاص، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا کہ حکمرانوں کی حالت آپ کے سامنے ہے کیا میں انھیں اپنی زکوٰۃ دے دوں آپ نے فرمایا کہ جی ہاں۔

ابراہیم عشّار (زکوٰۃ وصول کنندگان) جو تم سے لے لیں تمہاری جانب سے جائز ہے۔

حضرت سلمۃ بن الاکوع سے مروی ہے کہ انھوں نے نجدہ (خارجیوں) کو زکوٰۃ دی۔

حضرت ابن عمرؓ سے استفسار کیا گیا کہ ابن الزبیر کے زکوٰۃ لینے والے کو زکوٰۃ دیں یا نجدۃ (خارجی) کو زکوٰۃ دیں؟ آپ نے فرمایا جسے دو درست ہے۔

اصحاب الرائے کہتے ہیں کہ جن کا اقتدار قائم ہو جائے انھیں زکوٰۃ دینا جائز ہے لیکن

---

[1] الدر المختار و حاشیہ، ج ۲، ص ۲۶-۲۷۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ مقروض 'غارمین' ہیں کیونکہ ان پر لوگوں کے حقوق اور اموال عائد ہیں۔ لیکن ہم نے 'الغارمین' کے بیان میں ایک شرط یہ ذکر کی ہے کہ 'غارمین' کا قرض کسی معصیت یا اسراف کا نہ ہو، اور یہ شرط یہاں موجود نہیں ہے۔

اگر خارجیوں کے پاس سے گزر ہوا اور وہ زکوٰۃ لے لیں تو زکوٰۃ جائز نہیں ہے۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ خارجی جن سے زکوٰۃ لے لیں ان پر اعادہ لازم ہے کیونکہ وہ حکمراں نہیں ہے بلکہ راہزنوں کے مشابہ ہیں۔

ابن قدامہؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے پیش نظر اقوال صحابہ موجود ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے وہ اجماع کے درجہ میں ہیں اور اہلِ ولایت کو دینا اہل بغی کو دینے کے مشابہ ہے۔

مطالب اولی النہی میں ہے کہ مسلک میں امام کو دینے میں کوئی اختلاف نہیں ہے خواہ وہ عادل ہو یا ظالم ہو اور اس کے پاس مال ظاہر ہو یا باطن ہو، کیونکہ صحابہؓ کرام سے اسی طرح مروی ہے۔

امام احمدؒ سے مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ زکوٰۃ امراء کو دیتے اور انہی کو دینے کا حکم فرماتے تھے حالاں کہ انھیں معلوم تھا کہ امراء زکوٰۃ کہاں صرف کر رہے ہیں تو اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا ہوں:۔

موازنہ اور ترجیح ان مسائل میں میری رائے یہ ہے کہ اگر ظالم حکمران زکوٰۃ کو زکوٰۃ ہی کے نام سے لیں تو انھیں دینا جائز ہے اور مسلم زکوٰۃ دہندہ کسی بھی صورت میں اعادہ کا مکلف نہ ہوگا، لیکن اگر زکوٰۃ کا نام لیے بغیر لے رہے ہیں تو جائز نہیں ہے جیساکہ فقہائے مالکیہ نے کہا ہے اور ہم اس گفتگو کی جانب زکوٰۃ اور ٹیکس کے باب میں لوٹیں گے۔

کیا زکوٰۃ ظالم کو دی جائے یا نہ دی جائے؟ تو میں اس صورت میں دینا پسند کرتا ہوں جبکہ وہ مستحقین کو پہنچ جائے اور وہ اسے مصارفِ زکوٰۃ میں صرف کرے اگرچہ وہ بعض دیگر امور میں ظلم کرے۔

اگر وہ زکوٰۃ کو اس کے مصارف میں صرف نہ کرے تو اس وقت تک اسے زکوٰۃ نہ دے جب تک وہ طلب نہ کرے اور اس میں زکوٰۃ نہ دینے کی گنجائش نہیں ہے کہ اس سلسلے میں احادیث بھی موجود ہیں اور اقوال صحابہ بھی ہیں کہ ظالم حکمرانوں کو بھی زکوٰۃ دی جائے۔

حکمراں کا اسلام کا پابند ہونا ضروری ہے

اس میں شبہ نہیں ہے کہ جن حکمرانوں کے بارے میں صحابۂ کرامؓ کی یہ آراء ہیں کہ انھیں زکوٰۃ دی جائے وہ مسلمان تھے اور اسلام کے پابند تھے اور اسلام کو نظام حکمرانی کے طور پر قائم کیے ہوتے تھے بلکہ اس کے لیے جہاد کرتے تھے، اس کے نام پر اور اس کے جھنڈے تلے فتوحات حاصل کرتے تھے، اگرچہ بعض احکام میں اس کی خلاف ورزی بھی کرتے تھے اور دنیا کو ترجیح دیتے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے تھے۔

جیساکہ صحیح احادیث موجود ہیں اور جمہور فقہاء نے ان سے استدلال کیا ہے اس قسم کے حکمرانوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

بہ ہمارے دور کے ان حکمرانوں سے مختلف ہیں جنھوں نے اپنا تعلق اسلام سے منقطع کرلیا ہے، اسے پس پشت ڈال دیا ہے اور قرآن کو ترک کردیا ہے بلکہ بعض تو دشمنانِ اسلام بن گئے ہیں اور اسلام کے دشمنوں کی ایجنٹی کررہے ہیں، ان کی مال زکوٰۃ سے مدد نہیں کی جاسکتی کہ یہ کفر اور الحاد پھیلائیں اور زمین میں فساد برپا کریں، غرض حاکم کا اسلام کا پابند ہونا اسے زکوٰۃ دینے کے لیے شرط ہے۔

جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ ابن السبیل یعنی وہ مسافر جس کا سفر گناہ کا سفر ہو اسے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی حتیٰ کہ وہ توبہ کرے اسی طرح غارمِ معصیت (کسی گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے جو مقروض ہوگیا ہو) کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ کہ ان معصیت کے مرتکب افراد کی اللہ کے مال سے اعانت نہیں کی جاسکتی۔

اس حقیقت کے پیش نظر اس حکمراں کو زکوٰۃ کیسے دی جاسکتی ہے جو اللہ کے راستے سے روکنے والا ہو شریعت آلٰہی کو معطل کرے اور داعیانِ حق کو اذیتیں پہنچائے۔

علامہ سید رشید رضا نے اپنی تفسیر "المنار" میں کس قدر عمدہ بات کہی ہے۔

"دارالاسلام میں مسلمانوں کا امام وہ ہوسکتا ہے جس کو زکوٰۃ ادا کی جائے اور جو اس کو مستحقین میں تقسیم کرے اور زکوٰۃ نادہندگان سے مقابلہ کرے۔

لیکن آج کل اکثر مسلمان اسلامی حکومت سے محروم ہیں ایسی اسلامی حکومت

جس میں اسلام کی دعوت دی جائے اور اس کی مدافعت کی جائے۔ حدود قائم کرے اور ان کو ان مصارف میں صرف کرے جو اللہ نے ان کے مقرر کیے ہیں۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ یا تو انگریزوں کے غلام ہیں یا مسلمانوں پر ایسے حکمراں مسلط ہیں جو خود مرتد اور بے دین ہیں۔ اور نام نہاد مسلمان غیر مسلموں کے ایجنٹ بنے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے تمام معاملات و مسائل میں وہ ان کی پالیسیاں نافذ کر رہے ہیں[1] ——— ظاہر ہے کہ ایسی حکومتوں کو زکوٰۃ دینا درست نہیں ہو سکتا خواہ ان کا سرکاری دین، اسلام ہو۔"

بہرحال جو اسلامی حکومت اسلام پر ایمان رکھتی ہو اور اس کا مقتدر طبقہ اسلام کا پیرو کار ہو اور اس کے مالی مسائل پر غیروں کا تسلط نہ ہو تو ان کو اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ دی جائے اور اگر وہ مطالبہ کریں تو اموالِ باطنہ کی بھی دی جائے، اگرچہ وہ بعض معاملات میں عدل و انصاف کے حامل نہ ہوں۔

شرح المہذب وغیرہ میں محققین نے کہا ہے کہ اگر امام یا حکومت ظالم ہو اور زکوٰۃ کو اس کے شرعی مصارف میں تقسیم نہ کرے تو بہتر یہی ہے کہ جس پر زکوٰۃ فرض ہو اور امام یا اس کا عامل اس سے طلب نہ کرے تو وہ از خود مستحقین کو دے دے۔[2]

●

---

[1] آج کل بیشتر مسلمان ملکوں میں اسی طرح کے لادین طبقے حکمران ہیں۔

[2] المنار، ج ۱۰، ص ۵۹۵، ۵۹۶ - طبع ثانیہ۔

دوسری فصل

زکوٰۃ میں نیّت کا درجہ

زکوٰۃ کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ شعائرِ اسلام میں سے ہے، ایمان کے ستونوں میں تیسرا ستون ہے اور اس قدر اہم عبادت ہے کہ قرآن کریم میں اور سنّت رسول ؐ میں اس کا ذکر نماز کے بعد کیا گیا ہے ——— لیکن عبادت ہونے میں بھی اس میں ایک گونہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

زکوٰۃ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ ایک مقررہ ٹیکس ہے اور ایک حق ہے جو فقراء اور مستحقین کے لیے کتاب اللہ نے دولتمندوں کے اموال پر متعین کر دیا ہے۔ اور یہ ایک ایسا ٹیکس ہے جس کی وصولی اور جس کا صرف ریاست کی ذمّے داری ہے۔ کہ جن پر زکوٰۃ واجب ہو، اور وہ اپنی رضا مندی سے نہ دیں تو حکومت ان سے جبراً لے لے۔ یعنی یہ ایسا ٹیکس ہے جس میں عبادت کا پہلو بھی ہے اور ایسی عبادت ہے جس میں مال ادا کیا جاتا ہے۔

انہی دو مفاہیم کی بنا پر ہمیں فقہاء کرام کی بعض تصریحات میں اختلاف ملتا ہے کہ کسی فقیہ نے پہلے مفہوم کو ترجیح دی ہے اور کسی نے دوسرے مفہوم کو ترجیح دی ہے اور بعض فقہاء نے بعض مسائل میں ایک مفہوم کو ترجیح دی ہے اور دوسرے مسائل میں دوسرے مفہوم کو ترجیح دی ہے۔

بچے اور مجنون کے مال پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بارے میں اختلاف رائے کی وجہ یہی ہے جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور یہی وجہ اختلاف اس مقام پر بھی ہے کہ کیا زکوٰۃ میں نیّت ضروری ہے؟ نیز یہ کہ اس کی زکوٰۃ میں کیا اہمیت ہے؟

زکوٰۃ میں نیت کی شرط

کیا زکوٰۃ دینے میں نیت شرط ہے یا نہیں ہے؟

عام فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ ادائے زکوٰۃ میں نیت شرط ہے اس لیے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت بغیر نیت صحیح نہیں ہوتی، چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ

(البینہ : ۵)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔

اور فرمان نبوت ہے: کہ

"اعمال نیتوں پر موقوف ہیں"

یعنی اگر کسی نے بلا نیت اور ارادہ زکوٰۃ دے دی، خواہ بوجہ ناواقفیت ایسا کیا ہو اور یا بھول کر ایسا کیا ہو، تو یہ زکوٰۃ جائز نہیں ہوگی کہ ناواقفیت یا بھول اس امر کی دلیل ہیں کہ اس نے اپنا مال بلا ارادہ تقرب اور بلا نیت عبادت دے دیا اور یہ ایک بے روح اور بے جان عمل ہو گیا۔[1]

نیت واجب یا تو اپنی طرف سے ہوگی یا اس شخص کی طرف سے ہوگی جس کے مال کا وہ ولی ہے یعنی بچہ، مجنون اور کم عقل، جس کے معاملات پر پابندی لگا دی گئی ہو (سفیہ محجور علیہ) کے مال کا ولی ہو کہ اگر یہ ولی بغیر نیت زکوٰۃ ادا کرے گا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اور اس پر تاوان عائد ہوگا۔[2]

---

[1] حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر، ج ۱، ص ۲۳۵۔

[2] الروضۃ للنووی، ج ۲، ص ۲۰۸۔

امام اوزاعیؒ کی رائے اور اس کی تردید زکوٰۃ میں نیت کے شرط ہونے کے مسئلہ کے بارے میں امام اوزاعیؒ نے جمہور کے مسلک کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے۔

"زکوٰۃ میں نیت لازمی نہیں ہے کہ زکوٰۃ کی حیثیت دَین (قرض) کی سی ہے اور اس میں قرض کی طرح نیت نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ یتیم کا ولی اس کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور جو شخص زکوٰۃ نہ دینا چاہے حکومت (امام) اس سے لے لیتی ہے۔"[1]

ان کی اس رائے کو اس حدیث سے رد کیا گیا ہے کہ

"تمام اعمال نیتوں پر موقوف ہیں"

نیز یہ کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور عبادت کا وجوب بار بار ہوتا ہے اور فرض اور نفل میں تقسیم ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی ایک عمل عبادت ہے اس لیے اس میں نماز کی طرح نیت لازمی ہے۔ اور ادائے قرض سے ایک مختلف امر ہے اس لیے کہ قرض عبادت نہیں ہے اور مستحق کے ساقط کرنے سے ساقط ہو جاتا ہے جبکہ زکوٰۃ کو کوئی ساقط نہیں کر سکتا اور اس لیے کہ فقراء پر مال صرف کرنے کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے زکوٰۃ ہے، نذر ہے، کفارہ ہے اور نفلی صدقہ ہے اور ان اقسام میں تمیز اور فرق کے لیے بھی نیت ضروری ہے۔ جبکہ ولی صَبی (بچہ کا ولی) اور سلطان (حکومت) دونوں نیابتاً نیت کرتے ہیں۔

مسلک مالکؒ کے بعض فقہاء سے بھی امام اوزاعیؒ کی رائے کے مطابق قول منقول ہے کہ زکوٰۃ میں نیت کی حاجت نہیں ہے کیونکہ مسلک مالکؒ میں ایک شاذ قول یہ ہے کہ فقراء مال زکوٰۃ میں شریک ہوتے ہیں اور شریک کے اپنے حق کے وصول کرنے کے لیے نیت لازمی نہیں ہے اور نہ ہی قابض اور دینے والے کی نیت ضروری ہے۔ نیز مسلک کا ایک قول یہ ہے کہ باوجودیکہ عبادت اور اس کو ناپسند کرنے میں منافات ہے جو شخص زکوٰۃ نہ دے رہا ہو تو

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۳۸۔

اس سے زبردستی لے لی جائے گی اور ادا ہو جائے گی۔

مالکیہ کے نزدیک قابل اعتماد امر یہ ہے کہ زکوٰۃ کے جواز میں نیت شرط ہے۔

جبکہ زکوٰۃ نادہندہ سے زبردستی زکوٰۃ لینے کے بارے میں ابن العربیؒ کا قول آگے آرہا ہے کہ اس کی زکوٰۃ تو ادا ہو جائے گی مگر اسے اس پر کوئی ثواب نہ ہو گا[1] بخلاف اس کے کہ مستحق، خود غنی کے یہاں سے بقدر زکوٰۃ چوری کرے تو اس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی کہ نیت موجود نہیں ہے[2]

زکوٰۃ میں نیت سے مراد

نیت سے مراد یہ یقین ہے کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے یا بچے اور مجنون کی جانب سے زکوٰۃ ادا کر رہا ہے کیونکہ اعتقادات کا محل قلب ہے[3] نیت حکمیہ بعض فقہائے مالکیہ کی وضاحت کے مطابق کافی ہے، چنانچہ اگر کسی نے اپنے دراہم شمار کیے اور جو زکوٰۃ واجب ہوتی تھی وہ علیحدہ کر دی اور دے دی بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ جسے دی ہے وہ زکوٰۃ کا مصرف ہے لیکن اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ یہی بتلائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی[4]

اور اگر اس کی عادت یہ ہو کہ وہ مثلاً زید کو ہر سال ایک دینار زکوٰۃ دیتا ہے اور اسے دے دینے کے بعد نیت کرے کہ یہ زکوٰۃ ہے اور زید زکوٰۃ کا مستحق بھی ہو تو یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی کہ اس میں نہ تو نیت حکمیہ پائی گئی ہے اور نہ نیت حقیقیہ[5]

---

[1] شرح الرسالہ لابن ناجی: ج ۱، ص ۳۱۷، ۳۱۸۔

[2] الشرح الکبیر، ج ۱، ص ۵۰۳۔

[3] المغنی، ج ۲، ص ۶۳۸، مطالب اولی النہی، ج ۲، ص ۱۲۱۔ فقہائے شافعیہ کے نزدیک زبان سے کہہ دینا قلبی نیت کے قائمقام ہے۔ الروضۃ، ج ۲، ص ۲۰۶۔ البحر میں اس قول کو داؤد کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

[4] حاشیۃ الصاوی، ج ۱، ص ۲۳۵۔

[5] حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۰۔

بہرحال عبادات میں نیت فیصلہ کن امر ہے اور فقہاء کی رائے ہے کہ زکوٰۃ میں نیت شرط ہے اور بغیر نیت عبادت قبول نہیں ہوتی اور اسی سے زکوٰۃ کے عبادت ہونے کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔

سلطان (حکومت) کے زکوٰۃ لینے کی صورت میں نیت

اگر حکومت زکوٰۃ لے اور دہندہ خوشی سے دے دے یا نہ دے اور اس سے زبردستی لی جائے تو ان دونوں صورتوں میں نیت کا کیا حکم ہے؟ کیا حکومت کی نیت دہندہ GIVER کی نیت کے قائمقام ہوگی؟ ہر حال میں یہ نیت کافی ہوگی یا بعض حالات میں؟ اور ظاہراً جائز ہوگی یا ظاہری اور باطنی دونوں طرح درست ہوگی؟

بیشتر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر مالک زکوٰۃ اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے دے رہا ہو تو حکومت کی نیت کافی نہیں ہے اور امام شافعیؒ کا ایک قول یہ ہے کہ جائز ہے اگرچہ حکومت کی بھی نیت نہ ہو جیسا کہ المختصر میں ان کا ظاہر قول درج ہے، اور دوسرا قول ان کا یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اس لیے کہ حکومت مساکین کی نائب ہے جب کہ مالک خود مساکین کو بلا نیت دے دے تو جائز نہیں ہے اسی طرح حکومت کی نیت بھی کافی نہیں ہوگی[1]

امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ

اگر زکوٰۃ نادہندہ اس سے زکوٰۃ وصول کیے جانے کے وقت نیت کرلے تو وہ ظاہری اور باطنی طور پر بری الذمہ ہو جائے گا اور امام کی نیت ضروری نہیں ہوگی اور اگر امام نے نیت

---

[1] النووی الروضۃ میں فرماتے ہیں کہ یہی دوسرا قول قاضی ابوالطیب اور المہذب اور التہذیب کے مصنفین کے نزدیک زیادہ صحیح ہے اور انھوں نے امام شافعیؒ کو نادہندہ پر محمول کیا ہے کہ اگرچہ اس کی نیت نہ ہو لیکن جو زکوٰۃ اس سے لی گئی ہے وہ جائز ہے لیکن الام میں نص یہ ہے کہ جائز ہے اگرچہ اس نے نیت نہ کی ہو اور خواہ اس نے زکوٰۃ از خود دی ہو یا اس سے زبردستی لی گئی ہو۔ الروضۃ، ج ۲، ص ۲۰۸۔

کرلی تو ظاہراً جائز ہو جائے گی اور دوبارہ اس سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا لیکن کیا باطنی طور پر بھی جائز ہو جائے گی تو اس بارے میں دو اقوال ہیں جن میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ جائز ہے، جیسا کہ بچے کے ولی کی نیت اس کے قائمقام ہو جاتی ہے۔ اور اگر امام نیت نہ کرے تو باطنی طور پر بالکل ساقط نہیں ہوتی اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ظاہراً بھی ادا نہیں ہوتی۔ بہر حال مسلک یہ ہے کہ نیت امام پر لازم ہے اور اس کی نیت مالک کی نیت کے قائمقام ہے، اور ایک رائے یہ ہے کہ امام پر نیت واجب نہیں ہے کہ اس طرح مالک اپنی اس عبادت کی ادائیگی کی نیت میں سستی کرنے لگیں گے۔[1]

ابن قدامہؒ المغنی میں فرماتے ہیں کہ

اگر امام زبردستی لے لے تو بغیر نیت جائز ہے کیونکہ نیت اس کے حق میں متعذر ہو گئی ہے اس لیے اس سے ساقط ہو گئی ہے اور یہ امام شافعیؒ کی رائے ہے کیونکہ امام کا لینا اثر کار میں تقسیم کر دینے کے مترادف ہے اس لیے اس میں نیت کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ امام کو اس کے لینے کی ولایت حاصل ہے اسی لیے وہ بالاتفاق نادہندہ سے بھی وصول کرے گا اور اگر اسے جائز نہ ہوتی تو وہ وصول نہ کرتا۔

فقہائے حنابلہ میں سے ابوالخطاب اور ابن عقیل کہتے ہیں کہ فیما بینہ وبین اللہ صرف نیت ہی کے ساتھ درست ہے کیونکہ امام یا تو زکوٰۃ دہندہ کا وکیل ہے یا فقراء کا وکیل یا دونوں کا وکیل ہے اور ہر صورت میں اس کا مالک کی طرف سے نیت کرنا کافی نہیں ہے۔ اور اس لیے کہ زکوٰۃ عبادت ہے جس کے لیے نیت لازمی ہے اور اس لیے اس شخص کی طرف سے جس پر نیت واجب ہے بغیر نیت ادا نہیں ہوگی جیسا کہ نماز بغیر نیت ادا نہیں ہوتی۔ اور بغیر نیت نادہندہ سے زکوٰۃ اس لیے وصول کر لی جاتی ہے تاکہ اس کی ظاہری صورت پوری ہو جائے جیسا کہ نماز نہ پڑھنے والے کو ظاہری طور پر نماز پڑھوائی جائے کہ اگر اس کی نیت نہ ہوگی تو نماز نہ ہوگی لیکن اس کی ظاہری صورت پوری ہو جائے گی۔

---

[1] الروضۃ، ج ۲، ص ۲۰۸، ۲۰۹۔

ابن عقیل کہتے ہیں کہ فقہاء کے اس قول کے کہ ظاہری طور پر ادا ہو جائے گی یہ معنی ہیں کہ دوبارہ اس سے ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ مرتد اگر ظاہری طور پر اسلام کا اقرار کرے تو اسی ظاہر کو حکم اسلام کے لیے کافی سمجھا جائے گا اور دوبارہ اس سے اسلام کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور دل سے اقرارِ اسلام نہ ہونے کی بنا پر عنداللہ اس کا اسلام معتبر نہ ہوگا۔[1]

ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ جبراً زکوٰۃ لینے سے زکوٰۃ تو ادا ہو جائے گی مگر اس پر ثواب نہیں ملے گا۔[2]

اور یہی قول زیادہ صحیح ہے کہ ولی امر (حکمراں) کا مالک کی نیت کے بغیر زکوٰۃ لے لینا درست ہے اور اس طرح قانونی لحاظ سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اس سے دوبارہ اس زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک ثواب کا تعلق ہے تو وہ نیت پر موقوف ہے کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور عمل بغیر نیت ایسا ہوتا ہے جیسے جسم بغیر رُوح کے ہوتا ہے۔

فقہائے احناف کے نزدیک فتویٰ یہ ہے کہ جس شخص پر زکوٰۃ فرض ہے اگر اس سے زکوٰۃ وصول کنندہ (مداعی) نے زبردستی لے لی تو اس کی طرف سے جائز ہو جائے گی اور اموال ظاہرہ میں اس سے فرض ساقط ہو جائے گا اس لیے کہ اسے اس کے لینے کی ولایت حاصل ہے لیکن اموال باطنہ میں فرض (زکوٰۃ) ساقط نہ ہوگا۔[3]

زکوٰۃ کی نیت کا وقت

اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے نیت ضروری ہے تو اس کا وقت کون سا ہے؟

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۴۰، ۶۴۱۔

[2] شرح الرسالۃ لابن ناجی ج ۱، ص ۳۱۸ اور الشرح الکبیر (ج ۱، ص ۵۰۳) میں ہے کہ اگر حکومت نے نادہندہ سے زکوٰۃ زبردستی لی ہو تو حکومت کی جانب سے نیت زکوٰۃ درست ہے۔

[3] ردالمحتار، ج ۲، ص ۱۴۔

فقہائے احناف کے نزدیک نیّت کا ادائیگی کے وقت سے متصل ہونا ضروری ہے اور ادائیگی سے مراد فقراء کو دینا یا امام کو دینا ہے کیونکہ امام فقراء کا نائب ہے اور نیت کا ادائیگی کے وقت سے متصل ہونا اس لیے ضروری ہے کہ تمام عبادات میں اصول یہی ہے (کہ جس وقت عبادت شروع کی جائے اسی وقت نیّت کی جائے)۔

نیّت کا زکوٰۃ سے حکمی طور پر متصل ہونا بھی جواز کے لیے کافی ہے جیسا کہ بلا نیت دے دیا پھر نیت کی جبکہ مال ابھی فقیر کے ہاتھ میں موجود تھا، یا وکیل کو دیتے ہوئے نیت کی پھر وکیل نے بلا نیت دے دی، یا ذمی کو دے دی تاکہ وہ فقراء کو دے دے اس لیے کہ نیّت حکم دینے والے کی معتبر ہے۔

زکوٰۃ کی مقدار کو باقی مال سے جدا کرتے وقت کی نیت بھی کافی ہے اگرچہ یہ خلاف اصول ہے کیونکہ مستحقین کو دیتے وقت نیّت علیحدہ علیحدہ ہو گی اور ہر مرتبہ نیت میں دشواری محسوس ہو گی اس لیے زکوٰۃ کی رقم علیحدہ کرنے کے وقت کی نیّت کافی ہے لیکن محض جدا کر کے زکوٰۃ سے عہدہ برآ نہیں ہو گا بلکہ فقراء کو دے کر عہدہ برآ ہو گا۔

اگر کسی نے اپنا تمام مال صدقہ کر دیا تو اس سے زکوٰۃ بھی ادا ہو گئی اگرچہ اس نے علاً اس کی نیّت کی ہو یا نہ کی ہو، کیونکہ جو زکوٰۃ واجب ہے وہ اس مال کا ایک حصّہ ہے اور اس نے پورا کا پورا اللہ کے لیے صدقہ کر دیا اور نیّت دفع تزاحم (ضروریات اور مصارف کے ٹکراؤ) کے لیے ضروری ہے، جب پورا مال ہی صدقہ کر دیا تو ضروریات کا یہ تزاحم ختم ہو گیا۔[1]

فقہائے مالکیہ کے نزدیک زکوٰۃ کی نیت اس کے علیحدہ کرنے یا مستحق کو دینے کے وقت لازمی ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک وقت کر لینا کافی ہے لیکن اگر ان دونوں مواقع پر نہ کی بلکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی تو جائز نہیں ہے۔[2]

---

[1] الدر المختار ورد المحتار، ج ۲، ص ۱۴، ۱۵۔ ط استنبول۔

[2] حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۰۔

فقہائے شافعیہ کے نزدیک زکوٰۃ کی تقسیم سے پہلے نیت کے جواز کی دو صورتیں ہیں اور صحیح قول جواز ہے جیساکہ امام نووی نے فرمایا ہے، جیساکہ روزہ میں پہلے سے نیت جائز ہے کیونکہ زکوٰۃ کی تقسیم کے وقت نیت کے لازمی قرار دینے میں دشواری ہوسکتی ہے اور یہ کہ مقصود حاجتمند کی ضرورت کو پورا کرنے ہیں، اسی اساس پر مؤکل کی وکیل کو دیتے وقت کی نیت کافی ہے جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ وکیل مستحقین میں تقسیم کرتے وقت نیت کرے ۔ اسی لیے کہا ہے کہ اگر کسی شخص نے زکوٰۃ کا معاملہ اپنے کسی وکیل کے سپرد کردیا اور اسی کو نیت بھی سونپ دی تو جائز ہے۔[1]

فقہائے حنابلہ کے نزدیک جیساکہ المغنی میں ہے کہ دینے سے کچھ وقت پہلے نیت جائز ہے جیساکہ تمام عبادات میں ہے اور اس لیے کہ اس میں نیابت درست ہے اور دینے وقت نیت کے لازم ہوجانے سے اس کے مال میں دھوکہ پیدا ہوسکتا ہے۔

نیت کے اتصال میں اس آسانی کے باوجود دوسرے پہلو میں تشدد برتا گیا ہے چنانچہ المغنی میں ہے کہ اگر زکوٰۃ دہندہ نے زکوٰۃ اپنے وکیل کو دے دی اور خود نیت کی وکیل نے نہیں کی تو جائز ہے بشرطیکہ اس نے دینے سے کافی پہلے نیت نہ کی ہو اور اگر بہت پہلے نیت کی تھی تو جائز نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس نے وکیل کو دیتے ہوئے پھر نیت کرلی ہو اور وکیل نے دینے کے وقت نیت کرلی ہو۔

اگر دہندہ نے اپنا مال پورا صدقہ نفلی میں دے دینے کی نیت کرلی لیکن زکوٰۃ کی نیت نہیں کی تو جائز نہیں ہے۔

---

[1] الروضۃ، ج ۲، ص ۲۰۹۔

کہ اس نے فرض کی نیت نہیں کی، جیسے کوئی شخص سو رکعت نفل پڑھے اور فرض کی نیت نہ کرے۔ یہی رائے امام شافعی رح کی بھی ہے۔[1]

میری رائے یہ ہے کہ ان تمام معاملات میں سہل پہلو کو اختیار کیا جائے اور زکوٰۃ کو جائز قرار دیا جائے اور یہ متصوّر کر لیا جائے کہ مُسلم کے دل میں ادائے زکوٰۃ کی ایک عمومی نیّت تو بہرحال ہوتی ہے (وہی کافی ہے)۔

●

[1] المغنی، ج ۲، ص ۵۳۳۔ الروضۃ للنووی، ج ۲، ص ۲۱۰۔

تیسری فصل

زکوٰۃ کی قیمت ادا کرنا

قیمتِ زکوٰۃ دینے کے بارے میں فقہی اختلاف

اگر مال کے مالک پر بکریوں میں ایک بکری، اونٹوں میں ایک اونٹنی، گندم میں ایک اردب، پھلوں میں ایک قنطار زکوٰۃ لازم ہے کہ وہ انہی اشیاء کی صورت میں زکوٰۃ ادا کرے یا اسے اختیار ہوگا کہ وہ یہ اشیاء دے یا ان کی قیمت نقد کی صورت میں دے دے اور اگر قیمت دے دے تو کیا جائز ہے اور زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

فقہاء کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں بعض کے نزدیک درست نہیں ہے اور بعض کے نزدیک جائز ہے مگر مکروہ ہے اور بعض دیگر کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔

شافعیہ اور ظاہریہ نے قیمتِ زکوٰۃ کے دینے کے جواز میں زیادہ سختی برتی ہے جبکہ ان کے بالمقابل فقہائے احناف نے ہر حال میں جائز کہا ہے۔ اور مالکی اور حنبلی فقہاء کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔

مختصر خلیل میں ہے کہ زکوٰۃ کی قیمت دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، ابن الحاجب اور ابن بشیر نے اسی کی اتباع کی ہے اور التوضیح میں اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ رائے المدونۃ کی رائے سے مختلف ہے اور اس میں یہ ہے کہ قیمت زکوٰۃ دینا مکروہ ہے حرام نہیں ہے۔

ابن ناجی کے شرح الرسالہ میں اشہب اور ابن القاسم کا یہ قول ہے کہ قیمتِ زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اور ایک رائے اس کے برعکس ہے۔

المدونۃ میں ہے کہ اگر زکوٰۃ وصول کنندہ زکوٰۃ دہندہ کو صدقہ کی قیمت لینے پر مجبور

کرے تو مجھے اُمید ہے کہ جائز ہے۔ شیوخ کہتے ہیں اس لیے کہ وہ حاکم ہے اور حاکم کے حکم سے اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

حنابلہ کی رائے المغنی میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ امام احمدؒ کا ظاہری مسلک یہ ہے کہ کسی بھی زکوٰۃ کی خواہ وہ زکوٰۃ الفطر ہو یا زکوٰۃِ مال قیمت ادا کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ خلافِ سنّت ہے۔

لیکن امام احمدؒ سے فطرہ کے علاوہ زکوٰۃ کے قیمتاً ادا کر دینے کا جواز بھی منقول ہے، ابوداؤد کہتے ہیں کہ امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے نخلستان کے پھل کو فروخت کر دے، تو آپ نے فرمایا کہ عشر فروخت کنندہ پر ہے، جسے وہ چاہے تو پھل کی صورت میں دے دے اور چاہے اس کی قیمت دے دے — یہ رائے قیمت کے زکوٰۃ میں دے دینے کے جواز پر دلیل ہے۔

زکوٰۃ الفطر میں انھوں نے تشدّد کیا ہے اور ان کے نزدیک اس میں قیمت دینا جائز نہیں ہے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فعل کو اس رائے کے برخلاف قول رکھنے والوں پر دلیل بنایا — حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ واقعہ ہم ساتویں باب میں بیان کریں گے۔

وجہ اختلاف

اس اختلاف کا پہلا سبب یہ ہے کہ حقیقت زکوٰۃ کے بارے میں نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہے کہ کیا یہ عبادت ہے یا قربت ہے یا یہ اغنیاء کے اموال میں فقراء کا حق لازم ہے۔ یعنی مالک نصاب پر ایک لازمی ٹیکس ہے۔

صحیح امر یہ ہے کہ زکوٰۃ ان ہر دو پہلوؤں کی حامل ہے — لیکن امام شافعیؒ، امام احمدؒ، مسلک ظاہر کے فقہاء اور بعض مسلک مالک کے فقہاء نے اس کے عبادت کے پہلو کو ترجیح دی ہے اور اس لیے انھوں نے کہا ہے کہ مالک پر لازم ہے کہ جس شئے پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے وہی ادا کرے اور اس کی قیمت دینا جائز نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، ان کے اصحاب اور دیگر ائمہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مالی حق ہے اور اس سے فقراء کی ضرورت ہی رفع کرنا مقصود ہے اس لیے قیمت ادا کرنا جائز ہے۔

ان فقہاء کے دلائل جن کے نزدیک قیمت کا زکوٰۃ میں دینا جائز نہیں ہے

ان فقہاء کے دلائل حسبِ ذیل ہیں۔

۱) امام حرمین الجوینی الشافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے فقہاء کی اس سلسلے میں اصل دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک امرِ ثواب (قُربت) ہے اور امورِ قُربت میں حکم آلٰہی کی اتباع کی جاتی ہے، اس کی مثال اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے وکیل سے کہے کہ کپڑا خرید لو، اور وکیل کو معلوم ہو کہ اس کا مقصود تجارت ہے تو وہ اس حکم کی مخالفت نہیں کر سکتا اگرچہ اس کے خیال میں کسی اور شئے کی تجارت زیادہ نفع بخش ہو۔ اسی طرح جس حکم کا اجراء محض اللہ کے لیے ہے اس کا اتباع اسی صورت میں لازم ہے۔ جس طرح سجدہ ناک اور پیشانی ہی پر کرنا لازم ہے اور گال یا ٹھوڑی پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے حالانکہ مقصود خضوع (عاجزی) کا اظہار کرنا ہے، کیونکہ سجدہ کی ہئیت میں یہ تبدیلی نصّ کے خلاف ہے اور تعبُّد (عبادت) کے مفہوم سے خارج ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ میں بکری اور اونٹ کی قیمت دینا یا غلّے یا پھل کی قیمت دینا جائز نہیں ہے اس لیے کہ نصّ میں انہی اشیاء کا ذکر ہے اور قیمت کا دینا نصّ کے الفاظ کی خلاف ورزی اور معنیٔ عبادت سے گریز ہے جبکہ زکوٰۃ کو قرآن نے نماز کے ہم رشتہ کر کے بیان کیا ہے[1]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن نے ادائے زکوٰۃ کا اجمالی حکم دیا ہے اور اس اجمال کی تفصیل سُنّت نے بیان کی ہے اور اس کی مقداریں بیان کی ہیں کہ چالیس بکریوں پر ایک بکری اور پانچ اونٹوں پر ایک بکری اور قرآن و سنّت کے ان احکام کا مجموعی

---

[1] النووی: المجموع، ج ۵، ص ۴۳۰۔

تقاضا یہ ہو گیا کہ "چالیس بکریوں یا پانچ اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ ادا کرو" اس طرح فقیر (محتاج) کا حق اس نص کی بنا پر اس زکوٰۃ سے متعلق ہو گیا اور یہ جائز نہ رہا کہ تعطیل کے ذریعے اس حق عین کو باطل کر دیا جائے۔

۲) اس مفہوم کی تاکید قاضی ابو بکر بن العربی رح کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ

"امام ابو حنیفہ رح نے جس طرح سمجھا ہے کہ زکوٰۃ کے حکم کا مکلف بنانے کا مقصود محض مال میں کمی ہے حالانکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس ذمے داری کے پورا کرنے کا حق جس خاص کمی سے متعلق ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ ذمے داری اسی خاص مقدار سے متعلق ہے جو کم ہوتی ہے کیونکہ مال کا مالک یہ چاہے گا کہ اس کے اصل مال میں کمی نہ ہو اور قیمت کے ذریعے زکوٰۃ ادا ہو جائے یعنی اس کا دل اس اصل مال سے متعلق رہے گا اور مقصود یہی ہے کہ اس تعلق کو منقطع کر دیا جائے اس لیے لازم ہوا کہ اصل مال کا بعینہٖ وہی حصہ زکوٰۃ میں ادا کیا جائے"[1]

۳) تیسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت کی منشا فقیر کی ضرورت کو پورا کرنا ہے اور اللہ کی نعمت پر شکر ادا کرنا ہے اور حاجتیں متنوع ہیں اس لیے زکوٰۃ کی صورتیں بھی مختلف ہونی چاہئیں تاکہ فقیر کو اس کی ہر ضرورت پہنچ جائے اور اللہ کا شکر اسی نعمت سے ادا ہو جائے جس نعمت پر شکر واجب ہوا ہے[2]

۴) ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رض کو یمن روانہ فرمایا تو ان کو یہ حکم دیا کہ

"غلہ پر غلہ، بکری پر بکری، اونٹ پر اونٹ اور گائے پر زکوٰۃ وصول کرنا"

ظاہر ہے کہ یہ نص ہے اور اس پر عمل لازمی ہے اور اس سے تجاوز کر کے قیمت

---

[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۹۴۵۔

[2] المغنی، ج ۲، ص ۶۶۔

لینے کا فتوا اختیار کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں غلہ کے بدلے کوئی اور شئے زکوٰۃ میں ادا ہوگئی اور بکری کی جگہ اور کوئی شئے ادا ہوگی جو کہ درست نہیں ہے اور حدیث کے خلاف ہے۔

ان فقہا کے دلائل جن کے نزدیک زکوٰۃ میں قیمت ادا کرنا جائز ہے

فقہائے احناف اور ان کے مسلک کے مطابق رائے رکھنے والے دیگر فقہاء نے اپنے مسلک کو عقلی اور نقلی دلائل سے واضح کیا ہے اور ان کے یہ دلائل ہیں :-

۱) اللہ سبحانہٗ نے فرمایا ہے کہ

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

اس نص سے معلوم ہوا کہ جو شئے لی جارہی ہے وہ بھی مال ہے اور قیمت بھی مال ہے اس لیے قیمت کا لینا جائز ہے اور نبی کریمؐ کا یہ فرمان کہ ہر چالیس بکری پر ایک بکری زکوٰۃ ہے تو یہ اس مال کے مالک کی سہولت کے بیان کرنے کے لیے ہے، اس لیے نہیں ہے کہ ادائے زکوٰۃ کی شرط یہی ہے کیونکہ مویشی کے مالکوں کے پاس نقد رقم کم ہوتی ہے اس لیے ان کے لیے جانور ہی زکوٰۃ میں دینا زیادہ سہولت کا باعث ہے[1]

۲) بیہقیؒ نے اپنی سند سے اور بخاریؒ نے معلقًا طاؤس سے روایت کیا ہے کہ حضرت معاذ رضؓ نے یمن پہنچ کر فرمایا کہ

ومیرے پاس نیزے اور کپڑے لے آؤ، میں اصل زکوٰۃ کی جگہ یہ اشیاء

---

[1] یہ حدیث المنتقیٰ میں مذکور ہے اور امام شوکانیؒ کہتے ہیں کہ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور اس کی ایک سند عطاء از معاذ بھی ہے حالانکہ عطاء کا حضرت معاذ رضؓ سے سماع ثابت نہیں ہے کیونکہ عطاء حضرت معاذ رضؓ کی وفات کے بعد یا سال وفات میں پیدا ہوئے تھے۔

نیل الاوطار: ج ۴، ص ۱۵۲: ط۔ عثمانیہ۔

لے لوں گا اس میں تمہارے لیے آسانی اور مدینہ میں مہاجرین کے سہولت ہو گی۔[1]

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

"میرے پاس کپڑے لے آؤ جو میں تم سے جو اور مکئی کے بدلے قبول کر لوں گا۔"[2]

ان روایات کی وضاحت یہ ہے کہ اہل یمن کپڑے کی صنعت میں ممتاز مقام رکھتے تھے اس لیے ان کا زکوٰۃ میں پارچہ جات دینا آسان تھا جبکہ مدینہ والوں کو کپڑوں کی ضرورت تھی اور یمن کی حاصل شدہ زکوٰۃ یمن کے مصارف سے زیادہ تھی جو حضرت معاذؓ کو مدینہ منورہ بھیجتا تھی۔

حضرت معاذ کا یہ قول فقیہ اور امام یمن حضرت طاؤس نے روایت کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خود طاؤس حدیث نبوی "غلہ پر غلہ اور بکری پر بکری زکوٰۃ لے لو" سے یہ مفہوم اخذ نہیں کرتے تھے کہ جس شئے پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے وہی شئے زکوٰۃ میں لینا چاہیے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شرحوں سے زکوٰۃ طلب کی جائے گی اور اگر وہ چاہیں گے تو قیمت ادا کر سکیں گے۔ گویا ان اجناس کے تعین کا مقصود مال کے مالکین کو سہولت بہم پہنچانا ہے کیونکہ ہر مالک کو اسی مال کے دینے میں سہولت ہوتی ہے جو اس کے پاس موجود ہوتا ہے، جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے دیت میں بھی ان لوگوں سے جن کے پاس سلے ہوئے کپڑے تھے سلے ہوئے کپڑے لیے تھے۔[3]

۳) احمدؒ اور بیہقیؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کے اونٹوں میں ایک موٹی تازی اونٹنی دیکھی اور ناراض ہو کر فرمایا کہ برا ہو اس زکوٰۃ

---

[1] المبسوط، ج ۲، ص ۱۵۷۔

[2] البیہقی: السنن الکبری، ج ۴، ص ۱۱۳۔

[3] ابن الترکمانی: الجوہر النقی، المطبوع مع السنن الکبری، ج ۴، ص ۱۱۳۔

وصول کنندہ کا جس نے زکوٰۃ میں یہ اونٹنی وصول کی ہے۔ اس زکوٰۃ وصول کنندہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے زکوٰۃ کے اونٹ دے کر یہ اونٹنی بدلی ہے اس پر آپ نے فرمایا، پھر ٹھیک ہے۔

یہ حدیث بلحاظ سند بھی اور بلحاظ استدلال بھی دلیل بننے کے قابل ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ اونٹنی بلاشبہ باعتبار قیمت ہی دو اونٹوں کے برابر ہوگی۔

۴) زکوٰۃ کا مقصود فقیر کو مستغنی کر دینا اور محتاج کی بھوک ختم کرنا ہے، اور امت کی مصالح کو اس طرح بروئے کار لانا ہے کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کا ذریعہ بنے۔ اور یہ مقصود جس طرح بکری کے زکوٰۃ میں دینے سے بھی حاصل ہوتا ہے بلکہ قیمت کے زکوٰۃ میں دینے سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح اس کی قیمت کے دینے سے بھی حاصل ہوتا ہے بلکہ قیمت کے زکوٰۃ میں دینے سے یہ مقصود زیادہ بہتر طریقے پر حاصل ہوتا ہے کہ مختلف ضروریات کی تکمیل کے لیے ادائے قیمت زیادہ سہل ہے۔

۵) از روئے اجماع عین شئے کو جنس سے تبدیل کر لینا جائز ہے کہ اپنی بکریوں کی زکوٰۃ ان بکریوں کے علاوہ کسی اور بکری سے اور ایک زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ دوسری زمین کی پیداوار سے ادا کر دے۔ تو جس طرح عین شئے کو جنس سے تبدیل کرنا جائز ہے اسی طرح ایک جنس کو دوسری جنس سے بدلنا جائز ہے۔

اور یہ دلیل قاضی ابن العربی کی اس رائے کی تردید بن جاتی ہے کہ شارع نے ہر مال میں ایک خاص زکوٰۃ متعین کیا ہے اس کا مقصود مالک کا اس مال سے تعلق منقطع کرنا ہے، کیونکہ اگر شارع کا مقصود یہی ہوتا تو کسی کے لیے یہ جائز نہ رہتا کہ وہ اس خاص حصہ کے علاوہ جو بطور زکوٰۃ متعین ہو گیا ہے مال کی اسی جنس کا کوئی دوسرا حصہ دے سکے۔

۶) سعید بن منصور اپنی سنن میں حضرت عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت عمرؓ دراہم کی زکوٰۃ سامان کی صورت میں لے لیا کرتے تھے۔[۲]

---

[۱] بحوالہ مذکور۔ [۲] المغنی، ج ۳، ص ۶۵۔

موازنہ و ترجیح میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ہر دو فریق کے دلائل پر غور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلک حنفی زیادہ صحیح ہے اور جہاں آثار و اخبار سے ثابت ہے وہاں فکر و نظر بھی اسی کی مؤید ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ میں عبادت کے پہلو کا غالب ہونا اور اس کا نفعؔ میں وارد فقیر کے لحاظ سے نماز پر قیاس کرنا طبیعت زکوٰۃ کے مطابق نہیں ہے اور نہ ہی یہ مخالفین حنفیہ کی اس رائے کے موافق ہے کہ زکوٰۃ ایک مالی حق اور ایک ممتاز عبادت ہے اور بچہ اور مجنون کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے حالانکہ اس پر نماز واجب نہیں ہے جبکہ ان کو یہاں بھی وہی رائے اختیار کرنی تھی جو انھوں نے وہاں کی ہے اور ان حنفیہ کا رد کرنا چاہیے تھا جنھوں نے نماز پر قیاس کرتے ہوئے غیر مکلفین سے زکوٰۃ کو ساقط قرار دیا ہے۔

فی الواقع فقہائے احناف کی رائے ہمارے عہد کے موافق لوگوں کے لیے باعث سہولت حساب میں آسانی کا ذریعہ ہے بالخصوص جبکہ زکوٰۃ جمع کرنے اور تقسیم کرنے کے باقاعدہ ادارے موجود ہوں کیونکہ اصل عین زکوٰۃ میں وصول کرنے سے ان کے نقل و حمل پر اخراجات زیادہ ہوں گے اور ان کی نگرانی اور حفاظت کے انتظامات اور ان کے گھاس اور چارے کا بند و بست کے مصارف بے حد بڑھے ہوں گے جو کہ وصولی ٹیکس میں اصول اقتصاد کے منافی ہوں گے۔

یہ رائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت حسن بصریؒ سے بھی مروی ہے اور یہی سفیان ثوریؒ کی رائے ہے اور زکوٰۃ فطر کے علاوہ ہر زکوٰۃ میں امام احمدؒ سے یہی رائے مروی ہے[1] اور امام نوویؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ کا بھی مسلک یہی ہے[2] اور ابن رشید کہتے ہیں کہ اگرچہ امام بخاریؒ کی راتے بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے

---

[1] ایضاً۔

[2] المجموع، ج ۵ / ص ۴۲۹۔

برخلاف ہے مگر اس مسئلہ میں وہ بربنائے دلیل حنفی مسلک سے متفق ہیں[1]

چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں زکوٰۃ میں سامان (قیمت) کے لینے کا ایک جدا باب قائم کیا ہے اور اس باب میں وہ بطور دلیل حضرت معاذ رضؓ کے طاؤس کے روایت کردہ اثر کو لائے ہیں کہ حضرت معاذ رضؓ نے اہل یمن سے مطالبہ کیا کہ وہ غلوں کی بجائے کپڑے زکوٰۃ میں دیں، کہ اس طرح انھیں سہولت ہوگی اور مدینہ میں موجود اصحاب النبیؐ کو آسانی ہوگی[2]

اسی طرح امام بخاریؒ نے اور بھی احادیث بطور استدلال ذکر کی ہیں مثلاً حضرت ابوبکر رضؓ کے مویشیوں پر زکوٰۃ کے بارے میں خط میں ہے کہ

"جس شخص کی زکوٰۃ بنت مخاض بن جائے اور وہ اس کے پاس نہ ہو بلکہ اس کے پاس بنت لبون ہو تو وہی اس سے لیا جائے گا، اور زکوٰۃ وصول کنندہ اسے بیس درہم یا دو بکریاں دے گا"

یعنی ایک عمر کے زکوٰۃ کے بدلے دوسری عمر کا اونٹ لے لینا اور ان دونوں کے مابین فرق کو درہم یا بکری دے کر پورا کر دینا مطلوب بالذات نہیں ہے بلکہ مال کے مالکوں کی سہولت کے لیے ہے

لیکن ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ درج ذیل وجوہ کی بنا پر طاؤس کی حدیث سے استدلال درست نہیں ہے۔

۱) یہ حدیث مرسل ہے اور طاؤس کی ملاقات حضرت معاذ رضؓ سے نہیں ہوئی ہے کیونکہ

---

[1] فتح الباری، ج ۳، ص ۲۰۰۔

[2] بخاریؒ نے طاؤس کے اس اثر کو معلقاً صیغہ جزم کی ساتھ روایت کیا ہے جو کہ اس کی صحت کی دلیل ہے کیونکہ طاؤس فقیہ یمن تھے اور حضرت معاذ رضؓ کے اخبار اور وقائع سے واقف تھے اور امام بخاریؒ کا اس اثر کا بطور دلیل ذکر کرنا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اثر ان کے نزدیک قوی ہے۔ (الفتح، ج ۳، ص ۲۰۰)

طاؤس تو پیدا ہی حضرت معاذ رضؓ کی وفات کے بعد ہوتے ہیں۔

۲) اگر یہ اثر صحیح بھی تو حجت اس لیے نہیں ہے کہ یہ بیان سرکار دو عالمؐ کی جانب سے نہیں ہے اور جو قول آپؐ کی جانب سے مروی نہ ہو وہ حجت نہیں ہے۔

۳) اس اثر میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ سے متعلق ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ جزیہ سے متعلق ہو اور حضرت معاذ رضؓ نے غلہ اور کپڑا جزیہ کے بدلے لیا ہو۔

۴) اس اثر کے باطل ہونے پر ایک دلیل خود حضرت معاذ رضؓ کا یہ قول ہے کہ یہ اہل مدینہ کے لیے بہتر ہوگا کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت معاذ رضؓ نے اس شئے کو خیر (بہتر) قرار دیا ہو جس کو اللہ نے مقرر نہیں کیا ہے [1]

سچی بات یہ ہے کہ یہ وجوہ کمزور ہیں۔ اس لیے کہ ہر چند کہ طاؤس کی ملاقات حضرت معاذ رضؓ سے نہیں ہوئی ہے مگر حضرت طاؤس عالم تھے اور حضرت معاذ رضؓ کے حالات و سیرت سے بخوبی واقف تھے اور بقول امام شافعیؒ عہد تابعین کے امام تھے اور قریب العہد ہونے کی بنا پر حضرت معاذ رضؓ کی اخبار اور ان کے وقائع سے آشنا تھے

یمن میں حضرت معاذ رضؓ کے اس عمل سے اور اصل واجب کی جگہ ان کی قیمت لے لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک یہ عمل سنت کے معارض نہیں تھا اور صحابہ کرام رضؓ کے ان کے اس عمل پر اعتراض نہ کرنے سے ان کی ضمنی تائید اور موافقت کا علم ہوتا ہے۔

یہ احتمال کہ یہ اثر جزیہ سے متعلق ہو سکتا ہے ضعیف اور باطل ہے جیسا کہ احمد شاکر نے المحلی کی تعلیق میں تحریر کیا ہے کیونکہ یحییٰ بن آدم کی روایت میں زکوٰۃ کی وضاحت موجود ہے۔

جبکہ چوتھی وجہ علامہ ابن حزمؒ کی بلا وجہ کھینچا تانی ہے اس لیے کہ یہاں 'خیر لکم' کے معنی انفع لکم ہیں، یعنی یہ کپڑے اہل مدینہ کی ضرورت کو غلہ سے زیادہ پورا کریں گے

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۳۱۲۔

اور یہ امر واقع ہے اور اس میں نزاع کی گنجائش نہیں ہے، رہ گیا یہ کہنا کہ اسے اللہ نے واجب نہیں قرار دیا ہے تو یہ اصل دعویٰ ہے جس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ زکوٰۃ میں قیمت وصول کرنا بھی اللہ کے واجب کردہ حکم کی تعمیل ہے۔

ابن تیمیہؒ نے اس میں ایک درمیانی مسلک اختیار کیا ہے کہ بلا ضرورت اور بغیر مصلحت قیمت زکوٰۃ لینا درست نہیں ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسر کی مقدار کو دو بکریوں یا بیس درہم سے پورا کرنے کا حکم فرمایا، اور قیمت کی جانب منتقل نہیں فرمایا۔ نیز یہ کہ اگر مطلقاً قیمت دینا جائز ہو تو مالک ردی انواع میں دے سکتا ہے اور قیمت کے تعین میں بھی نقصان ہو سکتا ہے اور چونکہ زکوٰۃ مواسات پر مبنی ہے جو کہ مال کی مقدار اور اس کی جنس میں ہے۔ لیکن بہر حال ضرورت اور مصلحت کے پیش نظر زکوٰۃ میں قیمت ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً کوئی مالک اپنا باغ یا فصل دراہم کے بدلے فروخت کر رہا ہو تو اسے دس درہم زکوٰۃ میں دینا جائز ہے، اور اسے اس امر کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جائے گا کہ وہ غلہ خرید کر زکوٰۃ میں دے، اس لیے کہ وہ اب خود ہی فقراء کے مساوی ہو گیا ہے اور احمد نے اس کا جواز بیان کیا ہے۔

اسی طرح اگر کسی پر ایک بکری زکوٰۃ لازم آئے اور وہ بکری اسی جگہ نہ خرید سکتا ہو تو اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ بکری خریدنے کے لیے دوسرے شہر جائے بلکہ اس کا قیمت دینا ہی کافی ہوگا۔

اور اسی طرح اگر مستحقین خود ہی یہ چاہیں کہ انھیں قیمت دے دی جائے اور مالک انھیں قیمت دے دے یا زکوٰۃ وصول کنندہ خود محسوس کرے کہ نقد قیمت فقراء کے لیے زیادہ مفید ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے اہل یمن سے فرمایا کہ میرے پاس نیزے اور لباس لے آؤ کہ اس میں تمھاری آسانی ہے۔ اور

مدینہ منورہ کے مہاجر و انصار کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ (اور اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کے بارے میں ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ جزیہ کے بارے میں ہے۔)[1]

اسی کے قریب قریب رائے ہم نے اختیار کی ہے کہ دورِ جدید میں مصلحت اور ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ زکوٰۃ میں قیمت ہی وصول کی جائے الا یہ کہ اس میں ضرورت مندوں یا مالکوں کا کوئی نقصان ہو۔

---

[1] مجموع فتاوی ابن تیمیہ: ج ۲۵، ص ۸۲، ۸۳۔ ط السعودیہ۔

چوتھی فصل

زکوٰۃ کا اس شہر سے باہر لے جانا جس سے وصول ہوئی ہے

اسلام نے محصولات زکوٰۃ کے صرف کے لیے ایک انتہائی حکیمانہ اور عادلانہ نظام مقرر کیا ہے جو کہ دورِ جدید کے ترقی یافتہ انتظامی مالیاتی اداروں کے ہم پلہ ہے اور یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ آج کل مالیاتی و انتظامی ادارے بالکلیہ جدید ہیں اور پہلے کبھی اس طرح کے ادارے موجود نہیں رہے ہیں۔

ادوار جاہلیت میں اور یورپ کے عصور مظلمہ DARK AGES میں ان کسانوں، صنعت کاروں، پیشہ وروں اور تاجروں سے ٹیکس وصول کیے جاتے جو اپنے ہاتھوں کی جفاکشی اور اپنے خون پسینہ کی محنت سے اور شب و روز کی کدوکاوش سے اپنی روزی کماتے تھے...... پھر پسینہ آنسوؤں اور خون میں تر یہ دولت جمع ہو کر سلطان معظم کے دارالسلطنت میں پہنچ جاتی جو کہ بادشاہ کی شان و شوکت اور عظمت اقتدار پر صرف ہوتی ہے، غریبوں کے اس خون پسینہ کی کمائی سے بادشاہوں کی بادشاہتوں کو مضبوط کیا جاتا، اس کے حواریوں اور درباری حاشیہ برداروں پر خرچ کیا جاتا اور دارالسلطنت کی خوبصورتی اور جلال و جمال پر خرچ ہوتا، اور اس کے بعد بھی اگر کچھ باقی رہ جاتا تو وہ بادشاہ کے شہر سے متصل شہروں کی خوبصورتی پر خرچ ہوتا ... لیکن جن شہروں کی کدوکاوش سے یہ محصولات ملتے ہیں ان پر کبھی توجہ نہ دی جاتی۔[1]

سب سے پہلے اسلام نے یہ اصول مقرر کیا کہ زکوٰۃ سے حاصل شدہ مال اسی علاقے

---

[1] یوسف القرضاوی: مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام۔ ص ۱۱۴۔

میں تقسیم کیا جائے جس علاقے سے یہ وصول ہوتے ہیں خواہ یہ محصولات فصلوں اور پھلوں سے حاصل ہوں یا مویشی سے بہرحال مال وہیں تقسیم کیا جائے گا جہاں سے حاصل ہوا ہے نیز زکوٰۃ فطر وہاں تقسیم کی جائے گی جہاں وہ شخص موجود ہے جس پر زکوٰۃ فطر واجب ہے۔

اس بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے کہ اگر زکوٰۃ نقود کی صورت میں وصول ہوئی ہو تو کیا وہ وہاں تقسیم ہوگی جہاں مالک موجود ہوگا یا وہاں تقسیم ہوگی جہاں مال موجود ہوگا[1] لیکن اکثر فقہاء کے یہاں مشہور یہی ہے کہ زکوٰۃ مال کے تابع ہے مالک کی نہیں ہے۔

اس اصول کی دلیل خود سنّتِ رسولؐ اور سنّت خلفائے راشدین ہے کہ آپؐ جب کسی والی یا زکوٰۃ وصول کنندہ کو کسی علاقے کی طرف روانہ فرماتے تو اسے یہ حکم فرماتے کہ وہ اس علاقے کے امیروں سے زکوٰۃ وصول کر کے وہاں کے حاجتمندوں پر تقسیم کرے۔

حضرت معاذؓ بن جبل کی حدیث گذر چکی ہے جس کی صحت پر اتفاق ہے کہ نبی کریمؐ نے انھیں یمن روانہ فرمایا اور انھیں حکم فرمایا کہ وہ زکوٰۃ ان کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء میں تقسیم کر دیں۔

حضرت معاذؓ نے اسی طرح تعمیل حکم فرمائی کہ اہلِ یمن کی زکوٰۃ وہیں کے مستحقین پر تقسیم فرمائی بلکہ ہر جگہ کی زکوٰۃ خاص طور پر اسی جگہ کے مستحقین کو دی گئی اور ان کے لیے یہ تحریر لکھی کہ جو شخص اپنے خاندان کے علاقے سے (جہاں اس کی زمین اور مال ہے) کہیں اور چلا گیا تو اس کی زکوٰۃ اور اس کا عشر اسی علاقے میں تقسیم ہوگا۔[2]

ابو جحیفہ سے مروی ہے کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا زکوٰۃ وصول کنندہ آیا، اس نے ہمارے اغنیاء سے صدقہ لے کر ہمارے فقراء کو دیا، خود میں یتیم نوجوان تھا تو مجھے زکوٰۃ سے ایک اونٹ ملا۔[3]

---

[1] حاشیۃ الدسوقی۔ ج ۱، ۵۰۰۔

[2] طاؤس نے ان سے اس روایت کو بسند صحیح نقل کیا ہے اور سعید بن منصور اور اثرم نے اس کو روایت کیا ہے — نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۶۱۔

[3] ترمذیؒ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے (بحوالہ مذکور)

صحیح روایت میں ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی سوال پوچھے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ میں آپ کو اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ لے کر ہمارے فقراء میں تقسیم کریں، آپ نے فرمایا، ہاں۔

ابو عبید رضؓ نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اپنی وصیت میں کہا تھا، میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو فلاں بات اور فلاں بات کی وصیت کرتا ہوں اور اسے وصیت کرتا ہوں کہ وہ دیہاتی عربوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اس لیے کہ ان لوگوں پر عربوں کا دارومدار ہے اور یہی لوگ اسلام کا بنیادی مواد ہیں (میرے جانشین کو چاہیے) کہ وہ ان کے زائد (القدر نصاب) اموال میں سے زکوٰۃ لے اور اسے انھی کے محتاجوں میں واپس کردے[1]

غرض حضرت عمرؓ کے عہد میں یہی طریقہ رہا کہ جس جگہ سے مال زکوٰۃ اکٹھا کیا جاتا وہیں تقسیم کیا جاتا اور جب زکوٰۃ وصول کنندہ مدینہ منورہ واپس آتے تو ان کے پاس بچھانے کے کپڑے (البستر) اور عصا کے کچھ نہ ہوتا۔

چنانچہ حضرت سعید بن المسیبؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت معاذؓ کو بنی کلاب یا بنی سعد بن ذبیان پر زکوٰۃ کا محصل بنا کر بھیجا، انھوں نے انھی قبائل کے فقراء پر وہ زکوٰۃ تقسیم کردی اور کچھ بھی باقی نہ بچا اور اپنے کاندھے پر وہی بوریا رکھ کر واپس آئے جو لے کر نکلے تھے[2]

سعد یعلی بن امیہ کے اصحاب سے اور جنھیں حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ کا عامل بنا کر بھیجا تھا ان سے روایت کرتے ہیں کہ ہم زکوٰۃ کی وصولیابی کے لیے جاتے اور جب واپس آتے تو اپنا کوڑا لے کر واپس آتے[3]

---

[1] الاموال، ص ۵۹۵۔
[2] بحوالۂ مذکور۔ [3] بحوالۂ مذکور

حضرت عمرؓ سے اعراب کے صدقات کے بارے میں پوچھا گیا کہ ہم ان کا کیا کریں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم انھیں صدقہ دیتے رہیں گے تا آنکہ ان میں سے ایک کے پاس سو اونٹ ہو جائیں [1]

اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر مال زکوٰۃ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کر دیا جائے تو جس مصلحت کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اس کی تکمیل نہ ہوگی کہ زکوٰۃ کا مقصود اسی مقام کے فقراء کو غنی بنانا ہے اور زکوٰۃ کے اس مقام سے منتقل کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مقام کے فقراء محتاج رہ جائیں گے [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی اس سنت پر تمام عادل حکمرانوں کا عمل رہا ہے اور یہی جملہ فقہائے صحابہ اور تابعین اور فقہائے امت کی رائے ہے

چنانچہ مروی ہے کہ زیاد بن ابیہ یا اور کسی اموی حکمران نے عمران بن حصین کو زکوٰۃ پر والی بنا کر بھیجا تھا جب وہ واپس آئے تو ان سے پوچھا کہ مال کہاں ہے؟ انھوں نے کہا کیا تم نے مجھے مال لینے بھیجا تھا؟ ہم نے تو زکوٰۃ اس طرح وصول کی جس طرح عہدِ رسالتؐ میں وصول کیا کرتے تھے اور اسی طرح تقسیم کر دی جس طرح عہدِ نبوتؐ میں تقسیم کیا کرتے تھے [3]

محمد بن یوسف نے طاؤس کو مخلاف (یمن کے کسی علاقے) کا عامل مقرر کیا، وہ امیروں سے زکوٰۃ لے کر فقراء میں تقسیم کرتے رہے، جب فارغ ہوئے تو محمد بن یوسف نے کہا کہ اپنا حساب پیش کرو؟ اس پر انھوں نے جواب دیا، میرے پاس کوئی حساب نہیں، بس امیروں سے وصول کرتا گیا اور غریبوں کو دیتا گیا [4]

---

[1] المصنف، ج ۳، ص ۲۰۵ - ط - حیدر آباد۔

[2] المغنی، ج ۲، ص ۶۷۲ -

[3] ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے، نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۶۱۔

[4] الاموال، ص ۵۹۵ -

فرقد سبخی کہتے ہیں کہ میں اپنے مال کی زکوٰۃ تقسیم کرنے کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوا تو راستہ میں مجھے حضرت سعید بن جبیر ملے اور انھوں نے کہا کہ اسے واپس لے جاؤ اور اپنے ہی علاقے میں تقسیم کرو[1]

سفیان ثوری بیان کرتے ہیں کہ کسی کی زکوٰۃ رَے سے کوفہ لائی گئی تو حضرت عمر بن عبدالعزیزرحؒ نے اسے رَے واپس بھیج دیا[2]

ابو عبید کہتے ہیں کہ

ان تمام آثار پر جملہ فقہاء کا اتفاق ہے کہ ملک کے ہر علاقے کے باشندے (یا پانی (چشمے یا وادی) والے اپنے علاقے کی زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں اور یہ استحقاق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ ان میں ایک یا اس سے زائد کوئی حاجتمند باقی رہے، خواہ اس احتیاج کو رفع کرنے کے لیے وہاں کی تمام زکوٰۃ کام میں آجائے اور محصل زکوٰۃ کو وہاں سے بغیر کچھ لیے خالی ہاتھ ہی واپس آنا پڑے۔

اس پر ابو عبید نے حضرت معاذرضؓ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی ہے کہ وہ اپنا وہی بوریا لے کر واپس آتے جو لے کر گئے تھے اور سعید کی یہ روایت کہ ہم زکوٰۃ کا حصہ پانی کے لیے جاتے اور صرف اپنے کوڑے واپس لے کر آتے۔ نیز اس روایت سے استدلال کیا ہے جو ہم عنقریب ذکر کریں گے کہ حضرت معاذرضؓ نے جب یمن کی بقیہ زکوٰۃ بھیجی تو حضرت عمررضؓ نے اس کے بارے میں ان سے استفسار کیا۔

ابو عبید کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قوم کے لوگ اپنی زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں تا آنکہ آسودگی کی بنا پر انھیں اس کی ضرورت نہ رہے۔ اور دوسرے لوگوں کے علاوہ قریب کے لوگ زکوٰۃ کے مستحق اس لیے قرار دیئے گئے ہیں کہ اسلام حرمتِ جوار (احترام پڑوس) کو ملحوظ رکھتا ہے اس لیے سنت یہی قرار پائی کہ جس جگہ کے امیروں سے زکوٰۃ لی جائے اسی جگہ کے حاجتمندوں میں تقسیم کی جائے۔

---

[1] ایضاً۔ [2] ایضاً۔

اگر محصل زکوٰۃ لاعلمی کی بنا پر ایک علاقے کی زکوٰۃ دوسرے علاقے میں لے جائے حالانکہ اس علاقے والوں کو اس کی ضرورت باقی ہو تو امام اس لائی ہوئی زکوٰۃ کو واپس انہی لوگوں کے پاس بھیج دے گا جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا تھا اور جیسا کہ حضرت سعید بن جبیر نے فتویٰ دیا تھا، اگرچہ ابراہیم نخعی اور حسن بصری نے اس سلسلے میں اس شخص کو رخصت دی ہے جو اپنے رشتہ داروں کو بھیج دینا چاہتا ہو تاہم اس اجازت کا تعلق ذاتی مال سے ہے اور اس کا تعلق اس مجموعی مال سے نہیں ہے جو زکوٰۃ وصول کنندہ کے پاس جمع ہو، ابوالعالیہ سے بھی مروی ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ مدینہ لے جایا کرتے تھے، اور ابو عبید کہتے ہیں کہ وہ ایسا اس لیے کیا کرتے تھے کہ زکوٰۃ ان کے رشتہ داروں اور قرابت داروں ہی میں تقسیم ہو جائے۔[1]

اگر کسی جگہ کے لوگ زکوٰۃ سے مستغنی ہوں تو وہاں کی زکوٰۃ بالاجماع دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے

ائمہ اور متفقہ حکم نبوی ہے کہ جس شہر (یا علاقہ) سے زکوٰۃ وصول کی جائے اسی جگہ اس کی تقسیم کی جائے لیکن اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کسی علاقے کے لوگ، پوری زکوٰۃ سے یا اس کے کچھ حصے سے مستغنی ہوں یعنی اس جگہ زکوٰۃ کے مصارف باقی نہ رہے ہوں یا مستحق کم ہوں اور مال زیادہ ہو تو اس مال کو منتقل کرنا درست ہے اور اس کو قریبی علاقے میں منتقل کیا جا سکتا ہے یا امام کے پاس بھیجا جا سکتا ہے کہ وہ حسب ضرورت اس میں تصرف کرے۔

چنانچہ ابو عبید بیان کرتے ہیں کہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضؓ کو یمن بھیجا تو وہ جند میں

---

[1] کتاب الاموال، ص ۵۹۸۔

رہے تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضہ کے انتقال کے بعد حضرت عمر رضہ کے پاس آئے، حضرت عمر رضہ نے بھی انھیں یمن بھیجا، اس کے بعد حضرت معاذ رضہ نے حضرت عمر رضہ کو لوگوں کی زکوٰۃ کا تہائی حصہ بھیجا، جس پر حضرت عمر رضہ نے اعتراض کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے تمھیں مال جمع کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے بلکہ اس لیے امیر کیا ہے کہ تم امیر لوگوں سے وصول کر کے وہیں کے ضرورتمندوں میں تقسیم کردو، اس پر حضرت معاذ رضہ نے فرمایا میں نے جو کچھ آپ کو بھیجا ہے یہاں مجھے اس کا مستحق نہیں ملا اس لیے بھیجا ہے۔ اگلے سال حضرت معاذ رضہ نے نصف زکوٰۃ روانہ فرمائی اور پھر حضرت عمر رضہ نے اسی تأمل کا اظہار کیا اور حضرت معاذ رضہ نے وہی جواب دیا، بعد ازاں تیسرے سال حضرت معاذ رضہ نے پوری زکوٰۃ روانہ کردی اور حضرت عمر رضہ نے اسی طرح اعتراض کیا جس پر حضرت معاذ رضہ نے فرمایا کہ اب یہاں ایک بھی مستحق زکوٰۃ باقی نہیں رہا ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جس علاقے سے زکوٰۃ وصول ہو وہیں کے مستحقین پر صرف ہونی چاہیے لیکن اگر مستحقین باقی نہ رہیں تو زکوٰۃ کا منتقل کرنا جائز ہے۔

عدم استغناء کی صورت میں انتقال زکوٰۃ

اس مسئلے میں بعض مسالک نے تشدد اختیار کیا ہے اور ان کے نزدیک زکوٰۃ کی دوسرے شہر منتقلی جائز نہیں ہے، ایسے کہ اس شہر تک منتقلی جائز نہیں جو قصر صلوٰۃ کی مسافت پر ہو اگرچہ زکوٰۃ کا یہ انتقال بر بنائے ضرورت ہو۔

فقہائے شافعیہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اسے وہیں صرف کرنا چاہیے جہاں سے وصول کی گئی ہے الا یہ کہ کوئی مستحق زکوٰۃ موجود نہ ہو، اور یہی حنبلی فقہاء کی رائے ہے، اگر مستحق زکوٰۃ موجود ہونے کے باوجود زکوٰۃ منتقل کی گئی تو ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، لیکن جن لوگوں نے زکوٰۃ دی ہے ان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی کیونکہ انھوں نے مستحق کا حق دے دیا اس لیے وہ اس الجھ

---

[1] الاموال، ص ۵۹۶۔ نیز دیکھیے حاشیہ بر کتاب مشکلۃ الفقر و کیف عالجہا الاسلام۔

بری الذمہ ہو جائیں گے جس طرح مقروض ادائے قرض سے بری الذمہ ہو جاتا ہے لیکن بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ دہندگان بھی بری الذمہ نہیں ہوں گے کہ اس صورت میں نصّ شرعی کی مخالفت ہوتی ہے۔[1]

فقہائے احناف کہتے ہیں کہ منتقل کرنا مکروہ ہے لیکن اگر یہ انتقال قرابت دار محتاجوں کو دینے کے لیے ہو تو مکروہ نہیں ہے، کہ یہ صلہ رحمی ہے، یا ان افراد یا جماعت کو پہنچانا مقصود ہو جو اس جگہ کے لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں، یا اس کے انتقال میں مسلمانوں کی صلاح و فلاح مضمر ہو، جیسے دار الحرب سے زکوٰۃ کو دار الاسلام پہنچانا، کیونکہ دار الاسلام کے فقراء دار الحرب کے فقراء سے زیادہ مستحق ہیں، یا کسی عالم یا طالب علم کو دینا مقصود ہو، تاکہ اسے اسلام کا پیغام پہنچانے میں سہولت ہو، یا کسی ایسے شخص کو دینا ہو جو زیادہ نیکوکار پرہیزگار ہو اور اسے دینا مسلمانوں کے حق میں مفید ہو، یا ابھی سال پورا نہ ہوا ہو اور زکوٰۃ پہلے دے دی گئی ہو تو ان تمام صورتوں میں انتقال زکوٰۃ مکروہ نہیں ہے۔[2]

فقہائے مالکیہ کے نزدیک زکوٰۃ کا اس مقام پر جہاں وہ واجب ہوئی ہے یا مقام قصر کے اندر اندر تقسیم کرنا واجب ہے۔

اگر وجوب کے مقام پر یا اس کے قریب مستحق موجود نہ ہو تو اس جگہ زکوٰۃ منتقل کرنا

---

[1] الاحکام السلطانیہ للماوردی، ص ۱۱۹، ۱۲۰ - ط - مصر۔ شرح الغایۃ، ج ۲، ص ۲۲۸۔ ملا علی قاری شرح مشکاۃ میں طیبی کا قول کرتے ہیں کہ اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر زکوٰۃ منتقل کر دی گئی اور وہاں تقسیم کر دی گئی تو فرض ساقط ہو جائے گا، ماسوا اس کے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خراسان سے شام لائی جانے والی زکوٰۃ کو واپس خراسان بھیج دیا تھا، اس پر ملا علی قاری کہتے ہیں کہ ان کے اس عمل سے اجماع کے برخلاف رائے کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت یہ کمال عدل اور لوگوں کی طمع کو ختم کر دینے کی مثال ہے۔ المرقاۃ: ج ۴، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

[2] الدر المختار و حاشیۃ ابن عابدین، ج ۲، ص ۹۳، ۹۴۔

واجب ہوگا جہاں مستحق موجود ہے اگرچہ وہ مسافت قصر پر ہو، جبکہ مستحق موجود ہونے کی صورت میں اسی جگہ یا اس کے قریب تقسیم کرنا لازم ہے۔ اور مسافت قصر پر اس کا منتقل کرنا جائز نہیں ہے ماسوا اس کے کہ جن کی طرف منتقل کیا جائے وہ زیادہ حاجتمند اور ضرورتمند ہوں تو ان کی جانب اکثر زکوٰۃ منتقل کرنا مستحب ہے اور اگر پوری منتقل کر دی یا پوری محل وجوب میں تقسیم کر دی تو جائز ہے۔

اگر ایسے مقام پر منتقل کی جہاں کے لوگ مقام وجوب کے لوگوں سے زیادہ مستحق اور حاجتمند نہیں ہیں۔ تو دو صورتیں ہیں۔

پہلی یہ کہ دونوں کی ضرورت برابر ہو تو اس صورت میں منتقل کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، یعنی اس کا اعادہ لازم نہیں ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زکوٰۃ ایسی جگہ منتقل کی گئی ہو جہاں اس کی ضرورت کم ہو تو اس صورت میں دو اقوال ہیں ایک وہ قول ہے جو خلیل نے اپنی مختصر میں درج کیا ہے کہ جائز نہیں ہے اور دوسرا وہ ہے جو ابن رشد نے اور الکانی نے نقل کیا ہے کہ جائز ہے، کیونکہ زکوٰۃ بہر حال مصارف کے اندر رہی ہے [1]

زیدیہ مسلک کے فقہاء کے نزدیک ایک شہر کی زکوٰۃ کو دوسرے شہر کے ضرورتمندوں پر صرف کرنا جائز ہے البتہ جس شہر سے زکوٰۃ وصول ہوئی ہے اسی کے حاجتمندوں پر صرف کرنا اولیٰ ہے اور اس میں مال کا مالک اور امام برابر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ کراہت ہمارے نزدیک استحباب کی ضد ہے، اس لیے اگر زکوٰۃ کسی اور شہر کے ضرورتمندوں کو دی گئی تو باوجود کراہت کے جائز ہوگی۔ اور اگر کسی رشتہ دار مستحق یا طالب علم یا زیادہ ضرورتمند کو دینے کے لیے منتقل کی گئی تو بلا کراہت جائز ہے بلکہ افضل ہے [2]

اباضیہ کے نزدیک اس سلسلے میں کہ امام (سربراہ) زکوٰۃ کا تہائی یا نصف ضرورتمندوں

---

[1] حاشیۃ الدسوقی، علی الشرح الکبیر، ج ۱، ص ۵۰۱۔

[2] شرح الازہار، ج ۱، ص ۷، ۵۴۸، ۵۴۷۔

پر تقسیم کردے اور باقی اسلامی ریاست کے اعزاز کو برقرار رکھنے کے لیے منتقل کرے دو اقوال ہیں، کہ جائز ہے اور یہ کہ نا جائز ہے۔

اور کہتے ہیں کہ اگر امام کو تمام زکوٰۃ کی ضرورت ہو تو وہ تمام لے سکتا ہے اور مقام زکوٰۃ کے ضرورتمندوں کو اگلے سال ان کی ضرورت کے مطابق دے سکتا ہے اور اگر اسے ضرورت نہ ہو تو ساری تقسیم کردے اور جب ایک بستی کے لوگوں کو کافی ہو جائے تو قریب ترین بستی والوں کو دے دے[1]

امام کے اجتہاد کے مطابق زکوٰۃ کا منتقل کرنا جائز ہے

جملہ احادیث آثار اور اقوال کے بیان کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ اصولاً زکوٰۃ وہیں تقسیم کی جائے جہاں وہ جمع ہوئی ہے تاکہ حرمت جوار ملحوظ رہے، فقرا اور حاجتمندی کا سدباب کیا جا سکے۔ ہر علاقہ بذات خود مکتفی ہو سکے، اور ہر جگہ کے مسائل وہیں حل کیے جا سکیں، اور اس لیے بھی کہ اس علاقے کے فقراء کی نظریں اس مال پر لگی ہوئی ہیں اس لیے ان کا حق مقدم ہے۔

لیکن اگر امام عادل اہل شوریٰ کے مشورے سے مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر زکوٰۃ کو منتقل کرنا چاہے تو کوئی شرعی مانع بھی موجود نہیں ہے، اور اس سلسلے میں مجھے امام مالکؒ کی رائے پسند ہے کہ اگرچہ اصولاً انتقال زکوٰۃ جائز نہیں ہے لیکن اگر امام اپنے اجتہاد اور رائے سے اس کو منتقل کرنا مناسب خیال کرے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔[2]

ان کے اصحاب میں سے ابن القاسمؒ کہتے ہیں کہ بعض زکوٰۃ کا ضرورتاً منتقل کرنا درست ہے[3]

---

[1] شرح النیل، ج ۲، ص ۱۳۸۔

[2] تفسیر القرطبی، ج ۸، ص ۱۷۵۔

[3] ایضاً۔

سحنون کہتے ہیں کہ اگر امام کو یہ معلوم ہو کہ فلاں شہر کی ضرورت زیادہ شدید ہے تو زکوٰۃ منتقل کرنا جائز ہے اس لیے کہ صاحب احتیاج کی ضرورت کو مقدم کرنا ضروری ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ظلم کے سپرد کرتا ہے۔

امام مالکؒ کی المدونۃ میں ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے مصر حضرت عمرو بن العاص کو قحط کے سال لکھا عرب کے لیے مدد، عرب کے لیے مدد، اتنے اونٹ روانہ کرو کہ ان کا ایک سرا میرے پاس ہو اور دوسرا تمھارے پاس اور آٹا اور کپڑا بھیجو۔ حضرت عمرؓ ان اشیاء کو تقسیم فرماتے گئے، تقسیم پر لوگوں کو متعین کرتے گئے اور انھیں اونٹوں کے ذبح میں موجود رہنے کا حکم دیتے گئے اور فرماتے تھے کہ عرب اونٹوں سے محبت کرتے ہیں کہیں وہ ان کے ذبح سے متامل نہ ہوں اس لیے انھیں ذبح کر کے ان کا سالن بناؤ اور جن کپڑوں میں آٹا آیا ہے ان کے لباس بناؤ۔[1]

غرض اسلامی ریاست کے مختلف علاقوں کو اس طرح دوسرے علاقوں کی کفالت و امداد کرنی چاہیے۔

اس کی تائید ان امور سے بھی ہوتی ہے۔

۱) وسیع اسلامی ریاست کا ہر علاقہ اور ہر شہر بالکل مستقل نہیں ہوتا اور نہ دیگر علاقوں سے جدا ہوتا ہے بلکہ تمام علاقے مرکزی حکومت سے پیوست اور مربوط ہوتے ہیں اور اسلامی ریاست کے تمام مسلمان افراد ایک خاندان کی طرح باہم مربوط ہوتے ہیں اور ان میں وہ یکجہتی کفالت اور ارتباط ہوتا ہے جو اسلام نے لازم کیا ہے اور اسلامی ریاست کا کوئی علاقہ دوسرے علاقوں سے اور دارالسلطنت سے بالکلیہ منقطع نہیں ہوتا بلکہ جب ایک علاقہ قحط سالی یا آفات سماویہ سے

---

[1] المدونۃ الکبری، ج ۱، ص ۲۴۶۔ الحاکم نے اس اثر کو المستدرک میں المدونۃ سے طویل تر نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ اور الذہبی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ ج ۱، ص ۴۰۵ - ۴۰۶۔

دوچار ہوتا ہے تو ملک کے تمام حصے اس کی اعانت اور مدد کرتے ہیں۔

۲) زکوٰۃ کے مصارف میں تالیف قلوب اور فی سبیل اللہ کے مصارف بھی ہیں، جس میں جہاد بھی شامل ہیں اور وہ تمام اعمال شامل ہیں جن سے اسلام کو نصرت اور سربلندی حاصل ہو، جو کہ یقینی طور پر ایسے امور ہیں جو مرکز سے متعلق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ہم سبیل اللہ کو جہاد ہی پر مقتصر تصور کریں تو دورِ جدید میں جہاد بھی افراد اور اداروں کا کام نہیں ہے بلکہ مرکزی حکومت کے دائرۂ اختیار میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرکزی حکومت کے پاس ان امور پر صرف کرنے کے لیے ذرائع آمدن ہونے چاہئیں جنھیں وہ مسلمانوں کے مفاد میں صرف کرے، اگر اس کے پاس علاوہ زکوٰۃ کے ایسے موارد موجود ہوں تو بہتر ہے ورنہ امام (سربراہ حکومت) ان ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے مختلف علاقوں سے زکوٰۃ لے سکتا ہے۔

اسی لیے امام قرطبیؒ نے بعض فقہاء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

فقراء اور مساکین کا حصہ اسی جگہ تقسیم کیا جائے گا جہاں سے زکوٰۃ وصول کی گئی ہے جبکہ باقی حصہ امام اپنے اجتہاد کے مطابق منتقل کر سکتا ہے [۱]

بہرحال یہ ایک اجتہادی امر ہے اور اس میں اہل شوریٰ کی رائے پر چلنا زیادہ موزوں ہے جیسا کہ خلفائے راشدین فرماتے تھے، اور اسی لیے اس مسئلہ کو کسی غیر متغیر قسم کے اصول کے تابع نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کسی سال میں اور کبھی کوئی تبدیلی نہ ہو۔ اسی سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس عمل کی وضاحت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے عمال کو تحریر فرمایا کہ

"نصف زکوٰۃ وہیں تقسیم کر دو اور نصف زکوٰۃ مجھے بھیج دو"

جب کہ آپ نے اگلے سال لکھا کہ "تمام زکوٰۃ وہیں تقسیم کر دو" [۲]

---

[۱] ج ۸، ص ۱۷۶۔

[۲] الاموال: ص ۵۹۴۔

اور ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ آپ نے رُے کی جو زکوٰۃ کوفہ پہنچائی گئی تھی واپس کردی تھی۔

میری رائے میں ان دونوں طرح کے طرزِ عمل میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ہر دو اعمال مصلحت اور ضرورت کے مطابق ہیں۔

اسی بنا پر ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ انتقال زکوٰۃ کی ممانعت کو مسافت قصر میں محدود کرنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ بتقاضائے مصلحت زکوٰۃ کو منتقل کرنا جائز ہے۔[۱]

۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعراب سے صدقات طلب فرماتے اور انھیں فقراء مہاجرین اور انصار میں تقسیم فرماتے۔

عبداللہ بن ہلال الثقفی سے مروی ہے کہ

"ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ قریب تھا کہ میں ایک بکری کے بدلے مار ڈالا جاتا، آپؐ نے فرمایا کہ اگر ہمیں فقراء مہاجرین کو دینا نہ ہوتا تو ہم نہ لیتے۔" (نسائی)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیصۃ بن مخارق کے زیرِ بار ہونے کے بارے میں فرمایا تھا کہ

"تم ہمارے پاس قیام کرو، زکوٰۃ آنے پر یا تو ہم تمھارا بوجھ ہلکا کر دیں گے یا سارا اپنے ذمّے لے لیں گے۔"

یعنی قبیصہ نجد کے باشندے تھے اور آپؐ نے انھیں حجاز کی زکوٰۃ میں سے دینے کا وعدہ فرمایا۔

عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایام ارتداد میں اپنی قوم کی زکوٰۃ حضرت ابوبکرؓ کو لا کر دی۔

حضرت عمرؓ نے عام الرمادہ (قحط کے سال) کے بعد ابن ابی ذباب کو محصّل بنا کر

---

[۱] الاختیارات، ص ۵۹۔

بھیجتے وقت کہا تھا، ان سے دو سال کی زکوٰۃ لینا اور ایک سال کی وہیں تقسیم کر کے ایک سال کی میرے پاس لے آنا۔

حضرت معاذ رضؓ نے اہلِ یمن سے کہا تھا کہ میرے پاس خمیس اور لبیس (یمنی چادریں اور کپڑے) لے آؤ میں زکوٰۃ کی جگہ یہ اشیاء تم سے لے لوں گا، اس لیے کہ ان کا دینا تمھارے لیے زیادہ آسان اور کپڑے مدینہ میں مہاجرین کے لیے کارآمد ہوں گے۔

ابو عبید کہتے ہیں کہ ان تمام اشیاء کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں الا یہ کہ یہ چیزیں علاقے والوں کی ضرورتوں سے زائد ہوں اور انھیں ان اشیاء کی ضرورت باقی نہ رہے جیساکہ حضرت عمرؓ اور معاذؓ کی روایات میں ہم بیان کر آئے ہیں۔[1]

میں کہتا ہوں کہ مطلق استغناء لازمی نہیں ہے کہ استغناء کے بھی مراتب ہیں جن میں لامحالہ فرق ہوتا ہے، اسی طرح ضرورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور یہ امام کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس کی ضرورت کو شدید خیال کرے اور کس ضرورت کے بارے میں یہ محسوس کرے کہ یہ فوری نوعیت کی ہے اور کس ضرورت کو یہ سمجھے کہ یہ فوری نوعیت کی نہیں ہے اور یہ کہ کون سی مصلحتیں فوری اہمیت کی حامل ہیں اور ان میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے، لیکن بہرحال جو زکوٰۃ منتقل کی جاتی وہ حاصل شدہ زکوٰۃ کا ایک حصہ ہو، پوری زکوٰۃ نہ ہو کہ پوری زکوٰۃ کے منتقل کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اس میں مطلق استغناء ہو جیساکہ حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

اس مقام پر اس امر پر متنبہ کرنا ضروری ہے کہ فقہائے مسلک شافعیؒ جو انتقال کے جواز میں زیادہ متشدد ہیں وہ بھی صاحب مال ہی پر یہ لازم کرتے ہیں کہ وہ خود تقسیم کرنے میں زکوٰۃ کو منتقل نہ کرے لیکن اگر امام اور ساعی (زکوٰۃ وصول کنندہ) منتقل کرے تو صحیح مسلک کی رُو سے یہ جائز ہے۔

چنانچہ المہذب کے مصنف کہتے ہیں کہ

---

[1] الاموال، ص ۵۹۴ / ۶۰۰۔

"اگر امام ساعی کو تقسیم کرنے کے لیے کہے تو وہ تقسیم کر دے اور اگر تقسیم کا حکم نہ دے تو امام کے پاس لے آئے"[1]

امام نووی اپنی شرح میں فرماتے ہیں کہ

"مصنف کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ انتقال زکوٰۃ جائز ہے امام کے لیے بھی اور ساعی کے لیے بھی ۔ البتہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ مال کا خود زکوٰۃ کو منتقل کرے .... رافعی نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور احادیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے"

انفرادی طور پر کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت انتقال زکوٰۃ کا جواز

چونکہ امام (سربراہ ریاست) اسلامی معتبر مصلحت کے تحت اپنے اجتہاد کے مطابق زکوٰۃ کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کر سکتا ہے تو مسلمان فرد جس پر زکوٰۃ واجب ہو اور جو خود اپنی زکوٰۃ کی تقسیم کا ذمے دار ہو ضرورت اور مصلحت کے تحت زکوٰۃ منتقل کر سکتا ہے

مثلاً فقہائے احناف کے نزدیک کوئی شخص اپنی زکوٰۃ قریبی رشتہ داروں کو دینے کے لیے، یا ان لوگوں کو دینے کے لیے جن کی ضرورت زیادہ یا جنھیں دنیا مسلمانوں کے لیے مفید ہو، یا کسی ایسے منصوبہ میں لگانے کے لیے جس کا فائدہ تمام مسلمانوں کو پہنچے یا اسی قسم کی کسی مصلحت کے لیے جس میں زکوٰۃ دہندہ رضائے رب حاصل کرنے کی نیت رکھتا ہو منتقل کرنا جائز ہے۔

●

---

[1] المجموع ، ج ۶ ، ص ۱۷۳۔

پانچویں فصل

زکوٰۃ کو فوراً ادا کرنا اور اس میں تاخیر کرنا

زکوٰۃ کا فوری وجوب فقہائے احناف کے نزدیک زکوٰۃ کا وجوب توسیعی ہوتا ہے اور جب تک مطالبہ نہ ہو صاحب مال اس کی ادائیگی میں تاخیر کر سکتا ہے کیونکہ امر ادا مطلق ہے اور اس کی ادائیگی کا اوّل زمانہ متعین نہیں ہے جیساکہ مقام کا تعین نہیں ہے یہ ابوبکر جصاص کی رائے ہے۔

ائمہ احناف میں سے کرخی رح کہتے ہیں کہ زکوٰۃ فوراً واجب ہے کیونکہ تقاضائے حکم فوری ادائیگی ہے اور اگر حکم سے فوری ہونا یا مؤخر ہونا مترشح نہ بھی ہو تب بھی بقول ابن الہمام طریقۂ مختار یہی ہونا چاہیے کہ فوراً ادائیگی ہو جائے کہ فوراً ادائیگی کا یہ قرینہ موجود ہے کہ زکوٰۃ فقیر کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہے اور فقیر کی ضرورت فوری ہے تو اگر زکوٰۃ فوری طور پر واجب نہیں ہوتی تو یہ مقصود بکمال حاصل نہیں ہوگا۔[1]

یہی رائے درست بھی ہے اور اسی کے امام مالک رح امام شافعی رح اور امام احمد رح اور جمہور فقہاء قائل ہیں۔

ابن قدامہ رح کہتے ہیں کہ امر (حکم) فوری تعمیل کا متقاضی ہوتا ہے اور اسی وجہ سے حکم کی تعمیل میں تاخیر کرنے والا سزا کا مستحق ہوتا ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ ابلیس پر ناراض ہوا اور راندۂ درگاہ کر دیا اور اس کو سجدہ نہ کرنے پر سرزنش کی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے غلام کو پانی پلانے کے لیے کہے اور وہ تعمیل حکم میں تاخیر کرے تو وہ سزا

---

[1] فتح القدیر، ج ۱، ص ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴۔ ردالمحتار، ج ۲، ص ۱۳، ۱۴۔

کا مستحق ٹھہرے گا، اس لیے کہ تاخیر کا جواز وجوب کے منافی ہے کہ واجب وہ ہوتا ہے جس کے ترک پر سزا دی جائے اور اگر تاخیر جائز ہو گی تو بغیر غایت جائز ہو گی جس سے ترک (چھوڑ دینے) پر سزا ختم ہو جائے گی۔

اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مطلق امر فوری تعمیل کا متقاضی نہیں ہوتا تو اس مسئلہ میں بہرحال ہے اس لیے کہ اگر ادائے زکوٰۃ میں تاخیر جائز ہو تو زکوٰۃ دہندہ اپنے طبعی اقتضاء کے تحت تاخیر ہی کرے گا کیونکہ اسے اطمینان ہو گا کہ وہ اس تاخیر سے گنہگار نہیں ہو گا اور اس طرح ممکن ہے کہ اس کی موت آ جائے یا مال تلف ہو جائے اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کر سکے اور اس طرح فقراء اور مساکین کو نقصان پہنچے۔

مزید ایک قرینہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت فقراء کی ضرورت کے پیش نظر ہوتی ہے اور یہ ضرورت فوری ہے اس لیے ادائیگی بھی فوری ہونی چاہیے، نیز یہ کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور بار بار آتی ہے اس لیے اس کی دوبارہ فرضیت کے وقت آ جانے تک تاخیر جائز نہیں ہے جس طرح کہ ایک وقت کی نماز کی اس حد تک تاخیر جائز نہیں ہے کہ دوسری نماز کا وقت آ جائے اور ایک روزے کی اتنی تاخیر جائز نہیں ہے کہ دوسرے روزے کا وقت آ جائے۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ زکوٰۃ دہندہ کو فوری ادائیگی سے کوئی نقصان نہ ہو اگر اسے فوری ادائیگی سے کوئی جانی یا مالی نقصان ہو تو وہ ادائے زکوٰۃ کو مؤخر کر سکتا ہے اس لیے کہ فرمان نبوت ﷺ ہے کہ

"نہ کوئی نقصان پہنچتا ہے نہ پہنچانا ہے"۔[1]

---

[1] احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے اسے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، ابن ماجہ نے حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے بھی روایت کیا ہے، الحاکم اور الدارقطنی نے حضرت ابو سعید سے روایت کیا ہے اور النووی نے الاربعین اور الاذکار میں حسن کہا ہے، امام مالکؒ نے متعدد طریقوں سے جو ایک دوسرے کے مؤید ہیں مرسلاً روایت کیا ہے۔ الہیثمی نے کہا ہے کہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

اور اس لیے کہ چونکہ قرض کی ادائیگی میں تاخیر جائز ہے اس لیے (بایں صورت) زکوٰۃ میں بھی تاخیر جائز ہے [1]

ادائے زکوٰۃ میں سبقت ایک عمومی اصول کے تحت ہر عبادت میں جلدی کرنا اور سبقت اختیار کرنا اسلام میں پسندیدہ ہے۔ کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (البقرہ : ۱۴۸)

امورِ خیر کی جانب سبقت کرو۔

نیز فرمایا:

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ (آل عمران: ۱۳۳)

(بقیہ آگے) اس کے رجال ثقات ہیں، علائی کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ایسے شواہد موجود ہیں جو اسے صحیح اور حسن کے درجے میں داخل کر دیتے اور اسے قابل احتجاج بنا دیتے ہیں۔ شیخ احمد شاکر مسند کی حدیث ۲۸٦۷ کی تخریج میں کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے اور معنی صحیح ہیں اور ابن ماجہ کی حضرت عبادۃ بن الصامت کی صحیح سند سے ثابت ہیں۔

اس حدیث کے الفاظ ہیں: "لا ضرر ولا ضرار۔"

ضرر کے معنی ابتدائی نقصان کے ہیں اور ضرار کے معنی اس کے بدلے کے ہیں (یعنی پہلے کا مطلب ہے دوسرے کو مطلقاً نقصان پہنچانا جبکہ دوسرے کے معنی ہیں دوسرے کو بطور مقابلہ نقصان پہنچانا۔ اس حدیث کے لیے ملاحظہ کیجیے۔

ابن رجب : جامع العلوم والحکم

القاری : المبین المعین لفہم الاربعین ص ۱۸۰/ ۱۸۵۔

المناوی : فیض القدیر، ج ٦، ص ۴۳۱/ ۴۳۲۔

[1] ابن قدامہ : المغنی، ج ۲/ ص ٦۸۴/ ٦۸۵۔

اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی جانب سرعت سے آگے بڑھو۔

چونکہ سرعت عمل تمام نیک کاموں میں محمود ہے تو یہ زکوٰۃ اور دیگر مالی حقوق میں اور بھی زیادہ محمود ہے تاکہ طبیعت پر لالچ کا غلبہ نہ ہو، خواہش نفس مانع نہ بنے اور دیگر عوارض طاری نہ ہو جائیں اور اس طرح فقراء کے حقوق ضائع ہوں۔

اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا ہے کہ خیر کی جانب سبقت کرنا چاہیے کہ آفات پیش آتی رہتی ہیں، موانع رکاوٹ بنتے رہتے ہیں، موت کا وقت معلوم نہیں ہے ٹال مٹول ناپسندیدہ ہے اور خیر کی جانب سبقت ذمے داری کے پورا ہو جانے، ضرورت کے دور کرنے، رضائے الٰہی حاصل کرنے اور گناہ کے دور کرنے میں مفید ہے بلہ

حدیث میں ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ "جس زکوٰۃ میں کوئی اور مال شامل کر دیا گیا وہ زکوٰۃ ضائع ہو گئی"۔

امام شافعیؒ، امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور الحمیدی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ جس مال میں زکوٰۃ فرض ہو چکی ہو لیکن زکوٰۃ نہیں دی گئی تو یہ حرام مال حلال مال کو ہلاک کر دے گا۔ ؎

چونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں جلدی کرنا ایک امر محمود ہے تو کیا زکوٰۃ کے اخراج کا وقت آنے سے پہلے ہی یعنی سال گزرنے سے پہلے اور فصل کٹنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

قبل از وقت زکوٰۃ نکالنا

زکوٰۃ کے اموال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں سال شرط ہے جیسے مویشی، نقد رقم اور سامان تجارت۔ دوسری قسم میں سال گزرنے کی شرط نہیں ہے جیسے فصلیں اور پھل۔

پہلی قسم کے بارے میں اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جب وجوب زکوٰۃ کا سبب۔

لہ نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۴۳ ط عثمانیہ۔

؎ ایضاً۔

یعنی مکمل نصاب موجود ہو تو سال گزرنے سے پہلے ہی زکوٰۃ دے دینا جائز ہے بلکہ دو سال یا اس سے زیادہ پہلے بھی زکوٰۃ دے دینا جائز ہے لیکن نصاب کی ملکیت سے پہلے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

حسن، سعید بن جبیر، زہری، اوزاعی، ابوحنیفہ، شافعی، احمد، اسحٰق، اور ابوعبیدہ کی یہی رائے ہے [1]

جبکہ ربیعہ، مالک اور داؤد کے نزدیک سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے، خواہ ملکیت نصاب سے پہلے زکوٰۃ دے یا ملکیت نصاب کے بعد [2]

بعض مالکی فقہاء کے نزدیک زر نقد کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں قدرے تقدم جائز ہے، اور تاجر مدیر کا سامان تجارت اور بیع سے حاصل ہونے والے وہ قرضے جن کی وصولیابی کی امید ہو اور وہ مویشی جن کا ساعی (وصول کنندہ) نہ ہو، تو ان کی تقدیم جائز ہے اگرچہ مکروہ ہے۔ مگر فصل اور پھل، تاجر محتکر (ذخیرہ اندوز) کے سامان تجارت اور تاجر مدیر کے قرض کی زکوٰۃ کی تقدیم جائز نہیں ہے، اسی طرح ان مویشی کی زکوٰۃ کی تقدیم جائز نہیں ہے جن کا زکوٰۃ وصول کنندہ (ساعی) اختتام سال پر آتا ہو، لیکن اگر سال گزرنے سے کچھ پہلے زکوٰۃ مویشی کے ساعی کو دے دی تو جائز ہے

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۳۰۔

[2] المغنی، بحوالہ مذکور۔ ابن رشد بدایۃ المجتہد میں (ج ۱، ص ۲۶۶) کہتے ہیں کہ وجہ اختلاف یہ ہے کہ کیا یہ عبادت ہے یا مساکین کا حق واجب ہے، جن فقہاء کے نزدیک عبادت ہے اور نماز کے مشابہ ہے ان کے نزدیک وقت سے پہلے اخراج جائز نہیں ہے اور جن کے نزدیک زکوٰۃ ایسے حقوق سے مشابہ ہے جو ایک وقت آنے پر لازم ہوتے ہیں ان کے نزدیک بسبیل تطوع قبل از وقت اخراج بھی جائز ہے، چنانچہ امام شافعی نے حضرت علی کی اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ نبی کریم نے حضرت عباس کی زکوٰۃ وجوب کے وقت سے پہلے لے لی تھی۔

فقہاء کا اس معمولی زمانے کی تحدید میں اختلاف ہے (جس میں تقدیم زکوٰۃ کا پیشگی ادا کرنا) جائز ہے یعنی یہ مدت ایک دو یوم ہے یا ایک دو ماہ ہے، قابل اعتماد رائے یہ ہے کہ یہ مدت ایک ماہ ہے اور اس سے زیادہ مدت پہلے زکوٰۃ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

اس صورت میں زکوٰۃ کا پیشگی ادا کرنا بلکہ کراہت جائز ہے جبکہ زکوٰۃ کو اس کے وجوب کے مقام سے کسی زیادہ حاجت مند کو منتقل کیا جانا مطلوب ہو تاکہ سال کے اختتام پر یہ زکوٰۃ مستحق کو پہنچ جاتے بلکہ بعض مالکی فقہاء کی وضاحت کے مطابق اس صورت میں زکوٰۃ کی تقدیم واجب ہے حتیٰ کہ اگر اس تقدیم کی صورت میں زکوٰۃ تلف یا ضائع ہو جائے تو بھی زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور وہ ضامن نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں یہی وقت، وجوب کا وقت متصور ہوگا اور وہ باقی ماندہ مال پر زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا جیسا کہ اسے دیگر صورتوں میں باقی مال پر، اگر بقدر نصاب ہو، زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔[1]

قبل از وقت ادائے زکوٰۃ کے جواز کے قائل فقہاء کی دلیل

جو فقہاء اس امر کے قائل ہیں کہ زکوٰۃ کے وجوب کا وقت آنے سے پہلے اس کا ادا کرنا جائز نہیں ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح وجوب زکوٰۃ کے لیے مال کا بقدر نصاب ہونا شرط ہے اسی طرح سال کا گزرنا بھی شرط ہے اور جس طرح نصاب کا مالک ہونے سے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی جائز نہیں ہے اسی طرح سال کے گزرنے سے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی جائز نہیں ہے۔ اور نیز اس لیے کہ شریعت نے نماز کی طرح زکوٰۃ کا بھی ایک وقت مقرر کر دیا ہے اس لیے زکوٰۃ کا وقت سے مقدم کرنا جائز نہیں ہوگا۔[2]

قبل از وقت ادائے زکوٰۃ کے جواز کے قائل فقہاء کی دلیل

قبل از وقت ادائے زکوٰۃ

---

[1] الشرح الکبیر وحاشیۃ الدسوقی، ج ۱/ص ۵۰۲۔

[2] بحوالہ مذکور۔

کے فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ ابوداؤد وغیرہ نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی زکوٰۃ پہلے دے دینے کے بارے میں استفسار کیا تو آپؐ نے ان کو اجازت دی[1]

اگرچہ اس حدیث کی سند میں کلام ہے مگر بیہقی نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریمؐ نے حضرت عمرؓ کو زکوٰۃ لینے بھیجا تو ابن جمیلؓ، خالد بن الولید اور حضرت عباسؓ نے زکوٰۃ نہیں دی، تو آپؐ نے فرمایا کہ ہم عباسؓ سے پہلے ہی دو سال کی زکوٰۃ لے چکے ہیں[2]

یہ واقعہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے جس میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "عباسؓ کی زکوٰۃ میرے ذمے ہے اور اسی کے بقدر اور بھی، بعدازاں آپؐ نے فرمایا عمرؓ تمہیں نہیں معلوم کہ چچا باپ ہی کے درجے میں ہوتا ہے[3]

ابوعبید اس روایت کی تشریح میں کہ "عباسؓ کی زکوٰۃ میرے ذمے ہے اور اسی کے بقدر اور بھی" کہتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے حضرت عباسؓ سے اس سال

---

[1] ماسوا نسائی کے صحاح کے پانچوں محدثین نے، الحاکم، الدارقطنی اور البیہقی نے روایت کیا ہے، الدارقطنی اور ابوداؤد نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے، اور اس کی تائید میں دیگر احادیث بھی موجود ہیں۔

نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۹، ۱۶۰۔ المجموع، ج ۶، ص ۱۴۵، ۱۴۶۔

[2] السنن الکبریٰ، ج ۴، ص ۱۱۱۔ ابوداؤد اور الطیالسی نے ابورافع سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ ہم پچھلے سال پیشگی عباسؓ سے زکوٰۃ لے چکے ہیں۔

نیل الاوطار، بحوالہ مذکور۔

[3] بحوالہ مذکور۔

اور اس سے پہلے سال کی زکوٰۃ لے لی تھی [1]

ان فقہاء نے بلحاظ قیاس و نظریہ استدلال کیا ہے کہ یہ زکوٰۃ اس مال کی ادا کی جارہی ہے جو موجود ہے یعنی سبب وجوب زکوٰۃ موجود ہے اگرچہ زکوٰۃ ابھی واجب نہیں ہوئی ہے، اس لیے یہ اسی طرح جائز ہے جس طرح قرض کی ادائیگی کا جو وقت مقرر ہو، اس سے پہلے قرض ادا کر دینا، جیسے قسم کا کفارہ قسم کھانے کے بعد اور حنث (قسم توڑنے) سے پہلے ادا کر دینا اور جیسے کسی کو زخم لگانے کے بعد اور اس کی رُوح نکلنے سے پہلے قتل کا کفّارہ ادا کر دینا جائز ہے اور جو کہ امام مالکؒ کے نزدیک بھی جائز ہے [2]

رہ گیا یہ کہنا کہ سال گزرنا زکوٰۃ کی دو شرطوں میں سے ایک ہے، اس لیے سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنا جائز نہیں ہے جس طرح کہ نصاب سے پہلے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے، قابل تسلیم نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ کا ملکیت نصاب سے پہلے ہی ادا کر دینا ایسا ہے جیسے حلف سے پہلے ہی کفارۂ یمین دینا، اور زخمی کرنے سے پہلے قتل کا کفارہ دے دینا۔ نیز اس لیے کہ نصاب کی ملکیت سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنے میں زکوٰۃ ہر دو شرائط (نصاب اور حولان حول) پر مقدم ہو جائے گی جبکہ مسئلہ ایک شرط پر تقدیم کا ہے اس لیے ان دونوں صورتوں میں فرق ہے [3]

زکوٰۃ کا وقت مقرر ہونے کے بارے میں امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی حکم میں وقت بطور رفق (نرمی) کے ہو تو انسان کو اختیار ہے کہ اپنا حق ادا کر دے اور وقت

---

[1] الشوکانیؒ کہتے ہیں، اگر مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کی زکوٰۃ اپنے ذمے لے لی تو پھر آپؐ جو زکوٰۃ واجب تھی اسی کو اپنے ذمے لیتے اور اس کے مثل مزید اپنے ذمے نہ لیتے، اور اگر مراد یہ ہے کہ حضرت عباسؓ دینا نہیں چاہتے تھے تو یہ ان کے ساتھ سوءِ ظن ہے۔ نیل الاوطار، بحوالۂ مذکور

[2] المغنی، ج ۲، ص ۶۳۰۔

[3] ایضاً۔

کی سہولت سے فائدہ نہ اُٹھائے، مثلاً کسی شخص کا کسی خاص وقت پر کوئی حق عائد ہو اور وہ اس سے پہلے ادا کر دے، یا مثلاً کوئی شخص غائب ہو اور آدمی اس کی زکوٰۃ ادا کر دے درانحالیکہ اسے یقین بھی نہ ہو کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت وہ مال تلف ہو چکا ہو۔ جبکہ نماز اور روزے محض عبادت ہیں اور ان میں وقت کا تعین غیر معقول المعنی ہے اور مقصود آزمائش اور امتحان ہے، اس لیے ان میں وقت کی پابندی لازم ہے۔[۱]

اگر کسی شخص نے اپنے پاس موجود بقدر نصاب مال کی زکوٰۃ دے دی اور اس کے ساتھ ہی اس کی متوقع آمدنی پیداوار اور منافع کی بھی زکوٰۃ دے دی تو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک قدر نصاب کی زکوٰۃ جائز ہے لیکن اس پر ہونے والے متوقع اضافہ کی زکوٰۃ جائز نہیں ہے اس لیے کہ یہ اضافہ ابھی اس کی ملکیت میں نہیں ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس اضافہ کی زکوٰۃ جائز ہے اس لیے کہ وہ اس کا مالک بننے والا ہے اس لیے اس کا حکم بھی وہی ہو گا جو موجود ملکیت کا ہے۔[۲]

مال کی دوسری قسم وہ ہے جس میں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے، جیسے فصلیں پھل، کانیں اور دفینے، ان اموال میں زکوٰۃ قبل از وقت وجوب ادا کرنا جائز نہیں ہے جبکہ بعض فقہائے شافعیہ کے نزدیک عشر دینا جائز ہے، لیکن راجح رائے یہی ہے کہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ عُشر (۱/۱۰) پھل کے پکنے اور غلّوں کا دانہ پیدا ہو جانے کے بعد واجب ہوتا ہے، اس لیے اس پر تقدیم سبب وجود پر تقدیم ہو گی اس لیے جائز نہیں ہو گی جس طرح کہ نصاب سے قبل ادائے زکوٰۃ درست نہیں ہے۔[۳]

۱۔ معالم السنن، ج ۲، ص ۲۲۴۔

۲۔ المغنی، ج ۲، ص ۶۳۱۔

۳۔ المجموع، ج ۱۰، ص ۱۶۰۔

بعض فقہائے حنابلہ نے عشر کے قبل از وقت دینے کے جواز کی یہ شرط عائد کی ہے کہ فصل کی کونپلیں نکل آئی ہوں اور کھجور کی کلیاں طلوع ہو گئی ہیں۔

کیا تعجیل کی کوئی حد ہے؟

اگر تعجیل (قبل از وقت زکوٰۃ دینا) جائز ہے تو کیا اس کی سالوں کے اندر کوئی حد متعین ہے یا بلا حد جائز ہے فقہائے احناف کے نزدیک بلا تحدید مالک جتنے سالوں کی چاہے پیشگی زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کے پاس تین سو درہم ہوں اور وہ ان کی آنے والے بیس سالوں کی زکوٰۃ سو درہم دے دے تو جائز ہے کیونکہ زکوٰۃ کا سبب موجود ہے یعنی نامی مال بقدر نصاب کا مالک ہونا۔ بخلاف عُشر کے کہ اس کی تعجیل جائز نہیں ہے تا آنکہ پودے پھوٹ آئیں اور پھلوں کی کلیاں نکل آئیں اس لیے بونے اور کاشت کرنے سے پہلے ان کا عُشر دینا جائز نہیں ہے کیونکہ سبب وجوب موجود نہیں ہے اور یہ اس طرح ہے جیسے کوئی مال بقدر نصاب کا مالک ہونے سے پہلے ہی زکوٰۃ دے دے۔[1]

بہر حال قبل از وقت زکوٰۃ دینے کے بجائے اس کے وقت پر زکوٰۃ دینا افضل ہے تاکہ فقہی اختلاف سے بچا جا سکے اور ہر سال کی زکوٰۃ کی آمدنی کا حساب ہو سکے۔ الّا یہ کہ کوئی ضرورت پیش آجائے مثلاً فرض جہاد در پیش ہو یا فقراء کی ضروریات زیادہ ہوں اور بیت المال کو زیادہ مال کی ضرورت ہو اس وقت مال کے مالک اپنی پیشگی زکوٰۃ بھی دے سکتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے پیشگی زکوٰۃ لی۔

اس سلسلے میں مناسب یہ ہے کہ مذکورہ نص کے پیش نظر زکوٰۃ کی یہ تقدیم دو سال کے عرصہ میں محدود ہو اس سے زائد نہ ہو۔

کیا زکوٰۃ میں تاخیر جائز ہے

مصلحت اور ضرورت کے نقطہ نظر سے زکوٰۃ کی تعجیل تو جائز ہے لیکن زکوٰۃ کا مؤخر کرنا اس وقت جائز ہے جب ایسی شدید ضرورت اور قابل اعتبار مصلحت موجود ہو، مثلاً کوئی شخص اس لیے

---

[1] حاشیہ ابن عابدین، ج ۲، ص ۲۹/۳۰ - البحر الزخار، ج ۲، ص ۱۸۸۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کو مؤخر کرے کہ زیادہ تنگدست شخص جو اس وقت موجود نہیں ہے آجاتے اور اسے دے دے یا اس لیے زکوٰۃ مؤخر کرے کہ کسی قریبی مستحق رشتہ دار کو دے دے، کیونکہ اس کا حق بھی زیادہ ہے اور اسے دینے میں ثواب بھی زیادہ ہے۔

کسی مالی عذر کی بنا پر بھی ادائے زکوٰۃ میں تاخیر کی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص اپنی زکوٰۃ خرچ کرے اور وہ اس پر ایک قرض کے طور پر لازم رہے اور جوں ہی اسے سہولت ہو وہ اسے ادا کر دے۔

شمس الدین الرملی کہتے ہیں کہ زکوٰۃ دہندہ کسی زیادہ حاجت مند، کسی قریبی رشتہ دار، پڑوسی یا نیک شخص کے انتظار میں زکوٰۃ کو مؤخر کر سکتا ہے اس لیے کہ یہ تاخیر ایک اچھے مقصد کے لیے ہے لیکن اگر اس تاخیر کے عرصے میں مال ضائع ہو گیا تو اس کا ضامن ہوگا اور اگر اپنی کسی ضرورت کی بنا پر ادائے زکوٰۃ میں تاخیر کی تو اس کا جواز سلامتی انجام پر موقوف ہوگا اور اگر تاخیر سے موجود حاجتمندوں کو تکلیف پہنچتی ہو تو مطلقاً تاخیر حرام ہے اس لیے اس کی تکلیف کو دور کرنا فرض ہے اور محض فضیلت کے حصول کے لیے تاخیر جائز نہیں ہوگی۔[1]

ابن قدامہ نے تاخیر کے جواز کی یہ شرط عائد کی ہے کہ زکوٰۃ معمولی ہو لیکن اگر زیادہ ہو تو جائز نہیں ہے اور احمدؒ سے یہ قول مروی ہے کہ زکوٰۃ کو مؤخر کر کے ماہ بہ ماہ اپنے رشتہ داروں کو کچھ دیتے رہنا جائز نہیں ہے لیکن اگر پیشگی زکوٰۃ ادا کرے اور پھر رشتہ داروں کو یا غیروں کو ہر ماہ دیتا رہے تو جائز ہے کیونکہ اس طرح زکوٰۃ کے وقت میں تاخیر نہیں ہوئی ہے۔ اسی طرح اگر اس کے پاس دو مال ہوں یا زیادہ مال ہوں اور ان کی زکوٰۃ ایک ہو جیسے اس کے پاس نصاب زکوٰۃ موجود ہو پھر دوران سال اس مال کی جنس سے نصاب سے کم مال آجائے تو تمام زکوٰۃ کو جمع کرنے کے لیے پہلے سے موجود نصاب کی زکوٰۃ میں تاخیر جائز نہیں ہے کیونکہ جمع کی تو صورت یہ بھی ہے کہ جو مال بعد میں آیا ہے اس کی زکوٰۃ پہلے

---

[1] نہایۃ المحتاج، ج ۲، ص ۱۳۴۔

دے دے۔[1]

بعض فقہائے مالکیہ نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ زکوٰۃ کی تقسیم فوری طور پر لازم ہے اور اس کا مالک کے پاس اس طرح رہنا کہ دوران سال جو اس کے پاس مستحق آتا رہے اُسے دیتا رہے جائز نہیں ہے۔[2]

البتہ امام (سربراہ) یا اس کے قائمقام ملازمین مصلحت کے پیش نظر زکوٰۃ وصول کرنے میں تاخیر کر سکتے ہیں، مثلاً قحط کا زمانہ ہوا اور پیداوار میں کمی واقع ہوگئی ہو اور امام احمدؒ نے اس کے جواز پر حضرت عمرؓ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک سال لوگوں کو اپنے مال کی ضرورت تھی تو حضرت عمرؓ نے ان سے زکوٰۃ نہیں لی اور آئندہ سال زکوٰۃ لی۔[3]

ابوعبید نے ابن ابی ذباب سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے سال زکوٰۃ کی وصولی کو مؤخر فرما دیا تھا جب بارش ہو گی تو آپؓ نے مجھے بھیجا کہ دو سال کی زکوٰۃ وصول کرنا، ایک سال کی انہی میں تقسیم کر دینا اور ایک سال کی میرے پاس لے آنا۔[4]

یہ حضرت عمرؓ کی سیاست حکمت اور لوگوں پر نرمی اور مہربانی کی ایک عمدہ مثال ہے کہ آپ نے قحط سالی کے دوران زکوٰۃ کو مؤخر فرما دیا اور اس سال آپ نے چوری پر قطع یدؔ کی سزا بھی جاری نہیں فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ قحط کے سال قطع یدؔ کی سزا جاری نہیں ہوگی۔[5]

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۸۵۔

[2] حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۰۔

[3] مطالب اولی النہی: ج ۲، ص ۱۱۶۔

[4] الاموال، ۳۷۴۔

[5] ایضاً، ۵۵۹

حضرت ابو ہریرہؓ کی تعجیل زکوٰۃ کے بارے میں جو حدیث گزری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں فرمایا کہ یہ زکوٰۃ میرے ذمے ہے اور اس کی مثل بھی میرے ذمے ہے۔ اس کے بارے میں ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وجہ سے حضرت عباسؓ کی دو سال کی زکوٰۃ مؤخر فرما دی تھی، جو کہ امام اگر مناسب سمجھے تو کر سکتا ہے [1]

بلا ضرورت زکوٰۃ کی تاخیر

بغیر عذر اور بلا ضرورت زکوٰۃ میں تاخیر جائز نہیں ہے اور اس تاخیر پر زکوٰۃ دہندہ گنہگار ہوگا۔

فقہائے شافعیہ میں سے صاحب المہذب کہتے ہیں کہ

"زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد اس میں تاخیر جائز نہیں ہے کیونکہ یہ حق ہے جس کا مطالبہ کیا گیا ہے اس لیے اس میں تاخیر جائز نہیں ہے جیسے امانت رکھنے والا اپنی امانت کا مطالبہ کرے، اگر امین امانت واپس کرنے پر قادر ہو پھر نہ کرے تو ضامن ہوگا کیونکہ جو اس پر واجب تھا اس میں اس نے تاخیر کر دی جبکہ اسے ادائیگی پر قدرت تھی" [2]

الکرخی نے کہا ہے کہ بلا ضرورت زکوٰۃ میں تاخیر کرنے والے کی شہادت رد کر دی جائے گی اور وہ گنہگار ہوگا، امام الطحاوی نے امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بلا ضرورت تاخیر مکروہ (تحریمی) ہے۔ غرض امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے زکوٰۃ کی فوری ادائیگی کا قول مروی ہے۔

فقہائے احناف کہتے ہیں کہ بلا ضرورت زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر کرنے والا ایک دو یوم کی تاخیر پر بھی گنہگار ہوگا یہ بھی کہا گیا ہے کہ تاخیر سے مراد اگلے سال تک مؤخر کرنا ہے کیونکہ البدائع نے المنتقی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر زکوٰۃ ادا نہیں کی اور دو سال

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۹۔

[2] المجموع، ج ۵، ص ۳۳۱۔

گزر گئے، تو یہ شخص برائی کا مرتکب اور گنہگار ہے۔[1]

میری رائے یہ ہے کہ ایک دو دن یا چند دن کی تاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ ماہ دو ماہ اور سال سے کم کی مدت تاخیر ناروا شمار ہوگی تاکہ لوگ ادائے زکوٰۃ میں سستی نہ کریں۔

زکوٰۃ کا ضیاع

اگر ایسی صورت پیش آئی کہ زکوٰۃ دہندہ نے اپنے مال کی زکوٰۃ علیحدہ کرکے رکھ دی اور اس کے بعد وہ کسی طرح ضائع ہوگئی یا چوری ہوگئی تو اس بارے میں فقہاء نے متعدد نظائر پیش کی ہیں، جن کی ابن رشدؒ نے عمدہ تلخیص کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ

"اگر زکوٰۃ دہندہ کے زکوٰۃ علیحدہ کردینے کے بعد زکوٰۃ ضائع ہوگئی تو بعض فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ درست ہوگئی، اور بعض فقہاء کے نزدیک جب تک زکوٰۃ اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے وہ اس کا ضامن ہوگا، جبکہ کچھ فقہاء نے یہ فرق کیا ہے کہ اگر وجوب کے فوراً بعد زکوٰۃ علیحدہ کرلی اور اس سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تو ضامن نہیں ہوگا، اور اگر وجوب کے کچھ وقت بعد علیحدہ کی تو ضامن ہوگا اور یہ امام مالکؒ کا مشہور مسلک ہے۔ اور کچھ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر اس کی کوتاہی ہوگی تو ضامن ہوگا ورنہ باقی مال کی زکوٰۃ دے گا، یہی ابوثورؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے۔ اور کچھ اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اس مال کے جلنے کے بعد جو مال بچے گا اس میں مالک اور مستحقین زکوٰۃ دو شریکوں کی طرح ہیں اور اسے اس بقیہ مال کی نسبت سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی"

اس طرح یہ پانچ اقوال ہوگئے۔

۱) مطلقاً ضامن نہیں ہوگا۔

۲) مطلقاً ضامن ہوگا۔

۳) اگر کوتاہی کی ہے تو ضامن ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

---

[1] الدر المختار وحاشیۃ، ج ۲، ص ۱۴۔

۴) اگر کوتاہی کی ہے تو ضامن ہوگا ورنہ بقیہ مال کی زکوٰۃ دے گا۔
۵) باقی مال میں دونوں شریک ہوں گے۔[1]

وجوب زکوٰۃ کے بعد اور علیحدہ کرنے سے قبل زکوٰۃ کا ضیاع

ابن رشد نے ایک اور مسئلہ یہ ذکر کیا ہے کہ اگر مال پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بعد مگر زکوٰۃ کے علیحدہ کرنے سے پہلے کچھ مال ضائع ہو گیا، تو اس صورت میں بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ بقیہ مال کی زکوٰۃ دے گا جبکہ دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مساکین اور مالک دو شریکوں کی طرح ہوں گے جن کا کچھ مال ضائع ہوا ہے۔

ان دونوں مسئلوں میں اختلاف کی وجہ

ابن رشد کہتے ہیں کہ ان کے اس اختلاف کی وجہ زکوٰۃ کو یا تو حق ذمہ قرار دینا ہے نہ کہ ایسا حق جو مال سے متعلق ہو یا اسے ان حقوق کے مشابہ قرار دینا ہے جو عین مال سے متعلق ہوتے ہیں نہ کہ مال کے مالک کے ذمے جیسے امین کے ذمے ہوتے ہیں۔

جن فقہاء نے زکوٰۃ دہندہ کو امین کے مشابہ قرار دیا ہے ان کے نزدیک اگر مالک نے زکوٰۃ علیحدہ کر دی اور وہ ضائع ہو گئی تو اس کے ذمے کچھ واجب نہیں رہا اور جن کے نزدیک وہ غرباء (مقروض) کے مشابہ ہے ان کے نزدیک وہ اس ضائع شدہ زکوٰۃ کا ضامن ہے۔

جن فقہاء نے کوتاہی اور عدم کوتاہی کا فرق کیا ہے انھوں نے زکوٰۃ دہندہ کو بہر طور امین کے مشابہ تصور کیا ہے کیونکہ امین سے امانت میں کوتاہی ہو جائے تو وہ بھی ضامن ہوتا ہے۔

اور جن فقہاء نے یہ کہا کہ اگر کوتاہی ہوتی تو باقی مال کی زکوٰۃ دے گا تو انھوں نے اس کو اس شخص کے مشابہ متصوّر کیا ہے جس کا وجوب زکوٰۃ سے پہلے ہی کچھ مال ضائع ہو گیا

---

[1] بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۴۰۔ ط۔ الاستقامہ۔

ہو تو جس طرح وہ موجود مال پر زکوٰۃ دے گا اسی طرح یہ بھی موجود مال کی زکوٰۃ دے گا۔
غرض اس اختلاف کی وجہ مالک کی مشابہت میں تردد ہے کہ وہ امین کے مشابہ ہے، غریم (مقروض) کے مشابہ ہے یا اس شخص کے مشابہ ہے جس کا وجوب سے پہلے کچھ مال ہلاک ہو چکا ہو۔
لیکن اگر زکوٰۃ واجب ہو چکی ہو اور اس کا علیحدہ کرنا ممکن ہو، اور اس کے علیحدہ کرنے سے پہلے کچھ مال ضائع ہو جائے تو اس صورت میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ وہ ضامن ہوگا، ماسوا مویشی کے کہ اس میں امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ مویشی میں زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ وصول کنندہ پہنچ جاتے۔ [1]

کیا زکوٰۃ تقادم سے ساقط ہو جاتی ہے؟

اگر کسی شخص نے زکوٰۃ کو عذر کی بنا پر یا بغیر کسی عذر کے اتنا موخر کیا کہ ایک سال یا چند سال گزر گئے تو کیا اس مدت کے گزرنے سے زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک حق ہے جو اللہ نے فقراء اور مساکین کے لیے واجب (فرض) کیا ہے اور اس فرضیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ساقط نہ ہونا چاہیے خواہ کتنا ہی وقت ادائے زکوٰۃ میں تاخیر کو گزر جائے۔
چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ
"اگر کئی سال گزر جائیں اور جس پر زکوٰۃ واجب ہے وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس پر زکوٰۃ لازم ہے سب ادا کرنی ہوگی خواہ اسے فرضیت زکوٰۃ کا علم ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ دارالاسلام میں ہو یا دارالحرب میں، یہی ہمارا مسلک ہے۔"
ابن المنذرؒ فرماتے ہیں کہ

---

[1] بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۴۰، ۲۴۱۔ ط الاستقامہ۔ المحلی، ج ۶، ص ۲۶۳، الدر المختار بحاشیۃ ابن عابدین، ج ۲، ص ۷۹، ۸۰۔

"اگر اہل بغاوت کسی مقام پر غلبہ حاصل کرلیں اور اس طرح اس جگہ کے لوگ سالوں تک زکوٰۃ نہ دے سکیں، بعدازاں امام کو ان پر غلبہ حاصل ہوجائے تو امام ماضی کی جملہ زکوٰۃ وصول کرے گا۔ اور یہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ابو ثورؒ کی رائے ہے جبکہ اصحاب رائے کہتے ہیں کہ اس پر کوئی زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی نیز وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی جماعت دارالحرب میں اسلام لے آتے اور کئی سال وہاں رہ کر دارالاسلام آئے تو ان سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ ان کے ذمے نہیں ہے"[1]

ابو محمد بن حزمؒ فرماتے ہیں کہ[2]

"جس کے مال میں دو زکوٰۃ یا زیادہ جمع ہو جائیں اور وہ زندہ ہو تو وہ ہر سال اپنے اوپر واجب زکوٰۃ کے حساب سے ادا کرے گا، خواہ اس تاخیر کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ وہ خود اپنا مال لے کر کہیں چلا گیا ہو یا اس کے پاس ساعیؒ (زکوٰۃ وصول کنندہ) نہ پہنچا ہو یا اسے فرضیت زکوٰۃ کا علم نہ ہو اور خواہ اس زکوٰۃ کا تعلق عَین (نقود) سے ہو، یا فصل اور مویشی سے اور خواہ اس نے اپنے باقی تمام مال کی زکوٰۃ دی ہو یا نہ دی ہو اور خواہ اس نے اس اس مال کو جس پر زکوٰۃ ادا کی ہے اس مال میں شامل کر دیا ہو جس پر زکوٰۃ نہیں دی یا نہ کیا ہو، حتیٰ کہ جن لوگوں کا اس کے ذمے قرض یا تاوان وغیرہ ہوگا (غرماء) وہ بھی اس وقت تک کچھ وصول نہ کرسکیں جب تک کہ

---

[1] المجموع، ج ۵، ص ۳۳۷۔

[2] المحلی، ج ۶، ص ۸۷۔

زکوٰۃ نہ پوری ہو جاتے[1]

غرض قانونی طور پر لگائے گئے ٹیکس مدت کے گزرنے اور کئی سالوں کے گزر جانے کے، قانون کی تحدید کے مطابق ساقط ہو جاتے ہیں لیکن زکوٰۃ کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی بلکہ خواہ کتنے ہی سال گزر جائیں زکوٰۃ ایک مسلمان کے ذمے عائد رہے گی اور وہ اسے سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی ادا کرنی ہو گی اور اس کے بغیر اس کا ایمان اور اسلام صحیح نہیں ہو گا۔

سقوطِ زکوٰۃ بالموت

جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مال کے مالک کے مر جانے سے اس مال پر واجب زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی بلکہ اس کے ترکہ میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، اگرچہ اس نے وصیت بھی نہ کی ہو، یہ قول عطاء، حسن،

---

[1] یہ قول صحیح ہے اور اس کا مبنا یہ ہے کہ زکوٰۃ ذمے پر واجب ہوتی ہے، عین مال پر واجب نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر ذمے پر واجب ہو گی اور اس پر بغیر زکوٰۃ ادا کیے دو سال گزر جائیں گے تو اس کو پچھلی زکوٰۃ ادا کرنی ہو گی اور دوسرے سال کی زکوٰۃ میں کوئی کمی نہیں ہو گی اسی طرح اگر زکوٰۃ نصاب پر بھی بڑھ جائے تب بھی کمی نہیں کی جائے گی، خواہ کتنے ہی سال گزر جائیں۔ مثلاً اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہوں اور ان پر کئی سال تک زکوٰۃ ادا نہ کی جائے، تو اس پر تین بکریاں واجب ہو جائیں گی اور اگر کسی کے پاس سو دینار ہوں تو اس پر ساڑھے سات دینار زکوٰۃ لازم ہو جائے گی، اس لیے کہ زکوٰۃ اس کے ذمے واجب ہو چکی ہے، اور اب نصاب کی کمی اس پر اثر انداز نہیں ہو گی، لیکن اگر اس کے پاس ادائے زکوٰۃ کے لیے کوئی اور مال نہ ہو جس سے زکوٰۃ ادا کرے تو اس مقدار کی زکوٰۃ ساقط ہو گی کیونکہ قرض وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے۔

(المغنی، ج ۲، ص ۶۷۹، ۶۸۰)

زہری، قتادہؒ، مالکؒ[1]، شافعیؒ[2]، احمدؒ، اسحٰقؒ[3]، ابوثورؒ اور ابن المنذرؒ کی ہے اور یہی زیدیہ[4] کا مسلک ہے۔

امام اوزاعیؒ اور لیثؒ کہتے کہ وصیتوں کے اجراء سے پہلے تہائی میں سے زکوٰۃ لی جائے اور تہائی پر متجاوز ہونے والی زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

ابن سیرین شعبی نخعیؒ، حماد بن سلیمان اور ثوریؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ جب تک وصیت نہ کی ہو زکوٰۃ نہیں لی جائے گی، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ زکوٰۃ مکلف کی موت کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے۔ الا یہ کہ وہ وصیت کر جائے جو کہ تہائی میں جاری ہوگی اور اس میں اصحاب وصایا تزاحم کریں گے (یعنی اور وصیتیں بھی اسی تہائی میں سے جاری ہوں گی) اور اگر اس نے وصیت نہ کی تو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ اور ورثاء پر زکوٰۃ کی ادائیگی عائد نہ ہوگی اور اگر انھوں نے ادا کی بھی تو نفلی صدقہ ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ عبادت

---

[1] مسلک مالکؒ کی کتب میں ہے کہ زکوٰۃ کبھی رأس المال سے نکلتی ہے اور کبھی ثلث سے یعنی ترکہ میت سے، تو اگر اس نے وصیت کی ہے تب تو ترکہ کے ثلث سے ادا ہوگی اور اگر اس نے وجوب زکوٰۃ کا اقرار کر لیا تھا اور اس کی ادائیگی کی تاکید کردی تھی تو اصل رأس المال سے ادا ہوگی۔ حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۲۔ شرح الرسالہ، لزورق (ج ۲، ص ۱۷۲) میں ہے کہ اگر عام زکوٰۃ ہوا اور اس کی ادائیگی سے پہلے مر جائے تو تعین کی بنا پر یہ زکوٰۃ رأس المال سے ادا ہوگی۔

(بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۴۱۔)

[2] امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ واجب ہو جانے اور اس کی ادائیگی پر قدرت ہو جانے کے بعد موت سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی بلکہ ہمارے نزدیک اس کے مال سے زکوٰۃ کا اخراج لازمی ہوگا۔ المجموع، ج ۵، ص ۳۳۵۔)

[3] المغنی، ج ۲، ص ۶۸۳، ۶۸۴۔

[4] الازھار، شرحہ، ج ۱، ص ۴۶۳، البحر، ج ۲، ص ۱۴۴۔

ہے جس میں نیت شرط ہے اس لیے نماز اور روزے کی طرح زکوٰۃ بھی موت سے ساقط ہو جائے گی۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہائے احناف کے نزدیک یہ تارک زکوٰۃ گنہگار مرا ہے اور موت کے بعد اس سے اس فرض کے ساقط کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے جیسے نماز اور روزے کے تارک کی صورت ہے، اسی لیے بعض احناف نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے اور اس نے زکوٰۃ نہ دی ہو تو ورثاء سے چھپا کر دے۔[2]

بہرحال پہلا قول زیادہ صحیح ہے کہ بقول ابن قدامہؒ زکوٰۃ حق واجب ہے اور اس کی وصیت بھی درست ہے اور یہ موت سے ساقط نہیں ہوتی جیسے شخصی قرض ساقط نہیں ہوتا، نیز یہ کہ زکوٰۃ ایک لازمی مالی حق ہے جو نماز اور روزے سے مختلف ہے کہ یہ دونوں جسمانی عبادتیں ہیں، جن میں نہ نیابت درست ہے اور نہ وصیت صحیح ہے۔[3]

اگرچہ ایک صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ

"اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے ذمے روزے ہوں تو اس کا ولی روزے رکھے"

حالانکہ روزے جسمانی عبادت ہیں اور اس حدیث کی رُو سے ان میں بھی نیابت کی اجازت دی گئی ہے تو زکوٰۃ میں یہ نیابت بدرجۂ اولیٰ ہونی چاہیے کہ زکوٰۃ مالی حق ہے۔

قرضۂ زکوٰۃ کی اہمیت

فقہائے شافعیہ میں صاحب "المہذب"[4] فرماتے ہیں کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہو اور اسے ادائیگی کی قدرت ہو اور وہ

---

[1] امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کے بارے میں ہے، مویشی اور فصلوں کے کے بارے میں ان کی رائے مختلف ہے کہ کیا زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، یا موت کے بعد وصول کی جائے گی۔ المحلی، ج ۶، ص ۸۸، ۸۹۔ المجموع، ج ۵، ص ۳۳۵، ۳۳۶۔

[2] ردالمحتار، ج ۲، ص ۱۴۔

[3] المغنی، ابن قدامہ، ج ۲، ص ۶۸۳، ۶۸۴۔ المجموع، ج ۵، ص ۳۳۶۔

[4] المجموع، ج ۶، ص ۲۳۱۔

ادا نہ کرے تو اس کی ادائیگی اس کے ترکہ سے لازمی ہوگی، کیونکہ یہ مالی حق ہے جو زندگی میں اس پر لازم ہوا ہے اس لیے یہ اس کے ذمے سے ساقط نہیں ہوتا۔ لیکن اگر زکوٰۃ اور قرض دونوں لازم ہوں اور مال میں اتنی گنجائش نہ ہو۔ تو تین اقوال ہیں۔

۱) قرض کو مقدم کیا جائے گا کیونکہ حقوق العباد کی تکمیل کی زیادہ تاکید کی گئی ہے جب کہ حقوق اللہ کی تعمیل میں تخفیف روا رکھی گئی ہے۔

۲) زکوٰۃ پہلے ادا کی جائے گی، اس لیے کہ حج کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ "اللہ کا قرض ضرور ادا کیا جانا چاہیے"[1]

۳) ان دونوں کی برابر ادائیگی کی جائے گی کہ دونوں بلحاظ وجوب مساوی ہیں تو بلحاظ ادائیگی بھی مساوی ہوں گے۔

ادائے زکوٰۃ کو قرضوں پر مقدم کرنے کا قول فقہائے ظاہر کا ہے جس کی تائید محمد ابن حزم رح نے بھی کی ہے اور کتاب و سنت سے دلائل دیئے ہیں اور کہا ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس پر سال دو سال کی زکوٰۃ واجب ہو تو وہ اس کے راس المال میں سے ادا ہوگی، خواہ اس نے اس کا اقرار کیا ہو، یا ثبوت موجود ہو، اور خواہ اس کی وارث اس کی اپنی اولاد ہو، یا وہ کلالہ ہو، اور اس مال میں غرباء کا اور وصیت کا اور ورثاء کا کوئی حق نہیں ہوگا، اور تمام مال مویشی، پیداوار اور زر نقد سب اس سلسلے میں برابر ہوں گے۔

ابن حزم رح نے حنفیہ کے اس قول کی سخت تردید کی ہے کہ موت سے زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ فقہائے احناف نے اپنے اس قول میں شدید غلطی کی ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ حق اللہ ہے جو کہ زندگی ہی میں عائد ہوا ہے۔ اور احناف کے پاس اس قول کی کوئی دلیل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر زکوٰۃ موت سے ساقط نہ ہوگی تو جو شخص چاہے گا زکوٰۃ نہ دے کر ورثاء کو وراثت سے محروم کر دے گا۔

---

[1] صحیح بخاری، صحیح مسلم، بروایت حضرت ابن عباس رض۔

حالانکہ یہ دلیل غلط ہے کیونکہ اگر ایک شخص قرض لیتا رہے اور مرنے کے بعد اس کے ترکے سے قرض ادا ہو جائیں اور ورثاء کو کچھ نہ ملے تو بھی اس نے وارثوں کو محروم کر دیا، یا وہ غیر مسلموں کی شراب لے کر بہاتا رہے اور اس کے ذمے اتنے قرض ہو جائیں کہ ورثاء وارث ہوں یا نہ ہوں، یعنی احناف نے خود اپنی دلیل کو توڑ دیا اور اس حق اللہ کو ساقط کر دیا جو اللہ نے فقراء اور مساکین وغیرہ کا متعین فرمایا تھا اور اس کی جگہ انسانوں کا قرض لازم کر دیا اور اس طرح ورثاء کو مال حرام کھانے پر مجبور کر دیا۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ حنفیوں کے نزدیک نماز تو وقت نکلنے کے بعد بھی لازم رہتی ہے لیکن زکوٰۃ کو وہ اس کا وقت موجود ہونے کے بعد بھی ساقط کر دیتے ہیں۔

ہمارے قول کی صحت اور حنفیوں کے قول کا ابطال میراث میں اللہ سبحانہٗ کے اس فرمان سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ (النساء : ۱۱)

جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔ کہ اس فرمان میں دَیْن (قرض) عام ہے اور زکوٰۃ بھی مساکین اور فقراء کا قرض ہے۔

سعید بن جبیر مجاہد اور عطاء نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ "ایک شخص نبیؐ کے پاس آیا اور عرض کی کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور ان پر ایک ماہ کے روزے تھے تو کیا میں ان کی طرف سے قضا کروں، آپؐ نے فرمایا، ہاں، اللہ کا قرض ضرور ادا کیا جانا چاہیے۔" (مسلم)

ایک اور روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ کا قرض ادا کرو کہ اس کا قرض پورا کیا جانا چاہیے۔"

عطاء، سعید بن جبیر اور مجاہد حضرت ابن عباسؓ سے یہ حدیث نقل کر رہے ہیں اور یہ احناف اپنی رائے سے حق اللہ کو ساقط کر کے لوگوں کے حق کو لازم قرار دے رہے ہیں [1]

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۸۹، ۹۱۔

ابن حزمؒ کے اس سخت و تند طرز بیان سے چشم پوشی کرتے ہوئے[1] ہم کہتے ہیں کہ جو دلائل انھیں دیئے ہیں ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ بلاشبہ اصلی اور ثابت شدہ حق ہے جو موت سے یا تقادم سے ساقط نہیں ہوتا اور یہ کہ ترکہ میں سے سب سے پہلے زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اسے دیگر قرضوں پر ترجیح دی جائے گی۔

اس لحاظ سے اسلام نے جدید مالیاتی قوانین پر سبقت کی ہے جن کی رو سے حکومت کو یہ اختیار ملتا ہے کہ حکومت مالدار مرنے والے لوگوں کے مال سے اپنے وہ ٹیکس حاصل کر سکے، جو ادائیگی سے رہ گئے ہیں[2]

●

---

[1] بعض لوگ ابن حزمؒ کے لب و لہجہ کی اس تندی کی بنا پر ان سے استفادہ سے گریز کرتے ہیں مگر ہماری رائے یہ ہے کہ ان کے فقہ سے استفادہ کرنا چاہیے اور ان کی سختی اور تشدد سے متاثر نہ ہونا چاہیے۔ کہ ماسوا ذات نبویؐ کے ہر شخص کی بعض باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں اور بعض ترک کی جا سکتی ہیں۔

[2] الدکتور عبدالحکیم الرفاعی، و حسین خلاف: مبادئ النظریۃ العامۃ للضریبۃ، ص ۱۴۳۔

چھٹی فصل

زکوٰۃ سے متعلق چند متفرق مباحث

سقوطِ زکوٰۃ کا حیلہ جس شخص پر زکوٰۃ واجب ہو گیا اس کا زکوٰۃ کے اسقاط کے لیے حیلہ کرنا جائز ہے؟

ابن تیمیہؒ نے القواعد النورانیہ میں ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ کے اسقاط کے لیے حیلہ کرنا جائز ہے اگرچہ ان کے اصحاب میں اختلاف ہے کہ امام محمدؒ کے نزدیک مکروہ ہے اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے۔

جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک حیلۂ اسقاط زکوٰۃ حرام ہے اور حیلہ کرنے کے باوجود زکوٰۃ زکوٰۃ لازم رہے گی اور امام شافعیؒ کے نزدیک حیلۂ اسقاط زکوٰۃ مکروہ ہے۔

امام احمدؒ کا قول امام مالکؒ کی طرح ہے کہ حیلہ کرنا حرام ہے اور حیلہ کے باوجود زکوٰۃ واجب رہے گی، جیساکہ سورۂ ن[1] اور دیگر دلائل سے یہی امر ثابت ہوتا ہے[2]

امام ابن تیمیہؒ نے امام ابویوسفؒ کا جو قول نقل کیا ہے وہ الخراج میں امام ابویوسفؒ کی تصریح کے برخلاف ہے، اس لیے کہ وہاں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

وکسی ایسے شخص کے لیے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو جائز نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ کو روکنے کی تدبیر کرے اور اپنی ملکیت سے نکال کر کئی لوگوں کو دے دے کہ ہر ایک کے پاس نصاب سے کم مال آجائے اور اس

---

[1] اصحاب جنت کا قصہ مراد ہے جس کا آگے ذکر آرہا ہے۔

[2] القواعد النورانیہ، ص ۸۹۔

طرح زکوٰۃ واجب نہ ہو سکے۔ غرض زکوٰۃ سے بچنے کا کوئی حیلہ اور طریقہ بالکل جائز نہیں ہے۔[1]

ابن تیمیہؒ نے جو قول نقل کیا ہے اور جو ابو یوسفؒ کی جانب سے مشہور بھی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض حیلے بلحاظ قضا نافذ ہو جاتے ہیں اگرچہ بلحاظ تدین وہ جائز نہیں ہوتے۔

فقہائے احناف کی کتابوں میں ہے کہ بعض حیلے مکروہ ہیں اور بعض مکروہ نہیں ہیں۔ مکروہ حیلہ مثلاً یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے تنگدست والدین کو زکوٰۃ دینے کے لیے کسی فقیر کو دے دے اور وہ فقیر اس کے والدین کو دے دے۔

اسی طرح حنفی فقہاء جب یہ بیان کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کو تعمیر مسجد پر صرف کرنا، میت کے کفن پر خرچ کرنا اور اس کے قرض کی ادائیگی کرنا درست نہیں ہے تو وہ بتاتے ہیں کہ اس کا حیلہ یہ ہے کہ پہلے زکوٰۃ کسی فقیر کو دے دی جائے پھر وہ فقیر ان جگہوں پر صرف کر دے کہ اس طرح زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور اس فقیر کو نفلی صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ فقیر اگر چاہے تو زکوٰۃ لینے کے بعد اس کے اس طرح صرف کرنے سے انکار کر سکتا ہے کہ تقاضائے صحت تملیک یہی ہے اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ زکوٰۃ دہندہ نے اسے زکوٰۃ دی اور اس پر ایک فاسد شرط عائد کی اور ہبہ اور صدقہ شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتے۔[2]

یہ حیلے مکروہ ہوں یا غیر مکروہ یہ زکوٰۃ دینے سے متعلق ہیں (زکوٰۃ کے اسقاط کے نہیں ہیں) اور جہاں تک مالک نصاب کے زکوٰۃ کے اسقاط کا حیلہ ہے تو مجھے کتب حنفیہ میں کہیں بھی ایسے حیلہ کے جواز کی وضاحت نہیں ملی ہے۔

---

[1] ابو یوسفؒ: الخراج، ص ۸۰۔

[2] الدر المختار وحاشیۃ، ج ۲، ص ۶۹۔

فقہائے مالکیہ کے نزدیک حیلے باطل اور بلحاظ قانون غیر مؤثر ہیں

فقہائے مالکیہ کے نزدیک حیلے نہ تو بلحاظ تدین جائز ہیں اور نہ قانوناً مؤثر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس مویشی کا نصاب ہو اور وہ سال گزرنے کے فوراً بعد یا کچھ پہلے اس نصاب کو تبدیل کر لے کہ اس کے پاس پانچ اُونٹ ہوں وہ انہیں دوسرے چار اونٹوں سے بدل لے یا کسی اور نوع سے بدل لے یعنی اونٹوں کے بدلے بکریاں لے لے یا اس کے برعکس، خواہ بعد والا مال بقدر نصاب ہو یا نہ ہو، یا اس نے ان مویشیوں کو سامان سے یا زر نقد (رقم) سے بدلا ہو، یا اپنے جانور ذبح کر دیئے ہوں (تاکہ نصاب میں کمی آجائے) وغیرہ، اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہے کہ وہ اس امر کا اقرار کر لے یا قرائن احوال اس بات کی نشاندہی کریں۔ تو ان ردوبدل سے اور ان تصرفات سے اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی بلکہ اس کے اس ارادے کے علی الرغم اس سے زکوٰۃ لی جائے گی اور جو مال بعد میں تبدیل کیا ہے اس سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی اگرچہ وہ زیادہ ہو (بلکہ پہلے ہی والے مال سے زکوٰۃ لی جائے گی) کیونکہ اس تبدیل شدہ مال پر تو ابھی سال نہیں گزرا ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی ہے، لیکن اگر وہ سال کے بعد ردوبدل بھی مالک رہا تو اسے زکوٰۃ سے فرار حاصل کرنے والا تصور نہیں کیا جائے گا۔ بہر حال مسلک مالکیؒ کا اصول یہ ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات، حیلے کہیں بھی مؤثر نہیں ہیں۔

فقہائے مالکیہ کہتے ہیں کہ باطل حیلوں میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص سال کے اختتام کے قریب اپنا مال یا اس کا کچھ حصہ اپنے بیٹے کو دے دے تاکہ اس پر نیا سال گزرے اور زکوٰۃ واجب نہ ہو، اور پھر اس دوسرے سال کے اختتام سے پہلے اس سے لے لے اس تصور کے ساتھ کہ اب یہ مال نیا اس کی ملکیت میں آیا ہے یا بیوی کو ہدیہ کر دے اور اُسے کہے کہ یہ ہدیہ مجھے واپس کر دے اور مقصود زکوٰۃ کا اسقاط ہو تو زکوٰۃ اس سے وصول کی جائے گی اور حیلہ غیر مؤثر ہوگا۔[1]

---

[1] بلغۃ السالک وحاشیۃ، ج ۱/ ص ۲۱۰۔

فقہائے حنابلہ کی رائے

ابن قدامہؒ المغنی میں فرماتے ہیں۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نصاب کو کسی دوسری جنس سے بدل لینے سے حول (سال) کا تسلسل منقطع ہو جاتا ہے اور دوسرا سال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اس طرح کرے تو زکوٰۃ ساقط نہیں ہو گی خواہ مویشی ہی بدلے گئے ہوں یا کوئی اور نصاب بدلا گیا ہو، اسی طرح اگر کسی نے نصاب کے ایک حصہ کو تلف کر دیا تاکہ نصاب میں کمی آ جائے اور زکوٰۃ ساقط ہو جائے تو زکوٰۃ ساقط نہیں ہو گی بلکہ اگر رد و بدل یا اتلاف وجوب زکوٰۃ کے قریب ہو گا تو اس سے آخر سال میں زکوٰۃ وصول کی جائے گی لیکن اگر اس نے نصاب میں کوئی رد و بدل شروع سال میں کی تو پھر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی کہ اسے زکوٰۃ سے فرار تصور نہیں کیا جائے گا۔

یہی رائے امام مالکؒ اوزاعیؒ، ابن الماجشونؒ، اسحاقؒ اور ابوعبیدؒ کی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ (نصاب میں رد و بدل سے) زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اس لیے کہ سال پورا ہونے سے پہلے نصاب میں کمی ہو گئی ہے اس لیے زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی، اور یہ ایسی ہی صورت ہے جیسے وہ اپنے مال کو اپنی ضرورت میں صرف کر لے۔

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ وَلَا يَسْتَثْنُونَ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِنْ رَبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ (ن: ۱۷، ۲۰)

(ہم نے (ان اہل مکہ کو) اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا جب انھوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثنا نہیں کر رہے تھے۔ رات کو وہ

سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی۔

اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔)

ان آیات میں اللہ سبحانہٗ نے صدقہ (زکوٰۃ) سے فرار حاصل کرنے والوں کو سرزنش فرمائی ہے .... نیز یہ کہ یہ اس حق کے اسقاط کا ارادہ کرنا ہے جو کہ لازم ہو چکا ہے یعنی فقراء اور مساکین کا حق، اس لیے یہ ساقط نہیں ہوگا، جیسے کوئی شخص مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دے .... اور اس لیے کہ اس نے ایک قصد فاسد کیا ہے اور حکمت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس قصد کو توڑا جائے، جیسے کوئی شخص میراث جلد حاصل کرنے کے لیے اپنے مورث کو قتل کر دے تو شریعت اسے (قاتل) کو میراث سے محروم قرار دے دیتی ہے لیکن جب کہا اگر وہ اپنا مال اپنی ضروریات میں صرف کرے تو یہ قصد فاسد (غلط ارادہ) نہیں ہے اس لیے اس پر سزا بھی نہیں ہے۔

فقہائے زیدیہ کی رائے اس باب میں فقہائے زیدیہ کے یہاں قدرے تفصیل ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اسقاط زکوٰۃ کے لیے حیلہ کرنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک وجوب زکوٰۃ سے پہلے (یعنی سال پورا ہونے سے پہلے جو کہ وجوب زکوٰۃ کی شرط ہے۔)

اور دوسرے وجوب کے بعد۔

وجوب سے پہلے کی مثال یہ ہے کہ کسی کے پاس زر نقد کا نصاب تھا اس نے سال پورا ہونے سے پہلے سقوط زکوٰۃ کے حیلے کے ارادے سے غذائی اشیاء خرید لیں تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور کرنے والا گنہگار ہوگا۔ بعض فقہاء نے اسے مباح بھی کہا ہے۔

وجوب کے بعد کی صورت، یہ ہے کہ وہ اپنا مال فقیر کو دے دے اور اس پر یہ شرط

---

۱ المغنی، مع الشرح الکبیر، ج ۲، ص ۵۳۴، ۵۳۵۔

لگادے کہ وہ اسے واپس کردے گا اور یہ شرط اس معاملہ کے ساتھ منسلک ہو، یعنی وہ اس طرح کہے کہ یہ مَیں اپنی زکوٰۃ میں سے اس شرط پر تجھے دے رہا ہوں کہ تُو اسے مجھے واپس کردے گا، یہ صورت بہرحال جائز نہیں ہے اور اس بارے میں مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اگر واپسی کی شرط پہلے لگالی اور دونوں میں یہ اتفاق ہوگیا اور اس کے بعد بلا شرط زکوٰۃ دے دی تو یہ بھی ناجائز ہے اگرچہ مسلک کے بعض فقہاء نے کراہت تحریمی کے کے ساتھ جائز کہا ہے۔

وجہ مسلک یہ ہے کہ اس سے حق فقراء ساقط ہوتا ہے جو کہ اللہ کا مقرر کردہ اور حکم شریعت ہے اور جس حیلہ کا مقصود شارع کے حکم کی خلاف ورزی ہو وہ حرام ہے اور اس کا اثر باطل ہے۔[1]

ان فقہاء کے نزدیک جس طرح سقوطِ زکوٰۃ کے لیے حیلہ ممنوع ہے اسی طرح اخذ زکوٰۃ کے لیے حیلہ ممنوع ہے اور زکوٰۃ لینے کے لیے حیلہ کرنے کی بھی دو صورتیں ہیں۔

۱) فقیر زکوٰۃ اس حیلے کے تحت لے لے کہ اس شخص کو دے دے گا جس کو زکوٰۃ جائز نہیں ہے یعنی ہاشمی کو، یا بیٹے کو یا باپ کو، تو یہ حیلہ جائز نہیں ہے اور اس زکوٰۃ کا لوٹانا لازم ہے۔

البتہ اس سے ہاشمی فقیر کے لیے لینے کو مستثنیٰ کیا ہے کہ یہ جائز ہے خواہ پہلے ہی اس پر اتفاق ہوگیا ہو۔

۲) کوئی شخص غنی ہو اور وہ اپنا مال کسی اور کی ملکیت میں دے دے اور فقیر بن کر زکوٰۃ لے لے تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔ بعض فقہاء نے اس میں یہ قید لگائی ہے کہ اگر اس نے مال کی کثرت کے لیے یہ حیلہ کیا تو جائز نہیں ہے لیکن اگر اس نے اس وجہ سے ایسا کیا کہ اس کی آمدنی آنے تک اس کا گزارہ ہو سکے تو

---

[1] شرح الازھار و حواشیہ، ج ۱، ص ۵۳۹/۵۴۰۔

جائز ہے۔[1]

غرض اگر حیلہ سے مقصود رضائے الٰہی، مقاصد شرعیہ کی تکمیل اور حرام سے احتراز ہو تو جائز ہے اور اگر مقصود شریعت کی مخالفت ہو تو جائز نہیں ہے، کیونکہ اگر مطلق حیلہ جائز قرار دے دیا جائے تو شریعت کا کوئی حرام باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ وہ حلال ہو جائے گا۔[2]

الازھار کے حواشی میں الشوکانی رح کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ

"ہر ایسا حیلہ جس سے حرام حلال ہو جائے اور حلال حرام ہو جائے اس سے اجتناب لازمی ہے اور اس کو صحیح قرار دینا غلط ہے"۔[3]

زکوٰۃ دہندہ اور وصول کنندہ ادائے زکوٰۃ کے وقت کیا کہیں؟

زکوٰۃ اپنے روحانی پہلو کے لحاظ سے دنیا کے تمام ٹیکسوں سے ممتاز ہے کیوں کہ اسلام میں زکوٰۃ عبادت ہے اور اس کے عبادت ہونے اور ایک روحانی عمل ہونے کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔

جس کا ایک مظہر یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کنندہ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ وصول کرتے وقت زکوٰۃ دہندہ کو اور اس کے گھر والوں کو دعا دے، تاکہ انھیں ادائے زکوٰۃ کی رغبت پیدا ہو اور وصول کنندہ اور دہندہ میں اخوت اسلامی کا رابطہ استوار ہو اور مسلمانوں میں اور غیر مسلموں میں جو ظالمانہ ٹیکس ادا کرتے ہیں اس لحاظ سے بھی امتیاز اور تفریق پیدا ہو جائے اور اس فرمان الٰہی کی تعمیل ہو جائے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ

---

[1] شرح الازھار، ج ۱، ص ۵۰۳/ ۵۰۴۔

[2] حواشی الازھار، ج ۱، ص ۵۰۹۔ البحر، ج ۱، ص ۱۸۷۔

[3] ایضاً۔

تُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ : ۱۰۳)

(اے نبیؐ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمھاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی۔)

یہاں صَلِّ عَلَيْهِمْ کے معنی ہیں کہ آپ ان کے لیے دعا کیجیے اور اس دعا کا اثر اللہ سبحانہٗ نے یہ بیان فرمایا کہ اس سے زکوٰۃ دینے والوں کے نفوس میں سکون اطمینان، امن اور ثبات قدمی پیدا ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی جماعت زکوٰۃ لے کر آتی تو آپؐ انھیں دعا دیتے، میرے والد آپؐ کے پاس زکوٰۃ لے کر گئے تو آپؐ نے فرمایا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی آلِ اَبِی اَوْفٰی[1]

ضروری نہیں ہے کہ دعا یہ کلمات انھی الفاظ پر مشتمل ہوں جو حدیث میں وارد ہیں بلکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ وصول کنندہ یہ دعا بھی دے سکتا ہے کہ اللہ تیری اس زکوٰۃ پر تجھے اجر دے، تیرے لیے اس کو پاکی بنا۔ اور جو تیرے پاس باقی رہ گیا اس میں برکت دے۔[2]

نسائی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے آپؐ کے ایک خوبصورت اونٹنی بھیجی تو آپؐ نے فرمایا

اللّٰهم بارك فيه وفی ابله[3]

---

[1] المنتقی نے کہا ہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۳۔

[2] النووی: الروضۃ، ج ۲، ص ۲۱۱۔

[3] سنن النسائی: کتاب الزکوٰۃ، ج ۵، ص ۳۰۔

(اے اللہ اس میں اور اس کے اونٹ میں برکت دے۔)

کیا یہ دعا واجب ہے یا مستحب ہے؟ آیت کا ظاہری مفہوم وجوب پر دلالت کرتا ہے اور یہی ظاہریہ کا اور بعض شافعیہ کا مسلک ہے، جبکہ جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ اگر دعا واجب ہوتی تو نبی کریمؐ اپنے والیوں اور ساعی کو اس کی تعلیم دیتے جیسے حضرت معاذ رضؓ وغیرہ کو، مگر ایسی کوئی بات منقول نہیں ہے۔[1]

مگر یہ کہنا درست نہیں ہے اس لیے کہ آیت قرآنی موجود ہے جو ظاہر ہے کہ حضرت معاذ رضؓ سے مخفی نہ ہوگی۔

نیز جمہور فقہاء کہتے ہیں کہ امام جو قرض اور کفارہ وغیرہ وصول کرتا ہے اس پر دعا دینا اس پر واجب نہیں ہے اسی طرح زکوٰۃ میں بھی دعا دینا واجب نہیں ہے۔[2] مگر یہ بھی دلیل نہیں ہے کیونکہ زکوٰۃ کے معاملہ میں یہ حکم صراحتاً قرآنی آیت میں موجود ہے، نیز یہ کہ زکوٰۃ دوسرے قرضوں کے بالمقابل ایک مرتبہ اور مقام رکھتی ہے اور ایک ایسا حق ہے جو سال بسال لازم آتا ہے اس لیے اس باب ترغیب کے لیے دعائیہ کلمات ضروری ہیں۔

رہ گیا یہ کہنا کہ دعا کا وجوب آپؐ کی ذات ... سے مخصوص تھا کہ آپؐ کی دعا باعث سکینت تھی جبکہ کسی اور کی دعا میں وہ تاثیر نہیں ہو سکتی۔ تو یہ کہنا اس شبہ کو تقویت پہنچاتا ہے جس کا اظہار عہد صدیقی میں مانعین زکوٰۃ نے کیا تھا اور صحابہ میں کسی نے اس کو درست تسلیم نہیں کیا تھا، مزید یہ کہ ہم آیت کے پہلے حصہ کو عام اور دوسرے حصے کو نبیؐ کے ساتھ خاص کیسے قرار دے سکتے ہیں۔

اس لیے راجح یہی ہے کہ جس طرح قرآن میں حکم وارد ہے اسے وجوب ہی پر محمول کیا جائے کہ یہی زکوٰۃ کے مزاج کے مطابق اور اسلام کے تصور زکوٰۃ کے موافق

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۳۔

[2] ایضاً۔

ہے اور اسی سے زکوٰۃ تمام ٹیکسوں سے ممتاز ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کا محرک رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے اور یہ کہ زکوٰۃ پوری خوش دلی سے دی جائے اور اللہ سے دعا کی جائے کہ اللہ اسے قبول فرمائے اور اسے وجہِ غنیمت بنائے باعث تاوان نہ بنائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

جب تم زکوٰۃ دو تو اس کے ثواب کو فراموش نہ کرو بلکہ یہ کہا کرو

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا مَغْنَمًا وَلَا تَجْعَلْهَا مَغْرَمًا۔[1]

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب زکوٰۃ دہندہ کسی مستحق زکوٰۃ کو یا حکومت کے مقرر کردہ وصول کنندہ کو زکوٰۃ دے تو اس دعا کو نہ بھولے بلکہ یہ دعا کرے تاکہ ثواب پورا ملے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میرے نفس کو پاکیزہ بنا دے کہ میں اس زکوٰۃ کو اپنے دین، دنیا اور اپنی آخرت میں نفع اور غنیمت بنا سکوں اور یہ میرے اوپر ایک تاوان نہ بن جائے جسے میں ناگواری کے ساتھ ادا کر دوں۔

ترمذی نے حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ

"اگر میری اُمّت کے لوگوں میں پندرہ عادات پیدا ہو گئیں تو اس [illegible] مصیبت آجائے گی — اور ان میں سے ایک آپؐ نے یہ بیان فرمائی کہ ۔۔۔ کو غنیمت اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھنے لگے۔"[2]

---

[1] اس حدیث کو ابن ماجہ نے (ج ۱، رقم ۱۷۹۷) روایت کیا ہے، عبدالرزاق نے اپنی جامع میں روایت کیا ہے، السیوطی الجامع الکبیر میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لائے ہیں اور ضعیف کہا ہے المناوی نے الفیض (ج ۱، ص ۲۹۰) میں کہا ہے کہ حدیث بہت ضعیف نہیں ہے جیسا کہ وہم ہوا ہے، الاصل میں کہتے ہیں کہ ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں سوید بن سعید ہے، احمدؒ نے متروک کہا ہے۔ (نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۲، ۱۵۳)

[2] اس کی سند ضعیف ہے۔ نیل الاوطار۔

یعنی جب مسلم زکوٰۃ دہندہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا میری زکوٰۃ کا تاوان نہ بنا تو گویا وہ اپنے آپ کو اور اُمت کو اسباب بلائے سے بچاتا ہے۔

مندرجہ بالا مفہوم اس لحاظ سے ہے جبکہ حدیث میں وارد أَعْطَيْتُمْ کو مبنی علی الفاعل متصور کیا جائے جیسا کہ مشہور ہے لیکن اگر مبنی علی المفعول أُعْطِيتُمْ ہو، جیسا کہ المناوی نے کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ مستحقین سے خطاب ہے کہ جب تمھیں زکوٰۃ دی جائے تو تم زکوٰۃ دہندہ کے احسان کا بدلہ اس طرح دو کہ اس کے حق میں یہ دعا کرو کہ اے اللہ اس کی زکوٰۃ کو اس کے لیے حصولِ ثواب کا ذریعہ بنا اور اسے ذریعۂ تاوان نہ بنا[۱] اور یہی دعا مستحقین زکوٰۃ کا وکیل امام یا اس کا نائب دے اور یہی مفہوم ہوگا اللہ سبحانہٗ کے اس فرمان کا کہ

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (التوبہ : ۱۰۳)

اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔

زکوٰۃ دینے میں توکیل

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر مسلمان اپنی زکوٰۃ خود دے بلکہ وہ کسی بھی قابلِ اعتماد شخص کو اپنی جانب سے وکیل مقرر کرسکتا ہے یعنی جس شخص پر اسے یہ اعتماد ہو کہ وہ اس کی امانت (زکوٰۃ) مستحقین تک پہنچا دے گا۔ بعض فقہاء کے وکیل (برائے زکوٰۃ) کے مسلمان ہونے کی شرط بھی لگائی ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ عبادت ہے اور غیر مسلم اس کا اہل نہیں ہے جبکہ بعض دیگر فقہاء نے کہا ہے کہ اگر مؤکل نیت زکوٰۃ کرلے تو اس کی نیت کافی ہے اور وہ ادائے زکوٰۃ کے لیے ذمی کو وکیل بنا سکتا ہے۔[۲]

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلم کو اس وقت تک وکیل نہ بنائے جب تک ضرورت نہ ہو اور یہ اطمینان نہ ہو کہ وہ مؤکل کی فرضی کو پورا کرے گا۔

---

[۱] فیض الباری، ج ۱، ص ۲۹۰۔ میں ہے کہ اس دعاء کا تعلق چونکہ فضائل سے ہے اس لیے مستحب ہے۔

[۲] الشرح الکبیر وحاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۴۹۸۔

مسلک مالکؒ کے بعض فقہاء نے کہا ہے کہ مالک کا اپنی طرف سے نیابتاً زکوٰۃ ادا کروانا مستحب ہے کیونکہ اس میں ریا نہیں ہوگا اور خود زکوٰۃ دینے میں لوگوں کی ستائش کا جو پہلو ہے وہ نہیں ہوگا۔ اور اگر لوگوں کی ستائش کے مقصود بن جانے کا گمان غالب ہو تو زکوٰۃ کسی اور شخص کے ذریعے (نیابتاً) دلوانا واجب ہے اسی طرح اس صورت میں بھی واجب ہے جبکہ اسے علم نہ ہو کہ زکوٰۃ کا مستحق کون ہے، اس صورت میں زکوٰۃ دہندہ کو چاہیے کہ وہ کسی شخص کو وکیل بنا دے جو اس کی جگہ اہل شخص کو زکوٰۃ دے دے [۱]

ادائے زکوٰۃ کا اظہار

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ میں افضل یہ ہے کہ اس کا اخراج علی الاعلان ہو تاکہ دوسروں کو معلوم ہو جائے اور دیکھنے والوں میں بھی ادائے زکوٰۃ کا جذبہ پیدا ہو اور زکوٰۃ دہندہ کے بارے میں سوء ظن پیدا نہ ہو جیسے فرض نماز کا بھی اظہار ضروری ہے جبکہ نفلی نماز اور روزے کا اخفاء مستحب ہے [۲]

اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ ان شعائر اسلام میں سے ہے جن کا اظہار، ان کی تعظیم اور ان کو لوگوں کے لیے محبوب بنانا دلائل ایمان اور تقویٰ کی علامتوں میں سے ہے، چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ

(الحج : ۳۲)

اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

اور شاید یہ وہی اختیال (خوش ہونا اور بڑائی محسوس کرنا) ہے جس کو اللہ سبحانہٗ زکوٰۃ میں پسند فرماتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ

"اللہ تعالیٰ جنگ اور زکوٰۃ میں اپنے آپ پر خوش ہونے کو پسند فرماتے ہیں" [۳]

---

[۱] ایضاً۔

[۲] المجموع، ج ۶، ص ۲۳۳، فقہ الامام جعفر، ج ۲، ص ۹۶۔ چنانچہ ایک روایت میں ان کا یہ قول مروی ہے کہ "چھپا کر دینے سے اعلان کے ساتھ دینا افضل ہے"

[۳] النسائی، کتاب الزکوٰۃ، ج ۵، ص ۷۹۔

اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں فرمایا۔

وَإِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ (البقرہ : ۲۷۱)

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے۔

کیا محتاج کو زکوٰۃ دیتے وقت یہ بتلا دیا جائے کہ یہ زکوٰۃ ہے

چونکہ آج کل مسلمان حکومتیں زکوٰۃ کی وصولیابی اور اس کی تقسیم کے فرائض انجام نہیں دیتیں اس لیے ایسی صورت میں زکوٰۃ دہندہ کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ مستحق زکوٰۃ یہ نہ بتائے کہ وہ اسے زکوٰۃ دے رہا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے اس سے لینے والے کو اذیت محسوس ہو اور بالخصوص جبکہ وہ ستور حال اور دست سوال دراز کرنے سے بچنے والا ہو، اور اس لیے کہ اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

صاحب المغنی فرماتے ہیں کہ

"جس شخص کو فقیر (حاجتمند) سمجھ کر زکوٰۃ دی تو اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ یہ زکوٰۃ ہے، جس نے فرمایا یہ کہہ کر اسے اذیت دینا چاہتے ہو، نہیں اسے نہ بتلاؤ۔ احمد بن الحسن فرماتے ہیں کہ میں نے احمد سے کہا کہ ایک شخص جب زکوٰۃ دے دے تو کیا وصول کنندہ کو یہ بتائے کہ یہ زکوٰۃ ہے، یا خاموش رہے، آپ نے فرمایا کہ خاموش رہے اور حاجتمند کو تکلیف نہ پہنچائے"[1]

مسلک مالک کے بعض فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ بتا کر دینا مکروہ ہے اس لیے کہ اس میں حاجتمند کی دل آزاری کا پہلو موجود ہے[2]

مسلک جعفریہ کی بھی وہی رائے ہے جو اہل سنت کی ہے کہ حاجتمند کو زکوٰۃ دینے سے پہلے یا زکوٰۃ دینے کے بعد اس کو بتلانا ضروری نہیں ہے اور ابو بصیر کہتے ہیں کہ میں

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۶۴۷۔

[2] بلغۃ السالک وحاشیۃ الصاوی، ج ، ص ۲۰۔

نے امام باقرؒ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی ہم میں سے حاجتمند شخص زکوٰۃ لینے سے شرماتا ہو تو میں اُسے بغیر بتائے زکوٰۃ دے دوں، آپ نے فرمایا، ہاں بغیر بتائے ہوئے زکوٰۃ دے دو اور مسلمان کی اہانت نہ کرو۔[1]

تنگدست شخص سے قرض ساقط کر دینا کیا زکوٰۃ میں شمار ہو سکتا ہے؟

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی تنگدست شخص پر قرض ہو اور وہ اسے زکوٰۃ قرار دینا چاہے اور یہ کہہ دے کہ یہ میری جانب سے زکوٰۃ ہے۔ تو مسلک شافعی میں دو صورتیں ہیں صحیح یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اور یہی عدم جواز امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے کیونکہ زکوٰۃ اس کے ذمے موجود ہے جس سے وہ اسی وقت بری ہو گا جب اسے (مستحق کے) قبضے میں دے دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جائز ہے اور یہی حسن بصریؒ اور عطاؒ کی رائے ہے کیونکہ (مقروض) اگر قرض واپس کر دیتا اور پھر اس سے بطور زکوٰۃ لیتا تب بھی جائز ہوتا تو اسی طرح بغیر قبضہ کے بھی جائز ہے جیسے اس کے پاس امانت ہوتی اور وہ اُسے زکوٰۃ کے طور پر دے دیتا تو بھی جائز ہوتا خواہ اس کا قبضہ ہوتا یا نہ ہوتا، لیکن اگر زکوٰۃ اس شرط کے ساتھ دی کہ وہ اس سے اس کا قرض دے گا تو یہ دینا صحیح نہیں ہے اور زکوٰۃ بالاتفاق ساقط نہیں ہو گی اور نہ ہی اس سے قرض کی ادائیگی بالاتفاق جائز ہو گی اور اگر ان دونوں نے نیت کی اور شرط نہیں لگائی تو بالاتفاق جائز ہے اور اس سے زکوٰۃ بھی جائز ہے اور اگر اس کو قرض کی طرف سے لوٹا دیا تو وہ اس قرض سے بری ہو جائے گا اور اگر مقروض نے کہا کہ مجھے اپنی زکوٰۃ دے دو میں تمہارا قرض ادا کروں گا اور اس نے یہی کیا تو اس کی زکوٰۃ جائز ہے اور قابض مالک ہو جائے گا اور اس پر اس زکوٰۃ میں سے قرض ادا کرنا لازم نہ ہو گا لیکن اگر کر دے تو جائز ہے۔[2]

---

[1] فقہ الامام جعفر الصادق، ج ۲، ص ۸۸۔

[2] المجموع، ج ۶، ص ۲۱۰، ۲۱۱۔

امام نوویؒ نے حسن کا جو قول نقل کیا ہے اسے ابوعبید نے بھی ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں تھا اگر یہ قرض سے ہو لیکن ان کے نزدیک اگر قرض کسی سامان کی قیمت کا ہو جیسا کہ تاجروں کے قرضوں میں ہوتا ہے تو جائز نہیں ہے اور یہ ایک عمدہ قید ہے۔

ابوعبید کے نزدیک کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے اور یہ قول انھوں نے سفیان ثوریؒ سے نقل کیا ہے اور اس کو سُنّت کے برخلاف قرار دیا ہے اور اس اندیشہ کا اظہار کیا ہے کہ اس طرح قرض خواہ اپنے اس مال کو محفوظ کرلے گا جس سے وہ مایوس ہو چکا ہے اور اس طرح زکوٰۃ (ضائع ہونے والے) مال کے بچانے کا ذریعہ بن جائے گی حالانکہ زکوٰۃ جب ہی قبول ہوتی ہے جب وہ خالص اللہ کے لیے ہو[1]

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی قرض کسی اہل صدقہ (مستحق زکوٰۃ) پر ہو اور وہ اس کو یہ قرض زکوٰۃ میں دے دے اور زکوٰۃ کی نیت کرلے اور مقروض اسے قبول کرلے تو جائز ہے۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس قرض کو کسی مستحق کو صدقہ دے دے اور اسے جو اس کے پاس ہے اس پر محول کرے اور زکوٰۃ کی نیت ہو تو جائز ہے۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور زکوٰۃ کا مستحق زکوٰۃ کو دینا بھی واجب ہے تو اگر وہ قرض سے بری قرار دے دینے کو اپنی زکوٰۃ قرار دے دے تو جائز ہے۔

ابن حزمؒ نے اس رائے کی دلیل میں صحیح مسلم میں وارد حضرت ابوسعید خدریؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ

"عہدِ نبوت میں ایک شخص نے پھل خریدے اور اس میں اسے نقصان ہو گیا جس سے اس کا قرض بڑھ گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے صدقہ دو۔"

ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ عطاء بن ابی رباح وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے[2]

---

[1] الاموال، ص ۵۹۵، ۵۹۶۔

[2] المحلی، ج ۶، ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

اور یہی مسلک جعفریہ کے فقہاء کی بھی رائے ہے کیونکہ ایک شخص نے حضرت جعفر صادق سے پوچھا کہ کچھ لوگوں پر اس کا کافی عرصے سے قرض ہے اور وہ یہ قرض ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور وہ زکوٰۃ کے مستحق بھی ہیں تو کیا میں انھیں اس قرض کو چھوڑ دوں اور اسے زکوٰۃ کے حساب میں لگالوں تو آپ نے فرمایا کہ درست ہے۔[1]

میرے نزدیک یہی قول راجح ہے بشرطیکہ حاجتمند ہی اس زکوٰۃ سے فائدہ اٹھائے اور اپنی اصلی ضروریات اس سے پوری کر سکے یعنی اس کا قرض اتر جائے۔ اور خود قرآن کریم نے تنگدست سے قرض کے ساقط کر دینے کو صدقہ قرار دیا ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ : ۲۸۰)

تمہارا قرض دار تنگدست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

یہ بھی تنگدست مقروض کو صدقہ کرنا ہے اگرچہ اس میں قبضہ اور تملیک نہیں ہے لیکن بہر حال اعمال کے مقاصد پورے ہونے چاہئیں خواہ ان کی صورت پوری نہ ہو۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ یہ مقروض قرض ادا نہ کر سکتا ہو اور اسے اس قرض سے بری کر دیا جائے اور اسے بتا بھی دیا جائے کیونکہ ایسا عاجز مقروض اگر فقراء اور مساکین میں سے نہ ہو تو الغارمین میں سے تو یقیناً ہے جو کہ مستحقین زکوٰۃ میں سے ہے اور قرض سے بری قرار دینا بھی اس کے قبضے میں دے دینا ہے کہ اس سے بھی مقروض کی نفسیاتی ضرورت پوری ہوتی ہے کہ اس کے ذمے سے قرض ادا ہو جاتا ہے وہ شب و روز کے غم و فکر سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کا مطالبہ اور حبس کا خوف اور سزائے آخرت کا ڈر ختم ہو جاتا ہے۔

البتہ حضرت حسن کی اس قید پر غور کرنا چاہیے کہ یہ قرض تجارتی قرض نہ ہو کہ اس صورت میں یہ اندیشہ موجود ہے کہ تاجر زیادہ منافع کے حصول کے لیے قرض کے بدلے تجارت زیادہ کرنے لگیں گے اور جو قرض وصول نہ ہوگا اسے زکوٰۃ میں شمار کر لیں گے۔ اور اس میں جو

---

[1] فقہ الامام جعفر، ج ۲، ص ۹۱۔

خرابی ہے وہ ظاہر ہے۔

کیا کسی شئے کو کسی کے لیے مباح کر دینے سے تملیک کی شرط پوری ہو جاتی ہے؟

بعض فقہاء نے یہاں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی یتیم کو کھانا کھلا دیا یا کسی ضرورتمند کو اپنا مہمان بنا لیا اور زکوٰۃ کی نیت کر لی تو گیا جو کھانا اس نے ان کے لیے بنیت زکوٰۃ مباح قرار دیا اسے زکوٰۃ شمار کرنا درست ہوگا۔

فقہاء احناف کے نزدیک اس کو زکوٰۃ قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک تملیک ضروری ہے اور کھانا کھلا دینا تملیک نہیں ہے بلکہ اسے مباح قرار دینا ہے، لیکن اگر بنیت زکوٰۃ کھانا اس کے سپرد کر دیا تو جائز ہے، جیسا کہ کپڑا پہنا دینا جائز ہے کیونکہ زکوٰۃ کی نیت سے جب اُسے خوردنی شئے دی تو وہ مالک بن گیا اور اب اس نے اپنی ملکیت میں سے کھایا، بخلاف اس صورت کے جب کہ کھلانے والا اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائے (کہ اس صورت میں یہ کھانے والا اس کھانے کا مالک نہیں ہوگا۔)[1]

زیدیہ مسلک کے بعض فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ میں سے اپنے فقرا مہمانوں کو کھلانا بشرائط ذیل جائز ہے۔

۱) زکوٰۃ کی نیت ہو۔

۲) عین طعام (خوردنی شئے) باقی رہنے والی ہو، جیسے چھوارا اور کشمش۔

۳) ہر ضرورتمند کو اتنا حصہ مل جائے جس کی کوئی قیمت ہو اور جو (بالعموم) یونہی نہ دیا جاتا ہو۔

۴) فقیر (ضرورتمند) کے قبضے میں آجائے، یا اس کے اور اس شئے کے درمیان کوئی حاجز نہ رہے۔ اور اسے یہ معلوم ہو کہ یہ شئے مجھے دی گئی ہے۔

۵) فقیر کو یہ معلوم ہو کہ یہ زکوٰۃ ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات نہ رہے کہ یہ حُسنِ سلوک ہے جس کا بدلہ دینا ہے۔

---

[1] الدر المختار و حاشیۃ، ج ۲، ص ۳۔

چھٹا باب

۱: مقاصد زکوٰۃ اور انفرادی زندگی میں اس کے اثرات

۲: مقاصد زکوٰۃ اور اجتماعی زندگی میں اس کے اثرات

تمہید

ایک طویل عرصے تک ماہرین مالیات وضرائب اس امر کے قائل رہے ہیں کہ ٹیکس کو ہر طرح کے انسانی، اجتماعی اور حتیٰ کہ اقتصادی مقاصد سے بھی دور رکھا جائے تاکہ اس کا بنیادی مقصد یعنی "آمدنی" کا حصول اور خزانہ حکومت کا اس سے بھرا ہونا متاثر نہ ہو، اسے ٹیکس کی علیحدگی کا تصور کہا جاتا ہے۔

لیکن بالآخر افکار کے ارتقاء حالات کے تغیر اور پے در پے انقلابات کے بعد اس قدیم روایتی تصور کے ترک کر دینے کی فکر ابھری اور یہ خیال پیدا ہوا کہ ٹیکس کے کچھ ایسے اقتصادی مقاصد اور اجتماعی اہداف ہونے چاہئیں جو طبقاتی فرق کو کم کرنے اور معاشرے کے اقتصادی توازن کو قائم رکھنے میں مدد دیں۔ وغیرہ۔

ٹیکس کے ان تصورات کے بالمقابل زکوٰۃ کی نوعیت وحیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کہ اسلام نے زکوٰۃ کو دین کا ایک رکن، شعائر اسلام اور عبادت قرار دیا ہے اور مسلمان پر لازم کیا ہے کہ اسے وہ ایک مقدس دینی فرض سمجھ کر اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا کے حصول کے لیے پوری خوش دلی اور خلوص نیت کے ساتھ انجام دے تاکہ یہ زکوٰۃ اللہ کے یہاں مقام مقبولیت حاصل کر سکے۔

اس لیے کہ فرمان الٰہی ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ

(البینہ : ۵)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو

اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔

نیز فرمان نبوت ہے۔

"تمام اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی"

غرض زکوٰۃ ایک مسلمان کی ذمے داری اور فریضہ ہے اور اس فریضہ کا مکلف اسے اس خدا نے قرار دیا ہے جس اللہ نے اس کو سرزمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تاکہ وہ اللہ کی عبادت و بندگی کرے اور اس زمین کو حق و عدل کے ساتھ آباد کرے اور اس کا صلہ دار آخرت میں پائے۔ یعنی انسان اس دنیا میں تکالیف و مشقتوں سے گزرتا ہے اور ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے تاکہ وہ دارالبقاء میں دوامی زندگی کے قابل ہو سکے اور ان تکالیف کا نعمتوں کی صورت میں بدلہ حاصل کر سکے۔ جب اس کا نفس پاک ہو جاتا ہے اور اس کا قلب مطہر ہو جاتا ہے اور حدود اللہ کے قیام اور ادائے فرائض سے نعیم آخرت کا اور جنت میں اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو جاتا ہے تو وہ ان سعادت مندوں اور خوش بختوں میں سے ہو جاتا ہے جن کے بارے میں فرمایا ہے۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

(النحل : ۳۲)

ان متقیوں کو جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں سلام ہو تم پر جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے۔

قرآن کریم میں اٹھائیس مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے اور سنت نبوی میں دسیوں مقامات پر نماز اور زکوٰۃ یکجا بیان کیے گئے ہیں، اس سے یہ حقیقت معلوم ہوتی کہ نماز اور زکوٰۃ ایک ہی نظام کے دو اجزاء ہیں اور ان کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان صحابہ کرام سے جن کو مانعین زکوٰۃ سے جنگ میں اختلاف تھا

فرمایا کہ قسم بخدا میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا جنھوں نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ کتب فقہ میں زکوٰۃ کا بیان "عبادت" کے حصے میں آتا ہے[1] اور قرآن و سنّت کی اتباع میں نماز کے احکام کے فوراً بعد احکام زکوٰۃ بیان کیے جاتے ہیں۔

زکوٰۃ میں عبادت کے اس پہلو کے واضح ہونے کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ میں بڑے عظیم انسانی اور اخلاقی مقاصد اور روحانی اقدار موجود ہیں اور اسلام زکوٰۃ سے ان کے حصول کی سعی کرتا ہے، جیسا کہ آیات قرآنی اور احادیث سے ان مقاصد اور اہداف کی نشاندہی ہوتی ہے اور محققین علماء اسلام نے ان کی وضاحت کی ہے۔

چنانچہ اسلام کے اوّلین ادوار میں جب نظام زکوٰۃ عملاً نافذ تھا تو اس کے یہ فوائد بھی مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں موجود تھے۔

یہ فوائد اور مقاصد صرف مادّی نہیں ہیں، بلکہ زکوٰۃ میں ہر طرح کے مادّی اور معنوی فوائد موجود ہیں اور زکوٰۃ سے اقتصادی اور مالی مقاصد حاصل ہونے کے ساتھ اخلاقی اور روحانی مقاصد بھی حاصل ہوتے ہیں۔

نیز یہ کہ زکوٰۃ سے حاصل ہونے والے فوائد محض انفرادی یا اجتماعی نہیں

---

[1] اکثر کتب فقہ میں نماز کے بعد زکوٰۃ کا بیان آیا ہے، جب کہ کچھ کتب میں نماز کے بعد روزے کا بیان ہوا ہے کہ یہ دونوں جسمانی عبادتیں ہیں اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے اور حج مالی اور جسمانی عبادت ہے۔

ہیں بلکہ انفرادی طور پر زکوٰۃ دہندہ اور وصول کنندہ بھی یہ فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اور پورا مسلم معاشرہ بھی ان فوائد سے مستفید ہوتا ہے اور سماجی امن و انصاف حاصل ہوتا اور اجتماعی مسائل حل ہوتے ہیں۔

یہ باب دو بنیادی فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل میں زکوٰۃ کے مقاصد اور مسلمان کی انفرادی زندگی میں اس کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔

دوسری فصل میں زکوٰۃ کے مقاصد کو اس اعتبار سے بیان کیا گیا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اس کے فوائد واضح ہوسکیں۔

اوّل فصل

مقاصدِ زکوٰۃ اور انفرادی زندگی میں اس کے اثرات

اس فصل میں دو مباحث ہیں۔

بحث اوّل: مقاصد زکوٰۃ اس زکوٰۃ دہندہ کے لحاظ سے جو مالدار ہے اور جس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

بحث دوم: زکوٰۃ وصول کنندہ اور اس سے منتفع ہونے والے کے لحاظ سے مقاصد زکوٰۃ کا بیان، یعنی ان حاجتمندوں کے اعتبار سے زکوٰۃ کے فوائد کی وضاحت جن پر زکوٰۃ صرف کی جاتی ہے، اور وہ خود اس کی احتیاج رکھتے ہیں، جبکہ ان مصارف زکوٰۃ کا بیان جن پر زکوٰۃ کے صرف کرنے کی احتیاج مسلمانوں کو ہے، مثلاً مؤلفۃ القلوب، غارِم لاصلاح ذات البین (جو مخاصم افراد کے مابین صلح کرانے کی خاطر مقروض ہو جائے) غازی اور عاملین زکوٰۃ، زکوٰۃ سے معاشرے کو پہنچنے والے فوائد کے ضمن میں بیان ہوگا۔

بحث اوّل

مقصد زکوٰۃ اور زکوٰۃ دہندہ پر اس کا اثر

زکوٰۃ کا مقصود محض مال جمع کرنا اور خزانہ ملکی کی ضرورت پوری کرنا نہیں ہے اور نہ ہی اس کا صرف یہ منشا ہے کہ کچھ کمزوروں کی مدد ہو جاتے اور حاجتمندوں کی حاجت پوری ہو جاتے، بلکہ اس کا اوّلین اور اساسی مقصد یہ ہے کہ انسان مادہ پر بلند ہو جائے اور مادہ انسان کا تابع بن جاتے اس کا آقا نہ بنے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جس طرح زکوٰۃ وصول کنندہ پر توجہ دی ہے اسی طرح زکوٰۃ دہندہ پر بھی توجہ دی ہے اور یہی وہ نقطہ افتراق جس کی بنا پر زکوٰۃ دنیا میں مروج تمام ٹیکسوں سے مختلف اور ممتاز ہو جاتی ہے، اس لیے کہ ہر طرح کے ٹیکس میں مرکز توجہ ٹیکس دہندہ ہوتا ہے کہ اس کے ٹیکس سے ملکی خزانہ کو امداد ملتی ہے۔

جن اغنیاء سے زکوٰۃ لی جاتی ہے ان کے نقطہ نظر سے زکوٰۃ کے مقصد کو قرآن کریم نے چند حروف پر مشتمل دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے مگر ان دو الفاظ میں نظام زکوٰۃ کے اسرار و مقاصد کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ دو الفاظ ہیں۔ تطہیر اور تزکیہ۔ اور یہ ہر طرح کی مادی اور معنوی تطہیر و تزکیہ اور غنی کے نفس کی تطہیر اور تزکیہ اور اس کے مال کی تطہیر اور تزکیہ پر مشتمل ہیں۔

قرآنی تعبیر کا اعجاز ملاحظہ فرمائیے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (التوبہ : ۱۰۳)

اے نبی تم ان کے اموال میں صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں)

انھیں بڑھائو۔

زکوٰۃ بخل سے پاک کرتی ہے

مسلمان زکوٰۃ جب اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا کے لیے دیتا ہے تو یہ زکوٰۃ اسے تمام گناہوں سے بالعموم اور بخل کی آلودگی سے بالخصوص پاک کرتی ہے۔ بخیلی بہت بڑی برائی ہے جو نفس میں رچی بسی ہوتی ہے اور انسان اس میں مبتلا ہوتا ہے، کیونکہ منشاء الٰہی یہ ہے کہ انسان کے نفس کی تہوں میں بہت سے نفسیاتی میلانات اور جبلتیں موجود ہوں جو اسے زمین کی تعمیر اور اس میں سعی و کاوش پر مجبور کریں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ملکیت کی محبت، ذات کی محبت اور بقاء کی محبت ہو۔ انہی نفسیاتی میلانات کے زیر اثر انسان جس شئے کا مالک ہوتا ہے اس میں بخل اختیار کرتا ہے اور اس کی منفعتوں اور خوبیوں سے خود ہی مستفید ہونا چاہتا ہے دوسروں کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔

وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (الاسراء : ۱۰۰)

واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء : ۱۲۸)

نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں۔

ایک ترقی یافتہ اور ایک مؤمن انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود پسندی، خود ترجیحی اور انانیت کے ان میلانات سے بلند تر ہو اور ایمانی جذبات سے بخل کے میلانات پر غلبہ پائے اور اسے دنیا اور آخرت کی کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اس مکروہ خصلت بخل سے نجات حاصل کرلے۔

بخل ایک خطرناک مرض ہے جو فرد کے لیے بھی مضرت رساں ہے اور معاشرے کے لیے بھی نقصان دہ ہے کہ اس بخل کے زیر اثر آدمی خون بہا دیتا اور عزت پامال کر دیتا ہے دین میں خیانت کرتا اور وطن کو داؤ پر لگا دیتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"تین خصلتیں تباہ کن ہیں، بخل جس کے اشاروں پر چلا جائے، خواہش نفس

جس کی پیروی کی جائے اور اپنی ذات کو پسند کرنا؛ [۱]

اور قرآن میں فرمایا گیا۔

وَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے پس وہی فلاح پانے والے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ آیت دو مرتبہ آئی ہے (الحشر: ۹۔ اور التغابن: ۱۶) اور مقصود قرآنی یہ ہے کہ جو اس مہلک اور تباہ کن بیماری سے بچ گیا اس نے نجات حاصل کرلی۔

ایک موقع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"بخل سے بچو، پچھلے لوگ دراصل بخل ہی سے ہلاک ہوئے ہیں کہ انھیں بخل کا حکم دیا گیا تو انھوں نے بخل کیا، انھیں قطع رحم کو کہا گیا تو انھوں نے قطع رحمی کی اور انھیں برائیوں کا حکم دیا گیا تو انھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا؛" [۲]

غرض زکوٰۃ ان مفاہیم کے لحاظ سے پاک کرنے والی ہے اور زکوٰۃ دہندہ اس تباہ کن بخل سے پاک ہو جاتا ہے اور جس قدر زکوٰۃ میں خرچ کرتا ہے اس قدر پاکی حاصل ہوتی ہے اور وہ خوشی محسوس کرتا ہے کہ اس نے زکوٰۃ دی اور رضائے الٰہی کے لیے اپنا مال خرچ کیا۔

زکوٰۃ جہاں ایک طرف نفس کو بخل کی برائی سے پاک کرتی ہے وہاں دوسری جانب نفس کو مال کی محبت اور اس کے سامنے سر جھکا دینے سے اور اس کی خاطر ذلیل ہو جانے سے نجات دلاتی ہے اور انسان کو اس تذلیل سے بچاتی ہے کہ وہ روپے پیسے کی خاطر اپنا شرفِ انسانیت پامال کر دے۔ کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ انسان صرف اپنے خالق کے سامنے جھکے اور صرف اسی کا بندہ ہو کر رہے اور ہر بندگی اور ہر فروتنی سے نجات حاصل کر کے خود اس جہاں کا سردار بنے اور عناصر کون اور اشیائے ارض کا مالک بنے۔

---

[۱] طبرانی نے اوسط میں ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ التیسیر، ج ۱، ص ۵۷۰۔

[۲] ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے، مختصر المنذری، ص ۲۶۳، ج ۲۔

انسان کی اس سے بڑی توہین اور تذلیل کیا ہوگی کہ وہ خلیفہ الٰہی اور آقائے زمین ہونے کے باوجود مٹی کے ڈلوں کی خاطر پیشانی رگڑ دے اور مال و دولت دنیا کا غلام بن جائے۔

انسان کی شرافت و کرامت کی اس سے بڑی توہین کیا ہوگی کہ انسان مال جمع کرنا ہی مقصد حیات بنالے اور اس کا بیشتر وقت اور اس کا تمام علم و فن اسی کے حصول میں صرف ہو جائے، حالانکہ انسان کی تخلیق کا مقصد اس سے کہیں بڑا اور اس سے کہیں عظیم ہے۔

عبودیت اور بندگی صرف اللہ ہی کے لیے ہے اور انسان کی کسی اور شئے کی بندگی ہلاکت اور تباہی ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ

"دینار و درہم کا بندہ اور چادر کا غلام ہلاک ہو جائے اور سرنگوں ہو جائے اور جب اسے کانٹا چبھے تو نہ نکلے"۔[1]

زکوٰۃ کے ذریعے خرچ کرنے اور انفاق کرنے کی تربیت ہوتی ہے

جس طرح زکوٰۃ نفس مسلم کو بخل سے پاک کرتی ہے اسی طرح اس کی خرچ کرنے دینے اور انفاق کرنے کی تربیت بھی کرتی ہے۔

ماہرین تربیت و اخلاق اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کے اخلاق و عمل پر اس کی عادتوں کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ "عادت طبیعت ثانیہ ہے"، یعنی عادت میں اس قدر قوت اور نفوذ ہوتا ہے کہ یہ انسان کی طبیعت کے درجے میں بن جاتی ہے۔

مسلمان جسے انفاق کی عادت ہوتی ہے جو اپنی زرعی پیداوار پر زکوٰۃ دیتا ہے جو اپنی آمدنی کی زکوٰۃ دیتا ہے اپنے جانوروں کی زکوٰۃ دیتا ہے اور سال گزرتے ہیں اپنی نقد رقوم اور تجارتی سامان پر زکوٰۃ دیتا ہے اور ہر عید کے موقع پر زکوٰۃ ادا کرتا ہے، دینا اور عطا کرنا اس

---

[1] البخاری، کتاب الجہاد، والرقاق، وابن ماجہ فی الزہد۔

کی اصل صفت بن جاتی ہے اور اس کے اخلاق کا ایک حصّہ بن جاتی ہے۔

اسی لیے قرآن کی نظر میں عطا اور انفاق مؤمن متقی کی صفات میں سے ایک صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، چنانچہ جوں ہی مسلمان مصحف کھولتا ہے وہ سورۃ البقرہ کی یہ آیات تلاوت کرتا ہے۔

الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ : ۱، ۳)

الف لام میم یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

مکی قرآن میں بھی مؤمنین کی اس صفت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (الشوریٰ : ۳۶، ۳۸)

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصّہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں ہم نے جو کچھ

بھی رزق انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں انفاق سے مراد زکوٰۃ ہے کیونکہ یہاں پر نماز کے فوراً بعد اس کا ذکر آیا ہے۔ ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر نفلی صدقہ مراد ہے اس لیے زکوٰۃ کے لیے قرآن کریم میں زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں نفقہ سے مراد اہل و عیال پر نفقہ کرنا ہے۔

اور ایک اور رائے یہ ہے کہ یہ عام ہے اور اس سے ہر طرح کا انفاق مراد ہے۔ اور یہی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہاں عمومیت کے ساتھ مؤمنین کی صفت بیان کی جا رہی ہے اور اس طرح بیان کی جا رہی ہے جس طرح ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً (البقرہ : ۲۷۴)

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ۝ (آل عمران : ۱۳۴)

جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ خوش حال ہوں یا بدحال۔

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (آل عمران : ۱۷)

یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راستباز ہیں، فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں مؤمنین کی اس صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُحْسِنِیْنَ کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات : ۱۹۱۴)

البتہ متقی لوگ اس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے، جو کچھ ان کا رب انھیں دے رہا ہوگا اُسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے راتوں کو کم ہی سوتے تھے پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (المعارج : ۲۴، ۲۵)

انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے اور جب اسے خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوتے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔

مزید برآں جو شخص اپنا مال دُوسروں پر خرچ کردینے اور اپنے دینی بھائیوں کی تکلیف دُور کرنے کے لیے اپنی کمائی صرف کردینے اور مصالح اُمّت میں اپنے آپ کو شریک رکھنے کا عادی ہو وہ یقیناً اس امر سے بہت دُور ہوگا کہ وہ کسی دوسرے کے مال پر چوری اور لُوٹ کے ذریعے کوئی اعتداء (زیادتی) کرے کیونکہ جو شخص محض رضائے الٰہی کا اپنا مال خرچ کرتا ہو وہ اللہ کی ناراضگی مول لینے کے لیے دوسرے کے مال پر کس طرح دست درازی کرے گا۔

اللہ سبحانہٗ ارشاد فرماتا ہے۔

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ

بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَ
كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗ
اِذَا تَرَدّٰى اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى
فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى لَا يَصْلٰهَا اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِىْ كَذَّبَ
وَتَوَلّٰى وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى وَمَا
لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ
الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (اللیل : ۱-۲۱)

قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو اور اس ذات کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔ تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ جانا اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا، اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جاتے ہے؟

بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمے ہے اور درحقیقت آخرت اور دنیا دونوں کے ہم ہی مالک ہیں، پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے اس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو وہ تو صرف اپنے ربِ برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے اور ضرور وہ (اس سے) خوش ہوگا۔

اس سورہ میں انسانوں کے دو نمونے بیان کیے گئے ہیں۔
ایک قسم کے انسان وہ ہیں جن کی اللہ نے ستائش فرمائی اور ان کی داد و دہش

تقویٰ اور نیکی کی تصدیق پر ان کے لیے یہ راستہ سہل فرمادیا۔ یعنی تقویٰ اور بھلائی کی تصدیق کے ساتھ اس کا دینا بھی ایک بنیادی صفت ہے، قرآن کریم نے اس مقام پر اعطا کو مطلق رکھا ہے اور یہ نہیں کہا ہے کہ اس نے کیا دیا اور کتنا دیا، کیونکہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جس کا نفس کریم ہے جو دینے والا اور خرچ کرنے والا ہے اور روکنے والا نہیں ہے، درحقیقت دینے والا وہی ہوتا ہے جو احسان کرنے والا اور نفع پہنچانے والا ہو، جس کی طبیعت میں احسان اور اعطاء خیر ہو، وہ اپنی ذات کو بھی خیر پہنچائے اور اس میں دوسروں کو بھی شریک کرلے، اور وہ ایک چشمۂ آب صافی کی طرح ہو، جس سے پیاسے پانی پی کر سیراب ہوں، جس سے کھیتیاں سیراب ہو کر لہلائیں اور جس سے جانوروں کی بھی پیاس بجھے اور انسان جس طرح چاہیں اس سے استفادہ کریں، جس طرح یہ چشمۂ صافی سب کے لیے یکساں مفید اور نفع بخش ہے اسی طرح یہ انسان تمام انسانوں کے لیے مفید اور نفع بخش ہے۔

اس کے بالمقابل دوسری قسم کے انسان وہ ہیں جو بخل کریں، خدا سے بے پروا ہوجائیں اور بھلائی کی تکذیب کریں، یہ وہ لوگ ہیں جو بخیل اور لئیم ہیں جو اپنے مال میں بخل کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے مال کے گھمنڈ میں خدا سے اور اس کے بندوں سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور اللہ نے مومنین صادقین کے لیے جس حسن انجام کا وعدہ فرمایا ہے اس کو جھٹلاتے ہیں۔

اس بھلائی کو جھٹلا دینے اور اعطاء اور تقویٰ سے روگردانی کا انجام ہے۔

نَارًا تَلَظّٰی لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا الْاَشْقَی الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝

اور پہلی قسم کے انسانوں کا حسن انجام یہ ہے۔

وَسَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ۝

سورۂ لیل مکی قرآن کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اور اس میں ان دونوں قسم

کے انسانوں کا تذکرہ اس امر کا غماز ہے کہ آگے چل کر اسلام مال کے بارے میں اور دولتمندوں کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے اور اس اخلاقی کردار کی نشاندہی کرتا ہے جو اسلام کو مطلوب اور خدا کو پسند ہے۔

صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہونا

انسان بخل اور دنائت نفس سے پاک ہو کر اور انفاق کا عادی ہو کر انسانی نفس کی گراوٹ سے بلند تر ہو جاتا ہے۔

وَكَانَ الْإِنسَانُ قَتُورًا (الاسراء : ۱۰۰)

اور کمالات ربانی کے قریب ہو جاتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی صفات یہ ہیں کہ ان کی خیر اور رحمت، جود اور کرم اور احسان تمام مخلوقات پر عام ہے اور کوئی نفع انھیں نہیں پہنچتا، اس لیے ان صفات امکانی حصول اللہ کے اخلاق سے متصف ہونا ہے اور انسانی کمالات کی انتہا تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں[1] کہ نفس ناطقہ، جس کے ذریعے انسان بنا ہے، کی دو قوتیں ہیں نظری قوت کا کمال اللہ کے حکم کی تعظیم میں ہے اور عملی قوت کا کمال اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنے میں ہے، اللہ سبحانہ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے کہ روح یہ کمال حاصل کرے اور مخلوقات پر احسان کرنے کی صفت سے متصف اور ان کے ساتھ بھلائی کرنے اور ان کا دکھ درد دور کرنے کے وصف سے موصوف ہو جائے ——— یہی وجہ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ[2]

---

[1] التفسیر الکبیر، ج ۱۶، ص ۱۰۱۔

[2] میں نے اس روایت کو ہر ممکن مقام پر تلاش کیا مگر مجھے نہ ملی اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ یہ کس کا قول ہے۔

واخلاق الٰہی اختیار کرو"۔[1]

اس اخلاق اور اس رُوح کے اثرات یہ ہوں گے کہ زکوٰۃ کے ذریعے مسلمانوں میں خرچ کرنے اور نیکی کرنے کی رُوح پیدا ہو گی اور مسلمانوں کے ان صدقات جاریہ سے تمام مسلمان مستفید ہوں گے اور یہ نظام ایک وقف خیری کی صُورت میں ظاہر ہو گا جس کی مسلمانوں نے بہت عمدہ مثالیں قائم کی ہیں اور رُوح لطف و کرم کو فروغ دیا ہے اور محتاجوں اور ضرورتمندوں کو اور انسانوں کے ہر طبقے اور گروہ کے نادار لوگوں سے مادّی اعانت کی ہے، بلکہ بعض اوقات مسلمانوں کی کرم نوازیاں انسانوں سے گزر کر حیوانات پر بھی محیط ہو گئی ہیں۔[2]

زکوٰۃ نعمتِ الٰہی کا شکر ہے

احسان شناسی اور شکر نعمت تمام ادیان اور مذاہب کے لحاظ سے عقل کے اعتبار سے اور انسانی فطرت اور اخلاق کے لحاظ سے ایک امر لازم ہے۔

زکوٰۃ دہندہ کے نفس میں اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کا احساس بیدار کرتی ہے اور اللہ سبحانہٗ

---

[1] اس مفہوم سے قریب ایک قول یہ بھی ہے کہ کسی شئے کے ساتھ استغناء اختیار کرنے سے کسی شئے کے بغیر استغناء اختیار کرنا بہتر ہے، کیونکہ شئے کے ساتھ استغناء میں اس کی احتیاج بڑھ جائے گی الّا یہ کہ وہ اس کو دوسری اشیاء سے استغناء کا ذریعہ بنائے۔ جبکہ ہر شئے سے مستغنی ہو جانا غنائے تام ہے، اسی لیے ہر شئے سے استغناء خالق کی صفت ہے اور شئے کے ذریعے استغناء مخلوق کی صفت ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنے بعض بندوں کو بہت مال دیا ہے اور انھیں اس مال کے ذریعے مستغنی بنا دیا ہے گویا اسے زکوٰۃ کا حکم دینے سے مقصود یہ ہے کہ وہ استغناء کے کم تر درجے سے اعلیٰ تر اور ارفع تر درجے تک ترقی کرے یعنی اس مقام تک ترقی کرے۔ جو ہر شئے سے مستغنی ہونے کا درجہ ہے۔

[2] اس کی مثالیں ہماری کتاب "الایمان والحیاۃ" میں (ص ۲۹۱، ۲۹۳) ملاحظہ فرمایئے

کے احسان اور اس کی نعمت کے شکر پر آمادہ کرتی ہے جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ

"اللہ کی اپنے بندوں پر دو طرح کی نعمتیں ہیں، جانی اور مالی، جسمانی عبادتیں جانی نعمتوں کا شکر ہیں اور مالی عباداتیں مالی نعمتوں کا شکر ہیں، وہ شخص کس قدر خسیس ہوگا جو فقیر کی جانب دیکھے کہ اس کا رزق تنگ ہے اور وہ حاجتمند ہے پھر اس کے نفس میں یہ گنجائش پیدا نہ ہو کہ وہ اسے سوال سے مستغنی کر کے اور اس کی ضرورت رفع کر کے اللہ کا شکر بجالائے اور اسے اپنے مال میں صرف چالیسواں یا دسواں حصّہ دے دے"[1]

زکوٰۃ کے اس تصوّر کا مسلمانوں پر گہرا اثر مرتب ہُوا ہے اور انھوں نے اس امر کا ادراک کرتے ہوئے کہ ہر نعمت کی زکوٰۃ ہے، خواہ مادی نعمت ہو یا معنوی نعمت، کہ "اپنی صحت کی زکوٰۃ دو، اپنی بصارت و بینائی کی زکوٰۃ دو اپنے علم کی زکوٰۃ دو اور اپنی اولاد کی نجابت کی زکوٰۃ دو"

خود حدیث نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم میں وارد ہُوا ہے کہ

"ہر شئے کی زکوٰۃ ہے"[2]

حُبِ دنیا کا علاج

زکوٰۃ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ اس پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے عائد کردہ کیا فرائض ہیں اور زکوٰۃ انسان کو حُبِ دنیا اور حُبِ مال سے نجات دلاتی ہے کہ ان محبتوں کی شدت سے قلب یادِ آلٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ امام رازیؒ نے فرمایا ہے ــــ اور آخرت کی تیاری سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال حکمت شریعت اس امر کی متقاضی ہے کہ مال کے مالک پر یہ ذمے داری ہو کہ وہ

---

[1] الاحیاء، ج ۱، ص ۱۹۳، ط الحلبی۔

[2] بروایت ابن ماجہ از ابو ہریرہؓ، و طبرانی از سہل بن سعد، سیوطیؒ نے ضعیف کہا ہے اور المنذری نے بھی الترغیب میں ضعیف کہا ہے۔

اپنے مال میں سے کچھ حصہ راہِ خدا میں صرف کرے تاکہ مال کی محبت میں کمی آئے، قلب مسلم اسی کی محبت میں گرفتار نہ رہے اور یہ احساس رہے کہ محض طلب مال کی سعی میں لگے رہنا انسانی فلاح کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ فلاح و کامیابی کے لیے مال خرچ کر کے رضائے الٰہی کا حصول ضروری ہے۔ غرض وجوبِ زکوٰۃ قلب سے مرض حبِ دنیا کے ختم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

مال کی کثرت سے قوت اور قدرت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس قوت و قدرت کی زیادتی انسانی نفس کو لذتوں سے ہمکنار کرتی ہے اور ان لذتوں کی کسک انسان کو مزید طلب مال پر اکساتی ہے اور پھر یہ مال مزید حظ نفس عطا کرتا ہے اور یہ حظ نفس پھر اور طلب مال کی جانب لے جاتا ہے اور انسان طلبِ مال کے اس چکر میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔ شریعت نے اس چکر کا خاتمہ یہ مقرر کیا ہے کہ ہر مالدار شخص اپنے مال کا کچھ حصہ محض رضائے الٰہی کے لیے صرف کرے تاکہ اس کا نفس اس ظلماتی راستے سے ہٹ کر عبودیت خداوندی اور طلب رضائے الٰہی کی صراطِ مستقیم کی طرف متوجہ ہو جائے[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ، یہ نہیں چاہتے کہ ان کا بندہ ایک ایسی پیچیدہ پگڈنڈی پر چلے جس کی کوئی انتہا اور انجام نہ ہو اور وہ محض مال کے جمع کرنے اور اس کی حرص و طلب میں لگا رہے بلکہ اللہ سبحانہ، چاہتا ہے کہ بندہ کے سامنے ایک کھلی شاہراہ ہو جس پر چل کر رضائے الٰہی کی منزل پر پہنچے اور اس شاہراہ پر چلتے ہوئے ہر موقعے پر فقیر اور مستحق کا حق ادا کرتا رہے اور انفاق کرتا رہے۔

اللہ سبحانہ، نے مسلمان کو جمع مال کی اجازت دی ہے اور طیبات دنیا اس کے لیے حلال قرار دی ہیں مگر اس کا مقصود حیات نہیں قرار دیا ہے بلکہ انسان کا مقصود زندگی اس سے بلند تر بتایا ہے کہ ہر چند دنیا اس کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر خود انسان دنیا کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اسے عبادت الٰہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس بات کی اجازت

---

[1] تفسیر رازی ج، ص ۱۰۱۔

ہے کہ انسان اپنے راستے کو خوبصورت اور اپنی گزرگاہ کو ہموار بنائے لیکن اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ راہ کی خوبصورتی میں منہمک ہو کر منزل کھوٹی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ مال و دولت دنیا ہر انسان کو دیتا ہے اسے بھی جسے وہ پسند کرتا ہے اور اسے بھی جسے وہ پسند نہیں کرتا، مومن کو بھی دیتا ہے اور فاجر کو بھی دیتا ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۤءِ وَهٰٓؤُلَاۤءِ مِنْ عَطَاۤءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاۤءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (الاسراء : ۲۰)

ان کو بھی اور اُن کو بھی، دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامانِ زیست دیئے جا رہے ہیں، یہ تیرے رب کا عطیہ ہے اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔

یعنی کسی انسان کے پاس مال کا ہونا اس کے اچھا ہونے اور خوب ہونے کی ہرگز کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ اصل خوبی اور فضیلت یہ ہے کہ جو مال اللہ انسان کو دے انسان اس میں سے شکرِ نعمت کے طور پر اور رضائے آلٰہی کے لیے اللہ کے راستے میں خرچ کرے۔

مال اللہ کی نظر میں خیر اور نعمت ہے مگر اس خیر میں بھی آزمائش کا پہلو اسی طرح موجود ہے جس طرح کہ شر میں اور بُرائی میں ہوتا ہے۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء : ۳۵)

اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن : ۱۵)

تمھارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ

(الفجر : ۱۵)

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔

وہ شخص خوش بخت ہے جو اپنے آپ کو دنیا کے مال کا امانت دار اور نیابت دار

متصور کرے اور اس مال کو اللہ کے احکام کے مطابق صرف کرے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (الحدید : ۶)

اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔

زکوٰۃ درحقیقت مُسلم کو مال و دولت دنیا کے فتنوں اور آزمائشوں سے بچنے کی تربیت دیتی ہے کہ زکوٰۃ دہندہ کے نفس کو مال صرف کرنے کی عادت ہو جاتی ہے وہ اللہ کا حکم بجالاتا اور اس کی رضا کو پورا کرتا ہے۔

قوموں کو سب سے بڑا مرض جو لگتا ہے اور جس سے ان کی بڑی سے بڑی افرادی قوت سمندر کی جھاگ کی طرح ہو جاتی ہے اور دشمن اس کو لقمۂ تر بنا لیتے ہیں، وہ ایسا گھن ہے جو اندر ہی اندر قوموں کی قوت مزاحمت ختم کر کے رکھ دیتا ہے، ان کے نفوس میں کسلمندی پیدا کر دیتا ہے ان کی قوت عزم مٹا دیتا ہے اور ان کی معنوی طاقت کو ملیامیٹ کر دیتا ہے — اس مرض کو اور اس گھن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو امور میں منحصر فرمایا ہے: "دنیا کی محبت اور موت کا خوف"[1]

جب مُسلم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آخرت کی خاطر دنیا کو کیسے ترک کرے، کس طرح مال خرچ کرے اور کس طرح کسی مصلحت کے لیے اور کسی دوسرے کی ضرورت کے لیے اپنی ہوائے نفس کو مؤخر کرے تو وہ درحقیقت اس گھن (وَھْن) کو ختم کرنے اور اپنی اندرونی قوت کو بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو بالآخر پوری اُمتِ مسلمہ کی قوت بنتی ہے۔

زکوٰۃ غنی کی شخصیت کو نما عطا کرتی ہے

زکوٰۃ غنی کی معنوی شخصیت کو نشو و نما دیتی ہے کیونکہ انسان جب کوئی بھلائی کا کام کرتا ہے۔ کوئی نیکی کرتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اور اپنے مال سے اپنے دینی بھائیوں اور انسانی بھائیوں کی اعانت کرتا ہے اور انسانیت کی طرف

---

[1] مسند احمد، ج ۵، ص ۲۷۸ - ابوداؤد، کتاب الملاحم۔

سے اپنے اوپر عائد حق کو ادا کرتا ہے تو اس کے نفس میں ایسی وسعت، انشراح اور فراخی پیدا ہوتی ہے جیسی کسی معرکہ جیتنے والے بہادر کو محسوس ہوتی ہے اور درحقیقت مالی امداد کرنے والا بھی اپنے نفس کی کمزوری، خواہش نفس اور بخل و کنجوسی پر غلبہ پالیتا ہے۔

یہ ہے وہ نفسیاتی ارتقاء اور تزکیۂ معنوی جو زکوٰۃ دہندہ کو حاصل ہوتا ہے اور یہی آیت

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا

کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ تزکیہ کو تطہیر پر عطف کرنا اس مفہوم کی تائید کرتا ہے کہ قرآن کے ہر لفظ اور ہر ترتیب کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔

زکوٰۃ فروغ محبت کا ذریعہ ہے

زکوٰۃ مالدار فرد کے درمیان اور معاشرے کے درمیان اخوت محبت اور تعاون کا مضبوط رشتہ استوار کرتی ہے کیونکہ لوگوں کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص انھیں نفع پہنچانے کا اشتیاق ان کی بھلائی کی خواہش اور ان کو نقصان اور تکلیف سے بچانے کا جذبہ رکھتا ہے وہ طبعاً اسے پسند کرنے لگتے ہیں اور ان کے دل اس کی جانب مائل ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

"انسانوں کی جبلت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اس شخص سے محبت کرتے ہیں جو ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اور وہ اس شخص سے نفرت کرتے ہیں جو ان کے ساتھ برائی سے پیش آتا ہے"[1]

---

[1] اس حدیث کو ابن عدی نے الکامل میں، ابونعیم نے الحلیۃ میں البیہقی نے شعیب الایمان میں حضرت ابن مسعودؓ سے سند ضعیف کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، لیکن البیہقی نے اس کی موقوف روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن السخاوی فرماتے ہیں کہ موقوفاً اور مرفوعاً ہر دو طرح باطل ہے۔ التیسیر ج ۱، ص ۴۸۵۔

یہی وجہ ہے کہ اگر معاشرے کے تنگدست لوگوں (فقراء) کو یہ علم ہو کہ فلاں شخص ان کی تنگدستی دُور کرنے کے لیے اپنے مال کا کچھ حصّہ صرف کر رہا ہے اور جس قدر اس کے مال میں اضافہ ہوگا اس کی امداد و اعانت بڑھتی جائے گی تو وہ اس کے حق میں دعائے خیر کریں گے اور اس کی بھلائی کے خواستگار رہیں گے اور ان کے دلوں کی حرارت اور روحانی تاثیر اس انسان (مالدار) کے دِل میں خیر کے سرچشمہ کو فروغ اور جذبۂ انسانی ہمدردی کو دوام بخشے گی۔ جیسا کہ امام رازیؒ نے فرمایا ہے اور جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے۔

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (الرعد: ۱۷)

اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"زکوٰۃ کے ذریعے اپنے اموال کی حفاظت کرو۔"[1]

زکوٰۃ مال کو پاک کر دیتی ہے

زکوٰۃ جس طرح زکوٰۃ دہندہ کے نفس کا تزکیہ اور اس کی تطہیر کرتی ہے اسی طرح زکوٰۃ سے مالدار کے مال کی تطہیر ہوتی ہے اور تزکیہ ہوتا ہے یعنی مال پاک ہو جاتا ہے اور اسے نشوونما ملتا ہے۔

مال میں دوسروں کا حق بھی ہوتا ہے اور دوسروں کے حق کی وابستگی کی بنا پر وہ آلودہ ہو جاتا ہے اور اس وقت تک یہ آلودگی ختم نہیں ہوتی جب تک حقِ غیر ادا نہ کر دیا جائے، اسی مفہوم کو بعض علماء نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اگر کسی کے گھر میں ایک پتھر غصب شدہ لگا ہوا ہے تو یہی پتھر اس گھر کی ویرانی اور بربادی کا ضامن ہے۔

---

[1] ابوداؤد نے المراسیل میں روایت کیا ہے الطبرانی اور البیہقی نے مرفوعاً اور متصلاً صحابہؓ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ المنذریؒ نے کہا مرسل سند زیادہ موزوں ہے۔

یہی صورت اس پیسے کی ہے جو کسی تنگدست کا حق بنتا ہو کہ اس کی موجودگی سے پُورا مال آلودہ ہو جاتا ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"جب تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ دے دی تو تم سے اس کی بُرائی دُور ہو گئی" [۱]

اس مضمون کی اہم حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ

"اپنے اموال کو زکوٰۃ دے کر محفوظ کرو"

آج کے دُور میں جبکہ دنیا میں خونی انقلابات برپا ہو رہے ہیں اور تباہ کن اقتصادی نظام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں مالداروں کے لیے اپنے اموال کو محفوظ کرنا کس قدر ضروری ہو گیا ہے۔

ضرورتمند اور حاجتمند کا مالدار کے مال میں مضبوط حق ہے یہاں تک کہ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ زکوٰۃ مالدار کے ذمّہ عائد نہیں ہے بلکہ اس کے عَین مال پر عائد ہے اور اس مال میں کم ہو جانے اور ضائع ہو جانے کا اندیشہ موجود ہے اِلّا یہ کہ اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے چنانچہ فرمانِ نبوّت ہے کہ

"جس مال میں زکوٰۃ مل جاتی ہے زکوٰۃ اسے ضائع کر دیتی ہے" [۲]

ایک اور حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ

"اگر تمھارے مال پر زکوٰۃ عائد ہوا اور تم زکوٰۃ ادا نہ کرو تو یہ حرام (مال) حلال (مال) کو ضائع کر دے گا" [۳]

---

[۱] ابن خزیمہ، در صحیح خود، حاکم از جابر۔ اس حدیث پر کچھ کلام ہے جو آٹھویں باب میں آئے گا۔

[۲] یعنی جس جائز مال پر زکوٰۃ فرض ہو چکی ہے اور اس کی یہ فرض زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی تو یہ زکوٰۃ اس سارے مال کے ضیاع کا سبب بن جاتی ہے۔ اگلی حدیث میں حرام کے لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ واجب الاداء زکوٰۃ اس شخص کے لیے جس پر اس کی ادائیگی فرض ہے حرام ہو جاتی ہے۔ (س۔ صدیقی)

[۳] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

بلکہ پوری اُمت (قوم) کا مال معرض ہلاکت میں پڑ جاتا، آفات سماوی پیداوار گھٹا دیتی ہیں اور قومی آمدنی میں سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ نتائج اس قوم پر اللہ کی ناراضگی کا اظہار ہیں جو باہمی کفالت و تعاون کو بروئے کار نہیں لاتی اور ان کا قوی ان کے کمزور کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ

"جو قوم ادائے زکوٰۃ بند کر دیتی ہے اس کی آسمان سے بارش بند ہو جاتی ہے اور جانوروں تک کی ضرورت کے لیے پانی نہیں برستا"

غرض انفرادی مال ہو یا اجتماعی دولت اس کی تطہیر اس وقت تک نہیں ہوتی اور اس میں کمی کے اور ضائع ہو جانے کے اسباب اس وقت تک ختم نہیں ہوتے جب تک اس میں سے اللہ کا مقرر کردہ اجتماعی حق ——— زکوٰۃ ——— نہ ادا کر دیا جائے۔

زکوٰۃ سے مال حرام پاک نہیں ہوتا

زکوٰۃ صرف مال حلال و جائز کو پاک کرتی ہے اسی کو نشو و نما دیتی ہے اور اسی میں برکت کا ذریعہ بنتی ہے، جبکہ مال خبیث (حرام و ناجائز) کو زکوٰۃ پاک نہیں کرتی یعنی جو مال لوٹ مار کے ذریعے، چھین جھپٹ کر، چوری اور رشوت سے، سود اور جوئے سے یا اثر و نفوذ کے کسی طرح کے استعمال سے یا مال باطل کی کسی بھی صورت کے ذریعہ حاصل ہوا اس میں سے زکوٰۃ ادا کر دینے سے وہ پاک نہیں ہو جاتا مال حرام کو زکوٰۃ سے پاک کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گندگی کو پیشاب سے دھولے۔

ہمارے زمانے میں بعض چوروں اور لٹیروں کا جو کھلم کھلا اس نام سے پکارے جاتے ہیں جن کے معاشرے میں اچھے نام ہیں اور کام درحقیقت وہ ہی کرتے ہیں جو چور اور ڈاکو کرتے ہیں، یہ سمجھ لینا کہ وہ کچھ صدقہ خیرات کر کے اور اپنا حرام کا کمایا ہوا مال راہِ خدا میں دے کر خدا کے یہاں سرخرو ہو جائیں گے اور ان کے گناہوں کی تلافی ہو جائے گی۔[1]

---

[1] پاکستان میں بعض دینی درسگاہوں اور فلاحی اداروں کی ناکامی کا ایک بڑا اور اولین

(بقیہ اگلے صفحے پر دیکھئے)

یہ ایک بالکل غلط تصور ہے اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ فرمانِ نبوت ؐ ہے کہ

"اللہ پاک ہے اور پاک شے قبول فرماتا ہے"۔[1]

نیز فرمایا کہ

"جس نے مال حرام اکٹھا کیا پھر اس پر زکوٰۃ دی اسے اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا البتہ اس کا وبال اس پر ہوگا"۔[2]

اور فرمایا کہ

"اللہ خیانت سے حاصل کیے ہوئے مال کی زکوٰۃ قبول نہیں کرتا جس طرح بغیر وضو نماز قبول نہیں فرماتا"۔[3]

اور فرمایا کہ

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے جو بندہ مال حرام کما کر اس پر زکوٰۃ دیتا ہے وہ قبول نہیں ہوتی، اور نہ اس مال سے راہِ خدا میں خرچ کرنے پر کوئی برکت ہوتی ہے اور جو مال وہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہ جہنم کے

(بقیہ آگے) سبب یہی ہے کہ چندوں کے ذریعے حاصل ہونے والا جو سرمایہ خرچ ہوا اس میں یہ حقیقت پیشِ نظر نہیں رکھی گئی کہ اس میں مال حرام کس قدر شامل ہے اور غصب کے یہ پتھر "مدارس کی بنیادوں میں نصب کیے گئے جو ان کی ناکامی، خرابی اور ویرانی کی اصل اور حقیقی وجہ بن گئے۔ بلکہ اکلِ سحت کے عادی سرمایہ داروں کی رفاقت خود علمائے اُمت کی نیک نامی کو داغدار کر گئی۔ (س۔ صدیقی)

[1] مسلم، ترمذی (الترغیب والترہیب ج ۳، ص ۱۱) صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ من کسب طیب،

[2] ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، (الترغیب والترہیب ج ۱، ص ۲۶۶)

[3] ابوداؤد بسند صحیح، صحیح مسلم۔ (فتح الباری، ج ۳، ص ۱۷۸۔)

واسطے اس کا زادِ راہ بنتا ہے کیونکہ بُرائی کو بُرائی سے نہیں مٹایا جاتا اور خبیث کو خبیث ختم نہیں کرتا البتہ بُرائی کو اچھائی سے مٹایا جاتا ہے"۔[1]

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ مال حرام کے صدقہ کو اس لیے قبول نہیں فرماتا کہ مال حرام جس شخص کے پاس آیا ہے اس کی ملکیت ہی نہیں بنا ہے اور اس ملکیت کے بغیر اس کا کوئی بھی تصرف درست نہیں ہے۔ اس لیے مال حرام پر زکوٰۃ مقبول قرار دینے کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ مال حرام بھی ہے اور حلال بھی ہے (کہ زکوٰۃ صرف حلال مال پر عائد ہوتی ہے) اور یہ محال ہے۔[2]

بلکہ بعض فقہائے احناف نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی شخص مال حرام میں سے کسی تنگدست کو کچھ دے اور اس پر ثواب کی اُمید رکھے تو وہ کافر ہے اور اگر محتاج کو بھی علم ہو کہ یہ مال حرام ہے اور وہ اس کو قبول کر کے اس پر دُعا دے تو وہ بھی کافر ہو جائے گا، اور اگر سُننے والا حقیقتِ حال کے علم کے باوجود اس کی دُعا سن کر آمین کہے تو وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ مثلاً حرام مال سے کوئی شخص مسجد بنائے اور اُمید ثواب رکھے (تو یہ کفر ہے) کہ جس فعل پہ سزا ہونی ہے وہ اس پر ثواب کی توقع لگا رہا ہے۔ گویا اس نے حرام کو حلال سمجھ لیا ہے جو کہ کفر ہے۔

بہر حال حرام مال پر زکوٰۃ دینا حرام قطعی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔[3]

ہرگز کسی شخص کو یہ وہم نہیں ہونا چاہیے کہ غاصِب مال غصب پر زکوٰۃ دے گا تو اس کے جرم غصب کا کفارہ ہو جائے گا، راشی رشوت کے مال پر زکوٰۃ دے کر جرم رشوت سے رُستگاری حاصل کر لے گا، سود خوار اپنی گندگی خدا کے راستے میں دے کر عذاب سے بچ جائے گا ـــــ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ حرام مال ہر حالت میں حرام ہے اور کسی حرام

---

[1] احمد، بروایت حسن عند بعض علماء الحدیث (الترغیب والترہیب، ج ۳، ص ۱۴)

[2] فتح الباری، ج ۳، ص ۱۸۰۔

[3] حاشیۃ رد المحتار علی الدر المختار، ج ۲، ص ۲۷۔

مال سے زکوٰۃ وصدقات ادا نہیں ہوتے کیونکہ ایسے مال پر سرے سے زکوٰۃ عائد ہی نہیں ہوتی۔
زکوٰۃ درحقیقت صرف اسی مال پر فرض ہوتی ہے جو حلال و جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو اور جو صاحبِ مال کی ملکیت ہو اور اسلام کی نظر میں مال حرام حاصل کرنے والا اس کا مالک ہی نہیں ہوتا اس لیے اس مال پر زکوٰۃ بھی عائد نہیں ہوتی، اور نہ قبول ہوتی ہے۔

مالِ حرام خواہ کسی شخص کے پاس کتنا ہی طویل عرصہ رہے اس کی ملکیت اس پر قائم نہیں ہوتی اور اسلام غاصبوں، لٹیروں اور راشیوں کو یہ نہیں کہتا کہ زکوٰۃ دے کر اپنی اس کمائی کو پاک بنالو (جیسا کہ موجودہ نظام ضرائب کہتا ہے کہ اپنی کالی آمدنی پر ٹیکس ادا کر دو وہ قانونی آمدن بن جائے گی) بلکہ اسلام تو کہتا ہے کہ جو مال تم نے ناجائز ذریعے سے حاصل کیا ہے اُسے وہیں واپس کر دو جہاں سے لیا ہے اور جن لوگوں سے لیا ہے۔

زکوٰۃ سے مال میں افزائش ہوتی ہے

زکوٰۃ سے مال بڑھتا ہے نشو و نما پاتا ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے ــــ

ہو سکتا ہے بعض لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہو کہ بظاہر زکوٰۃ سے مال میں کمی آنی چاہیے تو زیادتی اور افزائش کی کیا صورت ہوتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے سے مال میں جو کمی ہوتی ہے وہ ظاہری ہے ورنہ فی الواقع زکوٰۃ سے مجموعی مال میں بھی اور خود مالدار شخص کے مال میں بھی اضافہ ہوتا ہے کہ تھوڑی سی مقدار زکوٰۃ کی دے کر ایسے طریقوں سے جن کا احساس تک نہیں ہوتا مال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

دورِ جدید میں تو ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک کو مالی امداد دیتے ہیں جو اس لیے نہیں کہ یہ حکم الٰہی ہے بلکہ اس لیے دیتے ہیں تاکہ غریب ملکوں میں ان کی مصنوعات کی خرید کی قوت پیدا ہو جائے (اور بالآخر انھوں نے جو مالی امداد دی ہے وہ مع منافع ان کو واپس پہنچ جائے۔)

نفسیاتی لحاظ سے بھی جو روپیہ انفاق کے لیے ہاتھ میں ہوگا، اس سے لوگ مانوس ہوں گے اور دعائے خیر کریں گے اور اس بنا پر یہ روپیہ ان کئی روپوں سے زیادہ عملی قوت کا حامل ہوگا جو کسی کی تجوری میں پڑے ہوں گے۔

قرآن نشوو افزائش کے اسی اقتصادی پہلو کی جانب اشارہ فرماتا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (سبا: ۳۹)

جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ: ۲۶۸)

شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے، اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم: ۳۹)

اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (البقرہ: ۲۷۶)

اللہ سُود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

اس نشوونما اور افزائش کے بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں جن کو اللہ ہی جانتا ہے بہرحال زکوٰۃ دہندہ کے مال میں برکت ہوتی ہے اور اللہ اپنا فضل فرماتا ہے کہ اللہ ہی بہت فضل فرمانے والا ہے۔

مزید برآں یہ کہ ہر سال مالدار کے مال میں جو حصہ بطورِ زکوٰۃ لیا جاتا ہے یہ اس کے لیے اس امر میں کشش پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو یونہی پڑا نہ رہنے دے کہ زکوٰۃ اُسے کھا جائے بلکہ اسے بڑھانے اور افزائش دینے کی سعی کرے اور پھر یہ مال دگنا اور چوگنا ہو کر اس کے پاس واپس آئے۔

بحث دوم

زکوٰۃ وصول کنندہ پر زکوٰۃ کا اثر

اگر وصول کنندہ کے لحاظ سے زکوٰۃ کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ زکوٰۃ انسانی شرافت کے پامال ہونے سے لوگوں کو محفوظ رکھتی ہے اور کشاکش حیات میں ان کی علمی اور نفسیاتی مدد کرتی ہے کہ زکوٰۃ لینے والے افراد یہ ہوتے ہیں اور زکوٰۃ ان کی معاون بنتی ہے۔

فقیر (تنگ دست) جس کو تنگدستی نے عاجز کر دیا ہو۔
مسکین جس کی مسکنت نے اُسے خاک میں ملا دیا ہو۔
غلام، جسے غلامی نے بے وقعت کر دیا ہو۔
مقروض جس کی قرض نے کمر ہمت توڑ دی ہو۔
مسافر جو اپنے گھر والوں سے اور اپنے مال سے بچھڑ کر مایوس ہو گیا ہو۔

زکوٰۃ وصول کنندہ کو زکوٰۃ حاجتوں سے نجات دلاتی ہے

اسلام چاہتا ہے کہ انسان خوش باش، عمدہ اور مطمئن زندگی گزاریں، اللہ سبحانہٗ کی نازل کردہ نعمتوں سے لطف اندوز ہوں، اس کا پیدا کیا ہوا رزق کھائیں اور ان کے قلوب سعادت سے، ان کے دل سکون سے ان کے جسم راحت سے اور ان کے شعور نعمت حیات سے بہرہ ور ہوں۔

اسلام کی نظر میں اس سعادتِ انسانی میں مادی ضروریات اور ان کی تکمیل اہمیت رکھتی ہے چنانچہ فرمان نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ

"تین امور سعادت (خوش بختی) کے ہیں، تمہاری بیوی کہ جب اسے دیکھو

تو دلکش معلوم ہو، اور جب اس سے دور ہو تو وہ تمہارے جان و مال کی محافظ ہو، تمہاری سواری جو تمہاری تابع ہو اور تمہیں ساتھیوں سے ملا دے، اور گھر جو وسیع ہو اور سہولتوں کا حامل ہو۔"

ایک اور حدیث میں ہے۔

"چار امور سعادت کے ہیں: نیک بیوی، بڑا گھر، اچھا پڑوسی، عمدہ سواری اور چار باتیں بدبختی کی ہیں، بری بیوی، برا پڑوسی، بری سواری اور تنگ مکان۔"

ان احادیث میں زندگی کے حقائق کو بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے بیان کر دیا گیا ہے کہ ازدواجی زندگی، ذرائع آمد و رفت آرام دہ گھر اور اچھے پڑوسی انسان کی خوشی و مسرت اور اس کی سعادت پر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں، اور اس حقیقت پر خود انسان کی زندگی شاہد عدل ہے۔

بلاشبہ اسلام یہی چاہتا ہے کہ افراد معاشرہ خوش بختی اور سعادت کی زندگی گزاریں اور فقر و تنگدستی سے محفوظ رہیں اور بالخصوص اسلام اس فقر و محتاجی کو سخت ناپسندیدہ قرار دیتا ہے جس کا سبب غلط اقتصادی تقسیم، افراد معاشرہ کا ایک دوسرے پر ظلم اور ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی ہو۔

اسلامی نظام اقتصاد اور مادی معاشی نظاموں میں فرق یہ ہے کہ مادی نظاموں کا مطمح نظر صرف پیٹ کا بھرنا اور جنسی تسکین ہوتا ہے اور ان کا دائرۂ ہدف مادی منفعتوں اور ارضی لذتوں اور دنیاوی آسائشوں تک محدود ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی اور ہدف TARGET ان کے پیش نظر نہیں ہوتا جبکہ انسانوں کو دنیاوی عیش و آرام بہم پہنچانے سے اسلام کے پیش نظر یہ مقصود ہے کہ وہ اپنی روح کے ساتھ اپنے رب کی جانب متوجہ رہیں اور کہد عیش اور فکر معاش انھیں اللہ سے اور فکر آخرت سے غافل کرنے والی نہ بن جائے، کیونکہ انسانوں کو اگر کفایتِ رزق حاصل ہو جائے اور اطمینانِ حیات نصیب ہو جائے تو وہ اپنے پروردگار کی بندگی کی جانب زیادہ عاجزی سے متوجہ ہوں گے کہ اس رب کریم نے

انھیں بھوک میں کھلایا اور خوف سے امن دیا۔

اسلام رفاہیت کو پسند کرتا اور فقر کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ احسان فرمایا کہ

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (الضحیٰ : ۸)

اور تمھیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا۔

اور بعد ہجرت مدینہ منورہ مسلمانوں پر احسان کرتے ہوئے فرمایا۔

فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (الانفال : ۲۶)

پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمھارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمھیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے۔

اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْهُدَىٰ وَالتُّقَىٰ وَالْعَفَافَ وَالْغِنَىٰ

(مسلم، ترمذی، ابن ماجہ بروایت حضرت ابن مسعودؓ)

(اے اللہ میں تجھ سے ہدایت تقویٰ عفت اور تونگری کا سوال کرتا ہوں)

نیز آپ نے غنی شاکر کی فقیر صابر پر فضیلت بیان فرمائی۔

قرآن کریم نے خوش حالی اور اچھی زندگی کو اللہ سبحانہ کا مومنین پر انعام قرار دیا اور فقر اور تنگی حیات کو کافروں اور فاسقوں کی سزائے دنیاوی کے طور پر بیان فرمایا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً (النحل : ۹۷)

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (الاعراف : ۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق : ۲،۳)

جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستہ سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً اٰمِنَةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۔

(النحل : ۱۱۲)

اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔

حضرت آدمؑ اور ان کی اہلیہ کے زمین پر آتے ہی انھیں اس سنتِ الٰہی سے آگاہ کیا گیا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى

(طٰہٰ : ۱۲۳،۱۲۴)

تم دونوں (فریق یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اب اگر میری طرف سے تمھیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری

اس بات کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا اور جو میرے ذکر (درس نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ تصوف کی جولانگاہ میں فقیری کے خوب ہونے اور تونگری کے ناخوب ہونے سے متعلق افکار غیر اسلامی ہیں جو ایران کے مانوی عقائد، ہندوستان کے ترکِ دنیا اور عیسائیت کے رہبانیت کے تصورات سے آئے اور اسلامی تصوف میں داخل ہو گئے۔[1]

اللہ سبحانہٗ نے مذکورہ بالا مقاصد کے لیے زکوٰۃ فرض فرمائی کہ امیروں سے لی جائے اور غریبوں کو دی جائے، تنگدست اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرے، رہائش کھانے پینے اور ازدواجی ضرورت کی تکمیل کا انتظام کرے کہ یہ اس کی جسمانی اور مادی ضرورتیں ہیں اسی طرح اس کی معنوی فکری ضرورت بھی پوری کی جائے مثلاً اگر اہلِ علم ہے تو اسے کتابیں فراہم کی جائیں۔

جب اس نہج پر معاشرے کے فقیر (نادار) فرد کی ضروریات پوری ہو جائیں گی تو وہ بھی زندگی میں عملاً شریک ہو جائے گا اور معاشرے میں اپنے آپ کو ایک متحرک فرد محسوس کرے گا اور اس کا یہ احساس ختم ہو جائے گا کہ وہ معاشرے کا کوئی ضائع، نکما اور بے کار حصہ ہے بلکہ اسے یہ احساس ہوگا کہ وہ پاکیزہ اور صاف ستھرے انسانی معاشرے میں زندگی گزار رہا ہے جو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بغیر جتلائے اور بغیر احسان کیے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے اور اسے سہارا دے رہا ہے اور اس کی عزت نفس برقرار ہے، اس کا سر بلند ہے، اس کی شرافت انسانی محفوظ ہے، اس لیے کہ جو کچھ اُسے دیا جا رہا ہے وہ اس کا حق ہے اور حکومت اور معاشرہ اسے اپنی طرف سے بھیک نہیں دے رہا ہے بلکہ اس کا حق اسے ادا کر رہا ہے۔

---

[1] مصنف کی کتاب "مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام، باب نظرۃ الاسلام الی الفقر۔

اگر مسلم معاشرہ ریاست کی صورت میں باقی نہ رہے اور اسلامی ریاست کے بجائے مسلمان افراد ادائے زکوٰۃ کے ذمے دار بن جائیں تو بھی قرآن نے ان کو متنبہ کیا ہے کہ وہ فقیر (تنگدست) کو ذلیل نہ کریں اس پر احسان نہ کریں اور اپنے آپ کو اس سے بلند تر نہ سمجھیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا (البقرہ : ۲۶۴)

اے ایمان لانے والو اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملادو جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔

غرض فقیر اور ضرورتمند کا یہ احساس کہ وہ اس معاشرے میں ضائع اور بے کار نہیں ہے بلکہ معاشرہ اس کا خیال رکھتا ہے اور اس کی جانب توجہ دیتا اور اس کے وجود کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ احساس فقیر بے مایہ کی شخصیت کو سنبھالنے اور اس کے نفسیاتی وجود کو سہارا دینے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس احساس سے بالآخر تمام قوم مستفید ہوتی ہے۔

اللہ سبحانہ نے انسان کو انسانیت کا جو شرف عطا کیا ہے اور مقام عزت عطا کیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی انسان کو ایسی کس مپرسی میں نہ چھوڑا جائے جو اسے اس کی ذات اور اس کے خدا کو فراموش کرنے کا ذریعہ بن جائے اور اس کی زندگی کا مطمح نظر صرف بھوک کا مٹانا، برہنہ جسم کا ڈھانپنا اور رات گزارنے کا ٹھکانا تلاش کرنا بن جائے۔

سید قطب شہیدؒ اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

"اسلام تنگدستی اور ضرورتمند ہونے کو ناپسند کرتا ہے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ

لوگ مادی ضرورتوں سے بلند ہوں اور انسانیت اور انسانی عظمتوں کے حامل امور انجام دیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (الاسراء : ۷۰)

یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

اللہ سبحانہ نے انسان کو عقل جذبات اور روحانی میلانات عطا فرما کر اسے فضیلت عطا کی ہے اور ان امور کے ذریعے اسے اس کی جسمانی ضروریات سے بلند کر دیا ہے۔ اگر انسان کو ضروریات زندگانی ہی میسر نہ ہوں تو وہ اپنا وقت ان فکری جولان گاہوں اور روحانی میلانات میں صرف نہیں کر سکے گا بلکہ کشاکش حیات اسے مقام انسانیت سے گرا کر مرتبۂ حیوانیت پر لے آئے گی، بلکہ حیوانات تو اپنا رزق حاصل کر ہی لیتے ہیں اور اس کے بعد زندگی سے پوری طرح لطف اندوز بھی ہوتے ہیں کہ جانور اچھلتے کودتے اور پرندے چہچہاتے ہیں۔

اگر انسان کی ضروریات زندگانی اسے اس قابل بھی نہ چھوڑیں کہ وہ حیوانات کی سی یہ خوشی حاصل کرے تو پھر انسان کی کرامت وعظمت کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کا اپنے تمام اوقات معاش ہی میں کھپا دینا اور پھر بھی بقدر کفایت حاصل نہ کر سکنا ہی وہ مصیبت عظمیٰ ہے جو انسان کو اللہ کے عطا کردہ مدارج سے گرا دیتی ہے اور بتلاتی ہے کہ جس معاشرے کا وہ فرد ہے وہ ایک پست معاشرہ ہے، کیونکہ ایسا ہونا ارادۂ الٰہی کے خلاف ہے۔

انسان اس رُو سے زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اسے اللہ نے اس لیے

خلیفہ بنایا ہے کہ وہ زندگی کو پروان چڑھائے اور نشوونما دے اسے ترو تازہ اور دلکش بنائے اور اس کی خوبصورتی اور رعنائی سے لطف اندوز ہو اور پھر اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ اور انسان اس مقام شکر پر اس صورت میں نہیں پہنچ سکتا جبکہ اس کی زندگی ایک لقمہ خوراک کی تلاش میں ختم ہو جائے۔"

زکوٰۃ حسد اور بغض سے نجات دلاتی ہے

زکوٰۃ، وصول کنندہ کو بھی بغض و حسد کی بیماریوں سے نجات دلاتی ہے کیونکہ جو انسان بھوک کے شکنجے میں کسا ہوا ہو اور اس کے گردو پیش لوگ زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں لیکن اس کی جانب دست تعاون نہ بڑھا رہے ہوں، اس کا نفس بغض و حسد کی بیماری سے نہیں بچ سکتا کہ بخل اور خود پرستی ہر ذی نعمت کے حق میں حسد پیدا کرتے ہیں۔

اسلام لوگوں کے مابین تعلقات کو اخوت کی اساس پر قائم کرتا ہے کہ انسانیت کا اشتراک بھی ہے اور عقیدے کا اشتراک بھی۔

کُونُوا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا

سب مسلمان، اللہ کے بندے اور باہم بھائی بھائی ہو جاؤ۔

(صحیح مسلم از ابو ہریرہؓ)

اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔[1] (صحیح بخاری و مسلم)

یہ بھائی چارہ ایسی صورت میں وجود میں نہیں آسکتا کہ ایک بھائی کا پیٹ بھرا ہو اور دوسرے بھوکے ہوں جو اس کی جانب دیکھ رہے ہوں اور کوئی دست اعانت دراز نہ

---

[1] بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے، مسلمؒ نے عقبۃ بن عامر سے اور ابوداؤد نے عمرو بن الاحوص اور قیلۃ ابنۃ مخرمہ سے روایت کیا ہے (کشف الخفاء، ج ۲ / ۲۱۰)

کر رہا ہو۔ یہ صورتِ حال تو اخوت کے روابط کو کاٹ ڈالے گی اور فقیر بے مایہ کے دل میں غنی عیش کوش کے خلاف نفرت کی چنگاریاں اور حسد کی آگ بھر دے گی.... اور یہی وہ چیز ہے جس سے اسلام روکنا چاہتا ہے، کیونکہ بغض وحسد ایسی بیماریاں اور ایسی مہلک آفتیں ہیں جو معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔

حسد کی عادت دین کے لحاظ سے بھی نقصان دہ ہے کہ حاسد کا اللہ کی تقسیم رزق کے بارے میں عقیدہ درست نہیں رہتا اور لوگوں کے درمیان اس اجتماعی ظلم کا بوجھ اسے بھی اٹھانا پڑتا ہے قرآن کریم یہود کے بارے میں فرماتا ہے۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ

(النساء : ۵۴)

پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے نواز دیا۔

بغض وحسد اور کینہ انسان کے روحانی اور جسمانی وجود کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور سماج کے مادی اور معنوی وجود کو کھوکھلا کر دیتا ہے کیونکہ جس انسان کے قلب میں بغض و حسد اور کینہ جاگزیں ہو چکا ہو وہ انسان کامل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ایک ہی قلب میں اللہ پر ایمان اور اللہ کے بندوں پر حسد جمع نہیں ہو سکتے۔

حسد اور نفرت جس طرح نفسیاتی بیماریاں ہیں اسی طرح جسمانی بھی ہیں کہ اس حسد و نفرت کی وجہ سے بڑے مہلک امراض ــ مثلاً معدے کے زخم اور خون کا دباؤ ــ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز حسد اور نفرت معاشرے کی پیداوار اور اس کی اقتصادیات کے لیے بھی نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ حسد اور نفرت کرنے والے کی کارکردگی گھٹ جاتی ہے کہ اس کی قوتِ جسمانی کا ایک حصہ بغض وحسد اور کینہ میں ضائع ہو جاتا ہے، اسی لیے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بیماریوں کو داء الامم (قوموں کی بیماری) قرار دیا ہے اور اُمتِ مسلمہ کو اس امر پر تنبیہ کیا ہے کہ کہیں یہ زہریلے سانپ بچھو اس اُمت کو نہ ڈس لیں۔ فرمایا۔

"بغض وحسد تمہاری پچھلی اقوام کی بیماریاں کہیں رینگ کر تمہارے اندر نہ داخل ہو جائیں، اور بغض تو دین ہی کو مٹا دیتا ہے" [1]

اسلام نے ان خطرناک اجتماعی اور نفسیاتی بیماریوں کے خلاف محض فکری جہاد نہیں کیا ہے اور صرف وعظ و تلقین ہی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان بیماریوں کے اسباب کو ختم کرنے کی تدابیر کی ہیں اور ایسی تدابیر اختیار کی ہیں جن سے یہ بیماریاں معاشرے کی جڑوں سے اکھاڑ کر پھینکی جاسکیں کیونکہ محروم بھوکے ننگے شخص کو محض حسد اور کینہ کی برائی بیان کر دینا کافی نہیں ہے۔ درانحالیکہ اس کے گرد و پیش میں مترفین اور متنعمین اسے دوسرے ہی درس دے رہے ہوں اور اسے بتلا رہے ہوں کہ وہ کس طرح حسد کرے؟ کس طرح بغض اختیار کرے؟ کس طرح کینہ اختیار کرے؟ اور کس طرح دل کی بھٹی میں نفرت عداوت حسد اور کینہ کی آگ بھڑکائے؟

اسلام نے انہی بیماریوں کے خاتمہ کے لیے زکوٰۃ فرض کی ہے تاکہ بے روزگار کو کام میسر آجائے، فرومایہ کو اسباب عیش فراہم ہو جائیں، مقروض کا قرض اتر جائے اور مسافر اپنے وطن پہنچ جائے، ہر تنگدست و محتاج کو یہ احساس ہو کہ معاشرے کے افراد اس کے بھائی اور اس کے معاون ہیں اور ضرورت و حاجت کے وقت ان کے مال میں اس کا بھی حصہ ہے اور اگر وہ کمزور ہی ہیں ہو تو اس کے (مسلمان) بھائی کی قوت اس کی قوت ہے اور اگر وہ تنگدستی میں گھر جائے تو اس کے (مسلمان) بھائی کا مال اس کی مدد کا ذریعہ ہے

اس حب و ایثار اور تعاون و ہمدردی کی فضا اسلام اپنا سایہ افراد معاشرہ پر دراز کرتا ہے۔ کہ فرمان نبوت ہے۔

"اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے" [2]

●

---

[1] بزار، بیہقی (الترغیب والترہیب ج ۴، ص ۱۱)

[2] احمدؒ بخاریؒ و مسلمؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، از حضرت انسؓ، (الجامع الصغیر)

فصل دوم

اجتماعی زندگی پر زکوٰۃ کے اثرات

مقاصد زکوٰۃ کا اجتماعی پہلو بالکل ظاہر اور نمایاں ہے اور اگر ہم مصارف زکوٰۃ پر نظر ڈال لیں تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ (التوبہ : ٦٠)

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور مسافر نوازی اور راہِ خدا میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مصارف ایسے ہیں جو دینی اور سیاسی پہلو لیے ہوئے ہیں جیسے مؤلفۃ القلوب اور فی سبیل اللہ۔

ان دونوں مصارف کا تقاضا یہ ہے کہ دین کا ایک اجتماعی نظام اور ریاست ہو جو عاملین علیہا کے توسط سے جملہ زکوٰۃ دہندگان سے زکوٰۃ وصول کرے اور اس حاصل شدہ زکوٰۃ کو دعوتِ اسلام کے فروغ اس کے کلمہ کو بلند کرنے اور اس کی مدافعت کرنے پر صرف کرے یعنی غیر مسلموں کی تالیف قلب کر کے ان کو دعوتِ اسلام دی جائے۔

ہم ان دونوں مصارف کے بارے میں پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں وہاں اس

کو دیکھا جائے یہاں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان معاشرے اور اُمّتِ مسلمہ کا زکوٰۃ سے روحانی اور اخلاقی تعلق کیا ہے۔

زکوٰۃ اور اجتماعی ضمانت

ان مقاصد میں بعض ایسے ہیں جن میں اجتماعی رنگ موجود ہے جیسے ذوی الحاجات کی مدد کرنا اور فقراء، مساکین، مقروض، مسافروں اور دیگر حاجتمندوں کو مدد بہم پہنچانا، تعاون کی یہ صورت انفرادی بھی ہے کہ ان ضرورتمند افراد کی جُدا جُدا امداد ہوتی ہے اور یہ پورے معاشرے سے بھی تعاون ہے کہ پورے معاشرے کے ایک مشترک وجود کی حیثیت میں اعانت ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ فرد اور معاشرے کی حدود ایک دوسرے میں داخل ہیں اور معاشرہ فی الواقع افراد کے اجتماع ہی کا نام ہے اس لحاظ سے فرد کی تقویت اور اس کی مادی اور معنوی صلاحیتوں میں اضافہ معاشرے کی تقویت اور اس کو فروغ دینا ہے، اور معاشرے پر اثرانداز ہونے والا ہر امر فرد پر بھی اثرانداز ہوتا ہے خواہ افراد کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔

بلاشبہ بے کار آدمی کو کام دلوانا، عاجز کی مدد کرنا، محتاج کی اعانت کرنا اور فقیر و مسکین اور مقروض کی ضرورتیں پوری کرنا اجتماعی مقاصد ہیں اور ان کی تکمیل سے معاشرے میں اجتماعی کفالت کا نظام بحال ہوتا ہے اور اجتماعیت کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان وصول کنندگان کی ضرورتوں کے پورا ہو جانے کے لحاظ سے انفرادی مقاصد بھی بروئے کار آجاتے ہیں۔

زکوٰۃ اسلام کے اجتماعی نظام کفالت کا ایک حصہ ہے، اس کفالت سے عرب بہت ہی محدود سے دائرے میں متعارف تھے یعنی وہ معیشت کے دائرے میں عاجز اور تنگدست لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے لیکن اسلام کی اجتماعی کفالت کا تصور اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے اور زندگی کے جملہ مادی اور معنوی پہلوؤں کو محیط ہے کہ اس اجتماعی کفالت میں اخلاقی کفالت، علمی کفالت، سیاسی کفالت، دفاعی کفالت فوجداری کفالت، فنی کفالت، اقتصادی کفالت، عبادتی کفالت، تہذیبی کفالت اور معاشی کفالت غرض کفالت کے تمام پہلو اسلام کے نظام کفالت میں داخل ہیں، جبکہ دور

جدید میں صرف معاشی کفالت کو اجتماعی کفالت کہا گیا ہے جو کہ غلط ہے[۱]

غرض اسلام کا نظام کفالت صرف زکوٰۃ میں محدود نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ اس اجتماعی کفالت کا ایک بڑا اور اہم شعبہ ہے جبکہ اجتماعی کفالت کا نظام حیات انسانی کے جملہ پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

زکوٰۃ کو ہم جدید مصطلحات کے لحاظ سے اجتماعی تامین اور اجتماعی ضمانت کہہ سکتے ہیں، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ تامین (انشورنس) میں تو ہر شخص اپنی آمدنی کا ایک حصّہ جمع کراتا ہے اور اس کے بدلے اس کے دائمی طور پر یا وقتی طور پر عاجز ہونے کی صورت میں اس کی کفالت ہوتی ہے، جبکہ ضمانت میں، معاشرہ کے اپنی آمدنی سے کوئی حصّہ دیئے بغیر ہی ریاست عام بجٹ سے افراد کی کفالت کی ضمانت دیتی ہے۔

جو لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں ممکن ہے کہ وہ آئندہ سالوں میں زکوٰۃ نہ دے سکیں اور کچھ مصائب کے آجانے سے ان کی ملکیت ضائع ہو جائے جس سے وہ مقروض ہو جائیں یا اپنے مال اور وطن سے منقطع ہو جائیں یا ان کا مال ان کی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے ناکافی ہو جائے اور اس طرح وہ خود زکوٰۃ کے مستحق بن جائیں، ان لوگوں کے لحاظ سے زکوٰۃ اجتماعی تامین ہے۔

اور وہ لوگ جن پر کبھی زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی اور انھوں نے کبھی زکوٰۃ نہیں دی لیکن وہ اپنے فقر و حاجت کی بنا پر زکوٰۃ کے مستحق ہیں، اس لحاظ سے یہ اجتماعی ضمان ہے[۲]

واقعہ یہ ہے کہ زکوٰۃ تامین کی بہ نسبت اجتماعی ضمانت سے زیادہ قریب

۱۔ ملاحظہ کیجیے: الدکتور مصطفیٰ السباعی، اشتراکیۃ الاسلام، ط۔ دمشق۔

۲۔ سید قطب: فی ظلال القرآن، ج ۱۰، ص ۸۱۔

ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے سے ضرورتمند فرد کو وہی کچھ نہیں ملتا جو اس نے پہلے دیا ہو بلکہ جس قدر اسے ضرورت ہوتی ہے اتنا ملتا ہے خواہ کم ہو یا زیادہ۔

اس لحاظ سے اسلام کا نظام زکوٰۃ ، اجتماعی ضمانت کے سلسلے کا اوّلین قانون ہے جو محض نفلی صدقات (تبرعات) پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ ہر ضرورتمند کی ضرورت پوری کرنے کا حکومت کی سطح پر ایک نظام قائم کرتا ہے جس کے تحت معاشرے کے ہر فرد کو لباس، غذا، رہائش اور ضروریات فراہم کی جا سکیں اور کوئی فرد اور اس کا خاندان ضروریاتِ زندگانی سے محروم نہ رہے۔

زکوٰۃ انفرادی عجز، اجتماعی اختلال اور حالات و حوادث کے تحت پیدا ہونے والی تمام ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔ چنانچہ امام زہریؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنے مکتوب میں بمقتضائے سُنّت زکوٰۃ کے مصارف کو اس طرح بیان فرمایا۔

"زکوٰۃ میں اپاہج اور لاچار لوگوں کا بھی حق ہے۔ ہر اس مسکین کا بھی حق ہے جو ایسی بیماری میں مبتلا ہو جو اسے کسبِ معاش سے عاجز کر دے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے، اس مسکین کا حق ہے جو بقدر کفایت اپنی خوراک کا سوال کرے، ان کا بھی حصّہ ہے جو اہلِ اسلام میں سے سجن میں ہوں اور ان مساکین کا حصّہ ہے جو مساجد میں حاضر ہوں اور ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور جو لوگوں کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتے ہوں، ان لوگوں کا بھی حصّہ ہے جو تنگدستی کا شکار ہوں اور ان پر قرض ہو اور انھوں نے کسی کارِ معصیت کے لیے قرض نہ لیا، اور اس مسافر کا حصّہ ہے جس کا کوئی ٹھکانا نہ ہو، ایسے مسافر کو بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے کہ اسے کھانا کھلایا جائے اور اس کی سواری کو چارہ دیا جائے تاآنکہ وہ اپنے گھر پہنچ جائے اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے" [1]

---

[1] الاموال، ص ۵۷۸، ۵۸۰۔

غرض زکوٰۃ ایک مکمل اجتماعی ضمانت کا نظام ہے اور اس کے ذریعہ اہل ضرورت کی تمام جسمانی، نفسیاتی اور عقلی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، جیساکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ازدواج اور کتب علم کی فراہمی بھی ایسی ضروریات میں جن کی تکمیل زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے۔

مزید برآں اسلام کا نظام زکوٰۃ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہود اور نصاریٰ تمام لوگوں کو شامل ہے جو اسلامی ریاست میں رہتے ہوں، جیساکہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک یہودی دست سوال دراز کر رہا تھا، حضرت عمرؓ نے اس کی بیت المال سے کفالت کا حکم دیا اور اس کو ایک قابل تقلید مثال بنا دیا[1] اسی طرح جب حضرت عمرؓ نے اپنے دمشق کے سفر میں نصرانیوں کی ایک جماعت کو دیکھا تو آپؓ نے ان کے لیے بیت المال سے وظائف مقرر کرنے کا حکم دیا۔[2]

اس طرح کی اجتماعی ضمانت تک فکرِ مغرب کی رسائی بھی ابھی قریب کے عہد میں ہوئی ہے اور اس جانب مغرب کو خدا ترسی اور کمزوروں کی ہمدردی نے متوجہ نہیں کیا ہے بلکہ خونی انقلابات اور اشتراکیت اور اشتمالیت کی طوفانی موجوں نے کیا ہے۔

نیز مغرب اس جانب دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے مائل ہوا ہے کہ اس جنگ نے یورپ کو مجبور کر دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے عوام کو راضی رکھے کہ وہ اختتام جنگ تک جان و مال کی قربانی دیتے رہیں۔

اس اجتماعی کفالت کا اولین مظاہرہ انگلستان اور امریکہ کے درمیان ہونے والے میثاق اطلنطی ۱۹۴۱ء میں ہوا جس میں افراد کی اجتماعی کفالت کی ضمانت دی گئی۔[3]

مگر اس کے باوجود یورپ کی رسائی تاہنوز اس قدر جامع نظام ضمانت کی جانب نہیں ہو سکی ہے جس کا تصور اسلام نے دیا ہے کہ ہر شہری اس ضمانت میں شامل ہے،

---

[1] ایضاً، ص ۴۶۔

[2] تاریخ البلاذری، ص ۱۷۷۔

[3] ڈاکٹر صادق مہدی، الضمان الاجتماعی، ص ۱۲۶۔

اور ہر شہری کی اور اس کے اہل خانہ کی بنیادی ضروریات کی تکمیل ریاست کی ذمے داری ہے اور بقول امام شافعیؒ فقراء (تنگ دستوں) کی پوری زندگی کی کفایت کے بقدر فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے زکوٰۃ، امداد اور اعانت سے مستغنی ہو جائیں۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اسلام نے موجودہ ترقی یافتہ ممالک سے صدیوں پہلے اجتماعی ضمانت کا نظام قائم کیا، جسے دین نے فرض قرار دیا، ریاست نے اس کا انتظام سنبھالا اور مالداروں کے چنگل سے غریبوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے جہاد کیا گیا ـــــ اس کے باوجود اہلِ قلم یورپ کے نظام کفالت کے محاسن گناتے نہیں تھکتے۔ اور اسلام کی زرّیں تاریخ کا انھیں ایک صفحہ بھی یاد نہیں آتا!

چنانچہ عرب یونین (جامعۃ الدول العربیہ) نے ۱۹۵۲ء میں دمشق میں اجتماعی مطالعہ کے اجلاسات میں ایک اجلاس اجتماعی کفالت کے موضوع پر منعقد کیا تو اس میں اس اجلاس کے صدر (مسٹر دائیل الیس جیرج) نے اجتماعی کفالت کے ارتقاء پر اپنے مقالے میں کہا کہ ـــــ ادوارِ ماضیہ میں ضرورتمندوں کے سامنے ماسوا دست سوال دراز کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا اور وہ بھیک مانگ کر اپنی زندگی بچانے پر قادر ہوتے تھے تا آنکہ سترھویں صدی عیسوی میں ضرورتمندوں کی کفالت کے لیے حکومت کی سطح پر تدابیر کا آغاز ہوا اور مقامی تنظیموں کے ذریعے محتاجوں کی اعانت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۔ ۔ ؛[۱]

یہ بیان اسلام سے اور اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت کا ایک شاہکار ہے کہ اس میں اسلام کے نظام زکوٰۃ کو بالکل نظر انداز کر دیا[۲] حالانکہ اسلام کا نظام زکوٰۃ کلیۃً حکومتی

---

[۱] حلقۃ الدراسات الاجتماعیہ، الدورۃ الثالثۃ، ص ۲۱۷۔

[۲] یورپ نے ہر علم و فن کی تاریخ میں یہی رویہ اختیار کیا ہے کہ یورپ کی تاریخ کو پوری دنیا کی تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے اور اسلام کے دور کو بالخصوص نظر انداز کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم اہلِ علم ہر فن کی تاریخ اسلام کے نقطۂ نظر سے مرتب کریں اور اس تصوّر کو فکری میدان میں باطل قرار دیں۔ (س۔ صدیقی)

سطح پر وجود میں آتا ہے اور یہ کہ یہ کوئی انفرادی احسان اور تبرعات کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ اہلِ ضرورت کا ایک متعین حق ہے جو دولتمندوں کے مال پر بطور ٹیکس عائد ہوتا ہے، اور اسلامی حکومت اس ٹیکس کو وصول کرتی اور تقسیم کرتی ہے۔ لیکن زکوٰۃ ٹیکس سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ زکوٰۃ ہر حال میں قائم رہتی ہے اور لازم رہتی ہے یعنی اگر کوئی مُسلم حکومت زکوٰۃ کی وصولیابی کی ذمے داری نہ سنبھالے تو بھی ہر مسلمان کے ذمّے زکوٰۃ بدستور لازم رہتی ہے اور اس کی ادائیگی کے بغیر اس کا ایمان درست نہیں ہے یعنی اسے اپنے رب کی رضا کے حصول، اپنے نفس کے تزکیہ اور اپنے مال کی تطہیر کے لیے زکوٰۃ دینا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ اپنی طیبِ خاطر سے دے اور کسی پر احسان نہ کرے اور جو ضرورتمند اس صُورت میں زکوٰۃ لے گا وہ بھی اس علم کے ساتھ لے گا کہ جو مال اللہ نے اپنے بندوں کو دیا ہے اس میں اس کا بھی حق ہے اور یہ کہ پوری اجتماعی زندگی پر لازم ہے کہ وہ ضرورتمندوں کا یہ حق معلوم اُنھیں دلوائے۔

زکوٰۃ بطور اقتصادی مہمیز

جیساکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ بطور ایک اقتصادی مہمیز کے اثرانداز ہوتی ہے اور جو مال ـــــ صاحب ثروت سے ـــــ زکوٰۃ کی حیثیت میں لیا جاتا ہے وہ اس کو اس امر پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ مزید جدوجہد کرے اور اکتساب رزق کی سعی کرے۔

نقود (زرِ نقد) کی زکوٰۃ میں یہ حقیقت زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ اسلام نے کنز کو حرام قرار دیا ہے اور اس امر کو ناجائز قرار دیا ہے کہ زرِ نقد روک لیا جائے اور اس کو گردش میں نہ آنے دیا جائے، چنانچہ اس کنز بنا لینے پر اللہ سبحانہ نے قرآن کریم میں وعید بھی فرمائی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (التوبہ: ۳۴)

دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

قرآن کریم نے کنز بنانے پر اس شدید وعید ہی پر اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ عملی جنگ کا اعلان کیا ہے اور ایسی تدابیر اختیار کی ہیں جن سے تجوریوں اور الماریوں سے سونا چاندی باہر آسکے۔ اسی لیے زرِ نقد پر ڈھائی فی صد (۲٫۵٪) زکوٰۃ فرض قرار دی ہے، خواہ مالک نے ان نقود کو آمدنی کے حصول میں لگایا ہوا ہو یا نہ لگایا ہوا ہو۔ گویا زکوٰۃ زرِ نقد کو تجوریوں سے باہر نکال کر لاتی ہے تاکہ وہ اکتساب نشوونما اور افزائش میں کام آتے اور یہ نہ ہو کہ سالہا سال گزرتے جائیں اور وہ سرمایہ یوں ہی پڑا رہے۔ چنانچہ احادیث اور آثار میں ہے کہ

"یتیموں کے مال سے تجارت کرو تاکہ وہ زکوٰۃ ہی میں ختم نہ ہو جائے۔"

ہم نے زکوٰۃ نقود (زرِ نقد) میں اس موضوع کو بالتفصیل بیان کر دیا ہے اور راس المال پر فرضیت زکوٰۃ کی حکمت بھی بیان کر دی ہے۔

زکوٰۃ اور امّت مسلمہ کی روحانی خصوصیات

جن اہم مقاصد اور جن بلند ترین اہداف کے لیے امّت مسلمہ وجود میں آتی ہے زکوٰۃ ان کی تکمیل میں بھی معاون ہوتی ہے کہ امّت مسلمہ کی تشکیل اور نشوونما انہی خصوصیات پر ہوتا ہے۔

استاذ البہی الخولی فرماتے ہیں کہ

امّت مسلمہ کے وجود کی کچھ معنوی اور روحانی خصوصیات ہیں، کیونکہ کوئی بھی قوم حسّی خصوصیات کے طفیل وجود میں نہیں آتی بلکہ لامحالہ اس کی کچھ نہ کچھ روحانی اور معنوی خصوصیات ہوتی ہیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے ان خصوصیات کی جانب بڑی توجہ کی ہے اور معاشرہ پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے انفاق کرے اور افراد معاشرہ پر صرف کرے کہ یہ امر قوم کی اجتماعی زندگی کیلیے اسی طرح لازمی ہے جس طرح اس کی حیات حسّی کے لیے کھانا پینا لازم ہے۔

اسلام نے ان روحانی خصوصیات کے تین اصول بیان کیے ہیں جن کی

جانب آیت مصارف زکوٰۃ سے اشارہ ملتا ہے۔

پہلا اصول : ۔ تمام افراد معاشرہ کو آزادی حاصل ہو، چنانچہ اس آیت میں اُمّت مسلمہ پر یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ غلاموں کی گردنیں چھڑائے اور انھیں غلامی کے شکنجے سے آزاد کرائے۔ تاریخ انسانیت میں یہ غلاموں کی آزادی کے بارے میں پہلا قانون ہے جو اسلام نے جاری کیا ہے اور جس کو تمام مسلمانوں پر اس طرح فرض قرار دیا ہے کہ ہر مسلمان اپنے مال میں سے "غلام کی آزادی" کے فنڈ میں کچھ حصہ ادا کرے۔

دوسرا اصول : ۔ افراد اُمّت میں باہمی مروّت کی صفات موجود ہوں اور ان صفات کی بنا پر وہ ایثار اور قربانی سے کام لیں اور معاشرے کی اخلاقی اور حسّی بہبود کے لیے کام کریں اور افراد معاشرہ پر آنے والی تکالیف کو دور کریں۔

انسان بھلائی کو طبعاً پسند کرتا ہے اور اس میں حُبِّ خیر کی بے اندازہ صلاحیتیں موجود ہیں اور اجتماعی کاوشوں کی ہمتیں موجود ہیں، جس کو ظاہر ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے یونہی پیدا نہیں کیا ہے بلکہ جس طرح اللہ سبحانہٗ انسان کو عقلی صلاحیتیں اس لیے عطا فرمائی ہیں کہ وہ ان کی مدد سے اپنی ذات کا اثبات کرے، اور زندگی میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں اپنے قوائے عقلی کو کام میں لائے، اسی طرح اللہ سبحانہٗ نے انسانوں میں فطری مروت پیدا کی ہے جس کا محض یہ مقصد نہیں ہے۔ کہ یہ ایک فرد کی ذات کے حسن کا ذریعہ بن جائے بلکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ ایسے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوں اور ایسے لوگ تیار ہوں جو ان اقدار کے حامل ہوں اور ان بلند اور پاکیزہ نفوس کی سماحت اُمّت کو بنیادی ثروت حاصل ہو، کیونکہ خیر کے ساتھ ساتھ وہ شخص بھی خیر ہے جو حسن نیت کے ساتھ کارِ خیر انجام دے۔

جس اُمّت میں یہ خوبی موجود ہو گی اس میں قوّت کے اور بلندی کے تمام اسباب موجود ہوں گے اور خیر کے عزائم اور فلاح و بہبود کے امور سے اسے عزّت حاصل ہو گی اور زندگی کی توانائی بہم پہنچے گی بلکہ یہ نیکی اس کی ذات کے لیے افراد معاشرہ

کے لیے اور اس کی زندگی کے دوام و بقا کے لیے کافی ہوگی اور اس سے فطرت کے عمدہ خزانے، انسانی جبلّت کی بہترین خوبیاں اور انسانی شرف و کرامت کے بہترین نمونے سامنے آئیں گے۔ اور یہی وہ اعلیٰ تر زندگی ہے جو خدا کے نزدیک انسانیت کے لیے مطلوب ہے۔

غرض معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ خیر کی ان صلاحیتوں کو افراد کے نفوس میں ابھارے اور نشو و نما دے اور خیر کے چشموں کو سوکھنے کے لیے نہ چھوڑ دے کیونکہ اگر معاشرہ کسی ابتلاء اور آزمائش کے وقت معاشرے کے افراد سے ان کی تمام دولت لے لے اور انھیں تہی دامن چھوڑ دے تو ان کے نفوس میں بخل اور بغض پیدا ہوگا لیکن اگر ہم اس خیر کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیں کہ وہ از خود اپنی مروّت کا اظہار کریں اور اپنے عمل کا ثمرہ پیش کریں۔ پھر اگر وہ خود کسی وقت ضرور تمند ہو جائے تو اس کا بھی اجتماعی مال میں حصّہ ہو، اور اس طرح تمام افراد اُمّت آمادۂ خیر رہیں، ان کی ہمت افزائی ہوتی رہے، فقر ان کو کچل نہ ڈالے، جیسا کہ آیت میں الغارِمین کے لفظ سے اشارہ ملتا ہے۔

تیسرا اصول یہ:۔ انسان کے فطری مبادی کے تزکیہ کے لیے نازل ہونے والے عقائد اور تعلیمات کی رعایت اور بالخصوص اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنا اور فرد کی راہنمائی کرنا کہ زندگی کا انجام اور مقصود کیا ہے اور آخرت میں کیا انجام ہونا ہے جس کی جانب لازماً ہر انسان گامزن ہے اور ازل سے انسان اسی انجام کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس مفہوم کو قرآن نے فی سبیل اللہ سے واضح کیا ہے۔

فی سبیل اللہ کے مفہوم میں دفاعی تیاری اور جہاد بھی داخل ہے اس لیے کہ جہاد درحقیقت عقیدہ کا دفاع اور اس کے قائم رکھنے کی جدوجہد ہے۔ محض ایک تہذیبی توسع اور ایک وطنی جنگ نہیں ہے یعنی فی سبیل اللہ کا مفہوم عقیدے کی حفاظت، اس کا تمکن اور اس کے دائرہ اختیار کو بڑھانا ہے۔[1]

---

[1] استاذ البہی الخولی: الاشتراکیۃ فی المجتمع الاسلامی، ص ۱۴۱، ۱۴۴۔

ان تینوں اصولوں کو بروئے کار لانے سے زکوٰۃ کا یہ مقصود پورا ہوگا کہ اقدارِ عالیہ قائم ہوں، حقیقی معنوی خصوصیات بروئے کار آئیں اور مسلمانوں میں وہ خصائص پیدا ہوں جن پر ان کا وجود قائم ہے۔

اسی سے اسلامی طرزِ زندگی وجود میں آتی ہے اور اسلامی نظام استوار ہوتا ہے اگرچہ زکوٰۃ کا تعلق مالیات سے ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ سے غیر متعلق، اقدار و اخلاق سے بے گانہ سیاست و جہاد سے جدا اور فرد اور معاشرے کے مسائل بیان کر رہے ہیں جو آج کل ہمارے معاشرے کا روگ بنے ہوئے ہیں اور مصلحین ان کے علاج کے متلاشی ہیں۔ ان مباحث میں ہم بتائیں گے کہ زکوٰۃ ان مسائل کو کس طرح حل کرتی ہے اور زکوٰۃ سے ان کی شدت میں کس قدر کمی آتی ہے۔

مسئلہ فقر (غربت) کو اور اس کے اسلامی حل کو ہم نے ایک مستقل کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اس کو ملاحظہ کیا جائے۔[1]

●

---

[1] اس کتاب کا نام ہے: مشکلۃ الفقر و کیف عالجہا الاسلام۔

بحث اوّل

معاشی ناہمواری اور اس کا اسلامی حل

زکوٰۃ کا مقصود صرف یہ نہیں ہے کہ وقتی اور سال بسال ضرورتمندوں کو امداد بہم پہنچا کر غربت کے مسئلے سے نمٹا جائے بلکہ اصل ہدف زکوٰۃ یہ ہے کہ اصول ملکیت میں توسیع ہو، ملکیت کے حامل افراد کی تعداد زیادہ ہو اور تنگدست محتاجوں کی ایک بڑی تعداد ایسے غنی مالکین میں تبدیل ہوتی چلی جائے جو اپنی پوری زندگی کی ضرورتوں کے بقدر ملکیت کے حامل ہوں۔

زکوٰۃ کا حقیقی مقصود فقیر (تنگدست) کو اتنا دینا ہے جس قدر دینے کی زکوٰۃ کی آمدن میں گنجائش ہو تاکہ وہ ضرورت کے شکنجے سے نکل کر دائمی کفایت کے دائرے میں داخل ہو جائے یعنی اس کو اس قدر مل جائے کہ وہ غنی بھی ہو جائے اور اس کی ضرورت بھی پوری ہو جائے جیسے تاجر کو مال تجارت اور اس کے لوازمات فراہم کر دیئے جائیں، کاشتکار کو زمین اور اس کی ضرورت دے دی جائیں اور دستکار اس کی دستکاری کا سامان دے دیا جائے ـــــ جیساکہ ہم مصارف زکوٰۃ میں بالتفصیل بیان کر چکے ہیں[۱] ـــــ اس کے نتیجے میں زکوٰۃ کا ایک بہت ہی اہم مقصود حاصل ہو گا کہ اجرتوں میں کام کرنے والے افراد کم ہوں گے اور مالکین کی تعداد بڑھے گی۔

اسلام چاہتا ہے کہ اقتصادیات اور اجتماعیات کے میدان میں اسے یہ مقصود حاصل ہو کہ اللہ سبحانہٗ نے زمین میں جو منافع اور خیرات رکھے ہیں ان میں تمام افراد کے شریک ہونے کے مواقع موجود ہوں اور یہ منافع محض چند دولتمندوں کے درمیان متداول ہو کر نہ رہ جائیں۔

---

[۱] دیکھئے چوتھے باب کی پہلی فصل، فقیر اور مسکین کو زکوٰۃ میں سے کتنا حصہ دیا جائے۔

چنانچہ اللہ سبحانہٗ کا فرمان ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ : ۲۹)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

آیۂ مبارکہ میں زمین کی جملہ (جَمِیْعًا) اشیاء کو انسانوں کی ملک کہا گیا ہے تاکہ کوئی ایک طبقہ یا گروہ ان اشیاء کو اپنے قبضے میں نہ لے لے، اور دوسرے لوگ اس سے محروم نہ ہو جائیں۔

اسلام نے اسی وجہ سے تقسیم مُلک کے عادلانہ طریقے اختیار کیے ہیں اور اس امر کی سعی کی ہے کہ معاشرے میں افراد کی ملکیتیں باہم قریب قریب ہوں اور اس اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنے میں زکوٰۃ اور فئے بہت اہم عمل سرانجام دیتے ہیں۔ چنانچہ فئے کی تقسیم کے بارے میں اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ

(الحشر : ۷)

جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اگرچہ اسلام نے لوگوں کے مابین معیشت اور رزق کے فرق کا اعتراف کیا ہے کیونکہ یہ تفاوت فی الواقع ایک فطری تفاوت ہے جو نتیجہ ہے اس فرق اور تفاوت کا جو انسانوں کی صلاحیتوں، قدرتوں، قوتوں اور ان کے مواہب طبعی میں موجود ہے۔

اس تفاوت اور فرق کو تسلیم کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام نے اس امر کی بھی کھلی چھٹی دے دی ہے کہ مالدار اور زیادہ دولتمند ہوتا چلا جائے اور غریب

اور زیادہ غریب ہوتا چلا جائے اور ان دونوں کے درمیان یہ خلیج اس قدر بڑھ جائے کہ یہ دونوں معاشرے کے دو علیحدہ علیحدہ طبقے بن کر رہ جائیں اور ان میں سے ایک طبقہ ہمیشہ سنگِ مرمر کی کوٹھیوں میں دادِ عیش دیتا رہے اور اس کی جنات النعیم کی یہ زندگی وراثت میں اس کی اولاد کو منتقل ہوتی رہے اور دوسرا طبقہ اپنی شقاوت و بدبختی کی جھونپڑیوں میں جان دے دے۔

اسلام ان دونوں طبقوں کے درمیان فرق کو مٹاتا اور ختم کرتا ہے اور دولتمندوں کی سرکشی کو ختم کرتا اور غریبوں کے معیار کو بلند کرتا ہے اور اس عمل کے لیے جہاں قانونی اور تنظیمی اقدامات کرتا ہے وہاں ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہدایات بھی دیتا ہے۔

اس وقت یہ موضوع پیشِ نظر نہیں ہے کہ اسلام نے غربت و امارت کے فرق کو مٹانے اور اس تفاوت کو کم کرنے کی کیا عملی تدابیر تجویز کی ہیں[1] بلکہ مدِّ نظر یہ حقیقت ہے کہ خود زکوٰۃ اس فرق کو ختم کرنے کا ایک بہت بڑا اور مؤثر ذریعہ ہے کہ

"زکوٰۃ امیروں سے لی جاتی اور غریبوں کو لوٹائی جاتی ہے"

ذرا ایک صحیح اسلامی معاشرہ کا تصور کیجئے جس میں تمام افرادِ معاشرہ اسلام کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے خوبی اور اتقان کے ساتھ مصروفِ عمل ہوں، تلاشِ رزق میں زمین پر چل پھر رہے ہوں، زراعت، صنعت اور تجارت میں لگے ہوئے ہوں مختلف میدانوں میں متعدد کاموں، حرفتوں اور پیشوں میں لگے ہوئے ہوں، تمام قوتیں اور طاقتیں بروئے کار لا رہے ہوں اور اللہ سبحانہ نے زمین و آسمان کی جو اشیاء انسان کے دستِ قدرت میں دی ہیں ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا رہے ہوں...... ایسے معاشرے میں کتنے لوگ ہوں گے جن پر زکوٰۃ فرض ہوگی بلاشبہ زکوٰۃ دہندگان کی ایک بہت بڑی تعداد ہوگی! اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی جو عمل سے عاجز ہوں یا کثرتِ عیال اور قلتِ آمدن سے وہ زکوٰۃ کے مستحق

---

[1] اس موضوع کو ہم تفصیل سے اپنی کتاب معالم النظام الاقتصادی فی الاسلام میں بیان کریں گے۔

بن گئے ہوں۔

اس معاشرے میں زکوٰۃ کی حاصل ہونے والی بہت بڑی مقدار ان تھوڑے سے افراد میں تقسیم کر دی جائے گی جن کی آمدن بے حد کم ہو یا جن کی سرے سے کوئی آمدن نہ ہو اور اس طرح ان کے درمیان اور معاشرے کے دولتمند افراد کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے گا۔

کسی معاشرے کی سب سے بڑی آفت جس سے معاشرہ کو گھن لگ جاتا ہے یہ ہوتی ہے کہ اس میں افراد کا ایک طبقہ ایسا ہو جو بے حد دولتمند ہو اور دوسرا طبقہ بے حد غریب ہو، ایک فرد سونے چاندی میں کھیلتا ہو، دوسرا ایک ایک لقمہ کو ترستا ہو، ایک ثقیل اور مرغن غذاؤں سے شکم سیر ہو کر پیٹ پکڑے ہوئے ہو اور دوسرا بھوک کے مروڑ دبانے کے لیے پیٹ پکڑے ہوئے ہو، کوئی وسیع و عریض بنگلوں میں رہتا ہو اور کوئی ذرا سی کوٹھڑی میں دس افراد خانہ کے ساتھ شب و روز گزار رہا ہو۔

مقصود زکوٰۃ اسی انتہائی فرق کو مٹانا ہے اور یہ کوشش کرنا ہے کہ غریبی کا یہ انتہائی درجہ باقی نہ رہے بلکہ معاشرے کے ایسے افراد کا معیار بلند ہو کر انھیں بھی انسانیت کے کم سے کم معیار کا لباس کھانا اور مسکن میسر آجائے، اور ان کا معیار اس طرح بلند ہوتا رہے کہ وہ معاشرے کے متنعم افراد کے درجے تک پہنچ جائیں اور خود بھی اغنیاء مالکین کے زمرے میں داخل ہو جائیں۔

بحث دوم

بھیک کا مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

اسلام دست سوال دراز کرنے سے منع کرتا ہے اور اس کی اخلاقی اور عملی تربیت کرتا ہے

اسلام انسانوں کو بلند ہمتی اور عزت نفس کی تعلیم دیتا ہے، انھیں نیچ باتوں سے احتراز کرنا سکھاتا ہے اور ان کے نفوس میں دست سوال دراز کرنے کی نفرت جاگزیں کرتا ہے۔

عدم سوال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چند بنیادی امور میں رکھا جن پر آپ بیعت لیا کرتے تھے۔ اور ارکان بیعت میں اس کا بطور خاص ذکر فرمایا کرتے تھے چنانچہ

"ابو مسلم الخولانی کی روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے میرے حبیب اور امین عوف بن مالک نے بیان کیا کہ ہم سات یا آٹھ یا نو اشخاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہماری بیعت کی گفتگو چل رہی تھی، میں نے کہا تم سب بیعت کرلو، انھوں نے کہا کہ ہم نے آپ سے بیعت کی، تین مرتبہ یہ الفاظ کہے اور سب نے ہاتھ بڑھا کر آپ سے بیعت کی، کسی نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ سے بیعت کی، مگر ہم کن امور پر بیعت کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کی بندگی کروگے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگے، پانچ اوقات کی نمازیں پڑھوگے، سنوگے اور اطاعت کروگے اور پھر ذرا آہستہ سے فرمایا کہ کسی سے کچھ نہ مانگوگے۔

راوی حدیث بیان کرتے ہیں کہ ان اصحاب میں سے اگر کسی کا کوڑا بھی گر جاتا (سواری پر سے) تو کسی سے اس کو اٹھا کر دینے کے لیے نہ کہتا۔"[1]

---

[1] مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، (الترغیب والترہیب، ج ۲، باب الترہیب عن المسئلہ)

ان صحابۂ کرام نے بیعت نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس طرح حرف بحرف نافذ فرمایا اور کبھی کسی سے اپنی گری ہوئی چیز اُٹھا کر دینے کے لیے بھی نہیں کہا اور صحابۂ کرام کی کامیابی اور فتح و نصرت کا راز یہی تھا کہ انھوں نے ہر فتح سے پہلے خود اپنے نفوس پر فتح پالی تھی، اور صراطِ مستقیم پر مضبوطی سے قائم ہو گئے تھے۔

وحضرت ثوبان رضؓ مولیٰ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ کون ہے جو مجھے یہ ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے کچھ نہیں مانگے گا اور میں اسے جنّت کی ضمانت دے دوں ثوبانؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم میں آپ نے فرمایا کہ کسی سے کچھ نہ مانگو، چنانچہ ثوبانؓ نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔[1]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے لینے والے ہاتھ کو الید السُّفلیٰ (نچلا ہاتھ) فرمایا اور دینے والے ہاتھ کو الید العُلیا (اوپر کا ہاتھ) قرار دیا (اور فرمایا کہ اوپر کا ہاتھ بہتر ہے) اور آپؐ نے صحابۂ کرام کو تعلیم دی کہ اپنے آپ کو تربیت دیں اور پاکیزگی عفت اور استغناء اختیار کریں اور یہ کہ جب وہ دوسرے لوگوں سے مستغنی ہو جائیں گے تو اللہ فی الواقع انھیں غنی کر دے گا۔ چنانچہ

وحضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ بعض انصار نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مانگا آپؐ نے دے دیا، پھر مانگا پھر دے دیا، تا آنکہ آپؐ کے پاس جو کچھ تھا ختم ہو گیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس جو بھی خیر ہو گی میں تم سے بچا کر اس کا ذخیرہ نہیں کروں گا، حق بات یہ ہے کہ جو سوال سے احتراز کرے گا اللہ اُسے بچا لے گا اور جو استغناء اختیار کرے گا اللہ اُسے غنی بنا دے گا، جو صبر اختیار کرے گا اللہ اُسے صبر دے دے گا اور صبر سے وسیع تر کوئی شئے کسی کو نہیں

---

[1] ابوداؤد بحوالہ مذکور۔ البیہقی، السنن الکبریٰ، ج ۴، ص ۱۹۷۔

دی گئی ہا۔[1]

عمل ہی اساس ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دو بنیادی اصولوں کی تعلیم فرمائی۔

پہلا اصول: یہ کہ عمل کسب کی اساس ہے اور ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ تلاش رزق کے لیے زمین کی پشت پر چلے پھرے اور اللہ کا فضل تلاش کرے اور عمل (ہاتھ سے کام کو) اگرچہ کسی معاشرے میں (اس کے اپنے بگاڑ کی وجہ سے) بُرا سمجھا جائے مگر بہر حال دست سوال دراز کرنے سے بہتر ہے چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

د کوئی شخص کاندھے پر رسی ڈال کر چلا جائے اور اپنی پشت پر لکڑیاں لاد کر لے آئے اور انھیں فروخت کر دے اور اپنے چہرے کی حیا کو محفوظ کرے اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرے اور کچھ لوگ دے دیں اور کچھ لوگ نہ دیں ہا۔[2]

سوال کی حُرمت

دوسرا اصول: یہ ہے کہ اسلام میں مانگنا، ہاتھ پھیلانا اور دست سوال دراز کرنا حرام ہے کیونکہ اس طرح نفس انسانی کی توہین اور تذلیل ہوتی ہے اور مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ دست سوال دراز کر کے اپنی تذلیل کرے اِلّا یہ کہ اسے ضرورت سوال پر مجبور کر دے تو مانگ سکتا ہے لیکن اگر اس ضرورت کے بغیر مانگا جبکہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ گزران وقت کے لیے موجود ہو تو یہ سوال روزِ قیامت اس کے چہرے پر داغ بن جائے گا۔

۱۔ ماسوا ابن ماجہ کے جملہ صحاح ستہ کی روایت ہے۔ السنن الکبریٰ، ج ۴، ص ۱۹۷۔

۲۔ صحیح البخاری، کتاب البیع۔

اس مفہوم کی متعدد احادیث موجود ہیں جن میں سوال کرنے پر ایسی وعیدیں آئی ہیں کہ ان کو بڑھ کر ہی زہرہ گداز ہو جاتا ہے۔

مثلاً بخاری، مسلم اور نسائی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ

"سوال، سوال کرنے والے سے چمٹا رہے گا اور جب وہ اللہ کے حضور پیش ہوگا تو اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی نہ ہوگی"

اصحاب سنن کی روایت ہے کہ

"جس کے پاس کچھ موجود ہو اور وہ دست سوال دراز کرے تو وہ روز قیامت اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ نُچا ہو، کھسٹا ہوا اور خراشیں لگا ہوا ہوگا، کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، غنیٰ (مالداری) کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا پچاس درہم یا اس کے بقدر سونا" [1]

یعنی سوال کرنا انسان کے سب سے نمایاں مظہر اور اس کی کرامت اور شرافت کے سب سے زیادہ واضح حصہ جسم چہرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ

"جس کے پاس ایک اوقیہ (چاندی) ہو اور وہ مانگے تو اس نے الحاف کیا"

اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے [2]

ایک اور حدیث ہے کہ

"جس کے پاس کچھ موجود ہو اور وہ سوال کرے تو وہ جہنم کے انگارے جمع کرنے والا ہے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مقدار غنا) اس کے پاس کیا موجود ہو آپؐ نے فرمایا کہ جتنا اس کے صبح و شام کے کھانے کے لیے کافی ہو" [3]

---

[1] بخاری و مسلم، ابوداؤد اور نسائی۔

[2] ابوداؤد، نسائی۔ (الحاف: اصرار۔ قرآن کریم میں ہے۔ لا یسئلون الناس الحافا۔

[3] ابوداود۔

کیا اس سے مراد ایک دن کا صبح کا کھانا اور اسی دن کا شام کا کھانا ہے یا یہ کہ تمام اوقات کے لیے صبح و شام کے گزارہ کی گنجائش، دوسری صورت زیادہ موزوں ہے کہ اسی طرح آدمی ذلت سوال سے بچ سکتا ہے کہ روزانہ صبح و شام کی گزر اوقات اس کے پاس موجود ہو۔

غنیٰ جس پر سوال کرنا حرام ہے

اب سوال یہ ہے کہ احادیث میں غنا (مالداری) کی جو کئی مقداریں بیان کی گئی ہیں جن کی موجودگی میں سوال کرنا حرام ہو جاتا ہے ان کی کیا توجیہ کی جائے، اس سلسلے میں حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ الدھلویؒ اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

'ہمارے نزدیک ان احادیث میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ درحقیقت بلحاظ کسب بھی انسانوں کے درجے ہوتے ہیں اور جس کا جو کسب ہو اس کے لیے اس سے ہٹنا ممکن نہیں ہوتا، یعنی جو شخص دست کاری کا کوئی پیشہ رکھتا ہو وہ اس وقت تک معذور ہو گا جب تک اس کے پاس اس کے پیشہ کے آلات نہ ہوں، جو کاشتکار ہو وہ اس وقت تک معذور ہو گا جب تک اس کے پاس کاشتکاری کے آلات نہ ہوں اور جو تاجر ہو گا وہ اس وقت تک معذور ہو گا جب تک اس کے پاس سامان تجارت نہ ہو اور ایسے بھی افراد ہوں جیسا کہ عہدِ نبوتؐ میں تھے کہ ان کا رزق جہاد میں شرکت کرنے اور غنیمت میں حصہ پانے سے ہو گا، تو ان کا قاعدہ پانچ اوقیہ یا پچاس درہم ہو گا؛ اور جو بازار میں بوجھ اٹھا کر یا لکڑیاں لا کر روزی کماتا ہو اس کے لیے اور اس جیسوں کے لیے ضابطہ صبح و شام کی گزر اوقات کا رزق موجود ہونا ہے۔'[۵]

---

۵ حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۴۶۔

ابو جعفر الطحاویؒ مشکل الآثار میں تحریر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس مقدار کے بیان میں س پر سوال کرنا حرام ہو جاتا ہے شدت برتی پھر بالتدریج اس میں تخفیف کی تاآنکہ پانچ اوقیہ تک مقدار بیان فرمادی، جو کہ چاندی میں زکوٰۃ کا نصاب ہے۔ مگر ان کے اس قول کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ علامہ دھلویؒ کی مذکورہ توجیہ زیادہ صحیح ہے، اور پانچ اوقیہ والی حدیث کی صحت ثابت نہیں ہے۔

بہر حال اصل حقیقت یہ ہے کہ غنا (مالداری) جس پر سوال کرنا حرام ہے اس غنا سے خاص ہے جس کی موجودگی میں زکوٰۃ لینا حرام ہے اس لیے کہ شارع نے اس میں سختی برتی ہے کیونکہ سوال کرنے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ بلا ضرورت سوال کرنا جائز نہیں ہے اور جس کے پاس اس کی صبح و شام کی گذر اوقات موجود ہو اسے سوال کی ضرورت نہیں ہے۔

امام خطابی رح نے فرمایا ہے کہ یہ اسلام کی مسلمانوں کو تربیت اور ان کی راہنمائی ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ جب تک ان مانگنے والوں کا عملی علاج نہ ہو جو ضرورت شدید کے تحت مانگتے ہیں اس وقت تک محض فکری راہنمائی اور اخلاقی تربیت کافی نہیں ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ بھوک کی چیخ ضمیر کی پکار سے اونچی ہوتی ہے۔

بھیک کا عملی علاج یہ ہے کہ قادر افراد کو کام دیا جائے

اس عملی علاج کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی یہ: ہر بے کار اور عمل پر قدرت رکھنے والے شخص کو مناسب عمل (کام) فراہم کیا جائے اور معاشرے کے ہر کام کے لائق شخص کو کام فراہم کرنا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے اور ارباب حکومت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کام کی قدرت رکھنے والے شہریوں کو بے کار رہنے دے اور اس حالت میں رہنے دے کہ وہ دست سوال دراز کرتے ہیں اور زکوٰۃ و صدقات سے انھیں کچھ ملتا رہے کیونکہ ہم مصارف زکوٰۃ کے بیان میں یہ فرمان نبوت ص نقل کر چکے ہیں کہ

"کسی مالدار (غنی) کو زکوٰۃ حلال نہیں ہے اور نہ کسی مضبوط توانا شخص کے لیے حلال ہے"

کیونکہ تندرست و توانا شخص کو مادی امداد بہم پہنچانا بے کاری کو فروغ دینا ہے اور کمزور، اپاہج اور عاجز افراد کے حقوق کو نقصان پہنچانا ہے۔

مناسب اور موزوں طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا وہ یہ ہے کہ

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ایک انصاری شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے سوال کیا، آپ نے استفسار فرمایا تمھارے گھر میں کچھ ہے، انھوں نے عرض کی ایک دری ہے جس کا کچھ حصہ بچھا لیتے ہیں اور کچھ اوڑھ لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں آپ نے فرمایا کہ دونوں اشیا لے آؤ، وہ لے آئے، آپ نے انھیں لیا اور فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں کون خرید رہا ہے ——— ایک شخص نے عرض کی کہ ایک درہم میں میں خریدتا ہوں، آپ نے فرمایا کون اس پر اضافہ کرتا ہے (آپ نے یہ بات دو یا تین مرتبہ ارشاد فرمائی) ایک شخص نے کہا کہ میں دو درہم میں لیتا ہوں آپ نے وہ دونوں اشیاء اسے دے دیں اور دو درہم لے لیے اور ان دونوں درہموں کو انصاری صحابی کو دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک درہم کا کھانا لے کر گھر میں ڈال دو اور دوسرے درہم کی کلھاڑی لے آؤ، بعد ازاں آپ نے خود کلھاڑی میں لکڑی باندھی اور ان سے فرمایا کہ جاؤ اور لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرو اور پندرہ دن تک مجھے نظر نہ آنا، چنانچہ یہ انصاری صحابی لکڑیاں کاٹتے رہے اور فروخت کرتے رہے، وہ واپس آئے تو دس درہم لے کر آئے اور کھانا اور کپڑا خریدا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ بہتر ہے اس سے کہ روز قیامت سوال تمھارے چہرے کا داغ بن جائے کیونکہ مانگنا صرف تین صورتوں میں جائز ہے، کمر توڑ ڈالنے والے فقر میں، سخت قسم کی دیت میں اور دردناک جانی حادثہ میں جس میں اُسے دیت دینی پڑے۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری صحابی کے

---

[1] ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ۔ ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اور ہم اس کو صرف بروایت اخضر بن عجلان جانتے ہیں جس کو یحییٰ بن معین نے صالح کہا ہے اور ابو حاتم الرازی نے کہا ہے کہ ان کی حدیث لکھی جاتی ہے (مختصر سنن ابی داؤد، ج ۲، ص ۲۳۹)

سوال پر انھیں زکوٰۃ کی مدمیں سے کچھ نہیں دیا، کیونکہ زکوٰۃ ان کے لیے اس وقت حلال ہوتی جب تمام راستے ان کے سامنے بند ہو جاتے اور کوئی تدبیر باقی نہ رہتی بلکہ انھیں کسب حلال کا موقع فراہم کیا اور عمل کا راستہ کھولنے میں ان کی مدد کی۔

غرض اس حدیث نبویؐ میں بہت سے ایسے درس موجود ہیں اور انسانیت کی پیش رفت کی ایسی راہیں ہموار ہوتی ہیں کہ انسانیت صدیوں بعد اس پیش رفت تک رسائی حاصل کر سکی ہے۔

آپؐ نے ضرورتمند سائل (مانگنے والے) کی صرف وقتی مادی امداد سے مدد نہیں کی ہے بلکہ اس ضرورتمند کا ہاتھ تھاما ہے اور اس کے مسئلہ کو حل کیا ہے اور اس کا کامیاب علاج کیا ہے۔

آپؐ نے انسان کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور جو تدبیر وہ کر سکے وہ کرتا رہے اور جب تک اس کے پاس معمولی سے معمولی چیز موجود ہے جس سے وہ کوئی کام کر سکے اس وقت تک سوال نہ کرے۔

آپؐ نے یہ درس دیا کہ ہر عمل جس سے رزق حلال حاصل ہوتا ہو معزز پیشہ اور قابل احترام ذریعۂ آمدن ہے اگرچہ لکڑیاں کاٹ کر رسّی سے باندھ کر لانے اور انھیں فروخت کرنے کا کام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اس کام سے انسان اپنے چہرے کو دست سوال دراز کرنے کے داغ سے بچا سکتا ہے۔

آپؐ نے انصاری صحابی کو ان کے حالات ان کی صلاحیت اور قوت کے مطابق کام بتایا اور انھیں آلۂ عمل بھی خود ہی تیار کر کے دیا اور انھیں حیران و سرگشتہ نہیں چھوڑا۔

آپؐ نے انھیں پندرہ یوم کی مہلت دی تاکہ اس عرصہ میں اس کام کی موزونیت کو دیکھا جا سکے اور یہ معلوم ہو سکے کہ اس سے ان صحابی کی ضرورت پوری ہوتی ہے یا ان کے لیے مزید کوئی اور کام تجویز کرنا ہوگا۔

انصاری صحابی کے اس مسئلہ کو آپؐ نے عملاً حل فرما کر انتہائی بلیغ اور موجز طریقہ پر نہیں سوال سے منع فرما دیا اور اس کی حدود بیان فرما دیں۔

اب ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اسی طریقۂ نبویؐ کی اتباع کریں اور بھیک کے بارے میں مہم شروع کرنے سے اس مسئلہ کو عملاً حل کریں یعنی ہر بیروزگار کو روزگار فراہم کریں۔[1]

ہم مصارفِ زکوٰۃ میں بیان کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ میں سے صاحب قدرت بے روزگار شخص کو اپنے پیشہ کے انجام دینے کے لیے ضروری آلات اور رأس المال دیا جائے گا، اور زکوٰۃ ہی سے بے روزگار شخص کو ایسا کام سکھایا جائے گا جس سے وہ اپنی روزی کما سکے، اور اس سے اجتماعی منصوبے — مثلاً کارخانے، تجارت گاہیں اور مزارع وغیرہ قائم کیے جائیں گے جن میں بے روزگاروں کو کام بھی ملے گا اور وہ اس کے مالکانہ حقوق کے بھی حاصل ہوں گے۔

نادار اور عاجز افراد کی معیشت کی ضمانت

اسلام کی نظر میں بھیک مانگنے اور دست سوال دراز کرنے کا ایک عملی حل یہ ہے کہ ہر عاجز و نادار شخص کو موزوں معاش میسر کیا جائے گا تاکہ وہ اپنی روزی حاصل کر سکے۔

ناداری اور عاجز ہونے کے دو اسباب ہیں:

ا) کوئی جسمانی کمزوری اور نقص جو کسب معاش سے مانع ہو، مثلاً کمسن یتیم ہو، یا بعض حواس یا اعضاء مفقود ہوں یا کوئی ایسی بیماری ہو جو کسب معاش میں رکاوٹ ہو۔

ایسا شخص جو ان جسمانی موانع میں مبتلا ہونے کی بنا پر کسب معاش سے عاجز ہو اسے زکوٰۃ کی مد سے اس قدر مقدار دی جاتی ہے گی جو اسے کافی ہو تاکہ ان کی اس ناداری اور عجز پر ان کے اوپر رحم ہو جائے اور ان کی اس عاجزی کی تلافی ہو جائے اور وہ معاشرے کا داغ نہ بنیں، بالخصوص آج سائنسی ترقیات نے نابینا افراد اور دیگر مصیبت زدہ افراد کی پیشہ ورانہ تربیت کے ایسے ذرائع فراہم کر دیے ہیں جو ان کی جسمانی حالت اور ان کی ضرورت کے مطابق ہیں، مدِ زکوٰۃ سے ان معذورین کی پیشہ ورانہ تربیت کر کے انھیں ذلت سوال سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] مصنف کی کتاب: مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام۔

ب) دوسرا سبب ناداری اور عجز کا یہ ہے کہ قدرت رکھنے والے افراد کے سامنے رزق حلال کے دروازے بند ہوں اور باوجود ان کی سعی و کوشش کے انھیں رزق حلال میسر نہ آئے۔ یہ لوگ جسمانی قوت اور قدرت کے باوجود بھی بلاشبہ عاجز اور اپاہج کے حکم میں ہوں گے کیونکہ محض جسمانی قوت سے بغیر رزق حلال کے پیٹ نہیں بھر سکتا۔

امام احمدؒ نے ان دو اشخاص کا واقعہ روایت کیا ہے جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس زکوٰۃ سے کچھ مانگنے آئے آپؐ نے ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہ توانا اور تنومند ہیں، تو آپؐ نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو میں تمھیں دیئے دیتا ہوں لیکن بہرحال زکوٰۃ میں غنی (مالدار) کا اور تنومند برسرروزگار کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ یہ تصوّر غلط ہے کہ زکوٰۃ میں سے ہر مانگنے والے کو دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس سے مانگنے والوں اور دست سوال دراز کرنے والوں میں اضافہ ہو جاتا ہے! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ اسلام کے بتلائے ہُوئے اصولوں کے مطابق وصول اور تقسیم کی جائے تو بھیک کا اور دست سوال دراز کرنے کا سلسلہ بالکلیہ منقطع ہو جائے۔

بحث سوم

عداوتوں اور آپس کی دشمنیوں سے رونما ہونے والے فساد کا مسئلہ

انسانی رشتۂ اخوت کی تاسیس اسلام کا بنیادی مقصود ہے

اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک عظیم مقصود یہ ہے کہ تمام انسانی برادری میں رشتۂ اخوت قائم ہو اور بالخصوص ایک معاشرے کے افراد میں برادرانہ تعلقات، محبت والفت کے روابط اور باہمی کفالت اور تعاون کے رشتے استوار رہیں، تاکہ امن و سلامتی کا دور دورہ ہو اور چھوٹے چھوٹے معاملات پر بڑے بڑے نزاع اور جھگڑے جنم نہ لیں اور زندگی کے معمولی ساز و سامان کی چھین جھپٹ میں انسانی زندگیاں اجیرن نہ ہو جائیں۔

یہ عظیم مقصود اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ افراد معاشرہ کے دلوں میں اللہ پر ایمان جاگزیں اور آخرت پر ایمان راسخ ہو اور ہر انسان کے سامنے حق کی نصرت اور خیر کی اشاعت کا عظیم مقصود ہو جس کے لیے وہ جد و جہد کرے اور جان کھپائے اور اس کا نفس "کمتر اشیاء" کی محبت سے بلند تر ہو جائے اس کا مطمح نظر انتہائی اعلیٰ ہو جائے اور وہ اعراض دنیا اور متاع دنیا پر جو کہ ثمن قلیل ہے اپنے آپ کو ضائع نہ کرے حالانکہ آخرت کی زندگی زیادہ باقی رہنے والی اور زیادہ بہتر ہے۔

اسلامی اخوت کا حامل مثالی معاشرہ مدینۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں انسانیت کی تاریخ میں ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم ہوا تھا جو آپس میں بھائی بھائی تھے ایک دوسرے کے جان نثار اور باہم محبت کرنے

والے تھے۔ باوجودیکہ ان میں نسلی تباین موجود تھا کہ مہاجرین جو عدنانی (عرب مستعربہ) تھے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے آئے تھے اور انصار خود مدینہ منورہ کے باشندے تھے اور خالص عرب (العرب العربا) تھے یعنی قحطانی تھے۔ ان عدنانیوں اور قحطانیوں میں بہت پرانا نزاع اور تفاخر موجود تھا، انصار بھی دو بڑے قبائل اوس اور خزرج سے تعلق رکھتے تھے جن میں باہم بڑی آویزش، میراث کے اور خون کے جھگڑے اور تہ بہ تہ دبے ہوئے کینے موجود تھے، اور ان میں متعدد خونی جنگیں ہو چکی تھیں۔ انھیں انصار میں حبش کے بلالؓ، ایران کے سلمانؓ اور روم کے صہیبؓ بھی تھے اور انہی میں (حضرت) ابوذرؓ جیسے درشت مزاج بدوی (دیہاتی) اور نعمتوں کی گود میں پلے ہوئے شہری مصعب بن عمیر بھی تھے۔

ان تضادات کے باوجود ایمان کے زیر سایہ ایسا مبنی بر اخوت معاشرہ وجود میں آیا کہ دنیا کی آنکھ نے کبھی ایسا معاشرہ نہیں دیکھا، یہ وہ معاشرہ ہے جس میں ہر فرد اپنے بھائی کے لیے وہی چاہتا ہے جس خیر کا وہ اپنے لیے طالب ہو، اور جس برائی سے وہ خود بچنا چاہتا ہے اس کی خواہش ہے کہ پہلے اپنے بھائی کو اس برائی میں مبتلا ہونے سے بچالے اور وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے بغیر اس کا ایمان کامل نہیں ہوگا۔ وہ خود بھوکا رہ کر اپنے بھائی کو کھلاتا ہے اور خود پیاسا رہ کر اپنے بھائی کو پانی پلاتا ہے۔

قرآن کریم نے اس معاشرے کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(الحشر: ۸، ۹)

(نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائیدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں یہی راستباز لوگ ہیں (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ مبنی بہ حقیقت ہے

یہ ایک مثالی معاشرہ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جسے اسلام ہی نوعِ انسان کے پیشِ نہاد کے طور پر سامنے رکھتا ہے تاکہ لوگ اس اعلیٰ ترین مثالی نمونہ تک پہنچنے کی جدوجہد کریں اور اس کو اپنا مرکزِ نگاہ اور قلوب کی آماجگاہ بنائیں۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اسلام ایک مبنی بر حقیقت دین ہے۔ اس کے قوانین محض نادر الوکھے حالات کے لیے نہیں ہیں جس میں انسانی طبیعت اور مزاج کو یکسر نظرانداز کر کے یہ متصور کر لیا گیا ہو کہ فرشتے زمین پر اُتر آئیں گے۔

جی نہیں بلکہ اسلام انسانوں کو انسان ہی متصور کرتا ہے، ان کی طبیعتوں کو مدِنظر رکھتا ہے، ان کی جبلتوں کو سامنے رکھتا ہے اور اس امر کو مدِنظر رکھتا ہے کہ ان کا نفس انھیں کشاں کشاں کن کن وادیوں کی سیر کراتا ہے، شیاطین الانس و جن انھیں کس قدر حسین و دلکش باتیں سجھاتے ہیں جو سراسر دھوکہ ہوتی ہیں۔ دنیا کی اور دنیا کی آلائشوں کی کشش انھیں کس قدر پرفریب معلوم ہوتی ہے اور انھیں فتنوں کی لہریں کس وادی پرخار میں پھینکتی ہیں اور وہ کس طرح جھگڑوں، نزاع اور قتل و غارت میں الجھ کر دوسرے

کے مال کے لٹیرے، عزتوں کے راہزن اور جانوں کے دشمن بن جاتے ہیں۔

جُرمِ قتل کا اِرتکاب اِنسانیت کا قدیم جُرم ہے

انسانیت سے جرم قتل اسی وقت سرزد ہو گیا تھا جب ابھی رُوئے زمین پر ایک ماں باپ اور ان کی اولاد پر مشتمل ایک ہی خاندان سکونت پذیر تھا مگر یہ خاندان ایک بھائی کو دوسرے بھائی پر زیادتی سے نہ روک سکا تھا اور ایک نے دوسرے کو ازراہِ ظلم و تعدی قتل کر دیا تھا۔ اسی سے ملائکہ کو بھی یہ اشتباہ پیدا ہوا کہ جس خاکی مخلوق کو منصب خلافت عطا ہو رہا ہے کیا وہ اس کی سزاوار بھی ہے۔ چنانچہ انھوں نے پروردگارِ عالم سے استفسار کیا۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (البقرہ : ۳۰)

کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا، آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

قرآن کریم نے قتل کے اس پہلے واقعہ کو بیان کیا ہے اور نشاندہی کی ہے کہ جب انسان جبلتوں کی ہی تکمیل میں لگ جاتے اور داعیۂ ایمان کو بالکل بھلا دے تو وہ ایسے ہی جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَا اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ اِنِّيْ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ

الْخٰسِرِیْنَ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ
كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ فَاَصْبَحَ
مِنَ النّٰدِمِیْنَ (المائدہ : ۲۷،۳۲)

اور ذرا انھیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم وکاست سنا دو جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی، اس نے کہا، میں تجھے مار ڈالوں گا، اس نے کہا اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے. ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔ آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہوگیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں، پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے یہ دیکھ کر وہ بولا، افسوس مجھ پر، میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا، اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔

غرض انسانی زندگی کے آغاز ہی میں جبکہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ مردہ کو کہاں چھپا جائے کہ اس نے ابھی کسی مردے کے دفن کا منظر نہیں دیکھا تھا، انسان اپنے بھائی (ن) کے قتل کا مرتکب ہوگیا۔

نزاع اور جھگڑوں کے بارے میں اسلام کا موقف

اب سوال اسلام نے اس انسانی مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے؟

اگر نزاع، خصومت اور جھگڑے انسانی طبیعت کا خاصہ ہیں اور ان سے کوئی چھٹکار

ممکن نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ شر زیادہ سے زیادہ پھیل جائے اور اس کی خطرناکی بڑھتی چلی جائے۔ نزاع اور جھگڑے کی مثال آگ کی سی ہے لیکن ظاہر ہے کہ کہیں آگ لگ جائے تو اسے بجھایا جاتا ہے اور آگ کو یوں نہیں چھوڑ دیا جاتا کہ جس شئے کو چاہے جلاتی چلی جائے اور پھر جب بجھے خود ہی بجھ جائے اور لوگ کھڑے تماشا دیکھتے رہیں یا چیخ و پکار کرتے رہیں ..... آگ لگ جانے کے بعد انسان کا معقول رویہ یہ ہے کہ وہ فوراً آگ بجھانے کی سعی و تدبیر کرے بلکہ ایسے افراد تیار کرے جو آگ لگ جانے کے وقت ضروری سازوسامان اور تیاری کے ساتھ فوراً آگ بجھانے روانہ ہو جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کہیں آگ لگ جائے تو معاشرہ اس کو بجھانے کا ذمّے دار ہے اور اس میں ذراسی بھی کوتاہی اور چوک سب کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہے۔

معاشرہ ہر اصلاح کا ذمّے دار ہے

جھگڑے اور نزاع بھی ایک طرح کی آگ ہے جو قلوب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، ضمیر کو راکھ بنا دیتی ہے اور محبت اور خیر کے سارے معانی ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ اس لیے معاشرہ ذمّے دار ہے کہ ایمان و اخلاق کو جلا دینے والی اس معنوی آگ کو بھی بجھائے اور سرد کرے کیونکہ فرمانِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ

"آپس کا فساد دین کو تباہ کر دینے والا ہے" [1]

معاشرہ کو ہر نزاع اور جھگڑے کی صلح کے لیے مداخلت کرنی چاہیے اور حتیٰ کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف کو مٹانا چاہیے اور اس صورت میں صلح کرانے والے اور ان کے درمیان آگ کو بجھانے والے میاں بیوی کے خاندان کے افراد ہوں۔

چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ

---

[1] ابوداؤد، ترمذی۔

بَيْنَهُمَا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا (النساء: ۳۵)

اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا، اللہ سب کچھ جانتا اور باخبر ہے۔

اس آیت میں بیان کیا گیا کہ میاں بیوی کے مابین صلح کرانے والے حکم خود میاں بیوی کے خاندان کے افراد ہوں مگر فَابْعَثُوا کا مخاطب عام مسلمان ہیں اور اس سے معلوم ہوا کہ یہ ذمے داری معاشرہ کی ہے کہ وہ یہ گھریلو مجلس صلح ترتیب دے اور اگر ایسے حَکَم موجود نہ ہوں تو یہ پورے معاشرے کی اور ان کے نمائندہ ارباب حل و عقد کی ذمے داری ہوگی کہ ان کے درمیان صُلح کرائیں۔

جبکہ معاشرہ خاندانی سطح پر ہونے والے ایک معمولی نزاع میں صُلح کرا دینے کا ذمّے دار ہے تو جب یہ نزاع بڑی سطح پر ہو، یعنی دو خاندانوں، دو قبیلوں اور دو شہروں (یا ملکوں) کے درمیان ہو تو بدرجہ اولی معاشرہ کی ذمّے داری ہوگی کہ اس اختلاف کو ختم کرا کے مسلمانوں کے درمیان باہم صُلح کرائے۔ اس صورت میں یقیناً معاشرہ کی ذمّے داری بڑھ جائے گی اور زیادہ لازم ہو جائے گی۔

چنانچہ قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ نزاع کو ختم کرانے، جھگڑے کو نمٹانے اور دو گروہوں کے درمیان لڑائی کو ختم کرانے کے لیے معاشرہ قوّت کے ساتھ مداخلت کرے اور اگر ضرورت ہو تو اس اصلاح کے لیے ہتھیار بھی استعمال کرے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللّٰهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

(الحجرات: ۹، ۱۰)

اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو، اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

قرآن کریم نے بیشتر مواقع پر لوگوں کے درمیان صُلح کرادینے پر زور دیا ہے۔

مثلاً فرمایا

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (الانفال : ۱)

پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مؤمن ہو۔

نیز فرمایا

لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (النساء : ۱۱۴)

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ وخیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے اور جو کوئی اللہ کی رضاجوئی کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔

سُنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اس مفہوم کی تاکید ہے اور بے حد مؤثر وجہ

میں اصلاح ذات البین (آپس میں صُلح کرا دینے) کی نصیحت کی گئی ہے چنانچہ فرمایا کہ

"کیا میں تمھیں نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی کوئی افضل درجہ بتا دوں، سنو وہ ہے آپس میں صُلح کرا دینا ہے کہ آپس کا فساد دین کو مٹا دیتا ہے"

انجمن ہائے صُلح

جس طرح جدید معاشروں میں آگ بجھانے کا باقاعدہ عملہ اور تنظیم ہوتی ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ مصالحتی انجمنیں CONCILATION BOARDS قائم کی جائیں اور ہر طرح اصلاح احوال کی سعی کریں اور ہر طرح سے جھگڑے کو نمٹانے کی سعی کریں اور اس کے اثرات کو مٹانے کے لیے تمام وسائل استعمال کریں۔

مالی دشواری

اصلاح احوال اور نزاع کو ختم کرنے میں ایک بڑی دشواری مالی تاوان کی ادائیگی ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جھگڑے کی بنیاد مالی ہو اور کسی ایک فریق کو کوئی روپیہ پیسہ ادا کرنا ہو جو وہ ادا نہ کرسکتا ہو اور فریق مخالف اسے مہلت دینے کے لیے تیار نہ ہو، اور جبراً اس سے واجبات کی ادائیگی کرانا ممکن نہ ہو اور خلاف مصلحت ہو۔

اس دشواری کو دُور کرنے کے لیے اسلام نے بے حد سہل حل پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے مصارف زکوٰۃ میں ایک مستقل مصرف 'غارمین' کا قائم کیا ہے۔

اسلامی عربی معاشرے میں طریقہ کار یہ تھا کہ معاشرے کے صاحب دِل دردمند افراد دو خاندانوں کے درمیان یا دو قبیلوں کے درمیان صُلح کرا دیتے اور اس صُلح کے سلسلے میں کسی فریق کے جو واجبات اور مالی مطالبات ہوتے وہ ادا کر دیا کرتے تھے اور اس طرح وہ فساد کی آگ کو سرد کر دیا کرتے تھے اور سکون و سلامتی کی فضا از سرِ نو قائم کرا دیا کرتے تھے، اسلام نے اسی بہترین مقصد میں ان غارمین کی اعانت کے لیے زکوٰۃ میں ایک جداگانہ مصرف مقرر کیا ہے۔

ایک صحابی قبیصہ بن مخارق الہلالی نے اسی قسم کی اصلاح (ذات البین) کے سلسلے میں تلوار کا پرتلا ادا کیا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اعانت طلب کی ـــــ اور اس معاملے میں اعانت طلب کرنے میں صحابہ کرام کوئی

حرج نہیں محسوس کیا کرتے تھے ـــــــ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
"ذرا ٹھیرو ہمارے پاس زکوٰۃ آجائے تو ہم تمہیں اس میں سے دلوادیں گے۔"
اور آپؐ نے ان سے فرمایا کہ اگر کوئی شخص (صُلح کرانے میں) تلوار کے پرتلے کا بھی بوجھ اٹھالے تو اس کے لیے (زکوٰۃ میں سے) طلب کرنا حلال ہے کہ اسے اس کی ادا کردہ شئے مل جائے۔ (احمد، مُسلم)

اسلام کی درگزر اور سماحت کی انتہا یہ ہے کہ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی مُسلمان ذمیوں کے درمیان یا انصاری اور یہود کے درمیان صُلح کرا کے کسی مالی تاوان کو ادا کردے تو اس کو بھی زکوٰۃ کی مد سے ادائیگی کی جائے گی[1] کیونکہ جو قومیں بھی اسلامی معاشرے میں رہ رہی ہیں ان کے مابین بھی امن وسلامتی کا قیام اسلام کے مقاصد میں سے ہے۔

ایک فقہی استفسار

کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی شخص پہلے اصلاح ذات البین (باہمی صُلح) کے لیے اپنے پاس سے تاوان ادا کرے اور اس کے بعد اسے مال زکوٰۃ میں اس کی دی ہوئی رقم ادا کی جائے تاکہ "الغارمین" کا حقیقی مفہوم پورا ہو جائے، کیونکہ قرآن کی آیت مصارف زکوٰۃ میں الغارمین کا لفظ آیا ہے اس لیے فقہاء کی تعبیرات اس شرط کی نشاندہی کرتی ہیں۔

لیکن جہاں تک رُوحِ قرآن اور اسلام کے اعلیٰ تر مقاصد کا تعلق ہے اس سے اس امر کی گنجائش نکلتی ہے کہ ایک اصلاحی انجمن قائم ہو اور اسے زکوٰۃ کی مد میں سے پہلے سے ایک رقم مخصوص کر کے دے دی جائے اور وہ انجمن اسے اس مقصد میں صرف کرے، بشرطیکہ ایسی انجمنوں کا قیام مصلحت کے مطابق ہو اور اسے معاشرے کی تائید و اعتماد حاصل ہو اور وہ الغارمین کی صورت کو اس طرح بروئے کار لائے کہ اس کا کوئی رکن کسی ادارے سے قرض لے کر کسی اصلاحی اقدام میں صرف کردے اور اس کے بعد الغارمین کی مد۔ مصالحاتی فنڈ ـــــــ سے اسے یہ رقم ادا کر دی جائے۔

---

[1] مطالب اولی النہی، ج ۲، ص ۱۴۳۔

بہرحال ہمیں اس امر کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص کسی باہمی صُلح کی خاطر خود اپنے پاس سے کوئی مالی ادائیگی کرے اور وہ زکوٰۃ کی مد سے اس کی وصولیابی کا طالب نہ ہو تو یہ بلاشبہ ایک بہت بڑا اخلاقی اقدام ہے اور اسلام کی نظر میں اس کارِ خیر کا درجہ بہت بلند ہے جیسا کہ ہم خصائص اُمّت سے زکوٰۃ کے تعلق کے بیان میں واضح کر چکے ہیں [1]

---

[1] غایۃ المنتہی اور اس کی شرح میں ہے کہ — چھٹا مصرف غارم ہے یعنی وہ شخص جو باہمی صُلح کرانے کی بنا پر مقروض ہو جائے اگرچہ وہ مالدار ہو مگر اس نے اپنے مال میں سے نہ دیا ہو اس لیے کہ اگر اس نے اپنے مال میں سے دیا تو وہ مقروض نہ ہوا، اور اگر اس نے قرض لے کر دیا پھر قرض ادا کر دیا تو اس قرض کو وہ زکوٰۃ سے لے سکتا ہے۔ (ج ۲، ص ۱۴۴)

بحثِ چہارم

مصائب اور آفاتِ سماویہ کا مسئلہ

کفایت اور امن اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے کا ہر فرد زندگی کے کفایت کے درجے میں رہے کہ اسے ضروریاتِ زندگی حاصل ہوں اور اسے کوئی خوف اور اندیشہ لاحق نہ ہو تاکہ وہ عاجزی (خشوع) اور حسن کاری (احسان) کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قریش پر ان دو نعمتوں —— کفایت اور امن —— پر احسان فرمایا۔

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (القریش : ۱، ۴)

چونکہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔

کسی بستی یا شہر پر جو بڑی سے بڑی مصیبت آسکتی ہے وہ ان دونوں نعمتوں سے محرومی ہے، چنانچہ فرمایا

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (النحل : ۱۱۲)

اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں

کا کفران شروع کر دیا تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت نے اسلامی ریاست کے ہر مسلم و غیر مسلم باشندے کو ایک "معیار زندگی" کی ضمانت دی ہے جس میں اسے لازماً روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کیا جائے گا اور ہر فرد کو علاج اور تعلیم کی سہولتیں اور مواقع میسر ہوں گے۔

زکوٰۃ نے معاشرے سے غربت (فقر) کو ختم کرنے کا عملی اقدام کیا ہے کہ ہر بیروزگار شخص کو روزگار فراہم کیا جائے اور محتاج کو اس کی اور اس کے خاندان کی کفایت — بعض فقہاء کے نزدیک پوری زندگی کی کفایت کے بقدر — فراہم کر دیا جائے اور جس کے پاس جزئی کفایت موجود ہو تو اس کی کفایت کی تکمیل کر کے اس کا معیار بلند کیا جائے۔

مصائب زمانہ

لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کو زندگی کی کافی ضروریات میسر ہوتی ہیں بلکہ وہ آسائش کی زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ اچانک زمانہ کی گردش کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور گردش روزگار اسے فقیر و محتاج اور پریشان و حیران بنا دیتی ہے اور ان مصائب کے روکنے پر انسان قادر بھی نہیں ہوتا۔ کوئی تاجر ہوتا ہے اس کا سامانِ تجارت سے لدا ہوا جہاز غرق ہو جاتا ہے یا اس کی دکان میں آگ لگ جاتی ہے یا کسی اور طرح اس کا سرمایا ضائع ہو جاتا ہے۔ کوئی زمین کا یا باغ کا مالک ہوتا ہے آفات سماوی اس کھیت اور باغ کو نیست و نابود کر دیتی ہیں یا ٹڈی دل یا کیڑا کھیت صاف کر ڈالتا ہے یا کاشتکار کے بیل مر جاتے ہیں اور وہ ہل چلانے کے قابل نہیں رہتا۔

یہی مصائب زمانہ مغرب میں انشورنس کا پیش خیمہ بنے ہیں

مصائب زمانہ گھروں کی بربادی اور کھاتے پیتے لوگوں کی فقیری کا باعث بن جاتے ہیں اس لیے لوگوں کو یہ خوف اور اندیشہ پریشان رکھتا ہے کہ کہیں مصیبت نہ آ جائے اور ان کی صنعت و تجارت اور سرمایہ ضائع نہ ہو جائے اور ان کو اور ان کی آل اولاد کو پریشانی کا

چہرہ نہ دیکھنا پڑے۔ اسی اندیشہ سے تحفظ کے لیے قرونِ اخیرہ میں مغرب میں نظام تائین INSURANCE SYSTEM وجود میں آیا ہے جس نے مختلف صورتیں اور شکلیں اختیار کی ہیں۔

اسلام کا نظام تائین

مغرب میں نظام تائین کے وجود میں آنے سے صدیوں قبل اسلام نے افراد معاشرہ کو تحفظ عطا کر دیا تھا اور مسلمانوں کے بیت المال میں تمام مسلمانوں کو شریک قرار دے کر ایک ہمہ گیر تائین کا بندوبست کر دیا تھا تاکہ افراد معاشرہ مصیبت کے وقت امداد اور تعاون حاصل کر سکیں۔

اسلام نے مصیبت زدگان کو اہلِ خیر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا ہے کہ ان کا جذبۂ رحمت جوش میں آئے تو وہ انہیں حسبِ توفیق کچھ دے دیں بلکہ اسلام نے اس مصیبت زدہ کی مصیبت رفع کرنے کا قانونی بندوبست کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اہلِ خیر کو بھی یہ ترغیب دی ہے تاکہ انفرادی طور پر بھی جذبات رحم اور خیر کے میلانات بروئے کار آتے رہیں۔ چنانچہ جب ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مبتلائے مصیبت ہو جانے کا حال بیان کیا تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اس کو زکوٰۃ دو، اور اصحابؓ نے اسے زکوٰۃ دی۔[۱]

الغارمین کے مصرف میں مصائب ناگہانی کی گنجائش موجود ہے

اسلام مصیبت زدہ افراد کو اہلِ خیر کے حسن سلوک پر نہیں چھوڑتا بلکہ بیت المال میں ان کا حصہ مقرر کرتا ہے اور زکوٰۃ میں ایک مستقل مصرف قائم کرتا ہے جس کا وہ حکمراں سے بلاجھجک

---

[۱] یہ حدیث صفحہ ۲۸۲ پر گزر چکی ہے۔ مسند احمد میں (ج ۳، ص ۵۸،۳۶) بھی مذکور ہے، مسلم نے کتاب المساقاۃ میں روایت کیا ہے ابوداؤد اور نسائی نے بیوع میں، ترمذی نے زکوٰۃ میں اور ابنِ ماجہ نے الاحکام میں روایت کیا ہے۔

اور قائل مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا ایک فرد ہے اور مسلمانوں کے بیت المال میں اس کا حق ہے۔

قبیصہ بن المخارق کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"تین صورتوں میں سوال جائز ہے ــــ ایک وہ شخص جس پر کوئی افتاد پڑ جائے اور اس کا مال ضائع ہو جائے تو اسے سوال کرنا جائز ہے تا آنکہ اُسے زندگی کی لازمی ضرورتیں میسر آجائیں"

بعض سلف مفسرین نے الغارمین کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"جس کا گھر جل جائے یا پانی میں اس کا مال بہہ جائے اور وہ اپنے گھر والوں کی ضرورت کے لیے قرض لے لے تو وہ اَلْغَارِمْ ہے"[1]

ناگہانی مصیبت میں زکوٰۃ کی مد سے کس قدر مدد کی جائے گی

ہم بیان کر چکے ہیں کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیصہ کو اجازت دی کہ وہ زندگی کی ضروریات کی وصولیابی کے لیے ارباب حکومت سے مطالبہ کر سکتے ہیں۔

"زندگی کی ضرورت" کا حساب انسان کے معاشرتی مقام اور مالی حیثیت کے مطابق ہوگا یعنی جس شخص کا گھر جل جائے تو اس کی زندگی کی ضرورت (قوامِ عَیْش) یہ ہے کہ اسے گھر بنا کر دیا جائے جو اس کی اور اس کے گھر والوں کی ضرورت کے مطابق ہو اور اس میں اتنا سامان ہو جو اس کی حیثیت کے مطابق ہو، اور تاجر جس کو تجارت میں نقصان ہو گیا ہو اس کو اس قدر سرمایہ فراہم کیا جائے کہ وہ از سرِ نو اپنا کاروبار چلانے میں کامیاب ہو جائے اگرچہ اسے پہلے جیسی فراخی اور وسعت حاصل نہ ہو۔ غرض اسی طرح ہر انسان کی ضرورت کا حساب کیا جائے گا۔

بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مصیبت ناگہانی میں افتادرسیدہ کو زکوٰۃ سے اس قدر

---

[1] الغارمون کا باب ملاحظہ کیجیے۔

امداد دی جائے گی کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر واپس آجائے۔[1]

لیکن میری رائے یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی رائے کا اختیار کرنا مال زکوٰۃ کی قلت اور کثرت پر موقوف ہے اور اس امر پر موقوف ہے کہ باقی سات مصارف کے لحاظ سے کیا ضروریات ہیں۔

کسانوں کے مصائب مصیبت رسیدہ افراد میں سب سے زیادہ شدید مصیبت ان محنت کش کسانوں کی ہوتی ہے جو زمین کا سینہ چیر کر دانہ گندم کاشت کرتے ہیں، اس لیے اس حصہ میں ان کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔

پہلے یہ ہوا کرتا تھا کہ دیہات کے لوگ خود ایک دوسرے کی کفالت کیا کرتے تھے کہ اگر کسی پر کوئی افتاد پڑ جاتی تو سب مل کر کچھ جمع کرتے اور اسے دے دیتے تاکہ اس کو سہارا مل جائے لیکن لوگوں کے دلوں سے خیر کے سوتے خشک ہو گئے اور مادی تہذیب نے انسانی ہمدردی کا جذبہ ہی مٹا کر رکھ دیا . . . . اب کسانوں کی کس مپرسی کا یہ عالم ہے کہ ——— اگر کسان کا بیل مر جائے تو وہ اور اس کے گھر والے اس کا اس [illegible] ہیں جیسے ان کا کوئی عزیز مر گیا ہو اور لوگ کہتے ہیں کہ اس کی تو کمر ہی ٹوٹ گئی۔

غرض آفات سماوی سے جس کے کھیت ضائع ہو جائیں، اس کا گھ[illegible] جائے، اس کی آمدن اور معاش ضائع ہو جائے یہ سب لوگ الغارمین کے مص[illegible] سے حصہ پائیں گے بلکہ ان کو الفقراء والمساکین سے بھی حصہ ملے گا تاکہ وہ اس [illegible] سے باہر آئیں اور ان کو سہارا دیا جائے تاکہ وہ زندگی کے سفر میں معاشرتی قافلہ کا ساتھ دے سکیں اور قافلہ سے منقطع ہو کر کسی اندھیری کھائی میں نہ گر پڑیں۔

---

[1] یہ رائے الغزالیؒ نے ذکر کی ہے جو ہم پہلے بھی الفقراء والمساکین کے مصرف میں بیان کر چکے ہیں۔

بحث پنجم

عدم ازدواج کا مسئلہ

اِسلام میں رہبانیت نہیں ہے

اسلام نے جنس کی جبلت کو آزاد نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس پر کچھ حدود و قیود عائد کی ہیں چنانچہ زنا کو حرام کیا ہے اور زنا کے دواعی کو بھی حرام قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام نے اس امر کی بھی اجازت نہیں دی ہے کہ انسان اس جبلت ہی کو ختم کر ڈالے یا اسے کچل ڈالے اور اپنی صلاحیت کو مٹا دے اور پوری زندگی کے لیے عورتوں سے علیحدگی اختیار کرے بلکہ اسلام نے نکاح کا حکم دیا ہے۔ اور اس امر کی تاکید کی ہے کہ دنیا سے منہ موڑ کر، رہبانیت اختیار کرے اور اس اللہ کی عبادت کے لیے فارغ ہو جانے کے دعویٰ کے ساتھ قدرت کے باوجود ترکِ زواج نہ اختیار کیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بعض صحابہ میں رہبانیت کا رجحان دیکھا تو آپؐ نے یہی اعلان فرمایا کہ یہ اسلام سے انحراف ہے اور سُنّت سے گریز ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ

"مجھے اللہ سبحانہٗ کا علم تم سے زیادہ ہے میں تم سے زیادہ اس کی خشیت رکھتا ہوں، اس کے باوجود میں رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، یہ میری سُنّت ہے جو اس سے گریز کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔" (بخاری)

حضرت سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون کو تبتّل سے منع فرمایا اگر آپ اجازت دے دیتے تو ہم ضرور عورتوں سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔"
(بخاری)

آپؐ نے عام نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

"اے نوجوانو جو تم میں سے ازدواج کی قدرت رکھے وہ شادی کرے کہ یہ آنکھوں کی حیا اور عفت کے لیے ضروری ہے" (بخاری)

انہی احادیث کی بنا پر فقہائے نے نکاح کو فرض کہا ہے اور فرمایا ہے کہ جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کے لیے ترک نکاح جائز نہیں ہے۔

مسلمان کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ ذمے داریوں کے بوجھ اور معاش کی کمی کا بہانا کر کے نکاح نہ کرے بلکہ اس کے لیے لازمی ہے کہ کوشش کرے اور جدوجہد کرے اور اللہ کے فضل اور اس کی اعانت کا منتظر رہے کہ اللہ سبحانہٗ نے پاک دامنی اور احصان اختیار کرنے والے زن و شو سے اپنے فضل کا وعدہ فرمایا ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور: ۳۲)

تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو، اگر وہ غریب ہوں تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

نیز فرمانِ نبوتؐ ہے۔

"تین افراد کی مدد اللہ پر حق ہے، پاکدامنی کے ارادے سے نکاح کرنے والا، ادائیگی کی نیت سے کتابت کا معاہدہ کرنے والا غلام اور راہِ خدا میں جہاد کرنے والا"[1]

اللہ کا فضل اور اس کی مدد جس کا اللہ نے ہر اس مؤمن سے وعدہ کیا ہے جو نکاح کا ارادہ رکھتا ہو ایک صورت یہ ہے کہ مسلم معاشرہ ——— اسلامی ریاست اور زکوٰۃ کا ادارہ ——— ضرورت مند شخص کے مہر اور نکاح کے اخراجات میں اس کی مدد کرے تاکہ وہ حیا و عفت کے اسلامی حکم کی تعمیل کر سکے، اسلامی معاشرہ استوار کر سکے اور اللہ کی ان آیات کا ادراک حاصل کر سکے جو حق سبحانہٗ نے بطور احسان بیان فرمائی ہیں۔

---

[1] احمد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم، از ابوہریرہ بسند صحیح، جیسا کہ التیسیر (ج ۱، ص ۴۸۴) میں ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (الروم : ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

یہ بات میں اپنے اجتہاد کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ فقہاء نے نکاح کو اتمام کفایت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ فقیر (تنگدست) کا اپنے نکاح کے لیے زکوٰۃ سے لینا اس کا اتمام کفایت ہے جیسا کہ ہم مصارف زکوٰۃ میں اس کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

●

بحث ششم

بے گھر ہونے کا مسئلہ

مصارف زکوٰۃ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کریم نے کس طرح ابن السبیل (مسافر) کی طرف توجہ فرمائی ہے اور بیشتر مقامات پر مسافر سے حسن سلوک کرنے اور مال زکوٰۃ میں سے اس کا حق دینے کا حکم فرمایا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر انسان کا گھر ہونا ضروری ہے جو اس کا ٹھکانا بن سکے اور یہ کہ ابن سبیل (مسافر) ہونے کو اسلام نے ناپسند فرمایا ہے غرض اسلام نے مکان اور گھر کو ضروریات حقیقی میں سے قرار دیا ہے۔

امام نوویؒ کفایت جس کے بغیر آدمی فقیر متصور ہوگا، کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کِفَایت (ضروریاتِ زندگی) جس کے بغیر آدمی کو فقیر (حاجتمند) سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ غذا، لباس، رہائش اور تمام ناگزیر ضرورتیں اس شخص کے لیے اور اس کے متعلقین (جو اس کے ذمے ہوں) کے لیے فراہم کی جائیں۔

ابن حزمؒ ان بنیادی اشیاء کا ذکر کرتے ہوئے جو اسلامی ریاست میں ہر فرد کو فراہم کرنا ضروری ہیں فرماتے ہیں کہ

"اگر نظام زکوٰۃ قائم نہ ہو تو ہر شہر کے اہلِ ثروت اس امر کے ذمے دار ہوں گے کہ وہ اپنے شہر کے فقیروں (ضرورتمندوں) کی ضرورت پوری کریں، اور انھیں حکومت اس پر مجبور کرے وہ انھیں غذا، لباس سرما و گرما اور ایسی رہائش جس سے وہ دھوپ بارش سے اور گزرنے والوں کی نگاہ سے محفوظ رہ سکیں دیں"[1]

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۵۶۔

ابن السبیل کے بیان میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے مفہوم میں لقیط (افتادہ بچہ) بھی شامل ہے کیونکہ سبیل کا مفہوم اہل خانہ ماں باپ پر مشتمل ہے اور لقیط جرم کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا بار دوسروں پر نہیں ڈالا جاسکتا کیونکہ فرمان الٰہی ہے۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ

(الانعام : ۱۶۴)

ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمے دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

اس لیے ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے مال میں سے ان کا بھی حصّہ ہو اور وہ اس سے ان کی دیکھ بھال کی جائے، ان کی تربیت کی جائے اور انھیں پاک اور مستقیم مستقبل کے لیے تیار کیا جائے۔

بہر حال جن فقہاء کے نزدیک لقیط ابن السبیل میں داخل نہیں ہے ان کے نزدیک وہ فقراء اور مساکین میں ضرور داخل ہے کہ یہ بھی بلا اختلاف مصارف زکوٰۃ ہیں۔

تنبیہ

زکوٰۃ اسلامی نظام حیات کا ایک حصّہ ہے اور یہ حصّہ تنہا معاشرہ کی تمام مشکلات ومسائل کا حل فراہم نہیں کرسکتا کہ محض نظامِ زکوٰۃ کو جاری کردیا جائے اور باقی تمام نظامِ زندگی جاہلی رہے کہ اس میں اسلام کہیں کارفرما نہ ہو، اسلامی قانون جاری، اسلامی اخلاق اور اسلامی آداب کی کوئی رعایت نہ ہو۔

اسلام مکمل جامع اور مربوط نظام ہے اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اس نظام میں یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا ایک حصّہ لے کر جاہلی نظام میں جاری کردیا جائے، یا کوئی غیر اسلامی نظام درآمد کرلیا جائے اور اس میں اسلام کے کچھ پیوند لگادیئے جائیں، کہ اس آمیزش سے نہ تو ایسا کوئی فائدہ حاصل ہوگا جس کی اسلام نے ضمانت دی ہو اور نہ جاہلی معاشرے کی پیدا کردہ کوئی خرابی دور ہوگی ــــ بلکہ اسلام کے

حقیقی فوائد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ پورا اور مکمل اسلام جاری اور نافذ ہو۔ یہود کو اللہ سبحانہ نے اسی بات پر سرزنش فرمائی ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۝

(البقرہ : ۸۵)

تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔

اور اللہ سبحانہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے بعد آنے والے تمام حکمرانوں کو تنبیہ فرمایا کہ

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

(المائدہ : ۴۹)

پس اے نبی، تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔

●

ساتواں باب

زکوٰۃ الفِطر (فِطرہ)

۱) اس کا مفہوم، حکمت اور حکم۔
۲) کس پر واجب ہے اور کس کی جانب سے واجب ہے۔
۳) مقدار واجب کیا ہے اور یہ کہ کس شئے پر واجب ہے۔
۴) وجوب کا وقت اور دینے کا وقت کیا ہے۔
۵) زکوٰۃ الفطر کس کو دی جائے۔

اس باب میں پانچ فصلیں ہیں۔

پہلی فصل: زکوٰۃ الفطر کا مفہوم اس کا حکم اور اس کا مشروعیت ہونا۔
دوسری فصل: کس پر واجب ہے اور کس کی جانب سے واجب ہے۔
تیسری فصل: مقدار فطر، کس شئے پر واجب ہے اور کیا اس کی قیمت دینا جائز ہے
چوتھی فصل: وجوب اور ادائیگی کا وقت۔
پانچویں فصل: کس پر زکوٰۃ الفطر صرف کی جائے گی۔

پہلی فصل

زکوٰۃ الفطر کا مفہوم اس کا حکم اور اس کی حکمت

زکوٰۃ الفطر کا مفہوم زکوٰۃ الفطر (فطرہ) کے معنی ہیں وہ زکوٰۃ جو رمضان المبارک کے روزے ختم ہو جانے (افطار) سے واجب ہوتی ہے اسے صدقۃ الفطر بھی کہتے ہیں کہ از روئے شریعت صدقۃ کے لفظ کا اطلاق فرض زکوٰۃ پر بھی ہوتا ہے جو کہ قرآن و سنّت میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ اسے زکوٰۃ الفطرۃ بھی کہتے ہیں یعنی یہ فطرتِ انسانی (تخلیق انسانی) کی زکوٰۃ ہے اور تزکیۂ نفس کے طور پر واجب ہوتی ہے۔ زکوٰۃ الفطر میں جو شئے (یا رقم) ادا کی جاتی ہے اسے فِطرہ کہتے ہیں مگر یہ لفظ عربی یا معرب نہیں ہے بلکہ مُوَلّد ہے اور ایک فقہی اصطلاح کے طور پر مستعمل ہے [1]

---

[1] ابن عابدین شامی اپنے حاشیہ رد المحتار میں فرماتے ہیں کہ فقہاء کے یہاں جو لفظ "فطرہ" استعمال ہوتا ہے مُوَلَّد ہے بلکہ بعض ماہرین لغت نے اسے لحن عوام (غلط العوام) قرار دیا ہے۔ بہر حال فطرہ سے مراد صَدَقہ ہے اور بلحاظ لغت درست نہیں ہے اس لیے کہ لغت میں اس معنی میں نہیں ہے۔ چنانچہ القاموس میں ہے کہ فطرہ سے مراد صدقۃ الفطر اور طبیعت اور ساخت ہے، جس کے بارے میں محققین نے کہا ہے کہ پہلا مفہوم غلط ہے کیونکہ صدقہ کا مفہوم فقہی اصطلاح کے طور پر ہے لغوی معنی کے لحاظ سے نہیں ہے۔ بہر حال اس لفظ کے یہ معنی القاموس کے اغلاط میں سے ایک ہیں اور صاحب القاموس نے متعدد مقامات پر شرعی مفاہیم کو لغوی معنی کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔

المغرب میں ہے کہ فطرہ صَدَقہ کے مفہوم میں امام شافعیؒ نے کئی مقامات پر استعمال

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

زکوٰۃ الفطر ۲ھ میں فرض ہوئی ہے اور اسی سال رمضان کے روزے فرض ہوئے ہیں ——— اور زکوٰۃ الفطر کی فرضیت کا مقصود یہ ہے کہ روزہ دار لغو اور رفث سے پاک ہو جائے (اور اس کا کفارہ ہو جائے) اور مساکین کے لیے کھانا فراہم ہو جائے اور وہ عید کے روز حاجتمندی سے اور ذلت سوال سے محفوظ ہو جائیں۔

اس زکوٰۃ میں اور زکوٰۃ کی دیگر انواع میں فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ الفطر (فطرہ) اشخاص پر عائد ہوتی ہے جبکہ دیگر انواع زکوٰۃ مال پر عائد ہوتی ہیں اسی لیے فطرہ میں ملکیت نصاب

(بقیہ آگے) کیا ہے جو بلحاظ لغت درست ہے لیکن مجھے اس کی کوئی اصل نہیں ملی۔

النووی کہتے ہیں کہ یہ لفظ مولّد ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ فطرۃ بمعنی فطرت ہی مستعمل ہوا ہو۔

ابو محمد بن الابھری کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم زکوٰۃ الخِلقہ (فطرت کی زکوٰۃ یا تخلیق کی زکوٰۃ) ہے یعنی یہ کہ یہ جسم انسانی کی زکوٰۃ ہے۔

المصباح میں ہے کہ فطرہ کا مفہوم ہے زکوٰۃ الفطرہ یعنی جسم انسانی پر عائد ہونے والی زکوٰۃ۔ اس میں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائمقام کر دیا اور صرف مضاف الیہ کا استعمال ہونے لگا کہ اسی سے ذہن مفہوم کی جانب متبادر ہو جاتا ہے۔ یہی رائے القہستانی کی ہے کہ یہ انسان کے سر کا صدقہ اور اس کے جسم کی زکوٰۃ ہے۔

حاصل یہ کہ فِطرۃ کا لفظ بلحاظ لغت خِلقت اور ساخت کے معنی میں ہے اور اسے زکوٰۃ الفطر کے مفہوم میں استعمال کرنا ایک فقہی اصطلاح ہے اور اس لحاظ سے یہ لفظ مُوَلّد ہے جبکہ اگر اسے مضاف (زکوٰۃ) کے لفظ کو متصور کر کے استعمال کیا جائے (یعنی زکوٰۃ الفطرۃ) تو یہ بلحاظ لغت بھی درست ہے اور یہی لغوی درستگی کی وہ صورت ہے جو المغرب نے بیان کی ہے۔

ردالمحتار، ج ۲، ص ۷۸۔

ف المرقاۃ، ج ۴، ص ۱۵۹۔

وغیرہ کی شرائط نہیں ہیں، اسی لیے فقہاء نے اسے "اجسام کی زکوٰۃ" یا "شخص کی زکوٰۃ" کہا ہے۔

زکوٰۃ الفطر کی فرضیت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ الفطر کی فرضیت کا اعلان رمضان میں فرمایا کہ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ہر مسلمان آزاد اور غلام مرد اور عورت پر فرض ہے۔"[1]

جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ یہاں پر فرضیت کے معنی وجوب کے ہیں یعنی زکوٰۃ الفطر واجب ہے اور اس فرمان الٰہی کے عموم میں داخل ہے:

وَآتُوا الزَّكٰوةَ

(البقرہ : ۱۱۰، النساء: ۷۷، النور: ۵۶)

اور زکوٰۃ ادا کرو۔

خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرہ کو زکوٰۃ فرمایا اس لیے لامحالہ اس حکم قرآنی میں داخل ہے اور آپؐ نے اسے فرض فرمایا جو کہ شریعت میں وجوب اور لزوم کے معنی میں مستعمل ہے۔

اس امر کی تائید کہ فرض وجوب اور لزوم کے معنی میں ہے اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث مذکورہ میں فرض کے ساتھ "علیٰ" استعمال ہوا ہے جو کہ وجوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ صحیح روایات میں اَمَرَ کا لفظ آیا ہے یعنی آپؐ نے حکم فرمایا اور امر کا لفظ بھی وجوب پر دلالت کرتا ہے۔[2]

---

[1] منتقی الاخبار، نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۷۹- ط العثمانیہ۔

[2] النووی علی مسلم، ج ۷، ص ۵۸، المحلی، ج ۶، ص ۱۱۹۔

ابوالعالیہ، عطاء اور ابن سیرین نے اس کے فرض ہونے کی وضاحت کی ہے جیساکہ بخاری میں ہے[1] اور یہی امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے۔

فقہائے احناف فرض اور واجب میں فرق کرتے ہیں اور ان کے نزدیک فطرہ واجب ہے فرض نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک فرض وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اور واجب وہ ہے جو دلیل ظنی سے ثابت ہو، اس فرق کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ فرض کا منکر کافر ہے لیکن واجب کا منکر کافر نہیں ہے اس لیے فقہاء احناف واجب کو فرض عملی کہتے ہیں جو فرض اعتقادی کے بالمقابل ہے، جبکہ ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ) کے نزدیک فرض ان دونوں اقسام پر مشتمل ہے یعنی جو قطعی دلیل سے ثابت ہو یا ظنی دلیل سے ثابت ہو۔ بہرحال احکام میں احناف کی رائے فقہائے ثلاثہ سے مختلف نہیں ہے[2] بلکہ یہ محض اصطلاحی اختلاف ہے جس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔

---

[1] البخاریؒ نے اس قول کو تعلیق کے ساتھ ذکر کیا ہے اور الحافظ (ابن حجرؒ) نے فتح الباری میں کہا ہے کہ عبدالرزاق نے اس قول کو بروایت ابن جریج از عطاء متصل روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے بروایت عاصم الاحول متصل روایت کیا ہے۔ بخاریؒ نے ان فقہاء کا نام اس لیے لیا ہے کہ انھوں نے زکوٰۃ الفطر کی فرضیت کی تصریح کی ہے ورنہ ابن المنذرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

[2] ابن الہمام کہتے ہیں کہ معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ائمہ ثلاثہ بھی جس طرح اس کی فرضیت ثابت کرتے ہیں اس سے اس کا منکر کافر نہیں ہوگا یعنی فقہائے احناف کے نزدیک فرض ہمارے واجب سے عام ہے اور ہم نے اس کے ایک جزء پر اس کا اطلاق کر لیا ہے۔ اور احناف نے فطرہ کو فرض کے بجائے واجب اس لیے کہا ہے کہ اس سلسلے میں وارد احادیث قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت نہیں ہیں — دیکھئے المرقاۃ علی المشکوٰۃ، ج ۴، ص ۱۶۰۔

مالکی فقہاء نے اشہب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ یہ سنت مؤکدہ ہے[1] مسلک ظاہر کے بعض فقہاء کی بھی یہی رائے ہے۔ مسالک شافعیؒ کے ابن اللبان کا یہی قول ہے۔ ان فقہاء نے سنت میں وارد فرض کے لفظ کو تقدیر (اندازے) کے معنی میں لیا ہے لیکن جو دلائل ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ان سے اس رائے کی تردید ہو جاتی ہے۔

ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ از روئے لغت فرض کے معنی قدر (مقرر کرنے اور اندازہ کرنے) کے ہیں جس کے شریعت میں وجوب کے معنی ہیں اور اسی معنی پر محمول کرنا بہتر ہے۔

ابن الہمام فرماتے ہیں کہ جو لفظ شارع کے کلام میں مستعمل ہوا ہو اسے شرعی مفہوم میں استعمال کرنا متعین اور لازمی ہے جب تک کوئی ایسی دلیل موجود نہ ہو جو اس معنی کے علاوہ کسی اور مفہوم کی نشاندہی کرتی ہو۔ فرض کے لفظ میں حقیقت شرعیہ محض تقدیر نہیں ہے خصوصاً جبکہ بخاری اور مسلم کی احادیث میں اَمر (حکم) کا لفظ آیا ہے اس لیے فرض کے معنی اَمر کے ہوں گے۔

وجوب کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ فطرہ کو زکوٰۃ کہا گیا ہے اس لیے یہ زکوٰۃ کے عمومی حکم میں داخل ہوگا جس کا اللہ سبحانہٗ نے حکم فرمایا ہے اور جس کے مانعین پر شدید وعید فرمائی ہے۔

---

[1] ابن حزمؒ نے المحلی (ج ۶، ص ۱۱۸) میں امام مالکؒ سے روایت کیا ہے کہ فطرہ فرض نہیں ہے۔ اس پر شیخ شاکر فرماتے ہیں کہ یہ ابن حزمؒ کا وہم ہے کیونکہ امام مالکؒ المؤطا میں فرماتے ہیں کہ اہلِ بادیہ پر بھی زکوٰۃ الفطر اسی طرح واجب ہے جس طرح اہل شہر پر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان سے افطار کی زکوٰۃ مقرر فرمائی۔ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں (ج ۱، ص ۲۶۹) میں بعض مالکی اصحاب سے یہی قول نقل کیا ہے۔

امام نوویؒ نے ابن اللبان کا یہ قول نقل کر کے کہ زکوٰۃ الفطر سنّت ہے کہا ہے کہ یہ قول شاذ اور منکر ہے بلکہ صریحاً غلط ہے۔

اسحٰق بن راہویہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ الفطر کا وجوب اجماع کے درجے میں ہے بلکہ ابن المنذر نے اس پر اجماع ہونا نقل کیا ہے۔

اسحٰق بن راہویہ کا قول زیادہ دقیق ہے کیونکہ اس میں کم ہی اختلاف ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور اس لیے کہ ابراہیم بن علیہ اور ابوبکر بن الاحم نے فرمایا ہے کہ زکوٰۃ الفطر کا وجوب زکوٰۃ کی فرضیت سے منسوخ ہو گیا ہے۔ ان حضرات کی دلیل قیس بن سعد بن عبادہ کی یہ حدیث ہے جو احمد اور نسائی نے روایت کی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے قبل ہمیں صدقۂ فطر کا حکم دیا تھا اور جب زکوٰۃ کا حکم نازل ہو گیا تو آپؐ نے نہ حکم فرمایا اور نہ منع کیا، اور ہم فطرہ ادا کرتے رہے۔"

مگر اس حدیث کی سند میں کلام ہے اور بقول حافظ[1] اس میں ایک راوی مجہول ہے لیکن اگر ہم اس کو صحیح تسلیم کر لیں تو بھی اس میں فطرہ کے نسخ پر کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ حکمِ اوّل ہی کافی ہے کیونکہ کسی فرض کے حکم کے نزول سے دوسرے فرض کا سقوط لازم نہیں آتا[2] جبکہ اللہ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے احکام میں اصل یہی ہے کہ

---

[1] السیوطی نے شرح النسائی میں اور الشوکانی نے نیل الاوطار (ج ۴، ص ۱۸۰۔ ط۔ العثمانیہ) میں حافظ ابن حجرؒ کے اس قول کی اتباع کی ہے مگر احمد شاکر نے ابن حجرؒ کے اس قول پر اظہار تعجب کیا ہے اور نسائی کی روایت کردہ دونوں سندوں کے ساتھ (ج ۵، ص ۴۹) اس حدیث کو نقل کر کے کہا ہے کہ یہ ہر دو سند صحیح ہیں، ان کے راوی ثقہ ہیں اور ان میں مطلقاً کوئی راوی مجہول نہیں ہے ــــــ حاشیۃ المحلی، ج ۶، ص ۱۱۹۔

[2] فتح الباری، ج ۴، ص ۱۱۰، ۱۱۱، ط الحلبی۔ المرقاۃ، ج ۴، ص ۱۵۹، ۱۶۰، المحلی، ج ۶، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔ الروضۃ للنووی، ج ۲، ص ۲۹۱، شرح مسلم للنووی، ج ۷، ص ۵۸، نیل الاوطار ج ۴، ص ۱۸۰۔ ط۔ العثمانیہ۔ الفتح الربانی وشرحہ، ج ۹، ص ۲۳۴، ۲۳۷۔

یہ احکام محکم ہیں اور باقی رہتے ہیں اور محض احتمال نسخ سے نسخ ثابت نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ زکوٰۃ الفطر کے وجوب کا قول رہا ہے اور اس قول سے گریز کرنے والوں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی، کیونکہ یہ اقوال شاذ اور اجماع کے خلاف ہیں[1] اور اس موضوع پر شاخت (Scha) نے جو کچھ کہا ہے وہ محض غلط بحث ہے[2]

---

[1] البحر الزخار ج ۲، ص ۱۹۵۔

[2] شاخت نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اپنے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ زکوٰۃ الفطر کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے یعنی جو رائے بعد میں عام ہوئی وہ فطرہ کے وجوب کی ہے جبکہ فقہائے مالکیہ کے نزدیک سُنّت ہے۔

شاخت کی اس رائے میں بڑا غلط بحث ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ زکوٰۃ الفطر کے وجوب پر فقہاء کا تقریباً اجماع ہے اور ابن المنذر نے تو اجماع ہی نقل کیا ہے اگر ایک یا دو فقہاء نے مختلف ادوار میں اس اجماعی رائے سے اختلاف کیا بھی ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہے۔ نیز مسلک مالک کے فقہاء کے نزدیک بھی زکوٰۃ الفطر واجب ہے جیسا کہ مسلک مالک کی کتب میں مذکور ہے۔ (دیکھیے: بلغۃ السالک علی الشرح الصغیر للدردیر ج ا، ص ۲۳۷۔ الشرح الکبیر وحاشیۃ الدسوقی علیہ ج ا، ص ۵۰۴) رہ گیا اشہب کا قول تو مسلک مالک میں ان کی رائے پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔

دراصل شاخت کو ابن ابی زید کے "الرسالۃ" میں مذکور اس قول سے التباس ہوا ہے کہ زکوٰۃ الفطر سُنّت واجبہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چھوٹے بڑے پر فرض قرار دیا۔ حالانکہ اس قول میں صرف سُنّت نہیں ہے بلکہ واجب اور فرض کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ (دیکھیے شرح الرسالۃ لزروق ج ا، ص ۳۴۱)

امام مالکؒ نے المؤطا میں اس کے وجوب کی تصریح کی ہے اور اس پر حدیث سے استدلال کیا ہے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اس لیے زکوٰۃ الفطر کی فرضیت کی رائے بعد میں عام نہیں ہوئی، جیسا کہ شاخت نے دعویٰ کیا بلکہ عہدِ نبوت ؐ ہی سے اس کی فرضیت متعارف ہے۔

زکوٰۃ الفطر کی حکمت زکوٰۃ الفطر کے وجوب کی حکمت حضرت ابن عباسؓ سے مروی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ اس لیے فرض فرمائی کہ روزہ دار لغو سے اور رفث سے پاک ہوجائے اور مساکین کو کھانا میسر آجائے"۔ [1]

اس حکمت کے دو پہلو ہیں:-

پہلا پہلو ماہ رمضان کے روزے داروں سے متعلق ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ روزے داروں کے روزوں میں کچھ نامناسب افعال سرزد ہوگئے ہوں اور کوئی ناشائستہ بات زبان سے نکل گئی ہو کہ صوم کامل (مکمل روزہ) تمام اعضاء کا روزہ ہوتا ہے اور روزہ دار کے کان، ناک، آنکھ، زبان، پیٹ، ہاتھ اور پیر تمام کے تمام ہر اس فعل سے باز رہتے ہیں جس سے اللہ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہو اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ روزہ دار ان تمام ممنوعات سے اجتناب کرسکے اس لیے کہ انسان کمزور مخلوق ہے۔

---

[1] اس حدیث کو ابوداؤد نے باب زکوٰۃ الفطر میں روایت کیا ہے اور انھوں نے اور المنذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے جو بمنزلہ تحسین کے ہے۔ الحاکم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (ج ۱، ص ۴۰۹) اور کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اور الذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ ابن ماجہ نے باب زکوٰۃ الفطر میں اور الدارقطنی (ص ۲۱۹) نے بھی روایت کیا ہے اور دارقطنی نے کہا ہے کہ اس کے راوی مجروح نہیں ہیں نیز بیہقی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (ص ۱۶۳)۔ دیکھیے المرقاۃ ج ۴، ص ۱۷۳۔ نصب الرایہ، ج ۲، ص ۴۱۱۔

زیر بحث حدیث کا مکمل متن یہ ہے۔

فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ الفطر طھرۃ للصائم من اللغو والرفث وطعمۃ للمساکین من اداھا قبل الصلوٰۃ فھی زکوٰۃ مقبولۃ ومن اداھا بعد الصلوٰۃ فھی صدقۃ من الصدقات۔

روزہ میں سرزد ہوجانے والی اس ممکنہ کوتاہی کے پیشِ نظر زکوٰۃ الفطر فرض کی گئی ہے تاکہ روزہ دار اس کوتاہی سے پاک وصاف ہوجائے، اس کے روزے میں جو آمیزش ہوئی ہے وہ دھل کر زائل ہوجائے اور جو نقص رہ گیا ہے اس کی تلافی ہوجائے کیونکہ قاعدہ ہے کہ حسنات سے سیئات دور ہوجاتی ہیں۔

نماز پنجگانہ کے ساتھ سنتوں اور نفلوں کا حکم شرعی بھی اسی حکمت پر مبنی ہے کہ اگر نماز میں کوئی غفلت ہوجائے یا اس کے کسی ادب کی تکمیل میں کوتاہی ہوجائے تو سنتوں سے اس کی تلافی ہوجائے گی بعض ائمہ نے زکوٰۃ الفطر کو سجدۂ سہو سے تشبیہ دی ہے چنانچہ وکیع بن الجراح فرماتے ہیں کہ ماہِ رمضان کے بعد زکوٰۃ الفطر نماز کے سجدۂ سہو کی طرح سجدۂ سہو سے نماز کے نقصان کی تلافی ہوجاتی ہے اسی طرح زکوٰۃ الفطر سے روزے کے نقصان کی تلافی ہوجاتی ہے[1]

دوسرا پہلو معاشرے سے متعلق ہے کہ زکوٰۃ الفطر کے ذریعے محبتوں کی فراوانی اور مسرتوں کی ارزانی کو معاشرے کے تمام افراد بالخصوص مساکین اور ضرورتمندوں تک پہنچایا جائے۔ کیونکہ عید کا دن عام خوشی اور مسرت کا دن ہوتا ہے اور اس خوشی کو مسلم معاشرے کے تمام افراد کے درمیان عام کرنا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ ایک غریب مسکین اس صورت حال میں خوش نہیں ہوسکتا کہ معاشرے کے خوش حال افراد خوش ذائقہ غذائیں کھا رہے ہوں اور وہ اس عام خوشی کے دن بھی ایک وقت کی روٹی سے محروم ہو۔

اس لیے حکمت شارع اس امر کی مقتضی ہوئی کہ اس روز خوش حال افراد پر کچھ ایسی ذمے داری عائد کردی جائے جو معاشرے کے نادار افراد کو ضرورت کے چنگل سے نکال دے اور سوال کی ذلت سے نجات دے دے، اور انھیں یہ احساس ہوجائے کہ معاشرے نے انھیں نظر انداز نہیں کیا ہے اور اس خوشی کے موقع پر انھیں فراموش نہیں کیا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ

---

[1] نہایۃ المحتاج، ج ۲، ص ۱۰۸۔

"آج کے دن انھیں (اہلِ ضرورت کو) غنی کر دو"۔[1]

زکوٰۃ الفطر میں یہ مصلحت بھی ملحوظ رکھی گئی کہ اس کی شرح کم ہو تاکہ لوگوں کو دینا آسان ہو اور وہ اپنی خوراک میں سے زائد حصہ اہلِ ضرورت کو دے سکیں اور معاشرے کے افراد کی کثیر تعداد اس مبارک موقع پر اس حسنِ سلوک میں شریک ہو جائے۔

---

[1] نیل الاوطار میں امام شوکانی نے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو بیہقی اور دارقطنی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اور بیہقی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "آج کے روز کے چکر سے انھیں مستغنی کر دو"۔ ابن سعد نے الطبقات (ج ۴، ص ۱۸۶) میں حضرت عائشہؓ اور ابو سعید سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مزید دیکھیے نصب الرایہ: ج ۲، ص ۴۳۲، حاشیۃ المحلی، ج ۶، ص ۱۲۰۔

دوسری فصل

زکوٰۃ الفطر کس پر واجب ہے اور کس کی جانب سے واجب ہے

زکوٰۃ الفطر کس پر واجب ہے

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث جو پہلے گزر چکی ہے اور جسے متعدد راویوں نے روایت کیا ہے یہ ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی زکوٰۃ الفطر مسلمانوں کے ہر آزاد غلام مرد و عورت پر فرض فرمائی ہے"

بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ الفطر فرض فرمائی ایک صاع کھجور، ایک صاع جَو، مسلمانوں کے ہر آزاد، غلام، مرد و عورت اور بچے بڑے پر"

جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ

"زکوٰۃ الفطر ہر آزاد غلام، مرد و عورت، بچے بڑے، مالدار اور فقیر پر فرض ہے"[1]

بہر حال یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے اور اس معاملہ میں رائے قابلِ قبول نہیں ہے (یعنی فقیہ کے بارے میں)۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ مسلمانوں کے افراد اور اشخاص پر فرض ہے اور اس میں آزاد یا غلام مرد یا عورت، بچے یا بڑے بلکہ فقیر یا غنی میں اور شہری اور دیہاتی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

---

[1] احمد، بخاری، مسلم، نسائی، الفتح الربانی، ج ۹، ص ۱۳۹۔ کتاب الزکوٰۃ حدیث نمبر ۱۰۱۔

امام زہری، ربیعۃ اور لیث کہتے ہیں کہ زکوٰۃ الفطر شہریوں کے ساتھ خاص ہے اور (اہل البادیہ) جنگل میں رہنے والوں پر واجب نہیں ہے۔ لیکن احادیث اس کی تردید کرتی ہیں اور اس مسئلہ میں جمہور ہی کی رائے درست ہے [۱]

ابن حزمؒ نے عطاء سے یہ قول نقل کر کے اس کی تردید کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اعرابی یا بدوی کی تخصیص نہیں فرمائی اس لیے جائز نہیں ہے [۲]

بیوی اور بچے پر زکوٰۃ الفطر کا وجوب

مذکورہ بالا احادیث میں ذکر اور انثی (مرد و عورت پر) کے الفاظ اس رائے کی تائید کرتے ہیں جو امام ابوحنیفہؒ نے اختیار فرمائی ہے کہ زکوٰۃ الفطر عورت پر بھی فرض ہے خواہ اس کا شوہر ہو یا نہ ہو اور یہ کہ یہ بیوی پر خود اس کے مال پر عائد ہوتی ہے۔ اور یہی ظاہریہ کا مسلک ہے [۳]

ائمہ ثلاثہ اور لیث اور اسحاق کے نزدیک شوہر پر اپنی بیوی کی زکوٰۃ الفطر دینا لازم ہے کیونکہ نفقہ میں وہ اسی کی تابع ہے۔ مگر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس رائے میں تامل یہ ہے کہ انہی فقہاء کے نزدیک اگر شوہر تنگدست ہو جائے اور بیوی باندی ہو تو اس کی زکوٰۃ الفطر اس کے مالک کے ذمے ہوگی، جبکہ نفقہ میں ایسا نہیں ہے (یعنی نفقہ میں شوہر کے تنگدست ہو جانے پر باندی بیوی کا نفقہ اس کے مالک کے ذمے نہیں آتا) اس لیے ان دونوں (نفقہ اور زکوٰۃ الفطر) میں فرق ہے۔ (اس لیے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا) نیز انہی فقہاء کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ مسلم اپنی کافر بیوی کی طرف سے زکوٰۃ الفطر ادا نہیں کرے گا باوجودیکہ مسلمان شوہر پر کافر بیوی کا نفقہ لازم ہے۔

---

[۱] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۱۔

[۲] المحلی، ج ۶، ص ۱۳۱۔

[۳] الفتح الربانی و شرحہ، ج ۹، ص ۱۴۰، حدیث نمبر ۱۸۷۔ کتاب الزکوٰۃ۔

دراصل امام شافعیؒ نے محمد بن علی الباقر کے اس مرسل کو دلیل بنایا ہے کہ "زکوٰۃ الفطر ان تمام لوگوں کی طرف سے ادا کرو جن کی تم کفالت کرتے ہو"[1] لیکن اس جیسی ضعیف حدیث کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ مگر امام شافعیؒ اور ان کی رائے کے قائل فقہاء — بقول ابن الترکمانی[2] — مستاجر پر اس کے مزدور کی اور مالک پر اس کے کافر غلام کی زکوٰۃ الفطر لازم قرار دیتے تھے، کیونکہ اجیر مستاجر اور غلام مالک کی زیر کفالت ہوتا ہے[3]

امامیہ مسلک کے فقہاء کہتے ہیں کہ ہر شخص پر اس کی اور اس کے زیر کفالت افراد کی زکوٰۃ الفطر لازم ہے۔

لیث کہتے ہیں مستاجر اس اجیر کی طرف سے زکوٰۃ الفطر ادا کرے گا جس کی اُجرت

---

[1] البیہقی (ص ۱۶۱، ج ۴) نے اس حدیث کو اس سند سے روایت کیا ہے اور اپنی سند میں ذکر علی کا اضافہ کیا ہے جو کہ منقطع ہے۔ ابن حزمؒ نے اس مقام پر بڑی عجیب بات کہی ہے کہ امام شافعیؒ مرسل کے قائل نہیں ہیں لیکن یہاں پر انھوں نے سب سے کم تر درجے کے مرسل کو دلیل بنا لیا ہے یعنی جو ابن ابی یحییٰ کی روایت سے ہے (المحلی، ج ۶، ص ۱۳۷) البیہقی نے حضرت ابن عمرؓ سے "ممن تمونون" کے الفاظ بھی روایت کیے ہیں جس کی سند قوی نہیں ہے (ج ۴، ص ۱۶۱) دار قطنی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۱) البیہقی نے اس حدیث کو حضرت علیؓ سے بھی روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ

"جس کا نفقہ تمہارے ذمے ہو تو تم اس کی جانب سے کھلاؤ"

اس میں عبد الاعلی راوی ہے جو کہ قوی نہیں ہے جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے لیکن ماقبل کی روایات سے اس کی تقویت ہو جاتی ہے۔

البحر میں ہے کہ یہ توقیف ہے (ج ۲، ص ۱۹۹) دیکھیے نصب الرایہ، ج ۲، ص ۴۱۳)

[2] الجوہر النقی، مع السنن الکبریٰ، ج ۴، ص ۱۶۰۔

[3] فقہ الامام جعفر، ج ۲، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

مقرر نہ ہو۔ لیکن اگر اس کی اجرت معلوم ہو تو اس کے ذمے زکوٰۃ الفطر کی ادائیگی نہیں ہے[1]
زیدیہ مسلک کے فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ الفطر کسی شخص پر اس فرد کا لازم ہے جس کا نفقہ رشتہ داری یا زوجیت یا غلامی کی بنا پر اس کے ذمے ہو۔[2]
حدیث میں صغیر اور کبیر کے الفاظ آتے ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ بچہ پر اس کے مال میں زکوٰۃ الفطر واجب ہے، اور اس کا ولی جس طرح اس کے مال کی زکوٰۃ دیتا ہے اسی طرح اس کی زکوٰۃ الفطر بھی ادا کرے گا اور اگر بچہ کے پاس مال نہ ہو تو جس کے ذمے اس کا نفقہ ہو وہ اس کی زکوٰۃ الفطر ادا کرے گا ——— جمہور فقہاء کا بھی مسلک ہے۔
محمد بن الحسنؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ الفطر صرف باپ پر لازم ہے اور جس بچہ کا باپ نہ ہو اس پر کچھ لازم نہیں ہے۔[3]
سعید بن الحسن اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ صرف روزے دار پر واجب ہے اس لیے کہ روزہ دار کی تطہیر کے لیے ہی زکوٰۃ الفطر واجب ہوئی ہے، اور چونکہ بچہ گنہگار نہیں ہوتا اس لیے وہ اس تطہیر کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ الفطر روزے دار کی لغو اور رفث سے تطہیر کے لیے فرض فرمائی"

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ تطہیر کا ذکر اس حدیث میں اس کے اغلب حکمت کے ذکر کے طور پر ہے کیونکہ دیگر احادیث میں زکوٰۃ الفطر کی یہ حکمت بھی بیان کی ہے کہ

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۲۷۔

[2] البحر، ج ۲، ص ۱۹۹۔

[3] ۔۔۔ ، ص ۱۳۵۔ نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۰، ۱۸۱۔ المحلی، ج ۶، ص ۱۳۷۔

اس سے مساکین کو غذا میسر آجاتی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ
"آج کے دن ان کو مستغنی بنا دو۔"
یعنی زکوٰۃ الفطر اگر ایک پہلو سے روزے دار کی تطہیر ہے تو اس میں دوسرا پہلو مسکین کو غذا فراہم کرنا اور اس کو غنی کر دینا بھی ہے، اور یہ ایسی حکمت ہے کہ جس طرح یہ بڑوں پر منطبق ہوتی ہے اسی طرح چھوٹوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔

جنین پر زکوٰۃ الفطر کا جواب

جمہور فقہاء کے نزدیک جنین (پیٹ کے بچے) پر زکوٰۃ الفطر واجب نہیں ہے۔

ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ اگر لیلۃ الفطر کی صبح ہونے سے پہلے رحم مادر میں بچہ کو ایک سو بیس دن پورے ہو گئے ہوں تو اس کی جانب سے زکوٰۃ الفطر واجب ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ اس وقت بچہ میں روح پھونکی جاتی ہے۔

ابن حزمؒ نے یہ دلیل بھی بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ الفطر بچے بڑے سب پر لازم کیا ہے اور جنین (صغیر) بچہ کے ضمن میں آتا ہے اس لیے اس پر صغیر کے احکام عائد ہوں گے کیونکہ روایت ہے کہ حضرت عثمان بن عفان صغیر و کبیر اور حمل کا بھی فطرہ ادا فرمایا کرتے تھے۔

ابو قلابہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام ہر صغیر و کبیر کی جانب سے زکوٰۃ الفطر ادا فرماتے اور حتی کہ حمل کی جانب سے بھی فطرہ دیتے۔

ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ ابو قلابہ نے صحابہؓ کا زمانہ پایا ہے اور ان کی صحبت میں رہے ہیں۔

سلیمان بن یسار سے پوچھا گیا کہ کیا حمل کی جانب سے بھی فطرہ دیا جائے تو انھوں نے فرمایا کہ جی ہاں۔

اس بیان کے بعد ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں سے کوئی حضرت عثمانؓ کی اس رائے کا مخالف نہیں تھا۔[1]

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۳۲۔

تو یہ ہے کہ علامہ ابن حزمؒ نے جو آثار نقل کیے ہیں ان میں حمل کی طرف سے فطرہ کے وجوب پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادتی ہوگی حدیث میں وارد صغیر کا لفظ حمل کو بھی شامل ہے جیساکہ حضرت عثمان وغیرہ سے مروی آثار محض استحباب پر دلالت کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو استحباب پر عمل کرے اس کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ ابن المنذر نے اس امر پر اجماع نقل کیا ہے کہ جنین پر زکوٰۃ الفطر واجب نہیں ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جنین کی طرف سے زکوٰۃ الفطر کی ادائیگی واجب نہیں ہے البتہ مستحب ہے۔[۱]

زکوٰۃ الفطر میں نصاب کی شرط

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں یہ الفاظ ہر آزاد اور غلام غنی اور فقیر دونوں پر مشتمل ہیں اور یہاں فقیر کا مفہوم یہ ہے کہ جو نصاب زکوٰۃ کا مالک نہ ہو، جیساکہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں یہ وضاحت موجود ہے کہ غنی ہو یا فقیر سب پر زکوٰۃ الفطر واجب ہے اور یہی ائمہ ثلاثہ اور جمہور کی رائے ہے۔

احناف کے نزدیک زکوٰۃ الفطر کے وجوب کی شرط صرف اسلام ہے اور یہ کہ یہ زکوٰۃ جو واجب ہوتی ہے اس کی روزانہ کی خوراک سے زائد ہو۔ یعنی شب عید جس کے پاس اس کی اور اس کے اہل وعیال کی خوراک سے مستزاد خوراک موجود ہو تو وہ زکوٰۃ الفطر ادا کرے گا، بشرطیکہ یہ خوراک اس کی رہائش، سامان اور اصلی ضرورتوں سے فارغ ہو۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ

> یہی مسلک درست ہے اس لیے کہ زکوٰۃ الفطر کے سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث مطلق ہیں اور ان میں غنی اور فقیر کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور تعین مقدار میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس مقدار کا فطرہ ادا کرنے والا مالک ہو اور بالخصوص جب کہ فطرہ کے وجوب کی وجہ یعنی رفث (آلودگی)

---

[۱] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۱۔

اور لغو سے تطہیر غنی اور فقیر دونوں میں موجود ہے۔ اور اس کے بارے میں یہ اعتبار کرنا کہ وہ ایک شب و روز کی خوراک کا مالک ہو ایک ضروری امر ہے اس لیے کہ مقصود شریعت یہ ہے کہ روز عید فطرہ کے ذریعے ہر ضرورتمند کو کچھ نہ کچھ میسر آجائے اب اگر فطرہ دینے والے کے بارے میں اس شرط کا اعتبار نہ کیا جائے کہ اس کے پاس ایک شب و روز کی خوراک موجود ہو تو دہندہ بھی وہی بن جائے گا جس کو دینے کا آج کے دن حکم دیا گیا ہے اور وہ ان مامورین میں سے نہیں رہے گا جنھیں زکوٰۃ الفطر ادا کر کے فقیر کو غنی بنانے کا حکم دیا گیا ہے [1]

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے اس سے مختلف ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ الفطر صرف اس شخص پر واجب ہے جو مالک نصاب ہو اس لیے کہ بخاری اور نسائی کی حدیث ہے کہ [2]

لا صدقة الا عن ظهر غنى

(زکوٰۃ صرف غنی کی طرف سے ہوتی ہے)

اور ان کے نزدیک غِنا (مالداری) مالک نصاب زکوٰۃ ہونا ہے اور فقیر غنی نہیں ہوتا اس لیے اس پر زکوٰۃ الفطر واجب بھی نہیں ہے کیونکہ اس کو زکوٰۃ لینا حلال ہے اور وہ ایسا ہے جیسے وہ ادائے زکوٰۃ پر قادر نہ ہو۔ نیز فقہائے احناف نے زکوٰۃ الفطر کے وجوب میں نصاب کی شرط کو زکوٰۃ مال پر بھی قیاس کیا ہے۔

شوکانی اور دیگر فقہاء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ فقہائے احناف کی ذکر کردہ حدیث سے استدلال درست نہیں ہے اس لیے کہ اس حدیث کو ابوداؤد نے ان الفاظ

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۶۔

[2] امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب الوصایا میں اس حدیث کو معلق روایت کیا ہے جو کہ جمہور کے نزدیک صحت کے حکم میں ہے مگر ابن حزم کی رائے اس سے مختلف ہے۔

میں ذکر کیا ہے[1]

خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنیً

(سب سے اچھی زکوٰۃ وہ ہے جو بحالت تونگری دی جائے)

نیز مذکورہ حدیث ابوداؤد اور حاکم کی مروی حضرت ابوہریرہ کی اس مرفوع حدیث کے بھی معارض ہے کہ

افضل الصدقۃ جھد المقل

(سب سے بہتر زکوٰۃ کم یافت آدمی کی زکوٰۃ ہے)

اور طبرانی میں ابوامامہ کی یہ مرفوع حدیث ہے کہ

سب سے اچھی زکوٰۃ وہ ہے جو کم یافت آدمی چپکے سے کسی فقیر کو دے دے۔

اور طبرانی نے النہایہ میں اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ جو قلیل المال برداشت کر سکے۔

نیز یہ حدیث ابوہریرہ کی اس حدیث کے معارض ہے جو نسائی، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے اور جسے حاکم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک درہم ایک لاکھ درہم پر فوقیت حاصل کر گیا، کسی نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کس طرح؟ آپ نے فرمایا کہ ایک شخص ہے جس کے پاس بہت مال ہے اس نے اپنے مال میں سے ایک لاکھ درہم زکوٰۃ دے دی اور دوسرا شخص ہے جس کے پاس

---

[1] اسی طرح الشوکانی نے صرف ابوداؤد پر اقتصار کیا ہے اور البخاری نے اس حدیث کو کتاب النفقات میں اور النسائی نے کتاب الزکوٰۃ میں، احمد نے مسند (ج ۲ ص ۲۷۸) نے روایت کی ہے اور مسلم نے کتاب الزکوٰۃ میں ان الفاظ میں روایت کی ہے۔

افضل الصدقۃ او خیر الصدقۃ عن ظھر غنی

دو درہم ہیں اس نے ان میں سے ایک درہم زکوٰۃ دے دی اور اس طرح اپنا نصف مال صدقہ کر دیا"

بقول امام شوکانی حنفی مسلک کے فقہاء کا مال کی زکوٰۃ سے استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے اس لیے کہ زکوٰۃ الفطر کا تعلق اشخاص اور ذوات سے ہے اور مال کی زکوٰۃ کے وجوب کا تعلق مال سے ہے۔ اس بنا پر ہر دو زکوٰۃ جُدا جُدا ہیں۔[1]

فقہائے احناف کا یہ کہنا کہ غِنیٰ (مالداری) نصاب زکوٰۃ کا مالک ہونا ہے اور فقیر غنی نہیں ہوتا اس لیے اس پر صدقۃ الفطر واجب نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جا چکا ہے کہ صحیح احادیث موجود ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ الفطر غنی اور فقیر ہر مسلمان پر واجب ہے اور اس کی تصریح حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اور احمد اور ابوداؤد نے ثعلبہ بن ابی صغیر از والد خود سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"ایک صاع گیہوں صدقۃ الفطر ہر چھوٹے بڑے آزاد و غلام غنی و فقیر، مذکر و مؤنث کی جانب سے ادا کرو۔ غنی اگر دے تو اللہ اس کو پاک کرے فقیر اگر دے تو اللہ اسے اس سے زیادہ عطا کرے جتنا اس نے دیا ہے۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ

"ہر دو افراد کی جانب سے ایک صاع گندم"

مزید یہ کہ جیسا کہ ابن قدامہ فرماتے ہیں زکوٰۃ الفطر کی نوعیت یہ ہے کہ یہ مال کی زیادتی سے بڑھتی نہیں ہے (بلکہ ہر حالت میں اس کی شرح یکساں ہے) اس لیے اس کے وجوب میں نصاب کی شرط نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ کفارہ میں نہیں ہے۔ یعنی نصاب زکوٰۃ الفطر کے دینے اور لینے میں مانع نہیں ہے، جیسے کسی کی پیداوار پر عُشر لے لیا جائے حالانکہ

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۵، ۱۸۶۔

وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کا محتاج ہو۔
جبکہ یہ حدیث کہ

لا صدقۃ الا عن ظہر غنیً

(صدقہ صرف مالدار کی جانب سے ہوتا ہے)

مال کی زکوٰۃ پر محمول ہے اور زکوٰۃ الفطر جسم اور وجود انسانی کی مخصوص زکوٰۃ ہے۔[1]
میری رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ الفطر ہر مسلمان (غنی ہو یا فقیر سب) پر واجب ہے اور اس کی حکمت یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ چاہتی ہے کہ اس زکوٰۃ کی فرضیت کو ہر مسلمان کی تربیت کا ذریعہ بنایا جائے یعنی یہ کہ ہر مسلمان غنی ہو یا فقیر آسانی اور سختی ہر دو حالتوں میں انفاق کرے چنانچہ قرآن کریم نے متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ (آل عمران : ۱۳۴)

شریعت اسلامیہ کی اس تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان خواہ فقیر ہو اور اس کی معاشی حالت کمزور ہو مگر اس کا ہاتھ ہر حال اوپر کا ہاتھ رہے اور وہ دوسروں کو دینے اور ان پر فضل کرنے کی لذت سے آشنا رہے خواہ اُسے دینے کا موقع سال میں ایک ہی مرتبہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ میں جمہور فقہاء کے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں جنھوں نے وجوب زکوٰۃ الفطر میں نصاب کی شرط نہیں لگائی ہے۔

اسی طرح میں امام ابو حنیفہؒ کی اس رائے کو ترجیح دیتا ہوں کہ بیوی پر اس کے اپنے مال پر زکوٰۃ الفطر واجب ہے کیونکہ اس سے مسلمان عورت کو اپنے سالانہ اسلامی فریضہ کا احساس ہوگا اور اسے اپنے مال میں سے خرچ کرنے کی عادت ہوگی۔ لیکن اگر شوہر از خود اس کی طرف سے زکوٰۃ الفطر ادا کر دے تو درست ہے۔

فقیر پر فطرہ کے وجوب کی شرط

فقیر (تنگدست) پر فطرہ کے وجوب کی جمہور فقہاء کے نزدیک شرط یہ ہے کہ اس کے پاس

---

[1] المغنی، ج ۳، ص ۴۷۔

شب عید اور روز عید کی اس کی اور اس کے زیر کفالت افراد کی ضرورتوں سے اور اس کی رہائش گھریلو سامان اور اصلی ضرورتوں سے زائد موجود ہو۔

مثلاً کسی کے پاس گھر ہو جس میں وہ رہتا ہو یا اس کے کرایہ سے اخراجات پورے کرتا ہو، اس کے اور اس کے زیر کفالت افراد کے پہننے کے کپڑے ہوں، یا جانور ہوں جو اس کی سواری کے کام آتے ہوں یا ان سے حوائج اصلی پوری کی جاتی ہوں، یا مویشی ہوں جن کی افزائش اس کے لیے ضروری ہو یا تجارتی سامان ہو جس میں سے زکوٰۃ دینے کر اس کا نفع متاثر ہوتا ہو اور اسے اس منافع کی احتیاج ہو تو اس پر فطرہ واجب نہیں ہے کیونکہ یہ اشیاء اس کی حقیقی ضروریات سے متعلق ہیں اس لیے اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ ان اشیاء کو فروخت کر کے فطرہ ادا کرے۔

اگر کوئی صاحب علم ہو اور اس کے پاس اس کے مطالعہ کی کتابیں ہوں تو اس پر بھی یہ لازم نہیں ہے کہ وہ ان کتابوں کو فروخت کر کے فطرہ ادا کرے، اسی طرح عورت جس کے پاس پہننے کے کپڑے ہوں تو اس پر بھی یہ لازم نہیں ہے کہ وہ ان کو فروخت کر کے فطرہ ادا کرے۔

بہرحال جو اشیاء ان جملہ حقیقی ضروریات سے زائد ہوں اور ان کو فروخت کرنے ناممکن ہو تو فطرہ واجب ہوگا کیونکہ یہ ادائیگی بغیر کسی حقیقی ضرر کے ہوگی اور یہ ایسا ہوگا جیسے اس کے پاس فاضل طعام (غذائی اجناس) موجود ہو اور وہ اس میں فطرہ ادا کرے[1]

دین موجل (مقررہ مدت کا قرض) ادائے فطرہ میں مانع نہیں ہے

اگر کسی شخص کے پاس اتنا کچھ موجود ہو کہ وہ اس سے فطرہ ادا کر سکتا ہو اور اتنا ہی اس پر قرض بھی ہو تو اس پر زکوٰۃ الفطر دینا لازم ہے۔ اِلّا یہ کہ اس وقت اس پر ادائے قرض کا مطالبہ ہو تو وہ قرض ادا کر دے اور اس پر زکوٰۃ الفطر لازم نہیں ہے۔

---

[1] المغنی، ج ۳، ص ۷۶، الروضہ، ج ۲، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔

ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ قرض فطرہ سے مانع نہیں ہے جس طرح کہ زکوٰۃ سے مانع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ الفطر کے وجوب کا حکم زیادہ مؤکد ہے کیونکہ یہ نفقہ پر بھی واجب ہے اور مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی جانب سے اور اپنے زیر کفالت افراد کی طرف سے ادا کرے اور یہ کہ اس کا تعلق مال کی مقدار سے نہیں ہے بلکہ نفقہ کی طرح ہے، اور اس لیے کہ زکوٰۃ مال پر واجب ہوتی ہے اور قرض ملکیت پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ جبکہ زکوٰۃ الفطر جسم (بدن) پر واجب ہوتی ہے اور قرض انسان کے وجود پر اثر انداز نہیں ہوتا اس لیے اس کے وجود کی زکوٰۃ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ البتہ قرض کے مطالبہ کی صورت میں زکوٰۃ الفطر ساقط ہوجائے گی کیونکہ مطالبہ سے قرض کی ادائیگی لازم آگئی اور ایک شخص متعین کا حق مؤکد ہوگیا جو کہ تنگدستی سے ساقط نہیں ہوتا، نیز یہ کہ قرض کا سبب وجوب پہلے لازم آیا ہے اور اس کی تاخیر سے وہ گنہگار ہوگا اسی لیے علاوہ فطرہ کے اس قرض کی بنا پر بغیر مطالبہ کے بھی ساقط ہوجائے گا۔ کیونکہ مطالبہ کی تاثیر بھی ہے کہ ادائیگی لازم ہوجائے اور تاخیر ناجائز قرار پائے۔[1]

---

[1] ایضاً

تیسری فصل

زکوٰۃ الفطر کی مقدار اور یہ کہ کس کی جانب سے فرض ہے

ہر طعام کا ایک صاع فرض ہونے کے قائل فقہاء کا مسلک

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے بعد زکوٰۃ الفطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو ___ مقرر فرمائی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے تو ہم غذا کا ایک صاع یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو یا ایک صاع کشمش یا ایک صاع پنیر زکوٰۃ الفطر دیا کرتے تھے۔ ہمارا یہی طرزِ عمل رہا تا آنکہ حضرت معاویہؓ ہمارے پاس مدینہ منورہ آئے تو انھوں نے فرمایا کہ میری رائے میں دو مُد شامی گندم ایک صاع کھجور کے برابر ہیں، چنانچہ لوگوں نے اس پر عمل شروع کر دیا"

اس روایت کو متعدد راویوں نے نقل کیا ہے اور ماسوا بخاری کے دیگر رواۃ نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ نے کہا کہ ___ "میں اسی طرح زکوٰۃ دیتا رہا جیسا کہ پہلے دیا کرتا تھا"

غرض ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کی جانب سے ایک صاع زکوٰۃ الفطر فرض ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ صاع کی مقدار اس لیے متعین فرمائی کہ اس سے ایک کنبہ کا پیٹ بھر سکتا ہے اور بالعموم یہ مقدار دینے والے پر بار

نہیں بنتی[1]

گندم اور کشمش میں مقدار صاع بالاجماع واجب ہے اور ان دونوں اشیاء کے علاوہ میں بھی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک واجب ہے اور یہی قول حضرت ابو سعید خدری رضؓ، ابو العالیہ، ابو الشعثاء، حسن بصری، جابر بن زید، اسحاق، ہادی، الناصر اور المؤید باللہ کا ہے۔ جیسا کہ امام شوکانی رحؒ نے ذکر کیا ہے[2]۔

نصف صاع گندم کے قائل فقہاء کا مسلک

امام ابو حنیفہ رحؒ اور ان کے نزدیک ایک شخص کی جانب

نصف صاع گندم زکوٰۃ الفطر درست ہے البتہ کشمش کے بارے میں ان کا قول مختلف ہے[3] جو کہ امام شوکانی رحؒ کے بیان کے مطابق زید بن علی اور امام یحییٰ کا مسلک ہے[4]۔

علامہ ابن حزم رحؒ فرماتے ہیں کہ یہی مسلک بروایت صحیح ان اصحاب کا ہے۔

عمر بن عبد العزیز رحؒ، طاؤس، مجاہد، سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، ابو سلمۃ بن عبد الرحمٰن بن عوف، سعید بن جبیر، اوزاعی، لیث اور سفیان ثوری۔

علامہ ابن حزم رحؒ نے ان صحابہ کے بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں کہ ان صحابہ کرام

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۵۰۹۔

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۳، المغنی، ج ۳، ص ۵۷۔
نیل الاوطار میں ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباس اور شعبی سے صاع اور نصف صاع ہر دو روایات مروی ہیں اور ابن حزم رحؒ نے ابو سعید سے وجوب صاع کی روایت نقل کی ہے حالانکہ ان کی معروف روایت اس کے برعکس ہے اور یہ عجیب ہے۔ المحلی، ج ۶، ص ۱۳۰۔

[3] امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک کشمش کا حکم بھی وہی ہے جو کھجور کا ہے اور یہی قول امام ابو حنیفہ رحؒ سے بھی مروی ہے اور بعض حنفی فقہاء نے اسی کو صحیح کہا ہے اور ابن الہمام نے فتح القدیر میں دلائل اسی کو راجح قرار دیا ہے اور الدر المختار میں ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔ (الدر المختار وحاشیۃ: ج ۲، ص ۸۳)

[4] نیل الاوطار، بحوالہ مذکور۔

کا یہی مسلک تھا اور بیان کیا ہے کہ ماسوا حضرت ابوبکرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی روایات کے یہ تمام روایات صحیح ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن الزبیرؓ اور حضرت ابو سعید الخدریؓ[1]

وجوب صاع کے قائل فقہاء کی دلیل

جمہور فقہاء کی دلیل حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ "غذا کا ایک صاع، یا کھجور کا ایک صاع، یا جو کا ایک صاع، یا کشمش کا ایک صاع یا پنیر کا ایک صاع"

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس سے استدلال کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ کہ اہل حجاز کی بول چال میں طعام (غذا) کا لفظ خاص طور پر گندم کے لیے استعمال اسی لیے حدیث میں طعام دوسری اشیاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری صورت یہ کہ اس حدیث میں کئی اشیاء ذکر کی گئی ہیں جن کی قیمتیں مختلف ہوتی ہیں چونکہ ہر نوع میں ایک صاع مقرر کیا گیا ہے اس لیے معلوم ہوا کہ مقصود صاع ہے اور قیمت مدنظر نہیں ہے[2]

نصف صاع کے قائل فقہاء کی دلیل صرف حضرت معاویہ کی حدیث اور کچھ اور احادیث ہیں جنھیں محدثین نے ضعیف کہا ہے اور ان کا ضعیف ہونا ظاہر ہے[3]

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۲۸، ۱۳۱۔ نصب الرایہ مع بغیتہ الالمعی، ج ۲، ص ۴۲۷، ۴۴۶۔

[2] شرح النووی علی مسلم : ج ۷، ص ۶۰۔

[3] ایضاً۔

اور جمہور فقہاء حضرت معاویہؓ کی حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ قول صحابی ہے اور ان کے اس قول کے برخلاف حضرت ابوسعید خدریؓ کا قول موجود ہے جن کی صحابیت کا زمانہ حضرت معاویہؓ سے زیادہ طویل ہے اور وہ احادیث نبوی سے زیادہ واقف ہیں اور اصول یہ ہے کہ صحابہ کے اقوال میں اختلاف کی صورت میں کسی اور دلیل کی جانب رجوع کیا جاتا ہے اور کسی ایک صحابی کے قول کو دوسرے صحابی کے قول پر ترجیح نہیں دی جاتی اور مزید دلیل یہ موجود ہے کہ ظاہر احادیث اور قیاس گندم اور دیگر اجناس کے فطرہ میں صاع کی شرط کی مؤید ہیں، اس لیے ان احادیث پر اعتماد کیا جائے گا جبکہ حضرت معاویہؓ نے اپنے قول کے بارے میں خود ہی تصریح کی ہے کہ یہ ان کی اپنی رائے ہے۔ اور یہ کہ یہ قول انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا ہے اور جس وقت حضرت معاویہؓ نے یہ بات بیان فرمائی بہت سے صحابہ موجود تھے اگر ان کے اس قول کی تائید میں کوئی فرمان نبوت موجود ہوتا تو صحابہ سنا دیتے، جیسا کہ دیگر مواقع پر ایسا ہوا ہے[1]

اگرچہ رائے اور قیاس کو شرعی حیثیت حاصل ہے جیسا کہ حضرت معاویہؓ نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا اور بعض صحابہ نے اس سے اتفاق کیا، لیکن بہرحال نص کی موجودگی میں رائے اور قیاس کا اعتبار نہیں ہے[2]

نصف صاع کی مقدار کے بارے میں امام ابوحنیفہ رح کے دلائل

امام ابوحنیفہ رح کے مسلک کے دلائل یہ ہیں:

اوّلاً:

ابوداؤد کی یہ بات جو انھوں نے عبداللہ بن ثعلبہ یا ثعلبہ بن عبداللہ بن ابی صُعیر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

[1] ایضاً، ص ۶۱، ۶۲۔

[2] فتح الباری: ج ۳، ۳۷۴، ط۔ السلفیہ۔

"صدقۃ الفطر ایک صاع گندم ہر دو کی جانب سے" [1]

حاکم نے حضرت ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ

"صدقۃ الفطر دو مد گندم ہے"

دو مُدّ جیسا کہ ہمیں علم ہے نصف صاع کے برابر ہوتے ہیں۔

ترمذی نے بروایت عمرو بن شعیب از والد خود از جد خود (عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ) مرفوعاً یہی حدیث نقل کی ہے۔

ابوداؤد اور نسائی نے حسن سے مرسلاً یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صدقہ (فطر) ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو یا نصف صاع گندم مقرر فرمائی" [2]

اس کے علاوہ دیگر احادیث جو احادیث صاع کی تخصیص کے لیے پیش کی جاسکتی ہیں اور یہ جن میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ لفظ بُرّ (گندم) لفظ طعام (غذا) میں داخل ہے جو کہ صحیح روایات میں آیا ہے۔ جیسا کہ شوکانیؒ نے فرمایا ہے [3]

دوم:

صحابۂ کرام سے جو صحیح آثار منقول ہیں کہ انھوں نے گندم کے نصف صاع کی رائے اختیار کی چنانچہ سفیان ثوری نے حضرت علیؓ سے یہ موقوف اثر روایت کیا ہے کہ "گندم کا نصف صاع" اور یہی رائے خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ سے منقول ہے [4]

---

[1] اس حدیث کے الفاظ اور اس کے طُرق روایات ملاحظہ کیجیے۔ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، الدارقطنی، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔ اس پر المحلّی میں ابن حزمؒ کا کلام، ج ۶، ص ۱۲۱۔ البیہقی، السنن الکبریٰ، ج ۴، ص ۱۶۷، ۱۶۸۔ الزیلعی۔ نصب الرایہ، ج ۴، ص ۴۰۶، ۴۱۰۔

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۸۳۔ المحلّی، ج ۶، ص ۱۲۲، ۱۲۳۔ نصب الرایہ، ج ۴، ص ۴۱۸، ۴۲۳۔

[3] نیل الاوطار۔ بحوالہ مذکور۔

[4] بحوالہ مذکور۔

صحابۂ کرام کے ان اقوال پر اعتماد کرتے ہوئے ابن المنذر فرماتے ہیں کہ "گندم کے بارے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کسی ایسی مستند حدیث کا علم نہیں ہے۔ جس پر اعتماد کیا جا سکے"۔[1] حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مدینہ میں گندم بہت

---

[1] المنذری کا کہنا درست نہیں ہے اس لیے کہ حاکم نے (ج ۱، ص ۴۱۰، ۴۱۱) متعدد احادیث نقل کی ہیں جن میں گندم کا ایک صاع بیان کیا گیا ہے اور حاکم نے انھیں صحیح کہا ہے اور الذہبی نے بھی ان میں سے دو کو تسلیم کیا ہے جن میں سے ایک بروایت سعید الجمحی از ابن عمر ہے، جس کے بارے میں بیہقی کہتے ہیں کہ اس میں بر (گندم) کا لفظ محفوظ نہیں ہے (ج ۴، ص ۱۶۶) اس لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

اور دوسری حدیث جسے حاکم نے اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے یہ ہے کہ

ابن اسحاق از عبداللہ بن عبداللہ بن عثمان بن حکیم از عیاض بن عبداللہ ——
فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید نے بیان کیا کہ میں زکوٰۃ الفطر وہی ادا کرتا ہوں جو میں عہد نبوت میں ادا کیا کرتا تھا یعنی ایک صاع کھجور یا ایک صاع گندم یا ایک صاع ۔۔۔ کسی نے کہا یا دو مُد گندم؟ انھوں نے کہا نہیں یہ حضرت معاویہؓ کی مقرر کردہ قیمت ہے نہ میں اسے قبول کرتا ہوں اور نہ اس پر عمل کرتا ہوں"۔

مگر ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ ابو سعید کی حدیث میں گندم کا لفظ محفوظ نہیں ہے اور میں نہیں جانتا کہ کس راوی کو یہ وہم ہوا ہے۔ فقال رجل (کسی نے کہا) کے الفاظ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ روایت کے آغاز میں گندم کا لفظ غلط ہے کیونکہ اگر ابو سعید یہ کہتے ہیں کہ ہم عہد نبوتؐ میں گندم کا ایک صاع دیا کرتے تھے تو کوئی یہ نہ کہتا کہ "یا دو مُد گندم؟" ابوداؤد نے بھی ابن اسحاق کی اس روایت کی جانب اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں گندم کا لفظ محفوظ نہیں ہے (فتح الباری: ج ۲، ص ۳۷۳) اس حدیث کو ابن حزم نے المحلی میں بھی ذکر کیا ہے (ج ۶، ص ۱۳۰) مگر اس میں صاع البر (گندم) کا

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کم ہوتا تھا، جب صحابہ کرام کے زمانے میں اس کی قدرے زیادتی ہوئی تو ان کی یہ رائے

(بقیہ آگے) لفظ نہیں ہے اور اس سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت ابو سعید مطلقاً گندم سے زکوٰۃ الفطر ادا کرنے کے قائل نہیں تھے۔ لیکن علامہ شیخ احمد شاکر نے اس پر دارقطنی کی روایت (۲۲۲) اور المستدرک (ج ۱ ص ۴۱۱) میں حاکم کی روایت سے اس پر گرفت کی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور جس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ صاعاً من حنطۃ (گندم کا ایک صاع) اور اس میں راویوں کا اختلاف ہے کہ کوئی ایک نوع ذکر کرتا اور دوسرا دوسری نوع ذکر کرتا ہے اور سب صحیح ہیں اور ثقہ راویوں کا اضافہ بھی حجت ہوتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ احمد شاکر اس زیادتی کے بارے میں ابن خزیمہ اور ابو داؤد کے قول سے واقف نہیں ہیں، جو کہ حافظ ابن حجر نے نقل کیے ہیں۔ ثقہ راویوں کی زیادتی وہاں مقبول ہوتی ہے جہاں وہ اپنے سے زیادہ ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف نہ ہو یا روایت میں ایسا اشارہ نہ ملتا ہو جو راوی کے وہم پر دلالت کرتا ہو حالانکہ حضرت ابو سعید اور دیگر صحابہ سے ایسی متعدد روایات مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت گندم (بُرّ) ان کی غذا میں شامل نہیں تھا، جو ہم عنقریب بیان کریں گے۔

مزید یہ کہ یہ روایت ابن اسحاق سے مروی ہے، اور انھوں نے اس کے حدیث ہونے کی صراحت نہیں کی اور عنعنہ کیا اور ناقدین حدیث نے کہا ہے کہ اس روایت میں تدلیس ہے (المستدرک) اس سے معلوم ہوا کہ حاکم سے اس حدیث کو صحیح قرار دینے اور ذہبی کے اس کی صحت کو تسلیم کرنے میں تساہل ہوا ہے۔

نتیجہ بحث یہ ہے کہ حافظ ابن المنذر کا یہ کہنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قابل اعتماد مستند حدیث گندم کے بارے میں مروی نہیں ہے صحیح ہے اور اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ البیہقی اپنی سنن (ج ۴ ص ۱۷۰) میں لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ سے صاعٌ من بُرٍّ بھی مروی ہے اور نصف صاع کی روایات بھی ہیں مگر ان میں سے کوئی حدیث نہیں ہے ... ورد الخلافیات میں میں نے ان سب کی وجوہ بیان کی ہیں ... بلکہ حضرت ابو سعید

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہوئی کہ گندم کا نصف صاع جو کے صاع کے برابر ہے اس لیے ان کے قول سے گریز درست نہیں ہے۔

بعدازاں ابن المنذر نے صحیح اسانید کے ساتھ ——— حافظ ابن حجر کے بقول۔ حضرت عثمان رضؓ، حضرت علی رضؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابر رضؓ، حضرت ابن عباس رضؓ، حضرت ابن الزبیر رضؓ اور ان کی والدہ اسماء بنت ابی بکرؓ کی بھی رائے نقل کی کہ زکوٰۃ الفطر نصف صاع گندم ہے۔

یہ وہ دلائل ہیں جن کی بنیاد پر فقہاء احناف نے یہ مسلک اختیار کیا ہے۔

مگر حضرت ابو سعید کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضؓ نے بھی اتفاق نہیں کیا اور اس طرح امام طحاوی کی رائے کے برعکس اس مسئلہ میں اجماع ثابت نہیں ہوا۔[1]

فقہائے احناف فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید سے مروی حدیث وجوب کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس سے صرف ان کے اپنے عمل کا علم ہوتا ہے جو کہ جواز پر دلالت کرتا ہے جس کے ہم بھی قائل ہیں اس لیے لازم تو نصف صاع ہوگا لیکن اس سے زائد تطوع (نفلی) ہوگا۔[2]

حضرت ابو سعد کی حدیث میں طعام کی گندم سے وضاحت قابل تسلیم نہیں ہے چنانچہ ابن المنذر کہتے ہیں کہ ہمارے بعض فقہاء کی یہ رائے کہ حضرت ابو سعید کی روایت میں ایک صاع طعام کے الفاظ ایک صاع گندم کے قائلین کی دلیل ہیں، غلط ہے کیونکہ

(بقیہ آگے) سے مروی حدیث اور حضرت ابن عمر رضؓ سے مروی حدیث سے ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ دو مُد گندم یعنی نصف صاع کو ایک صاع جو کے برابر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرار دیا گیا تھا۔

[1] فتح الباری، ج ۳، ص ۳۷۴۔ ط۔ السلفیہ۔ المحلی، ج ۶، ص ۱۲۸ - ۱۳۱۔

[2] بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۷۲۔ نصب الرایہ، ج ۲، ص ۴۱۸۔

حضرت ابو سعید نے خود طعام کی وضاحت کی ہے یعنی بخاری وغیرہ میں حفص بن میسرہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو سعید نے فرمایا کہ

"ہم عہدِ نبوتؐ میں یوم الفطر کے موقع پر ایک صاع طعام زکوٰۃ دیتے تھے اور اس وقت ہمارا طعام جو، کشمش، پنیر اور کھجور ہوتا تھا"

یہ روایت طعام کے مفہوم کو واضح کرتی ہے اور الطحاوی نے اسی مفہوم کی روایت ایک اور سند سے نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ ——— "ہم اس کے علاوہ اور کچھ زکوٰۃ الفطر میں نہ دیتے" [1]

بلکہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ عہدِ نبوتؐ میں زکوٰۃ (الفطر) صرف جو، کھجور اور کشمش سے ادا کی جاتی تھی اور گندم نہیں تھی۔

مُسلم کی ایک روایت حضرت ابو سعید سے اس طرح منقول ہے کہ

"ہم تین اصناف میں سے ادائیگی کرتے تھے، صاع کھجور، یا صاع پنیر یا صاع جو"

گویا اس روایت میں کشمش کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ان تین کھانوں کے لحاظ سے وہ کم مقدار میں ہوا کرتی تھی

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ان روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو سعید کی حدیث میں طعام سے مراد محض گندم نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم میں مکئی بھی داخل ہو سکتی ہے کہ وہ اس زمانے میں عربوں کی غالب خوراک تھی۔ چنانچہ جوزقی نے بروایت ابن عجلان از عیاض ابو سعید یہ روایت نقل کی ہے کہ

"صاع کھجور، صاع جوار، صاع مکئی" [2]

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۹۲، ۱۹۳ - فتح الباری

[2] فتح الباری، ج ۳، ص ۳۷۳ - السلفیہ۔

موازنہ اور ترجیح مجموعی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوت میں گندم عربوں کی عمومی غذا نہیں تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا صاع مقرر نہیں فرمایا تھا، جیسا کہ آپؐ نے جَو، کھجور، کشمش اور پنیر کا صاع مقرر فرمایا تھا۔ اسی کی تائید بخاری اور مسلم کی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی اس روایت سے ہوتی ہے، کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زکوٰۃ الفطر کا حکم فرمایا، ایک صاع کھجور، یا ایک صاع جَو بعد ازاں دو مُد گندم کو اس کے مساوی قرار دے دیا گیا"

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ

"بعد میں لوگوں نے اس کو نصف صاع گندم کے مساوی قرار دے دیا" [۱]

ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ معروف یہ ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے نصف صاع گندم کو ان اشیاء کے صاع کے مساوی قرار دیا ——— اس روایت کو ابوداؤدؒ نے ذکر کیا ہے [۲] اور بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ قیمت مقرر فرمائی، اور اس

[۱] صحیح مسلم بشرح النووی، ج ۷، ص ۶۰ - فتح الباری، ج ۳، ص ۲۷۱/۲۷۲ - السلفیہ

[۲] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ "لوگوں" سے حضرت ابن عمرؓ کی مراد حضرت معاویہؓ ہیں جس کی وضاحت حدیث ایوب از نافع میں موجود ہے جسے حُمیدی نے اپنی مسند میں سفیان بن عُیَینَہ سے نقل کیا ہے اور اس میں ہے کہ

"حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ جب معاویہؓ کا زمانہ آیا تو لوگوں نے نصف صاع گندم کو صاع جَو کے مساوی قرار دے دیا"

ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں یہ قول سفیان سے ایک اور سند سے نقل کیا ہے جو کہ قابلِ اعتماد ہے اور جو کہ ابوسعید کے قول کے موافق ہے، بلکہ اس سے زیادہ واضح ہے۔

ابوداؤد کی روایت جس کی جانب ابن القیم نے اشارہ کیا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلم نے کتاب التمییز میں اس کے ایک راوی کے بارے میں کہا ہے کہ اسے وہم ہوا ہے اور اس تردید کی توضیح کی ہے۔ فتح الباری، ج ۳، ص ۳۷۲ - السلفیہ۔

سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مستند احادیث منقول ہیں جو ایک دوسری کو تقویت پہنچاتی ہیں[1]

ابن القیم نے ابن ابی صعیر وغیرہ سے مروی روایت کو نقل کیا ہے اور حسن بصری سے مروی یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"حضرت ابن عباسؓ نے آخر رمضان میں بصرہ میں خطبہ دیا اور فرمایا کہ اپنے روزوں کا صدقہ ادا کرو ـ آپ نے محسوس کیا کہ لوگ ناواقف ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اہل مدینہ اپنے بھائیوں کو سکھلائیں کہ یہ نہیں جانتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صدقہ ایک صاع کھجور، یا جَو یا نصف صاع گندم مقرر فرمایا ہر آزاد، غلام، مرد وعورت اور بچے اور بڑے پر ـ جب حضرت علیؓ تشریف لائے اور انھوں نے ارزانی دیکھی تو فرمایا کہ اللہ نے تمھیں وسعت دی ہے اب تم ہر شئے پر ایک صاع ادا کرو"

یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے اور الفاظ روایت بھی انہی کے ہیں اور نسائی رح[2]

---

[1] زاد المعاد، ج ۱، ص ۳۱۳، ۳۱۴ -

[2] امام نسائی رح فرماتے ہیں کہ حسن کا حضرت ابن عباسؓ سے سماع ثابت نہیں ہے اور یہی احمد اور ابن المدینی وغیرہ نے کہا ہے، اس لیے اس حدیث میں انقطاع ہے اور یہ رائے ان ائمہ نے اس لیے اختیار کی ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانے میں حضرت ابن عباسؓ بصرہ میں تھے اور حسن حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد میں مدینہ میں رہے ہیں۔
شیخ احمد شاکر فرماتے ہیں کہ یہ سب وہم ہے کیونکہ حسن یقیناً حضرت ابن عباسؓ کے معاصر ہیں اور حضرت ابن عباسؓ کے بصرہ کے والی ہونے کے دوران حضرت حسن کا مدینہ میں ہونا ان کے سماع سے مانع نہیں ہے جبکہ محدثین کے نزدیک ثبوت سماع کے لیے صرف معاصرت کافی ہے۔ اور جس امر سے ان کا سماع اور [illegible] ہوتا ہے وہ ہے جو امام احمدؒ نے مسند میں صحیح مسند سے (۳۱۲۶) ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ حضرت

(بقیہ اگلے صفحے پر دیکھیے)

نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور ان کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ

"جب اللہ نے تمہیں وسعت دے دی ہے تو تم بھی وسعت اختیار کرو اور ایک صاع گندم مقرر کر لو"

ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ ابن تیمیہؒ اس مسلک کی تائید میں فرماتے تھے کہ کفاروں میں امام احمدؒ کے قول کا قیاس یہی ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ فطرہ میں گندم دوسری اجناس کا نصف ہوگا۔[1]

(بقیہ آگے) حسن اور حضرت ابن عباسؓ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا، جس پر حسن کھڑے ہو گئے مگر ابن عباسؓ کھڑے نہیں ہوئے۔ حسن نے ابن عباسؓ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ جی ہاں کھڑے بھی ہوئے ہیں اور بیٹھے بھی رہے ہیں اور اس کے بعد سماع اور ملاقات کا کوئی اور بیان درکار نہیں ہے۔ (مختصر المنذری مع معالم السنن وحواشیہ، ج ۲، ص ۲۲۲۔)

میں کہتا ہوں کہ محض معاصرت شہر بصرہ سے سنے جانے والے ایک خطبہ کی سماع کے لیے کافی نہیں ہے بالخصوص جبکہ معلوم ہو کہ اس وقت حضرت حسن بصرہ میں نہیں تھے، ظاہر ہے کہ اسے انھوں نے کسی واسطہ سے سُنکر نقل کیا ہوگا۔ محض معاصرت ان احادیث میں کافی ہوتی ہے جن میں وقت اور زمانہ کی تحدید نہ ہو۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطبہ اہلِ بصرہ کے نزدیک متعارف تھا اور یہ لازم نہیں ہے کہ اسے حسن نے (براہِ راست ابن عباسؓ ہی سے سُنا ہو، جیسا کہ طاؤس کے حضرت معاذ سے سماع کی یہی صورت ہے، ظاہر ہے کہ طاؤس کی حضرت معاذ سے ملاقات نہیں ہوئی ہے مگر وہ ان کی مرویات کے عالم متصور ہوئے ہیں، لیکن اس خطبہ (زیر بحث میں) حضرت ابن عباسؓ سے صاع من طعام ہی مروی ہے۔ السنن الکبریٰ، الجوہر النقی، ج ۴، ص ۱۶۷، ۱۶۹۔ نصب الرایہ، ج ۲، ص ۴۱۸، ۴۱۹۔

[1] زاد المعاد، ج ۱، ص ۳۱۴۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ نصف صاع گندم کے بارے میں احادیث اس قدر ضعیف نہیں ہیں کہ انھیں فی الجملہ رد کر دیا جاتے بالخصوص جبکہ حضرت حسن کی حضرت ابن عباسؓ سے مروی روایت صحیح ہو لیکن بہرحال یہ احادیث صحابہ کے مابین صحت و شہرت کے اس درجے کی حامل نہیں ہیں کہ ان کے ثبوت کا اسی طرح یقین ہو جس طرح کھجور، جَو، پنیر اور کشمش کے صاع کی روایات صحیح ہیں، اور اگر یہ احادیث صحت کے اس معیار پر ہوتیں تو ابن عمرؓ، ابو سعیدؓ، معاویہؓ اور دیگر صحابہؓ سے مخفی نہ رہتیں۔

حضرت معاویہؓ کا عمل ظاہر ہے کہ انھوں نے نصف صاع گندم کو صاع کھجور کے مساوی قرار دیا یعنی بلحاظ برابری اور قیمت، اسی لیے حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ نہ میں اسے قبول کرتا ہوں اور نہ میں اس پر عمل کروں گا۔[1]

اسی طرح بقول ابن المنذر دیگر صحابہؓ نے بھی گندم کی فراوانی ہو جانے کے بعد یہی رائے اختیار کی کہ نصف صاع گندم صاع جَو کے مساوی ہے۔

غرض ان روایات میں جس بات پر اطمینان قلب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نص سے چار غذائی اشیاء (کھجور، جَو، کشمش اور پنیر) میں ایک صاع (فطرہ) ہونا ثابت ہے لیکن صاع گندم کا ہونا ثابت نہیں ہے اور نصف صاع گندم کی روایات صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اور جن صحابۂ کرام نے ــــــ مثلاً حضرت معاویہؓ نے ــــــ نصف صاع گندم کو صاع جو اور کھجور کے مساوی قرار دیا ہے تو انھوں نے ایسا بر بنائے اجتہاد کیا ہے کیونکہ اس وقت (عہدِ نبوتؐ میں) گندم کی قیمت زیادہ تھی اور علاوہ گندم کے دیگر اشیاء کی قیمتیں قریب قریب تھیں۔ لیکن صحابۂ کرام کے اس اجتہاد کے اختیار کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر مقام پر اور ہر زمانے میں قیمت کا لحاظ کیا جائے جو کہ منضبط نہیں ہو سکتی اور

---

[1] ابن خزیمہ اور حاکم نے اپنی صحیح میں ابن اسحاق سے روایت کیا ہے۔ فتح الباری: ج ۳، ص ۲۷۳-۳۷۳۔ المستدرک: ج ۱، ص ۴۱۱ المحلی: ج ۶، ص ۱۳۰۔ نصب الرایہ، ج ۲، ص ۴۱۷، ۴۱۸۔

اس طرح شرح فطرہ مختلف ہوتی رہے گی، اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت نصف صاع کے بجائے کئی صاع گندم ہو جائیں۔[1]

میں جب پاکستان گیا تو مجھے وہاں کے متعدد علماء نے بتایا کہ پاکستان میں گندم کی قیمت کھجور سے بہت کم ہے اس لیے کھجور کے صاع کا نصف گندم کیوں کر مقرر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کشمش کی قیمت گندم اور کھجور سے زیادہ ہوتی ہے!

ان اشکالات سے ہم اسی وقت بچ سکتے ہیں کہ ہم صاع ہی کو اساس قرار دیں۔

قیمت کے اعتبار میں صحابہ کرامؓ نے بھی اس امر کو ملحوظ رکھا ہے جو ہم نے حضرت علی کی جانب سے بیان کیا ہے جبکہ بصرہ میں قیمتوں میں ارزانی پیدا ہو گئی تھی تو انھوں نے فرمایا تھا کہ گندم کا بھی ایک صاع ادا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کے پیشِ نظر قیمت تھی، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے۔[2]

مناسب یہی ہے کہ کسی ملک کی غالب غذا ہو اور اس کے نصف صاع کی قیمت دیگر اغذیہ کے مساوی ہو تو نصف صاع بھی دینا جائز ہے تاکہ صحابۂ کرام کے اجتہاد پر عمل ہو سکے۔ البتہ زیادہ احتیاط کا طریقہ یہی ہے کہ صاع ادا کیا جائے کہ اس طرح اختلاف سے بچا جا سکتا ہے۔ اور یقینی اور ثابت شدہ نص پر عمل ہو سکتا ہے اور شک سے تحفظ مل سکتا ہے اور بقول حضرت علیؓ جو وسعت اختیار کرے گا اللہ بھی اس کے مال میں فراخی عطا کرے گا۔

کیا صاع پر اضافہ درست ہے؟

عجیب بات ہے کہ مسلک مالک کی بعض کتب میں ہے کہ زکوٰۃ الفطر ادا کرنے والے کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ صاع کی مقدار میں اضافہ نہ کرے بلکہ یہ زیادتی مکروہ ہے کیونکہ صاع کی مقدار شارع کی مقرر کردہ ہے جس پر زیادتی بدعت و مکروہ ہے جیسے ۳۳ کی تسبیح کی تعداد پر اضافہ، لیکن شرط یہ ہے کہ اضافہ معلوم ہو شک کی صورت میں کوئی حرج

---

[1] فتح الباری: ج ۳، ص ۴۷۴۔

[2] ایضاً۔

نہیں ہے۔[1]

میری رائے میں یہ تشبیہ مسلم نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ نماز اور ذکر و تسبیح جیسے متعلقات نماز کی طرح تعبُّدی امر نہیں ہے اس لیے اس میں زیادتی میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ مستحسن ہے اس لیے کہ فدیہ صیام جو کہ مسکین کو کھانا کھلانا ہے کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ (البقرہ : ۱۸۴)

جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔

امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص کے مال پر ایک بنت مخاض زکوٰۃ واجب ہوتی اور اس کے پاس جو بنت مخاض اونٹنی تھی اس کے نہ دودھ تھا اور نہ وہ سواری یا بار برداری کے قابل تھی اس لیے زکوٰۃ دہندہ خود اُسے زکوٰۃ میں دینے پر رضامند نہ ہوا اور اس نے چاہا کہ بلند کوہان والی اونٹنی زکوٰۃ میں دے مگر ابی بن کعب رض نے لینے سے انکار کیا کیونکہ یہ اصل فرض سے زائد تھی، یہ فیصلہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ یہی اونٹنی تم پر لازم ہے لیکن اگر تم اس سے بہتر دو تو اللہ تمھیں اجر دے گا اور ہم قبول کریں گے۔ اور آپ نے اس سے یہ اُونٹنی لے لینے کا حکم فرمایا اور اس کے مال میں برکت کی دُعا فرمائی۔[2]

یہ حدیث اس باب میں نصّ ہے کہ زکوٰۃ سے زائد مقدار قابلِ قبول ہے اور اس میں زیادتی اجر کا وعدہ بھی ہے اور بلا کراہت ہے اور حضرت علی رض کا ارشاد ہے کہ «جب اللہ نے تمھیں وسعت دی ہے تم بھی وسعت اختیار کرو۔

اور اگر زکوٰۃ میں زیادتی کے بدعت ہونے کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کو حرام

---

[1] الشرح الکبیر للدردیر، ج ۱، ص ۵۰۸۔

[2] احمد، ابوداؤد، حاکم، حاکم نے صحیح کہا ہے اور الذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے، یہ حدیث مکمل صورت میں نویں باب کی چھٹی فصل میں آئے گی۔

دینا ہوگا صرف مکروہ نہ ہوگا اس لیے ہر بدعت گمراہی ہے۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص غلو اور تقشف سے صاع کی مقدار پر اضافہ کرے اور اس کا ارادہ سخاوت اور تطوع کا نہ ہو تو اس کے عمل کو بدعت اور مکروہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ صحیح حدیث ہے۔ ھلك المتنطعون[1] (غلو کرنے والے ہلاک ہو جاتیں۔)

صاع کی مقدار ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صَاعُ = ۲/۱ ۲ کلو مصری کے مساوی ہے یعنی ۲/۱ ۱ قدح مصری کے برابر ہے۔ جیسا کہ شرح الدردیر میں ہے، جو گندم کے وزن سے ۲۱۷۶ گرام بنتا ہے۔

یہ گندم کے حساب سے وزن ہے اگر کوئی جنس گندم سے ہلکی ہو تو اس کی مقدار اس سے زیادہ ہوگی، اگر مثلاً بعض لوگ گندم سے زیادہ وزنی جنس بالعموم استعمال کرتے ہوں جیسے چاول تو اس وزن مذکور میں جو زیادتی ہوگی وہی لازم ہوگی۔ اسی لیے فقہاء نے کَیل (پیمائش) پر اعتماد کیا ہے اور وزن پر اعتماد نہیں کیا ہے کیونکہ بعض غلے ہلکے ہوتے ہیں اور کچھ حُبوب (دانے) بھاری ہوتے ہیں۔

چنانچہ امام نووی الروضہ میں فرماتے ہیں۔

"صاع کو رطل سے منضبط کرنا دشوار ہے، کیونکہ عہدِ نبوتؐ میں صاع ایک معروف پیمانہ تھا اور بلحاظ اجناس مثلاً دال وغیرہ اس کا وزن مختلف ہوتا تھا، اور اس موضوع پر طویل گفتگو ہے اور جو شخص تحقیق کا ارادہ رکھتا ہو وہ شرح المہذب اور اس کی مختصر سے رجوع کرے کہ ہمارے فقہاء میں امام ابوالفرج الدارمی نے درست کہا ہے کہ اس سلسلے میں اعتماد کیل پر ہے وزن پر نہیں ہے اور یہ کہ لازمی یہ ہے کہ صدقۃ الفطر کی ادائیگی اس صاع سے ہو جو عہدِ نبوتؐ کے صاع کے مساوی ہو جو کہ اس وقت موجود ہے اور اگر کسی کو یہ صاع میسر نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ اتنی مقدار دے دے جس کے بارے

---

[1] احمد، مسلم، ابوداؤد از ابن مسعود۔

میں اسے یقین ہو کہ اس نے کوئی کمی نہیں کی ہے یعنی تقریباً پانچ رطل اور ایک تہائی اور فقہاء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ صاع ایک درمیانی ہاتھ والے شخص کے چار لپ کے برابر ہوتا ہے[۱]

بہر حال یہ امام نووی کا قول ہے لیکن ہمارے زمانے میں جبکہ ہر شئے وزن کی جاتی ہے صاع کی مقدار کا تعین دشوار نہیں ہے۔

ابن حزم فرماتے ہیں کہ ہم نے اہلِ مدینہ کو دیکھا کہ دو صحابہ کے مابین بھی اس امر میں اختلاف نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مُد جس سے آپ صدقات ادا فرماتے ایک رطل اور نصف سے زائد نہیں تھا اور ایک رطل اور چوتھائی سے کم نہیں تھا اور بعض کی یہ رائے بھی ہے کہ ایک رطل اور تہائی کے برابر تھا۔

ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ گندم، کھجور اور جو کی پیمائش کے اعتبار سے وزن کا فرق ہے[۲]

المغنی میں امام احمد سے یہ قول منقول ہے کہ ابن ابی ذئب کا صاع پانچ رطل اور ایک تہائی کا تھا اور ابو داؤد کہتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاع کا یہی وزن تھا اور فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ بھاری وزن کی شئے فطرہ میں دیتے وقت احتیاطاً کچھ اضافہ کر دیا جائے[۳]

فقہائے احناف کے نزدیک صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے جیسا کہ ہم زرعی پیداوار کی زکوٰۃ میں بیان کر چکے ہیں، یہ مقدار جمہور فقہاء کی بیان کردہ مقدار کے لحاظ سے ایک صاع اور نصف صاع کے برابر ہے یعنی ان کا نصف صاع دوسرے فقہاء کے بیان کردہ دو تہائی صاع کے برابر ہوا جس کی مقدار بعض حنفی فقہاء نے ایک مصری پیالہ

---

[۱] الروضۃ، ج ۲، ص ۳۰۱، ۳۰۲۔

[۲] المحلی، ج ۵، ص ۲۴۵۔

[۳] المغنی، ج ۳، ص ۵۹۔

(قدح) اور اس کا چھٹا حصہ قرار دیا ہے اور بعض دیگر نے ایک پیالہ اور ایک تہائی بتایا ہے [1]

اس لحاظ سے گندم کی واجب مقدار اتنے بڑے اختلاف کے باوجود ہر دو فریق کے نزدیک ایک ہی ہوتی البتہ گندم کے علاوہ دیگر اشیاء میں رائے کا فرق زیادہ نمایاں ہوگا کہ اس مقدار کے مطابق حنفی فقہ کے مطابق زکوٰۃ الفطر دیگر مسالک کی مقررہ مقدار سے دوگنی ہوگی۔

جس کے پاس مکیال اور میزان موجود نہ ہو وہ چار مُدّ ادا کرے اور مُدّ کے بارے میں فقہاء نے کہا ہے کہ یہ ایک معتدل انسان کے ایک لَپ کے برابر ہوتا ہے اور چار لَپ ایک صاع کے مساوی ہوتے ہیں اور جو حصول ثواب کی نیت سے اس سے زائد ادا کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔

زکوٰۃ الفطر کون سی اجناس سے ادا کی جائے گی

زکوٰۃ الفطر کے بارے میں وارد شدہ احادیث نے طَعَام (غذائی اجناس) کی کچھ اصناف متعین کی ہیں جو یہ ہیں، کھجور، جَو، کشمش اور پنیر (سوکھا ہُوا دودھ جس میں سے مکھن نہ نکالا گیا ہو) اور بعض روایات میں گندم کا لفظ بھی آیا ہے، نیز بعض روایات میں باجرہ اور مکئی کی اصناف بھی ذکر ہوئی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اصناف تعبّدی ہیں اور مقصود بالذات ہیں اور ان میں رد و بدل نہیں ہو سکتا اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان اصناف کو چھوڑ کر کچھ اور غذائی اشیاء سے صدقۃ الفطر ادا کرے۔

فقہائے مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک یہ اصناف تعبدی نہیں ہیں اور نہ مقصود بالذات ہیں بلکہ مسلمان اپنے ملک یا شہر کی غالب غذائی جنس کی صورت میں زکوٰۃ الفطر ادا کر سکتا ہے بلکہ ایک قول کے مطابق اپنی غالب غذائی شئے کی صورت میں صَدَقۃ الفطر ادا

---

[1] رد المحتار، ج ۲، ص ۸۳، ۸۴۔

کر سکتا ہے۔

اس کے بعد فقہائے مالکیہ نے یہ احتمالات بھی ذکر کیے ہیں کہ یہ مطلوبہ قوتِ غالب (اکثری خوراک) سارا سال غالب غذائی جنس کی صورت میں استعمال ہوتی رہی ہو، یا صرف رمضان میں رہی ہو یا ادائیگی کے دن رہی ہو، یا وجوب کے دن رہی ہو — چنانچہ کچھ فقہاء نے ادائیگی کے دن کا اعتبار کیا ہے جبکہ بعض دیگر نے اس غذائی شئے کے رمضان میں غالب خوراک ہونے کی رائے کو ترجیح دی ہے۔[1]

مسلک شافعیؒ کے لحاظ الغزالی الوسیط میں فرماتے ہیں کہ فطرہ کے وجوب کے وقت شہر کی اکثریتی غذائی جنس کا اعتبار ہے اور تمام سال کی غذائی جنس ہونا شرط نہیں ہے اور الوجیز میں وہ کہتے ہیں کہ یوم الفطر کے دن کی شہر کی غالب غذائی جنس کا اعتبار ہے۔[2]

مالکیہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ شہر کی اکثریتی جنس ان نو اجناس میں محدود ہونی چاہیے —— جَو، کھجور، کشمش، گندم، مکئی، باجرہ، چاول، بے چھلکا جَو، اور پنیر۔ اگر یہ نو غذائی اشیاء ملتی ہوں یا ان میں سے بعض ملتی ہوں اور ان کی غذائی استعمال یکساں ہو تو اختیار ہو گا کہ جس شئے سے چاہے صدقۃ الفطر ادا کرے، اور اگر کسی ایک جنس کا استعمال زیادہ ہو تو اسی سے زکوٰۃ الفطر ادا کرنا متعین ہو جائے گا۔

مجھے ان تفریعات کی کوئی دلیل نہیں ملی اسی لیے مسلک کے بعض محققین نے کہا ہے کہ اگر ان نو غذائی اشیاء کے علاوہ کوئی اور شئے بطور غذا استعمال ہوتی ہو تو وہی زکوٰۃ الفطر میں ادا کی جائے گی، اگرچہ یہ نو اشیاء بھی پائی جاتی ہوں یا ان میں سے بعض پائی جاتی ہوں۔

اقتیات (غذائی خوراک) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شئے آسانی اور سہولت کے ہر دور میں بطور خوراک استعمال ہوتی رہے۔

---

[1] حاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۵۔

[2] الروضۃ، ج ۲، ص ۳۰۵۔

اسی بنا پر فقہاء نے گوشت، دودھ وغیرہ اشیاء (جو قُوت بن سکتی ہوں) کے فطرہ میں دینے کو جائز کہا ہے اور یہ اشیاء بلحاظ وزن دی جائیں گی جب کہ آٹے کے بارے میں اختلاف ہے۔

فقہائے مالکیہ نے یہ مسئلہ بھی بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے شہر کی کمتر خوراک (قُوت) استعمال کرتا ہو اور اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ شہر کی غالب غذا کے استعمال سے عاجز ہو تو جو خوراک وہ استعمال کرتا ہے اسی سے فطرہ دینا جائز ہے لیکن اگر وہ یہ کمتر غذا بخل اور کنجوسی کی وجہ سے استعمال کرتا ہو تو بالاتفاق اس سے فطرہ کی ادائیگی جائز نہیں ہے اور اگر زود ہضم ہونے یا اس غذا کی عادت ہونے کی وجہ سے استعمال کرتا ہو، مثلاً کوئی دیہاتی شہری آبادی میں رہتا ہو اور اسے جَو کے استعمال کی عادت ہو (جبکہ شہری آبادی گندم استعمال کرتی ہو) تو اس مستعمل شئے کے فطرہ میں دینے کے بارے میں اختلاف ہے اور فتویٰ اس امر پر ہے کہ جائز ہے۔

فقہائے شافعیہ فرماتے ہیں کہ غلے اور پھل جن پر عُشر عائد ہوتا اور جو بحالت اختیار بطور غذا مستعمل ہوں تو ان سے فطرہ ادا کرنا جائز ہے اور امام شافعیؒ کا قول قدیم یہ ہے کہ مونگ اور مسور سے فطرہ دینا جائز نہیں ہے لیکن پہلا قول مشہور مسلک ہے۔

پنیر کے بارے میں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ اس کے بارے میں صحیح حدیث موجود ہے اس لیے اس کا جواز قطعی ہے۔

جبکہ صحیح قول یہ ہے کہ پنیر اور دودھ ہم معنی ہیں۔ مگر ان فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس پنیر سے فطرہ دینا جائز نہیں ہے جس سے مکھن نکال لیا گیا ہو اور اسی طرح وہ پنیر جس میں نمک اس قدر ہو کہ اس کا اصلی جوہر ختم ہو گیا ہو اسی طرح وہ غلے جو عیب دار ہوں اور ان میں کرم پڑ گیا ہو۔

اگر غلہ پرانا ہو لیکن اس کے رنگ اور ذائقہ میں فرق نہ آیا ہو اگرچہ اس کی قیمت میں میں کمی واقع ہو گئی ہو تو اس کا فطرہ میں دینا جائز ہے لیکن آٹا، ستو اور روٹی دینا جائز نہیں ہے جس طرح کہ قیمت دینا جائز نہیں ہے لیکن بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جائز ہے کیونکہ

مقصود مساکین کا پیٹ بھرنا ہے۔

غرض جن اجناس سے فطرہ دینا جائز ہے ان کے بارے میں تین آراء ہیں، جمہور فقہاء کے نزدیک صحیح رائے یہ ہے کہ قوت بلد (شہر کی عمومی غذا) ہو، دوسری رائے یہ ہے کہ فطرہ دہندہ کی اپنی غذا ہو اور تیسری رائے یہ ہے کہ دہندہ کو اختیار ہے (کہ جن اجناس سے چاہے فطرہ ادا کرے)۔

اس سلسلے میں فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر ہم شہر کی غذا یا اس کی اپنی غذا کے وجوب کی رائے دیں اور دہندہ اس سے تجاوز کر کے کوئی اور غذا فطرہ میں دے دے تو جائز نہیں ہوگا، لیکن اگر وہ اعلیٰ کی جانب تجاوز کرے تو بالاتفاق جائز ہے۔ اور اگر ہم دہندہ کی غذا کا لحاظ کریں اور وہ اس حالت میں ہو کہ گندم استعمال کر سکتا ہو لیکن بر بنائے بخل جو استعمال کرتا ہو تو اس پر گندم دینا ہی لازم ہوگا، لیکن اگر اس کے حالات جَو کے ہوں اور وہ ہر آسائش زندگی کی خاطر گندم استعمال کرتا ہو تو صحیح رائے یہ ہے کہ اس کا جو دینا جائز ہے جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ وہ لازماً گندم ہی دے گا۔ اور اگر ہم قوت بلد کو لازم قرار دیں درآں شہر کے لوگ مختلف اجناس استعمال کرتے ہوں اور ان میں غالب غذا کوئی بھی نہ ہو تو دہندہ جو جنس چاہے فطرہ میں دے سکتا ہے اور بہتر یہ ہے کہ ان میں سے افضل جنس دے دے[1]

مسلک احمد میں ظاہر قول یہ ہے کہ نص میں جو پانچ اصناف مروی ہیں ان سے تجاوز درست نہیں ہے، درانحالیکہ وہ ان سے فطرہ کی ادائیگی پر قادر ہو، خواہ جس غذا کی طرف تجاوز کیا ہے وہ اس کے شہر کی غذا ہو یا نہ ہو۔[2]

امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ستو اور آٹے سے بھی فطرہ دینا جائز ہے کیونکہ یہ اشیاء وزن کی جاتی ہیں اور فقیر (محتاج) ان سے منتفع ہو سکتا ہے بلکہ اس طرح وہ پسوانے کی کلفت سے بھی بچ جائے گا۔[3]

---

[1] ایضاً، ص ۳۰۵۔

[2] المغنی، ج ۳، ص ۶۲۔

[3] ایضاً۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرہ کی ادائیگی کے لیے ان اصناف کی تحدید اس لیے فرمائی تھی کہ اس وقت عرب کے معاشرے میں یہی غذائیں رائج تھیں، اس لحاظ سے اگر کوئی قوم چاول استعمال کرتی ہو یا مکئی ان کی غالب غذا ہو تو وہ انہی غذاؤں سے فطرہ ادا کریں گے غرض ہر شخص اپنے شہر (یا ملک) کی غالب غذا سے فطرہ ادا کرے گا اور اگر خود اس کی اپنی غذا ملکی غذا سے افضل ہو تو اس سے فطرہ ادا کرے گا۔

علامہ ابن حزمؒ کے نزدیک ماسوا کھجور اور جو کے کوئی شئے فطرہ میں دینا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ کشمش، گندم، آٹا اور پنیر بھی دینا جائز نہیں ہے اور اس رائے کے حق میں طویل دلائل دیئے ہیں اور اس کے برعکس تمام احادیث کو رد کر دیا ہے اور حسب عادت اپنی رائے کے مخالفین کی سختی سے گرفت کی ہے[1]

انھوں نے ابو مجلز کی یہ روایت میں اپنے استدلال میں نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے عرض کیا کہ اب اللہ نے ہمیں فراخی عطا کر دی ہے اور اب فطرہ میں گندم دینا کھجور دینے سے افضل ہے، اس پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں تو اسی طریقہ پر چلنا پسند کرتا ہوں جس پر صحابہؓ چلتے رہے ہیں۔[2]

زکوٰۃ الفطر کے ضمن میں وارد احادیث کے طرق روایات پر غور اور ان کے مفاہیم پر تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ کھجور اور جو کے اندر فطرہ کو مقتصر کر دینے کی درحقیقت علامہ ابن حزم کے پاس کوئی دلیل نہیں، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے صحابہ کی موجودگی شام کے گندم کے دو مُد کو جو کے ایک صاع کے برابر قرار دیا اور کسی صحابی نے جو کے بدلے گندم فطرہ میں دینے پر اعتراض نہیں کیا اور جہاں تک ابو سعید کے اعتراض کا تعلق ہے تو وہ مقدار سے متعلق ہے کہ ان کے نزدیک گندم کا بھی ایک صاع دینا چاہیے۔ اور ابن عمرؓ

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۱۸۔ ببعد۔

[2] ایضاً، ص ۱۲۷۔

کے قول کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی طرح ادائیگی فرماتے رہے جس طرح عہدِ نبوت میں فرمایا کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ اجناس سے فطرہ کی ادائیگی پر انھیں اعتراض نہیں تھا، اگر آپ کے نزدیک اس وقت کے لوگوں۔ جو کہ صحابہ تھے ــــــ کا عمل باطل ہوتا تو آپ زیادہ سختی سے اعتراض کرتے کیونکہ حضرت ابن عمرؓ بعض امور پر محض اتباعِ سُنّت کی خاطر تشدد فرمایا کرتے تھے چنانچہ آپ سواری سے وہاں اُترتے تھے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُترا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں تھا۔ زکوٰۃ الفطر کا مقصود عید کے دن محتاج (فقیر) کو گھروں کا طواف کرنے سے محفوظ کرنا ہے کہ روزِ عید مالدار اور صاحب حیثیت عید کی خوشیوں سے متمتع ہوتے اور اپنے مال و اولاد سے پُرلطف ہوتے ہیں تو کیا قاہرہ جیسے شہر میں اگر وہ کسی فقیر کو ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو دے دیں تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ فقیر مستغنی ہو جائے گا اور صاع کھجور یا جو کو لے کر فروخت کرنے نہیں نکلے گا کہ اسے معمولی قیمت پر فروخت کرکے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے وہ غذا خرید ے جو وہ استعمال کرتا ہے۔[1]

[...]ی ادائیگی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فطرہ میں اور ہر طرح کی زکوٰۃ میں قیمتِ زکوٰۃ کا ادا کرنا جائز نہیں ہے چنانچہ حضرت امام احمدؒ سے صدقۂ فطر کی [...]ے ادائیگی کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ سُنّت جائز نہیں ہے اور جب ان کے سامنے یہ بیان کیا گیا کہ حضرت عمر بن [...]زیزؒ فطرہ میں قیمت وصول کیا کرتے تھے تو انھوں نے فرمایا کہ قولِ رسول[...] [...]کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں نے کہا، پھر انھوں نے حضرت ابن عمرؓ

---

[1] [...]اش المحلی، ج ۶، ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

سے مروی حدیث سنائی اور یہ آیت پڑھی۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (النساء : ۵۹)

حکم مانو اللہ کا، اور حکم مانو رسول کا،

گویا حضرت امام احمدؒ کے نزدیک فطرہ کی قیمت دینا خلاف سنت ہے۔

اور یہی رائے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی بھی ہے۔[1]

ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ قیمت سے فطرہ کی ادائیگی بالکل جائز نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرہ میں ادائے قیمت فرض نہیں فرمائی اور حقوق الناس میں قیمت اسی وقت جائز ہے جب صاحب حق راضی ہو اور زکوٰۃ کا کوئی متعین مالک نہیں ہے جس کے راضی کرنے سے جائز ہو جاتے۔[2]

امام ثوریؒ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ قیمت کا دینا جائز ہے اور یہی رائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت حسن بصری کی ہے۔[3]

ابن ابی شیبہ نے عون سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خط بنام عدی والی بصرہ سنا جس میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ سرکاری ملازمین (اہل الدیوان) کے عطیات میں سے ہر شخص سے نصف درہم (فطرہ) لیا جائے۔[4]

حسن سے مروی ہے کہ دراہم کے فطرہ میں دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[5]

ابواسحٰق سے مروی ہے کہ لوگ (صحابہ و تابعین) صدقۂ فطر کھانے کی قیمت سے ادا کیا کرتے تھے۔[6]

---

[1] المغنی، ج ۳، ص ۶۵۔

[2] المحلی، ج ۶، ص ۱۳۷۔

[3] المغنی، ج ۳، ص ۶۵ / المحلی، ج ۶، ص ۱۳۰۔

[4] مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۴، ص ۳۷، ۳۸۔

[5] ایضاً

[6] ایضاً

حضرت عطاؒ سے مروی ہے کہ وہ چاندی کے دراہم سے صدقۂ فطر دیا کرتے تھے [1]

الف) فرمانِ نبوتؐ ہے کہ اس روز مساکین کو غنی کر دو اور غنی کرنا قیمت سے متحقق ہوتا ہے، جیسا کہ کھانا دے کر بھی ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ بذریعہ قیمتِ (طعام) زیادہ بہتر طریقہ پر ہو اس لیے کہ فقیر کے پاس طعام بکثرت ہو تو وہ اس کی بیع کا محتاج ہوگا اور قیمت کے ذریعے وہ مزید طعام ملابس اور دیگر ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

ب) ابن المنذر کا یہ قول بھی قیمت کے جواز پر دلالت کرتا ہے کہ صحابہؓ نے گندم کا نصف صاع دینا جائز قرار دیا تھا کیونکہ ان کے نزدیک اس وقت نصف صاع گندم ایک صاع کھجور یا جو کے مساوی تھا، اسی وجہ سے حضرت معاویہؓ نے فرمایا تھا کہ میرے نزدیک شامی گندم کے دو مُد ایک صاع کھجور کے مساوی ہیں۔

ج) ہمارے اس دور میں بذریعہ رقم فطرہ کی ادائیگی زیادہ موزوں ہے بالخصوص ان بعض ممالک میں جہاں تمام لین دین نقود کے ذریعے ہوتا ہے بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں یہی طریقہ رائج ہے اور مزید یہ کہ فقراء کو بھی اسی طرح فائدہ ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ الفطر کو طعام سے دو وجوہ سے متعین کیا تھا۔

پہلی وجہ یہ کہ اہل عرب میں اس وقت نقود (سکے) بہت کم تھے اور لوگوں کو غذائی اشیاء دے دینا آسان تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نقود (سکوں) کی قیمتیں کم و بیش ہوتی رہتی ہیں جبکہ صاعِ طعام دینا دہندہ کے لیے باعثِ سہولت اور لینے والے کے لیے زیادہ فائدہ مند تھا۔

واللہ اعلم بالصواب

ادائے قیمت کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہم ادائے زکوٰۃ کے بیان میں کر چکے ہیں، وہاں پر ملاحظہ کر لیا جائے۔

---

[1] ایضاً۔

ادائے قیمت سے متعلق مسائل

اب ادائے قیمت سے متعلق کئی مسائل باقی ہیں جنھیں فقہائے احناف نے ذکر کیا ہے۔

پہلا مسئلہ: ادائے قیمت سے مراد گندم یا کھجور کی قیمت دینا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ان میں سے کسی شئے کی بھی قیمت دینا درست ہے اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ گندم کی قیمت ہی ادا کی جائے گی۔[1]

میری رائے یہ ہے کہ جو بھی ملک کی غالب غذا ہو، اس کی درمیانی قسم کے لحاظ سے قیمت ادا کی جائے گی اور اگر اس کی اچھی قسم کی قیمت کے اعتبار سے ادائیگی کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

دوسرا مسئلہ: جن اجناس کے بارے میں نص وارد ہوتی ہے ان کا بلحاظ قیمت ایک دوسرے سے بدل کر دینا جائز نہیں ہے یعنی جس طرح قیمت کے اعتبار سے گندم کے بدلے گندم دینا درست نہیں ہے کہ درمیانی گندم کے ایک صاع کے بدلے اچھے گندم کا نصف صاع دے دیا جائے اسی طرح گندم کی قیمت کا لحاظ کر کے جَو یا کھجور دینا درست نہیں ہے کہ گندم کے نصف صاع کی قیمت کے بدلے نصف صاع کھجور دے دی جائے بلکہ یہ منصوص اشیاء نص میں بیان کردہ مقدار کے مطابق دی جائیں گی اور قیمت کا اعتبار ان اشیاء میں ہوگا جن میں نص وارد نہیں ہے۔[2]

تیسرا مسئلہ: فقہائے احناف کے مابین اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اصل منصوص شئے دینا افضل ہے یا ادائے قیمت افضل ہے، چنانچہ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ ہر حالت میں، خواہ شدت کا زمانہ ہو یا نہ ہو، گندم کا دینا افضل ہے اس لیے کہ اس میں سنت کی اتباع ہے جبکہ بعض دیگر فقہاء نے کہا ہے کہ اگر زمانہ شدت ہو اور قحط سالی کا دور ہو تو اجناس سے ادائیگی زیادہ افضل ہے جبکہ وسعت و فراخی کے دَور میں قیمت دینا افضل

---

[1] الدر المختار و حاشیۃ رد المحتار، ج ۲، ص ۸۰۔

[2] رد المحتار، ج ۲، ص ۸۳۔

ہے کیونکہ اس سے فقیر (محتاج) کی ضرورت زیادہ عمدہ طریقہ پر پوری ہوتی ہے [1]

اس سے معلوم ہُوا کہ افضل ہونے کا مدار ضرورتمند کی ضرورت کے عمدہ طریقہ پر پورے ہوجانے پر ہے یعنی اگر وہ طعام سے بہتر طور پر منتفع ہوسکتا ہو تو اسے طعام دینا افضل ہے مثلاً قحط سالی کے دَور میں اگر اسے نقد ادائیگی سے زیادہ فائدہ ہو تو نقد ادائیگی بہتر ہے۔

یہاں صرف محتاج کی ضرورت کو مدِنظر رکھنے کے بجائے اس کے خاندان کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی کنبہ والا شخص لے کر اپنی ضرورت پوری کرلے اور اس کے بچے غذا کے محتاج ہوں، ایسی صورت میں غذا دینا افضل ہے۔

●

---

[1] ایضاً۔

چوتھی فصل

فطرہ کے واجب ہونے کا وقت اور اس کے ادا کرنے کا وقت

زکوٰۃ الفطر کب واجب ہوتی ہے؟

اُمت اسلامیہ کے فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رمضان المبارک کے افطار کے وقت صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے اختتام پر صدقۂ فطر واجب فرمایا۔ البتہ وقت کی تحدید میں اختلاف ہے کہ امام شافعیؒ، احمدؒ، اسحٰقؒ، ثوریؒ اور امام مالکؒ کے رمضان المبارک کے آخری دن کے غروب کے وقت واجب ہوتا ہے اس لیے کہ صدقۂ فطر روزہ دار کی پاکیزگی کے لیے مقرر ہوا ہے اور روزہ چونکہ غروب آفتاب کے وقت ختم ہوتا ہے اس لیے اسی وقت زکوٰۃ بھی لازم ہے۔

امام ابوحنیفہؒ ان کے اصحاب، لیثؒ، ابوثورؒ اور امالکؒ (ان کے ایک قول کے مطابق) فرماتے ہیں کہ صدقۂ فطر یوم العید کی فجر کے وقت واجب ہوتا ہے اس لیے کہ اس عبادت کا تعلق یوم عید سے ہے اور اسے یوم عید پر متقدم نہیں ہونا چاہیے جیساکہ یوم الاضحیٰ کی قربانی یوم الاضحیٰ پر متقدم نہیں ہوتی[1]

بہرحال یہ ایک معمولی اختلاف ہے جس کا اثر اس صورت میں ظاہر ہوگا جبکہ کوئی بچہ غروب شمس اور فجر کے طلوع سے پہلے پیدا ہو کہ کیا اس کا صدقۂ فطر واجب ہے یا نہیں ہے اور اس صورت میں ظاہر ہوگا جبکہ کوئی مکلف شخص اس وقت کہ درمیان مر

---

[1] المغنی، ج ۳، ص ۶۷، ۶۸۔

جائے کہ گیا اس کا فطرہ دیا جائے گا یا نہیں ۔[۱]

زکوٰۃ الفطر کب ادا کرے
حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ الفطر کے بارے میں حکم دیا کہ لوگوں کے نماز کے لیے روانہ ہونے سے قبل دیا جائے اور حضرت عکرمہؒ نے فرمایا ہے کہ فطرہ نماز عید سے فوراً پہلے دیا جائے اس لیے کہ فرمان الٰہی ہے ۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى

(الاعلیٰ : ۱۴/۱۵)

بامراد ہوا وہ جو پاک ہو گیا اور اپنے پروردگار کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا ۔

ابن خزیمہ نے بروایت کثیر بن عبداللہ از والد خود از جد خود روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ زکوٰۃ الفطر کے بارے میں نازل ہوئی ۔[۲]

مگر یہ حدیث ضعیف ہے اس لیے کہ اس میں کثیر موجود ہے جو ائمہ حدیث کے نزدیک بے حد ضعیف ہے اور مزید ضعف اس حدیث میں اس سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور صدقہ فطر کا حکم صیام کی فرضیت اور عیدین کی مشروعیت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی —— اور اس کی تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ آیت عبارت النص اور اشارۃ النص کے لحاظ سے صدقۃ الفطر پر بھی دلالت کرتی ہے اگرچہ اصطلاحی معنوں میں خاص صدقۂ فطر کے بارے میں نازل نہیں ہوئی ہے ۔[۳]

---

[۱] بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۷۳ ۔

[۲] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۹۵ ۔

[۳] امام شافعیؒ اور ابو داؤد کثیر کو جھوٹا قرار دیتے ہیں، ابن حبان کہتے ہیں کہ بے حد منکر الحدیث اور اس کی اس سند کا تعلق (عن ابیہ عن جدہ) ایک موضوع نسخہ سے ہے جس کا ذکر بھی مناسب نہیں ہے ماسوا مقام استعجاب کے ۔ مگر امام ترمذیؒ نے اس کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے

(بقیہ اگلے صفحے پر دیکھئے)

بخاری اور مسلم نے حضرت ابو سعید سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"ہم عہدِ نبوتؐ میں یوم الفطر کو ایک صاع طعام دیا کرتے تھے"

اس حدیث کے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ یوم الفطر کا سارا دن مراد ہے مگر شارحینِ حدیث نے اوّل یوم مراد لیا ہے یعنی صبح کی نماز سے نمازِ عید تک جیسا کہ فتح الباری میں ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ادائے فطرہ کی نمازِ عید سے پہلے کی قید استحباب پر محمول ہے کیونکہ فرمانِ نبوتؐ ہے کہ

"انھیں آج کے روز غنی کر دو"

اور یوم کے لفظ کا پورے دن پر اطلاق ہوتا ہے [1]

جمہور فقہاء کے نزدیک فطرہ کا نمازِ عید کے بعد تک مؤخر کرنا مکروہ ہے کیونکہ فطرہ کا مقصود یہ ہے کہ عید کے دن فقیر کو طلب اور سوال سے مستغنی کر دیا جائے اور تاخیر سے دن کا یہ حصہ بغیر اغناء کے اس حکم کی تعمیل کے گزر جائے گا۔[2]

ابنِ حزمؒ فرماتے ہیں کہ سورج کے روشن ہو جانے اور نمازِ عید کا وقت آجانے پر فطرہ دینے کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور اس وقت کے بعد تاخیر حرام ہے۔ یعنی اگر کسی شخص نے فطرہ ادا

(بقیہ آگے) لیکن امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ محدثین نے امام ترمذیؒ کی کثیر کی حدیث کو صحیح قرار دینے پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ دیکھیے۔

میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۴۰۶، ۴۰۷۔

تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۴۲۱، ۴۲۳۔

التاریخ الکبیر للبخاری، ۴، ۱، ۲۱۷۔

الجرح والتعدیل، ۲-۲-۱۵۴۔

المستدرک للحاکم، ۱، ۱۲۸۔

[1] فتح الباری، ج ۳، ص ۳۷۵۔

[2] المغنی، ج ۳، ص ۶۷۔

نہیں کیا اور وقت نکل گیا تو اس پر اور اس کے مال پر یہ فطرہ بطور قرض واجب ہوگا کہ یہ مساکین کا حق ہے۔ اور اب اس کا اپنے مال میں اس حق کو روکنا حرام ہو جائے گا اور اس کی ادائیگی لازم رہے گی اور جب ادا کر دے گا تو مساکین کا یہ حق تو ساقط ہو جائے گا لیکن وقت ضائع کر دینے کی بنا پر حق اللہ باقی رہے گا اور استغفار اور ندامت کے بغیر اس کا تدارک نہیں ہو سکتا۔[1]

امام شوکانیؒ نے فرمایا ہے کہ صدقۂ فطر کی نماز عید سے قبل ادائیگی واجب ہے اس لیے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ

"جس نے صدقہ نماز عید سے قبل ادا کیا تو یہ مقبول زکوٰۃ ہے اور جس نے بعد نماز ادا کیا تو یہ ایک صدقہ ہے۔"

اس حدیث میں کہا گیا کہ نماز کے بعد فطرہ دینا ایک صدقہ ہے جس کا یہ مفہوم ہوا کہ اس کا ثواب نہیں ہے جو زکوٰۃ الفطر کا ہے جس کا ایک وقت متعین ہے۔[2]

ابن ارسلان کہتے ہیں کہ عید الفطر سے فطرہ کا مؤخر کر دینا بالاتفاق حرام ہے اس لیے کہ یہ زکوٰۃ واجب ہے اس لیے اس کی تاخیر میں گناہ ہوگا جیسا کہ نماز کا اس کے وقت سے مؤخر کر دینا گناہ ہے۔[3]

المغنی میں ہے کہ اگر یوم عید سے مؤخر کر دیا تو گنہگار ہوگا اور قضا لازم ہوگی[4] جبکہ ابن سیرینؒ اور نخعیؒ سے یوم عید سے مؤخر کر دینے کی رخصت بھی مروی ہے اور ابن المنذر نے امام احمدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اتباع سنت اولیٰ ہے۔[5]

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۴۳۔

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۹۵۔

[3] ایضاً۔

[4] الدردیر فی الشرح الکبیر میں ہے کہ مدت گزرنے سے فطرہ دینے سے ساقط نہیں ہوگا (ج ۱، ص ۵۰۸)۔

[5] المغنی، ج ۳، ص ۶۷۔

ابن حزم کے نزدیک فطرہ کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر جائز نہیں ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ طلوع فجر یوم عید سے پہلے فطرہ کی ادائیگی جائز نہیں ہے بلکہ بالکلیہ تقدیم جائز نہیں ہے[1] کیونکہ ان کے نزدیک تعجیل زکوٰۃ جائز نہیں ہے حالانکہ صحابۂ کرام سے مروی ہے کہ انھوں نے زکوٰۃ میں تعجیل بھی کی ہے۔ (یعنی زکوٰۃ کے وجوب کا وقت آنے سے پہلے بھی زکوٰۃ دی ہے۔)

امام بخاری رح نے حضرت ابن عمر رض سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ صحابۂ کرام رض یوم الفطر سے ایک دو روز قبل بھی فطرہ ادا کر دیا کرتے تھے یہی رائے امام احمد رح کی بھی ہے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ ایک دو روز سے زیادہ قبل جائز نہیں ہے۔

یہی مسلک امام مالک رح ہے اور بعض مالکی مسلک کے فقہائے کے نزدیک تین روز پہلے تک دینا جائز ہے[2] اور بعض حنابلہ کے نزدیک نصف ماہ تک تقدیم جائز ہے۔ اور امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ اول شہر رمضان سے فطرہ کی ادائیگی جائز ہے کیونکہ صدقہ کا سبب روزہ اور روزہ سے افطار ہے ان میں سے جو بھی سبب موجود ہوگا تو اس کے اعتبار سے تعجیل جائز ہوگی جیسا کہ نصاب کا مالک ہونے کے بعد مال کی زکوٰۃ واجب ہو[3] اور امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک فطرہ کی ادائیگی اول سال سے جائز ہے جیسا کہ مال کی زکوٰۃ کی تعجیل جائز ہے اور زیدیہ مسلک میں مال کی زکوٰۃ کی طرح فطرہ کی ادائیگی دو سال پہلے تک جائز ہے[4]

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۴۳۔ ابن حزم رح کا مسلک ہی امامیہ کا بھی مسلک ہے۔ (فقہ الامام جعفر، ج ۲، ص ۱۰۶)

[2] الشرح الکبیر بحاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۸۔

[3] المغنی، ج ۳، ص ۶۸، ۶۹۔

[4] البحر، ج ۲، ص ۱۹۶۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک حلمناطؒ کے زیادہ قریب اور مقصد سے زیادہ مربوط ہے کہ خاص عید کے وز اہل احتیاج کی ضرورت پوری کی جائے۔ اور نصف ماہ سے ادائیگی باعث دلت ہے بالخصوص جب کہ ریاست فطرہ کی وصولی کی ذمّہ داری سنبھالے کہ حکومت کو اتنے وقت کی ضرورت ہوگی کہ اس میں فطرہ جمع کر کے لوگوں تک پہنچا دے اور اہلِ احتیاج روز عید اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ عید کی خوشیوں میں شریک ہوں اور یہی صُورت اس وقت ہوگی جبکہ فطرہ کی وصولیابی جمعیات یا ادارے کر رہے ہوں۔

پانچویں فصل

فطرہ کے مستحقین

بالاجماع زکوٰۃ الفطر فقراء المسلمین پر صرف کی جائے گی

ابن رشدؒ فرماتے ہیں کہ اس امر پر اجماع ہے کہ فرمانِ نبوتؐ کے مطابق فطرہ مسلمان فقراء پر تقسیم کیا جائے گا۔

ذمی فقراء کے بارے میں اختلافِ رائے

جمہور فقہاء کے نزدیک صدقۂ فطر ذمی (غیر مسلم) ضرورتمندوں کو دینا جائز نہیں ہے جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے۔ وجہ اختلاف یہ ہے کہ کیا ادائے فطر کا سبب جواز صرف فقر (محتاجی) ہے یا فقر اور اسلام دونوں ہیں، جن کے نزدیک فقر اور اسلام دونوں سبب ہیں ان کے نزدیک ذمیوں کو فطرہ دینا جائز نہیں ہے اور جن کے نزدیک صرف فقر سبب ہے ان کے نزدیک جائز ہے اور بعض فقہاء نے ذمیوں کے بارے میں یہ شرط بھی لگائی ہے کہ اگر وہ راہب ہوں تو انہیں صدقۂ فطر دیا جا سکتا ہے[1]

چنانچہ ابو میسرہ[2]، عمرو بن میمون، عمرو بن شرحبیل اور مرۃ الہمدانی وغیرہ سے مروی ہے کہ وہ راہبوں کو صدقۂ فطر دیا کرتے تھے[3]

اس سے روحِ اسلام کا پتہ چلتا ہے کہ اسلام انسانیت پر مہربان ہے اور وہ

---

[1] بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۷۳۔

[2] المصنف، ج ۴، ص ۳۹۔

[3] المغنی، ج ۳، ص ۷۸۔

اپنے ماننے والوں کو ان مخالفین کی مدد و اعانت سے منع نہیں کرتا جو مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں تاکہ وہ بھی مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے مسلمانوں کی خوشی میں شریک ہوں، لیکن یہ جب ہے پہلے فقراء مسلمین پہلے مستغنی ہو جائیں جیسا کہ ہم مصارف زکوٰۃ کے بارے میں پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔

کیا صدقۂ فطر زکوٰۃ کے مصارف ثمانیہ میں تقسیم کیا جائے گا

اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ صدقۂ فطر انہی آٹھ اصناف پر مساوات کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا جن میں زکوٰۃ تقسیم کی جاتی ہے[1] اور یہی علامہ ابن حزمؒ کا مسلک ہے اور جب فطرہ دینے والا خود ہی دے رہا ہو تو عاملین علیہا کی صنف ساقط ہو جائے گی اور اسی طرح مؤلفۃ القلوب کی صنف ساقط ہو جائے گی کہ انھیں دینا ریاست (امام) کا فریضہ ہے[2]

امام ابن القیمؒ نے اس رائے کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقۂ فطر مساکین کو دیتے اور آٹھوں اصناف پر تقسیم نہ فرماتے اور نہ آپ نے اس کا حکم دیا اور نہ ہی صحابہ میں کسی نے یہ عمل کیا بلکہ ہمارا تو ایک قول یہ ہے کہ صدقۂ فطر مساکین کے سوا دینا جائز ہی نہیں ہے اور میرے نزدیک آٹھ اصناف پر تقسیم کو لازم قرار دینے کی رائے سے یہ رائے بہتر ہے[3]

مسلک مالکیؒ کے فقہاء کے نزدیک صدقۂ فطر مساکین اور فقراء کو دیا جائے گا اور عاملین علیہا، مؤلفۃ القلوب، فی الرقاب، اور فی سبیل اللہ کے مصارف میں صرف نہیں کیا جائے گا یعنی صرف فقر ہونے کی بنا پر دیا جائے گا اور اگر صدقۂ فطر دینے

---

[1] المجموع، ج ۶، ص ۱۴۴۔

[2] المحلی، ج ۶، ص ۱۴۳/ ۱۴۵۔

[3] زاد المعاد، ج ۱، ص ۳۱۵۔

والے کے شہر میں کوئی فقیر نہ ہو تو اس کے شہر سے قریب ترین شہر میں اسی کے خرچ سے بھیجا جائے گا تاکہ صدقۂ فطر کے مصارف میں کمی نہ آئے۔[1]

بہر حال اس سلسلے میں تین اقوال ہیں:-

۱) ایک رائے یہ ہے کہ صدقۂ فطر آٹھوں اصناف، یا جس قدر اصناف موجود ہوں تمام پر برابر تقسیم کیا جائے اور یہ فقہائے شافعیہ کا مشہور مسلک ہے۔

۲) دوسری رائے یہ ہے کہ صدقۂ فطر دیگر اصناف کو دینا بھی جائز ہے اور اس کو فقراء کے ساتھ مخصوص کر دینا بھی جائز ہے اور یہ جمہور کی رائے ہے کیونکہ یہ صدقہ ہے اور اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔ (انما الصدقات للفقراء)

۳) تیسری رائے یہ ہے کہ صدقۂ فطر خاص طور پر فقراء ہی کو دینا چاہیے، یہ مالکی فقہاء کا مسلک ہے، امام احمدؒ کا ایک قول ہے اور ابن القیمؒ اور ان کے شیخ ابن تیمیہؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے، یہی رائے الہادی، القاسم اور ابو طالب نے اختیار کیا ہے کہ صدقۂ فطر صرف مساکین اور فقراء کو دیا جائے گا کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ فطرہٗ طعمۃٌ للمساکین ہے اور حدیث ہے کہ آج کے روز انھیں غنی کر دو۔[2]

میرے نزدیک اگرچہ یہی آخری رائے درست، صدقۂ فطر کی روح کے قریب اور اس کے مقصد کی تکمیل کرنے والی ہے لیکن اس کے باوجود دوسرے مصارف میں، بوقت ضرورت صرف کرنے کی ممانعت نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عید کے دن بطور خاص فقراء کی حاجت روائی لازمی ہے اس لیے دیگر مصارف میں صرف کرنا ممنوع نہیں ہے جیسا کہ زکوٰۃ کے بارے میں ارشاد نبوتؐ ہے کہ "زکوٰۃ اغنیاء سے لے کر فقراء کو لوٹائی جاتی ہے"۔

اس حدیث کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ دیگر مصارف میں جو کہ آیت میں بیان ہوئے

---

[1] الشرح الکبیر بحاشیۃ الدسوقی، ج ۱، ص ۵۰۸، ۵۰۹۔

[2] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۹۵۔

ذکر صرف کرنا ممنوع ہے۔

غرض ہماری رائے یہ ہے کہ فطرہ فقراء کو دیا جائے اور اگر کوئی مصلحت و ضرورت درپیش ہو تو دیگر مصارف میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ ایک شخص اپنا فطرہ ایک مسکین یا متعدد مساکین کو دے سکتا ہے جیسا کہ متعدد افراد اپنا فطرہ ایک ہی مسکین کو دے سکتے ہیں[1] البتہ بعض فقہاء کے نزدیک ایک شخص کا اپنا فطرہ متعدد مساکین کو دینا مکروہ ہے کیونکہ اس سے استغناء متحقق نہیں ہوگا اور اسی طرح متعدد افراد کا ایک ہی شخص کو فطرہ دینا حامل کرامت ہے کیونکہ جب اور بھی حاجتمند موجود ہوں تو صرف ایک ہی فقیر (حاجتمند) کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے[2]

جس شخص کو زکوٰۃ الفطر نہیں دی جائے گی

درانحالیکہ صدقۂ فطر بھی زکوٰۃ ہی ہے اس لیے فطرہ بھی اس شخص کو دینا جائز نہیں ہے جس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے یعنی دشمن اسلام کافر کو، یا مرتد کو یا فاسق کو جو اپنے فسق کو مسلمانوں کو چیلنج کرنے کا ذریعہ بناتا ہو، یا مالدار کو یا اس بے کار شخص کو جو کسب کی قدرت رکھتا ہو مگر کسب نہ کرے۔ یا باپ کو یا بیٹے کو یا بیوی کو کیونکہ ان قریبی رشتہ داروں کو دینا خود اپنے آپ کو دینا ہے جیسا کہ ہم نے مصارفِ زکوٰۃ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شہر کے فقراء مقدم ہیں

جس شہر میں صدقۂ فطر دینے والا موجود ہو اسی کے فقراء کو صدقۂ فطر دیا جانا چاہیے، ان وجوہات کی بنا پر جو ہم نے زکوٰۃ کے ضمن میں بیان کی ہیں اور اس وجہ سے کہ فطرہ کا تعلق عید سے ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر فقراء کو مل جائے اس لیے دہندہ کے پڑوسی اور اہلِ شہر مقدم ہیں، لیکن اگر اس شہر میں فقراء موجود نہ ہوں تو پھر قریبی بستی میں بھیجا جا سکتا ہے جیسا کہ مسلک مالکؒ کے فقہاء سے منقول ہے اور البحر میں ہے کہ جب تک کوئی اعلیٰ مقصد موجود نہ ہو شہر کے فقراء کے علاوہ کسی اور کو دینا مکروہ ہے[3]

---

[1] البحر، ج ۲، ص ۱۹۷۔

[2] الدر المختار وحاشیتہ ج ۲، ص ۸۵، الشرح الکبیر بحاشیۃ الدسوقی ج ۱، ص ۵۰۸۔

[3] البحر الزخار، ج ۲، ص ...

آٹھواں باب

زکوٰۃ کے علاوہ مال پر حق

۱- ان فقہاء کی رائے جن کے نزدیک زکوٰۃ کے علاوہ مال پر حق عائد نہیں ہوتا ہے۔
۲- ان فقہاء کی رائے جن کے نزدیک زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر حق عائد ہوتا ہے۔
۳- ان اقوال کے درمیان ترجیح۔

زکوٰۃ کے علاوہ مال پر حق

بعض مسائل میں کوئی ایک رائے زیادہ شہرت اختیار کر جاتی ہے اور اس سے لوگوں کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ یہی واحد رائے ہے۔ اسی طرح کی ایک رائے فقہاء متاخرین میں یہ شائع ہو گئی ہے کہ ماسوا زکوٰۃ کے مال پر اور کوئی حق عائد نہیں ہوتا اور دینی علوم کے حاملین کے درمیان یہ ایک مسلمہ امر بن گیا ہے۔ اس باب میں ہم اسی مسئلہ کو نصوص اور قواعد شریعت کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل: ان فقہاء کی رائے جن کے نزدیک مال پر علاوہ زکوٰۃ کے کوئی حق عائد نہیں ہوتا۔

دوسری فصل: ان فقہاء کی رائے جن کے نزدیک زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر حق عائد ہوتا ہے۔

تیسری فصل: ان اقوال کے درمیان ترجیح۔

پہلی فصل

ان فقہا کی رائے جن کے نزدیک مال پر علاوہ زکوٰۃ کے کوئی حق عائد نہیں ہوتا

بیشتر فقہا کی رائے یہ ہے کہ از روئے شریعت مال پر لازم ہونے والا واحد حق زکوٰۃ ہے۔ جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ دے دے اس کا مال پاک ہو گیا صاحب مال بری الذمہ ہو گیا اور اس کے اوپر کوئی اور مطالبہ باقی نہیں رہا الا یہ کہ وہ بطور تطوع (نفل) کچھ دے، یہی مسلک متاخرین فقہا میں مشہور رہا ہے اور اس قدر مشہور ہے اس کے علاوہ اس بارے میں کوئی اور رائے ہی نہ ہو۔

اس رائے کے حق میں دلائل

۱) بخاری و مسلم نے حضرت طلحہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نجد کا ایک شخص آیا، جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آواز تو سنائی دیتی تھی، یہاں تک کہ وہ آپ کے قریب آگیا اور اس نے اسلام کے بارے میں استفسار کیا، آپ نے فرمایا شب و روز میں پانچ نمازیں، اس نے پوچھا کہ اس کے علاوہ کچھ آپ نے فرمایا، اس کے علاوہ نفل۔ آپ نے فرمایا رمضان کے روزے، اس نے کہا کہ اس کے علاوہ آپ نے فرمایا، اس کے علاوہ نفل، ..... بعد ازاں آپ نے زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو اس نے کہا کہ اس کے علاوہ اور کچھ، آپ نے فرمایا کہ اس کے علاوہ نفل۔ وہ شخص جانے لگا تو اس نے کہا کہ اس پر میں نہ اضافہ کروں گا اور نہ کمی کروں گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سچا ہے تو کامیاب ہو گیا، یا آپ نے فرمایا کہ سچا ہے تو جنتی ہو گیا[1]

---

[1] البحر، ج ۲، ص ۱۳۸۔

۲) بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ مجھے ایسا عمل بتلایئے جس کو میں کر لوں تو جنت میں چلا جاؤں، آپ نے فرمایا خدائے واحد کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، فرض نماز پڑھو اور فرض زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو، اس نے کہا قسم بخدا میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کروں گا جب وہ جانے لگا تو آپ نے فرمایا اگر کسی کے لیے جنتی شخص کو دیکھنا خوشگوار ہو تو وہ اس شخص کو دیکھ لے[1]

پہلی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو بتایا کہ اس پر اور کچھ لازم نہیں ہے، ماسوا اس کے کہ وہ کوئی نفلی صدقہ کرے اور دونوں حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائلوں کے اس کہنے پر رضامندی ظاہر فرمائی کہ وہ فرض زکوٰۃ پر کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ انھیں جنت کی خوش خبری دی، اگر مال پر علاوہ زکوٰۃ کے کوئی اور حق بھی لازم ہوتا تو یہ دونوں سائل اس کے ترک کے باوجود جنت کے مستحق نہ ہوتے۔

۳) ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دو تو تم نے اپنے اوپر عائد حق ادا کر دیا[2]

جو شخص اپنے مال پر عائد ہونے والے حق کو ادا کر دے تو اس پر اب کوئی حق نہیں رہا اور لازمی طور پر اب کسی اور ادائیگی کا اس سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

۴) حاکم نے حضرت جابرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اگر تم نے اپنے مال کی

---

[1] ماسوا ترمذی کے باقی پانچ نے روایت کیا ہے۔ جمع الفوائد، ج ۱، ص ۱۱۔

[2] ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، ج ۳، ص ۹۷، ۹۸۔ الترمذی مع شرح ابن العربی، انھوں نے حسن غریب کہا ہے اور الحاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے اور الذہبی نے تائید کی ہے، ج ۱، ص ۳۹۰، مگر حافظ ابن حجر نے التلخیص (ص ۱۷۷) میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔

زکوٰۃ دے دی تو تم سے اس کا شر دُور ہو گیا [1]

اِنسان سے مال کا دنیا اور آخرت کا شر اس وقت دُور ہوتا ہے جب وہ مال پر عائد تمام حقوق ادا کر دے۔

۵) حاکم نے ام مسلمہ سے روایت کیا ہے کہ ان کے پاس سونے کے زیورات تھے انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار فرمایا کہ کیا یہ بھی کنز ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ان کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو یہ کنز نہیں ہیں [2]

اور بعض روایات میں ہے کہ

و جو شئے حد زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو وہ کنز نہیں ہے" [3]

اس سے معلوم ہوا کہ کنز جمع کرنے والوں کے بارے میں جو وعید آئی ہے اس میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اگر مال میں کوئی اور بھی حق لازم ہوتا تو وعید سے محفوظ نہ رہتا۔

---

[1] ابن خزیمہ نے صحیح میں روایت کیا ہے اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ (ج ۱، ص ۳۹۰) مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور ذہبی نے اس کی تائید کی ہے اور الحافظ نے فتح میں (ج ۳، ص ۱۷۵) میں کہا ہے کہ ابو زرعہ اور بیہقی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے، جیسا کہ البزار کے نزدیک موقوف ہے —— اس حدیث میں شر کے لفظ سے مراد دنیا میں اس کا ضائع ہو جانا ہے اور آخرت میں اللہ کے حقوق کو ضائع کرنے والوں کے لیے عذاب ہے۔

[2] الحاکم (ج ۱، ص ۳۹۰) نے کہا ہے کہ یہ حدیث بشرطیکہ بخاری صحیح ہے، الذہبی نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے مگر اس کی سند میں کلام ہے جس کی تفصیل ہم تیسرے باب (زیورات پر زکوٰۃ) میں بیان کر چکے ہیں۔

[3] ابوداؤد۔

نیز اس رائے کے حامل حضرات نے یہ حدیث بھی روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"ماسوا زکوٰۃ کے مال میں اور کوئی حق نہیں ہے"

بہرحال یہ وہ احادیث ہیں جن کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے سوا کوئی اور حق لازم نہیں ہے اور پہلی دونوں حدیثیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث ہیں اور ان کے ثبوت میں کوئی طعن نہیں ہے، تیسری حدیث کی سند ضعیف ہے اور چوتھی حدیث کا موقوف ہونا راجح ہے اور پانچویں حدیث کی سند میں کلام ہے۔

جبکہ یہ حدیث کہ —— ماسوا زکوٰۃ کے مال میں اور کوئی حق نہیں ہے —— بہت ضعیف ہے اور بلاشبہ مردود ہے بلکہ خطا اور تحریف ہے[1] اور دراصل صحیحین کی احادیث ہی قابل اعتماد ہیں۔

معارض نصوص کے بارے میں ان حضرات کا موقف

علاوہ زکوٰۃ کے مال پر دیگر حقوق کے لازم ہونے کے بارے میں جو نصوص وارد ہوئی ہیں ان کے بارے میں یہ فقہاء فرماتے

---

[1] اس حدیث کی روایت ابن ماجہ کی جانب منسوب ہے۔ مگر امام نوویؒ المجموع (ج ۵، ص ۳۳۲) میں اسے بے حد ضعیف کہہ چکے ہیں اور البیہقی نے کہا ہے کہ ہمارے اصحاب نے اس حدیث کو حواشی میں درج کیا ہے مگر مجھے اس کی سند معلوم نہیں ہے (السنن الکبریٰ، ج ۴، ص ۸۴) الحافظ العراقی نے ابن ماجہ کے اپنی سنن میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کرنے پر اعتراض کیا ہے اور ان کے فرزند الحافظ ابوزرعہ نے کہا ہے کہ دراصل ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں —— فی المال حق سوی الزکوٰۃ —— (مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے) طرح التثریب، ج ۴، ص ۱۸ جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے شروع میں لَیْسَ کا لفظ ناسخین (ناقلین) کی جانب سے بڑھایا گیا اور یہ غلطی بعد میں عام ہو گئی، اسی بات کو علامہ شیخ احمد شاکر نے تفسیر طبری (ص ۳۴۳، ۳۴۴)

(بقیہ اگلے صفحے پر دیکھیے)

ہیں کہ یہ بر سبیل استحباب ہیں بر سبیل لزوم نہیں ہیں جیسا کہ حق حنیف کے بارے میں وارد نقش بنی استحباب ہے۔ یا یہ کہ یہ حقوق زکوٰۃ کے وجوب سے پہلے لازم تھے اور فرضیت زکوٰۃ کے بعد ان واجبات کی فرضیت منسوخ ہوگئی، جیسا کہ اس فرمان آلٰہی کے بارے میں انھوں نے یہی فرمایا ہے۔

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (الانعام : ۱۴۲)

(بقیہ آگے) میں اثر ۲۵۳۰ کے حاشیہ میں بیان کیا ہے اور ابن ماجہ میں اس غلطی کے واقع ہونے پر درج ذیل امور سے استدلال کیا ہے۔

الف) طبری میں یہ اثر (۲۵۲۷) جو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے یحییٰ بن آدم کی سند سے ان الفاظ میں مروی ہے۔

ان فی المال حق سوی الزکوٰۃ

ب) اس حدیث کو ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ترمذی اور ابن ماجہ دونوں کی جانب منسوب کیا ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے اور اسی طرح النابلسی نے (ذخائر المواديث ۱۱۶۹۹) اس کو ایک حدیث کے طور پر ترمذی اور ابن ماجہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

ج) البیہقی کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ مجھے اس حدیث کی سند نہیں معلوم، اور جن الفاظ میں ابن ماجہ میں مذکور ہوئی ہے وہ بلاشبہ ابن ماجہ کے الفاظ نہیں ہیں اور یہی النووی نے کہا ہے کہ وہ اس کی سند سے واقف نہیں ہیں۔

البتہ شیخ شاکر نے ابوزرعہ کے الفاظ نقل نہیں کیے ہیں، شاید وہ ان الفاظ پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔

بہر حال یہی تحقیق مناسب ہے کہ ناسخین کی غلطی سے ابن ماجہ کی روایت میں لَیْسَ کے لفظ کا اضافہ ہوگیا ہے کیونکہ دوسرے مقام پر یہی روایت بغیر لَیْسَ کے مذکور رہے، غرض سند کے اضطراب کے بیان کرنے سے یہ توجیہ زیادہ مناسب ہے۔

اور وہ اس کا حق جس دن کٹے۔

ایک تاویل ان فقہائے نے یہ بھی کی ہے کہ یہ حقوق ضرورت کے وقت لازم ہیں جیسا کہ 'الماعون' کے بارے میں ان کی یہی رائے ہے اور ان میں سے بعض فقہائے نے کہا ہے کہ 'الماعون' سے مراد زکوٰۃ ہے جیسا کہ بعض صحابہ کرام سے یہی تفسیر مروی ہے غرض یہ علاوہ زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے۔

اور وہ حدیث جو فاطمہ بنت قیس سے مرفوعًا مروی ہے کہ

'مال میں علاوہ زکوٰۃ کے بھی حق ہے'[1]

تو اسے امام ترمذیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے کہ یہ حدیث ابو حمزہ میمون الاعور القصاب[2] سے مروی ہے جو کہ ائمہ حدیث کے نزدیک بے حد ضعیف ہے اور اس کی روایت قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

●

---

[1] اس حدیث کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند اس طرح نہیں ہے اور میمون الاعور ضعیف ہے الطبری نے (ج ۳، ص ۱۷۶، ۱۷۷) اس روایت کو (اثر ۲۵۲۷، و، ۲۵۳۰) نقل کیا ہے اور الدارمی (ج ۱، ص ۳۸۵) اور ابن ماجہ (۱۷۸۶) نے بھی اس روایت کو بسند یحییٰ بن آدم نقل کیا ہے اور البیہقی نے السنن الکبریٰ (ج ۴/ص ۸۴) میں نقل کیا ہے۔

[2] ترجمہ دیکھئے۔ ابن حجر: التہذیب، البخاری: التاریخ الکبیر، ۴-۱-۳۴۳ - ابن ابی حاتم: الجرح والتعدیل، ۴-۱-۲۳۵ -- ۲۳۶۔

دوسری فصل

ان فقہا کی آراء جن کے نزدیک مال پر علاوہ زکوٰۃ کے بھی حق ہے

صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابوذرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت حسن بن علیؓ اور فاطمہ بنت قیسؓ اور تابعین میں سے شعبی، مجاہد، طاؤس اور عطاء کی رائے یہ ہے کہ مال پر علاوہ زکوٰۃ کے بھی حق ہے۔

دلائل

ان حضرات کی ایک دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ○ (البقرہ : ۱۷۷)

نیکی یہی نہیں کہ منہ کرو اپنے مشرق کی طرف یا مغرب کی (طرف) لیکن نیکی وہ ہے جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دیوے مال اس کی محبت پر ناتے والوں کو اور یتیموں

کو اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور کھڑی رکھتے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب قول کریں اور ٹھیرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور وقت لڑائی کے۔ وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی بچاؤ میں آئے۔

امام ترمذیؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنت قیسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے بارے میں استفسار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ مال میں علاوہ زکوٰۃ کے بھی حق ہے، اور آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (مذکورہ بالا)۔

امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث (کی سند میں) ضعف ہے لیکن مذکورہ آیت البرُّ سے اس کی تائید اور توثیق ہوجاتی ہے کہ آیت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو مال دینا بھی عناصر برؓ قرار دیا گیا ہے اور پھر اس پر نماز اور زکوٰۃ کا عطف کیا گیا ہے، اور عطف مغایرتُ کے لیے ہوتا ہے، جس سے معلوم ہُوا کہ اس آیت میں جو رشتہ داروں وغیرہ کو دینا بیان ہوا ہے یہ علاوہ زکوٰۃ کے ہے چنانچہ قرطبیؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہر چند کہ اس کی سند پر گفتگو ہے مگر اس حدیث کی صحت پر معنوی دلیل یہ ہے کہ آیت برؓ میں رشتہ داروں وغیرہ کو دینے کے حکم کے بعد ایتائے زکوٰۃ اور اقامت صلوٰۃ کا ذکر کیا گیا جس سے معلوم ہُوا کہ رشتہ داروں وغیرہ کو دینا زکوٰۃ کے علاوہ ہے ورنہ اگر دونوں مقامات پر زکوٰۃ ہی مراد ہو تو تکرار واقع ہوجائے گی[1]

---

[1] امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں کہ علاوہ زکوٰۃ کے بھی کوئی حق مال پر فرض ہے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے پہلے رشتہ داروں وغیرہ کو دینے کا حکم فرمایا، بعدازاں یہ بیان فرمایا کہ مؤمنین زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہُوا کہ پہلے جس حق کا بیان ہوا ہے وہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ ورنہ اس تکرار کا کوئی مفہوم نہ ہوگا اور اللہ سبحانہٗ کی ذات سے بعید ہے کہ وہ قرآن میں ایسی بات ارشاد فرمائیں جس کا مفہوم نہ ہو، اس سے معلوم ہُوا کہ پہلے مذکور حق، بعد میں بیان کردہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ اور بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ

آیت ہٰذا میں وارد مال دینے کے حکم کو تطوع اور نفل پر محمول کرنا درست نہیں ہوگا اس لیے کہ یہ آیت ان یہودیوں کے رد میں نازل ہوئی ہے جو مظاہر پرستی میں مبتلا تھے اور ظاہری صورتوں کو ترجیح دیا کرتے تھے، ان کی تردید کرتے ہوئے بیان کیا گیا کہ حقیقی نیکی کیا ہے اور سچا دین کیا ہے، یعنی یہ ارکان کا بیان ہے ارکان کے تکمیلی اجزاء کا بیان نہیں ہے اور فرائض اور واجبات کا بیان ہے مستحباب اور نوافل کا بیان نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ آیت میں مذکور دیگر تمام امور اسی قبیل کے ہیں، یعنی اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، وفائے عہد، اور سختی اور تنگی میں صبر جیسے اساسی امور جن کے بغیر عقیدۂ اخلاق اور عبادت کی نیکیاں متحقق نہیں ہو سکتیں۔ تو جب آیت میں یہ تمام امور لازمی واجبات کے سلسلے کے بیان ہوتے ہیں تو صرف ایتاء المال علی حبہ (رشتہ داروں وغیرہ کو دینے کے حکم) کو کیوں نفل اور مندوب قرار دیا جائے؟

ابو عبید بیان کرتے ہیں کہ بعض فقہاء نے اس آیت کو منسوخ کہا ہے جیسا کہ ضحاک کہتے ہیں کہ

"زکوٰۃ سے قرآن میں بیان کردہ صدقات منسوخ ہو گئے ہیں"[1]

مگر اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے، اور بلا دلیل قرآن کے نسخ کا دعویٰ مناسب نہیں ہے اور اگر ضحاک کی اس رائے کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو صورت یہ ہوگی کہ ایک ہی آیت کے ایک جزء (آتی المال علی حبہ) سے ایک حکم ثابت ہوگا اور اسی آیت کے دوسرے جز (وآتی الزکوٰۃ) سے منسوخ ہو جائے گا جو کہ ایک غیر معقول بات ہے۔ مزید برآں یہ کہ آیت ایسی خبر پر مشتمل ہے جس میں اہل بِرّ اور تقویٰ کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں، اور خبر

(بقیہ آگے) پہلے مذکور رشتہ داروں وغیرہ کو دینا وہی زکوٰۃ ہے۔

اس بیان سے امام طبریؒ کا رجحان معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ پہلی رائے کے قائل ہیں۔

الطبری، ج ۳، ص ۳۴۸ - ۳۴۸ - ط - المعارف۔ تفسیر القرطبی ج ۲، ص ۴۲۔

[1] الاموال، ص ۳۵۷/۳۵۸۔

میں نسخ نہیں ہوتا کہ خبر کے نسخ سے قائل کی تکذیب لازم آتی ہے جو یہاں پر اللہ سبحانہ ہے۔
ابو عبید بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت مدینہ منورہ میں فرائض کے نازل ہونے اور حدود کے لازم ہو جانے کے وقت نازل ہوئی[1] جس سے معلوم ہوا کہ آیت محکمہ ہے۔

دوسری دلیل: کٹائی کے وقت فصل کا حق

ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے مختلف النوع پھلوں کی تخلیق پر اپنے بندوں پر احسان فرماتے ہوئے ارشاد کیا

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (الانعام : ۱۴۲)

اور دو اس کا حق جس دن کٹے۔

اس آیت میں جس حق کا ذکر کیا گیا ہے وہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے جس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:-

۱) یہ آیت مکی ہے اور مدینہ منورہ میں عشر کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی کیونکہ مشہور روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پوری سورۃ الانعام مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس آیت کو مدنی قرار دینا بلا دلیل ہوگا۔

۲) آیت کا مطلوب وقتِ حَصاد (کٹائی) حق ثمر ادا کرنا ہے جو کہ عشر سے پورا نہیں ہوتا کیونکہ عشر تو صفائی وغیرہ کے بعد جب حاصل شدہ مقدار معلوم ہو جائے تب ادا کیا جاتا ہے۔

۳) آیت: وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے۔ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی ایک مقدار متعین ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی اس لیے اس میں اسراف نہیں ہو سکتا۔[2]

---

[1] ایضاً، ص ۳۵۸۔

[2] ابن حزم، المحلی: ج ۵/ص ۲۱۶، ۲۱۷۔

جن حضرات کی یہ رائے ہے کہ آیت بالا میں جس حق کا وقتِ حصاد پہلے دینا لازم تھا وہ بعد میں منسوخ ہو گیا تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نسخ محض احتمال سے ثابت نہیں ہوتا چنانچہ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ نسخ ایسی نص سے ثابت ہوتا ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سند متصل ہو کیونکہ اس کے بغیر ہر آیت اور ہر حدیث کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ منسوخ ہے کہ نسخ کا مطلب حکم الٰہی کو ساقط کرنا ہے جس کے لیے ظاہر ہے سند صحیح کی حامل نص کی ضرورت ہے[1] اور یہ حق واجب زکوٰۃ کے علاوہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فصل کاٹنے والا غیر معین طریقہ پر جو چاہے فصل کاٹنے کے وقت دے دے۔

یہی ظاہر آیت ہے اور یہی سلف کی رائے ہے[2] چنانچہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ صحابہؓ علاوہ زکوٰۃ کے یہ حق دیا کرتے تھے۔ عطاء کہتے ہیں کہ اس روز حسب سہولت جو بھی لینے والا موجود ہو اُسے علاوہ زکوٰۃ کے دے دیا جائے، مجاہد فرماتے ہیں کہ جب مسکین آئیں تو ان کو کچھ نہ کچھ دے دیا جائے اور فرمایا کہ جب فصل کاٹنے لگے جب مساکین کو ایک مٹھی دے دے پھر کاٹتے وقت انھیں مٹھی دے دے اور انھیں کٹائی کے پیچھے پیچھے آنے دے اور کچھ نہ کچھ دیتا جائے۔ ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ ایک گھٹڑی دے دے[3]

ابو العالیہ، سعید بن جبیر، علی بن الحسین، اور ربیع بن انس سے بھی[4] اسی طرح کا قول منقول ہے اور ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کی برائی بیان فرمائی ہے جو کہ فصل کاٹتے وقت صدقہ نہ کریں جیسا کہ سورۂ نٓ میں باغ والوں کے ذکر میں آیا ہے۔[5]

اس آیت میں حق کے لفظ کی مراد اور اس کا زکوٰۃ سے منسوخ ہونا اور اس مقام

---

[1] ایضاً

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] ایضاً

[5] ابن کثیر، ج ۲، ص ۱۸۱، ۱۸۲۔

پر نسخ کے معنی پہلے گزر چکے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جیسے صحابی اور عطاؔ، مجاہد نخعی جیسے فقہائے تابعین کی رائے یہی تھی کہ اس آیت میں حق سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ حق ہے۔

تیسری دلیل: مویشی اور گھوڑوں کے حقوق

صحیح احادیث میں اونٹوں اور گھوڑوں کے حقوق وارد ہوئے ہیں، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"اونٹ اپنے مالک کے پاس پہلے سے زیادہ موٹے تازہ ہو کر آئیں گے جب کہ اس کا حق ادا نہ کیا ہو تو وہ اپنے پیروں سے اپنے مالک کو روندیں گے اور بکریاں اپنے مالک کے پاس پہلے سے بہتر حالت میں آئیں گی جبکہ اس نے ان کا حق نہ دیا ہو تو وہ اپنے کھروں سے روندیں گی اور سینگوں سے ماریں گی اور ان کا حق یہ ہے کہ جب وہ پانی پینے آئیں تو وہاں ان کا دودھ دوہا جائے (اور تقسیم کیا جائے)"[1]

بظاہر یہ الفاظ کہ "اس کا حق یہ ہے کہ پانی چھڑک کر دوہا جائے" بکریوں اور اونٹوں دونوں کو مشتمل ہے جبکہ مسلم اور ابوداؤد کی حدیث میں واضح الفاظ ہیں کہ —— "جو اونٹ کا مالک، اونٹ کا حق ادا نہ کرے جو حق یہ ہے کہ اسے اس وقت دوہا جائے جب وہ پانی پینے آئے"[2]

اس جملہ کے بارے میں یہ تاثر غلط ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کے الفاظ ہیں جو شامل حدیث ہو گئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ حدیث ہی ہیں جیساکہ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ نبیؐ تک مرفوع ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ

"اونٹ کا حق یہ ہے کہ جب وہ پانی پر آئے اس وقت دودھ نکالا جائے اور تقسیم کیا جائے"[3]

---

[1] البخاری: کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ، فتح الباری، ج ۳، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

[2] مختصر سنن ابی داؤد، المنذری، ج ۲، ص ۲۴۸۔

[3] صحیح بخاری بحاشیۃ السندی، ج ۲، ص ۳۴۔

نسائی نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو اونٹ، گائے، بکری والا جس نے ان جانوروں کا حق ادا نہ کیا ہو روز قیامت ایک چٹیل میدان میں کھڑا ہو گا اور جانور اسے کھروں سے روندیں گے اور سینگوں سے ماریں گے اور کوئی جانور اس دن ٹوٹے ہوئے سینگ والا نہ ہو گا ہم نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان کا حق کیا ہے کہ ان کے نر (بغیر معاوضہ کے) دے دینا اور ان کو پانی کے لیے عاریتاً دے دینا اور راہِ خدا میں ان پر سواری کرنا ہے[۱]

اسی طرح مسلم نے بھی حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے[۲]

حضرت جابرؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونٹ کا حق یہ ہے کہ موٹے اونٹ کو نحر کیا جائے، نر عاریتاً دیا جائے اور اسے اس وقت دوہا جائے جب وہ پانی پر آئے[۳]

الشرید سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اونٹ کے بارے میں استفسار کیا آپؐ نے فرمایا کہ —— موٹے اونٹ نحر کرو، اچھے اونٹ پر سواری کرو اور جب وہ پانی پر آئے اس وقت اسے دوہا جائے[۴]

یہ تمام روایات اس بارے میں واضح ہیں کہ مذکورہ جملہ مرفوع ہے اور اس میں اِدراج کا احتمال نہیں ہے۔ اس سے حافظ عراقی کی تردید ہو جاتی ہے جنھوں نے ان الفاظ کو حضرت

۱۔ سنن النسائی مع شرح السیوطی وحاشیۃ السندی، ج ۵، ص ۲۷۔

۲۔ طرح التثریب، ج ۴، ص ۱۱، ۱۲۔

۳۔ مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۱۰۷، طبرانی نے اس روایت کو الاوسط میں نقل کیا ہے اور اس کے رجال، رجالِ صحیح ہیں، ماسوا شیخ طبرانی کے، مگر ابن ابی حاتم نے اس سے روایت کی ہے اور کسی نے ضعیف نہیں کہا ہے

۴۔ الطبرانی، الکبیر، بسند حسن، بحوالہ مذکور۔

ابو ہریرہؓ کا کلام قرار دیا ہے۔

ان احادیث میں جو حقوق بیان ہوئے ہیں ان کے پورا نہ کرنے پر وعید وارد ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حقوق لازم ہیں اور یہ حقوق زکوٰۃ کے علاوہ ہیں۔ اسی لیے حضرت امام ابن حزمؒ نے فرمایا ہے کہ[1] "یہ لازم ہے کہ اونٹ، بکری اور گائے کے دودھ ہونے پر اس کا دودھ صدقہ کیا جائے۔ نیز ابن حزمؒ نے بخاری میں وارد حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کوئی حق نہیں ہے وہ غلط کہتا ہے اور نص یا اجماع سے اس کی صحت پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال پر جو کچھ لازم کیا ہے وہ فرض ہے جبکہ اونٹ کا پانی کے لیے عاریتاً دینا اور نر اونٹ کو (بلا معاوضہ) استعمال کے لیے دے دینا الماعون میں داخل ہے کہ قرآن نے الماعون کے نہ دینے کی برائی بیان فرمائی ہے۔

گھوڑوں کے حقوق کے بیان میں صحیح احادیث وارد ہیں چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ گھوڑا کسی کے لیے باعثِ اجر ہے کسی کے لیے باعثِ ستر ہے اور کسی کے لیے باعثِ گناہ ہے، جس کے لیے باعثِ اجر ہے وہ وہ ہے جو گھوڑا جہاد کے لیے باندھتا ہے اور کوئی شخص بطور مالداری اور آسائش کے لیے رکھتا ہے مگر اس میں حق اللہ کو فراموش نہیں کرتا، اس شخص کے لیے گھوڑا ستر ہے اور وہ شخص جو گھوڑے کو فخر وریا اور اسلام دشمنی کے لیے باندھتا ہے تو وہ اس کے لیے باعثِ گناہ ہے۔[2]

چوتھی دلیل: مہمان کا حق

مہمان کا حق بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے چنانچہ خویلد بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۵۰۔

[2] البخاری مع حاشیۃ السندی، ج ۲، ص ۳۳، کتاب المساقاۃ، باب شرب الناس والدواب من الانہار۔

"جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ضیف (مہمان) کی تکریم کرے یہ ضیافت ایک شب و روز عطیہ دینا ہے اور تین روز ضیافت ہے اور اس کے بعد صدقہ ہے"[1]

اکرامِ ضیف کا یہ حکم وجوب پر دلالت کرتا ہے کہ اسے ایمان کی دلیل قرار دیا گیا ہے اور سہ روز کے بعد مہمان نوازی کو صدقہ کہا گیا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو سے فرمایا کہ

"تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے"[2]

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"جو مہمان لوگوں میں جاتے اور وہ اس کی مہمان نوازی نہ کریں تو وہ بلا حرج اپنی مہمان نوازی کے بقدر ان سے لے سکتا ہے"[3]

مقدام بن معدیکرب الکندی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"جو مہمان کسی جگہ مہمان نوازی سے محروم رہے تو اس کی نصرت ہر مسلمان پر فرض ہے یہاں تک کہ مہمان ان کی کھیتی اور مال سے ایک رات کی مہمان نوازی کے بقدر لے سکتا ہے"[4]

مقدام بن معدیکرب ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"ایک شب مہمان ہر مسلمان کے ذمے ہے اور اگر مہمان کی صبح کسی کے گھر میں (بغیر مہمان نوازی کے) ہو گئی تو وہ اس پر قرض ہے"[5]

۱۔ مؤطا مالک، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ ــ الترغیب، ج ۳/ص ۱۴۱-۲

۲۔ بخاری، مسلم۔

۳۔ احمد، راوی ثقہ ہیں، حاکم، سند صحیح ہے۔ المنذری: الترغیب۔

۴۔ ابوداؤد، الحاکم۔ سند صحیح ہے۔ بحوالہ مذکور۔

۵۔ ابوداؤد، ابن ماجہ۔ الترغیب والترہیب، ج ۳، ص ۲۴۱/۲۴۲-۲

حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ
وہم نے آپ سے پوچھا کہ ہمیں آپ کہیں بھیجتے ہیں اور بسا اوقات وہاں
کے لوگ ہماری مہمان نوازی نہیں کرتے، آپ نے فرمایا، کہ جہاں جاؤ وہ جو کچھ
مہمان نوازی کریں اسے قبول کر لو اور اگر نہ کریں تو ان سے مناسب حق مہمان
نوازی لے لو۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ
"اصحاب صُفّہ فقرا، تھے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ جس کے پاس دو افراد کا کھانا ہو وہ ان میں سے تیسرے کو لے جائے اور
جس کے پاس چار افراد کا کھانا ہو وہ ان میں سے پانچویں کو لے جائے اور
جس کے پاس پانچ افراد کا کھانا ہو وہ چھٹے کو لے جائے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ
تین افراد کو لے گئے اور آپ دس کو لے گئے۔"

یہ تمام احادیث اس امر پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ مہمان کا اپنے بھائی کے
مال میں حق ہے اور اس کی نصرت اور مدد ہر مسلمان کا فرض ہے نیز یہ کہ یہ حق زکوٰۃ کے علاوہ
ہے کیونکہ زکوٰۃ ایک وقت مقررہ پر لازم ہوتی ہے یعنی سال گزرنے کے بعد یا فصل کی
کٹائی کے وقت، جبکہ مہمان کسی بھی وقت آسکتا ہے اسی لیے علامہ ابن حزمؒ نے کہا
ہے کہ ضیافت شہری، دیہاتی، عالم اور جاہل ہر ایک پر فرض ہے جس میں سے ایک
شب و روز کی مہمان نوازی اس سے خوب نیکی کرنا اور مہربانی کرنا ہے پھر تین دن ضیافت
ہے۔ تین روز سے زائد کی ضیافت لازم نہیں ہے لیکن اگر صاحب خانہ تین روز کے
بعد بھی مہمان نوازی جاری رکھے تو بہت بہتر ہے اور اگر صاحب خانہ لازمی سہ روزہ
ضیافت بھی نہ کرے تو مہمان اس سے بزور حاصل کرے (اور اگر وہ عدالت میں جائے)
تو اس کے حق میں فیصلہ کیا جائے گا۔[1]

---

[1] المحلی، ج ۹، ص ۱۷۴۔

امام شوکانی ؒ فرماتے ہیں کہ

مہمان کے حق کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ فرض ہے یا مستحب ہے جمہور کی رائے یہ ہے کہ بلاشبہ ضیافت مکارم اخلاق اور محاسن دین میں سے ہے مگر واجب نہیں ہے جب کہ لیث بن سعد کے نزدیک ایک شب و روز کی ضیافت واجب ہے۔

جمہور فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ

"جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اس کی مہمان نوازی کرے، آپ نے فرمایا کہ ایک شب و روز اس کو جائزہ دینا ہے یعنی اچھی طرح مہمان نوازی کرنا ہے اور تین دن عام ضیافت کرنا ہے اور اس سے زائد صدقہ ہے"

اس حدیث میں جائزہ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں عطیہ اور صلہ جو کہ مستحب ہے اور حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شب و روز مہمان کی خصوصی مہمان نوازی کرنی چاہیے اور اسے ہدیہ دینا چاہیے اور ہر ممکن حسن سلوک کرنا چاہیے۔[1]

مزید یہ کہ وہ احادیث بھی ہیں جن سے مال مسلم کی حرمت ثابت ہوتی ہے الّا یہ کہ وہ اپنی خوشی سے دے اور وہ احادیث ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال میں ماسوا زکوٰۃ کے اور کوئی حق نہیں ہے"

بہر حال مہمان کے بارے میں وارد احادیث کے بارے میں فقہاء کے کئی موقف ہیں، چنانچہ امام خطابی رح فرماتے ہیں کہ یہ مہمان نوازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس وقت لازم تھی جبکہ بیت المال نہیں تھا لیکن جب بیت المال قائم ہو گیا تو تمام مسلمانوں کے حقوق بیت المال سے متعلق ہو گئے اور مہمانوں کا مسلمانوں کے مال میں حق نہیں رہا، بعض دیگر فقہاء نے کہا ہے کہ مہمانوں کا یہ حق آغاز اسلام میں لازم تھا کیونکہ

---

[1] نیل الاوطار ج ۸، ص ۱۶۲، ۱۶۳ - ط- الحلبی۔

اس وقت مواسات (ہمدردی) لازم تھی لیکن جب اسلام نے وسعت اختیار کرلی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔[1]

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ

حق یہ ہے کہ ضیافت واجب ہے اور اس کی درج ذیل وجوہ ہیں۔

۱) جو شخص مہمان نوازی نہ کرے اس کا مال لے لینے کی سزا درست ہے، اور سزا غیر واجب امر میں نہیں ہوتی۔

۲) اس مہمان نوازی کی اس قدر تاکید کی گئی ہے کہ اسے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا حصہ بنا دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ جو شخص مہمان نوازی نہ کرے تو اس کا عمل اس شخص کا سا ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو، یہ بھی واضح ہے کہ فروع ایمان بھی لازم ہیں مزید یہ کہ مہمان نوازی کو اکرام کہا گیا ہے جو کہ مزید اختصاص کا حامل ہے اور واجب ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔

۳) حدیث میں وارد ہے کہ تین روز سے زائد مہمان نوازی صدقہ ہے یعنی پہلے تین روز کی مہمان نوازی صدقہ نہیں ہے بلکہ واجب ہے۔

۴) فرمایا کہ ایک شب مہمان واجب ہے، اور یہ الفاظ صریحاً وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔

۵) فرمایا کہ مہمان کی مدد ہر مسلمان پر ایک حق ہے؛ اس سے بھی معلوم ہو کہ نصرت جو کہ ضیافت ہی کا ایک حصہ ہے واجب ہے۔

ان امور کی روشنی میں جمہور کی رائے کا ضعیف ہونا معلوم ہو گیا اور یہ کہ ضیافت کی احادیث سے حرمت اموال، اور مال میں ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے، کی تخصیص ہو گئی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ احادیث ضیافت سد رمق پر محمول ہیں تو اس پر کوئی دلیل قائم نہیں اور نہ کوئی حاجت اس کی داعی ہے، اسی طرح اس تخصیص کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ضیافت نہیں ہے کہ ضیافت شہروں کے رہنے والوں پر واجب نہیں ہے

---

[1] نیل الاوطار، ج ۸، ص ۱۶۲۔

اور بستیوں میں رہنے والوں پر لازم ہے[1]

پانچویں دلیل بحق الماعون

قرآن کریم میں الماعون نہ دینے والوں کے بارے میں وعید آئی ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ○ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ○

(الماعون : ۴، ۷)

پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں۔ وہ جو کچھ دکھادا کرتے ہیں۔ اور مانگے نہ دیں برتنے کی چیز۔

ابوداؤد میں کتاب الزکوۃ کے باب حقوق المال میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ

"عہد نبوتؐ میں ڈول اور ہانڈی عاریتاً دینے کو الماعون شمار کیا کرتے تھے"[2]

اس سے معلوم ہوا کہ ان چھوٹی چھوٹی اشیاء کا عاریتاً دینا جن کی پڑوسیوں کو ضرورت پیش آتی ہے لازم ہے کیونکہ ان اشیاء کا نہ دینا مذموم ہے اور ایسا شخص نماز سے غفلت برتنے والے اور دکھاوے کے طور پر پڑھنے والے کی طرح مستحق وَیل ہے اور ظاہر ہے کہ مکلف وَیل کا مستحق ترک واجب پر ہوتا ہے۔ جب ان اشیاء کا عاریتاً دینا واجب ہے جو کہ زکوۃ نہیں ہے تو معلوم ہو گیا کہ مال میں علاوہ زکوۃ کے بھی حق ہے۔

ابن حزمؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ "الماعون" وہ اشیاء ہیں جو لوگ آپس میں عاریتاً دیتے ہوں جیسے کلھاڑی اور ہانڈی وغیرہ[3] حضرت ابن عباسؓ سے مروی

---

[1] ایضاً، ص ۱۶۳۔

[2] ابوداؤد نے اور المنذری نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے (مختصر السنن، ج ۲، ص ۲۴۷) البیہقی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ (ج ۴، ص ۱۸۳)

[3] المحلی، ج ۹، ص ۱۶۸۔ بروایت ابن ابی شیبہ۔

ہے کہ الماعون سے مراد گھریلو ضرورت کی اشیا ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ[1] اور حضرت علیؓ[2] سے مروی ہے کہ ان اشیاء کو عاریتاً دینا مراد ہے اور ام عطیہ سے مروی ہے کہ باہم دوسرے کا کام بانٹ لینا الماعون ہے[3]

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ الماعون وہ مال ہے جس کا حق ادا نہ کیا گیا ہو اور یہی عکرمہ اور ابراہیم وغیرہ کا قول ہے اور صحابہ میں سے کسی سے اس کے خلاف مروی نہیں ہے[4]

یہ تمام اصحاب بقول ابن حزمؒ لغت قرآنی میں مستند ہیں اور الماعون کی تشریح میں ان کے اقوال متفق ہیں۔

امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے اگرچہ یہ بھی مروی ہے کہ الماعون زکوٰۃ ہے مگر انھوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ عاریت نہیں ہے جبکہ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ الماعون اشیائے عاریت ہیں اس لیے ان دونوں اقوال کو جمع کرنا ضروری ہے[5]

جبکہ ابوداؤد کی حضرت ابن مسعودؓ سے مروی حدیث، محدثین کے نزدیک مرفوع کے حکم میں ہے کہ انھوں نے الماعون کی تفسیر عہدِ نبوتؐ سے کی ہے۔ اگر صحابہ کرامؓ کے اس فہم میں غلطی ہوتی تو وحی سے اس کی اصلاح کی جاتی۔

چھٹی دلیل: مسلمانوں کے درمیان تکافل کی فرضیت

قرآن و سنت نے مسلمانوں کے مابین باہمی کفالت اور تعاون فرض قرار دیا ہے اور مساکین کو کھانا کھلانا واجب

۱۔ ایضاً۔ البیہقی، ج ۴، ص ۱۸۳/۱۸۴۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ایضاً۔

کیا ہے اور ان اعمال کو ایمان اور اسلام کا مقتضا قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرمایا کہ

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ : ۲)

اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور زیادتی پر۔

فرمایا

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح : ۲۹)

نرم دل ہیں آپس میں۔

فرمایا

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ (البلد : ۱۱ تا ۱۸)

سو نہ ہمک سکا گھاٹی پر اور تو کیا بوجھا کیا ہے وہ گھاٹی۔ چھڑانا گردن کا، یا کھلانا بھوک کے دن میں بن باپ کے لڑکے کو جو ناتے دار ہے۔ یا محتاج کو جو خاک میں رُلتا ہے۔ پھر ہُوا ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں سہارنے کا اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کا۔ وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے۔

فرمایا

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (الاسراء : ۲۶)

اور دے ناتے والوں کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو۔

مزید فرمایا

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (النساء: ۳۶)

اور ماں باپ سے نیکی اور قرابت والے سے اور یتیموں سے اور فقیروں سے اور ہمسایہ قریب سے اور ہمسایہ اجنبی سے اور برابر کے رفیق سے اور راہ کے مسافر سے اور اپنے ہاتھ کے مال سے۔

ہم اس سے قبل ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات اطعام مسکین کی تاکید کرتی ہیں اور اس کو ایمان کی علامت قرار دیتی ہیں اور اطعام مسکین کے ترک کو لوازم کفر اور آخرت کی تکذیب قرار دیتی ہیں، مثلاً اللہ سبحانہ کا یہ فرمان۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (الماعون: ۱-۳)

تُو نے دیکھا؟ وہ جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونا۔ سو وہی ہے جو دھکیلتا ہے یتیم کو۔ اور نہیں تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر۔

مجرمین کے جہنم میں جانے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان ہُوا۔

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ

(المدثر: ۴۳، ۴۴)

وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے۔ اور نہ تھے کھلاتے محتاج کو۔

اس شخص کے بارے میں جسے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا اور وہ عذاب جہنم میں جلے گا یہ فرمایا۔

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝

(الحاقہ: ۳۳، ۳۴)

وہ تھا یقین نہ لاتا اللہ پر جو سب سے بڑا۔ اور تاکید نہ کرتا فقیر کے کھانے پر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرہ کی حقیقی صورت بیان کی ہے اور اس کے تکافل باہمی ارتباط اور تعلق باہمی کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے کہ

"مؤمن دوسرے مؤمن کے لیے اساس کی طرح ہے جو ایک دوسرے کی مضبوطی کا باعث ہوتا ہے" (بخاری و مسلم)

یعنی مسلم معاشرے کے افراد علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں کہ ہر ایک جدا زندگی گزار رہا ہو بلکہ سب باہم مربوط ہیں اور باہمدگر ان کی محبت و عطف اور اخوت کی مثال ایسی ہے جیسے جسدِ واحد کہ اس کے کسی بھی حصہ میں تکلیف ہو، سارا جسم تکلیف اور درد سے پکار اٹھتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اتحاد و یگانگت کی اس سے زیادہ بلیغ تعبیر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جسم کے تمام اعضاء ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور جسم کے ایک حصہ میں تکلیف سے سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے اسی لیے ارشاد فرمایا کہ

"وہ شخص مؤمن نہیں ہے جو پیٹ بھرے ہوئے رات گزارے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو" (طبرانی، بیہقی)

حضرت علیؓ بن ابی طالب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"اللہ نے مسلمان اغنیاء کے مال پر اتنا حصہ (دینا) فرض کیا ہے جو ان کے فقراء کو کافی ہو سکے اور فقراء کے بھوکے ننگے ہونے کی جفاکشی ان کے ساتھ اغنیاء کے سلوک ہی کی وجہ سے ہے اور اللہ اغنیاء سے شدید حساب کرے گا اور دردناک عذاب دے گا"[1]

---

[1] المنذری الترغیب میں فرماتے ہیں کہ طبرانی نے اس حدیث کو الاوسط اور الصغیر میں روایت کیا ہے اور طبرانی نے کہا ہے کہ اس روایت میں ثابت بن محمد الزاہد منفرد ہے، المنذری کہتے ہیں کہ ثابت صدوق ہے اس سے بخاری وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے اور اس حدیث کے باقی راوی لا باس بہم ہیں، مزید یہ کہ یہ حدیث حضرت علیؓ پر موقوف بھی مروی ہے جو کہ زیادہ موزوں (اشبہ) ہے (الترغیب ج ۱، الزکوٰۃ) ابن حزمؒ نے المحلی میں سعید بن منصور کی روایت سے اس حدیث کو حضرت علیؓ پر موقوف روایت کیا ہے۔ (ج ۶، ص ۱۵۸)

ابن حزمؒ کی جانب سے اس مسلک کا دفاع

علامہ ابن حزمؒ نے اس مسلک کا بہت خوب دفاع کیا ہے اور قرآن وسنت اقوال صحابہ اور تابعین سے عمدہ دلائل فراہم کیے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں[1] کہ اللہ سبحانہ نے ہر مقام کے اغنیاء پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے فقراء کی کفالت کریں حتی کہ اقتدار وقت (سلطان) بھی انھیں اس پر مجبور کرے گا یعنی اگر زکوٰۃ اور فئے وغیرہ فقراء کے لیے کافی نہ ہوسکیں تو ہر جگہ کے اغنیاء فقراء کو غذا، سردی گرمی کا لباس اور موسم کی سختی سے بچانے والی رہائش فراہم کریں گے۔

دلیل قرآنی

قرآن کریم سے اس کی دلیل یہ آیت ہے۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ۔

(الاسراء : ۲۶)

اور دے ناتے والوں کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو۔

اور یہ آیت

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء : ۳۶)

اور ماں باپ سے نیکی اور قرابت والے سے اور یتیموں سے اور فقیروں سے اور ہمسایہ قریب سے اور ہمسایہ اجنبی سے اور برابر کے رفیق سے اور راہ کے مسافر سے اور اپنے ہاتھ کے مال سے۔

غرض اللہ سبحانہ نے مساکین اور مسافروں کے حقوق رشتہ داروں کے حقوق

---

[1] المحلی : ج ۶، ص ۱۵۶، ۱۵۹۔

کے ساتھ فرض فرماتے ہیں اور جہاں ماں باپ سے حسن سلوک فرض فرمایا وہاں رشتہ داروں، مساکین اور پڑوسیوں سے حسن سلوک کی تاکید فرماتی اور ان سے بُرے سلوک سے منع فرمایا اور اطعام مسکین کو نماز کے ساتھ بیان فرمایا۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ (المدثر : ۴۲، ۴۴)

تم کاہے سے پڑے دوزخ میں وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے اور نہ تھے کھلاتے محتاج کو۔

دلیل سُنّت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا"۔[۱]

جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد مال موجود ہو اور وہ اپنے مسلمان بھائی کو بھوکا ننگا اور بے کس دیکھ کر اس کی مدد نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس نے اس پر رحم نہیں کیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ

"اصحاب صفہ فقراء تھے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس دو افراد کا کھانا ہو وہ تیسرے کو لے جائے اور جس کے پاس چار کا کھانا ہو وہ پانچویں یا چھٹے کو لے جائے"۔[۲]

---

[۱] احمد، بخاری، مسلم، ترمذی نے جریر بن عبداللہ سے اور احمد اور ترمذی نے ابوسعید سے روایت کیا ہے۔ بہر حال یہ مفہوم مختلف الفاظ اور متعدد طریقوں سے جو تواتر کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں مروی ہیں (المناوی: التیسیر ج ۲، ص ۷۴۴)

[۲] احمد، ج ۱، ص ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹۔ بخاری نے اس حدیث کو اپنی صحیح کی المواقیت اور المناقب میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر خود ظلم کرتا ہے اور نہ اُسے ظالم کے سپرد کرتا ہے"۔ ؎۱

ظاہر ہے کہ مسلمان بھائی کو بھوکا ننگا چھوڑ دینا اس کے اس پر ظلم ہونے دینا ہے اور اسے رسوائی کے سپرد کر دینا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"جس کے پاس سواری زائد ہو وہ اس پر اس کو سوار کرا دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس زادِ راہ زائد ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو ـــ اسی طرح آپؐ نے مال کی دیگر اصناف ذکر فرمائیں یہاں تک کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کا اس کے زائد مال میں کوئی حق نہیں ہے"۔ ؎۲

درحقیقت حضرت ابو سعید خدریؓ نے اس موضوع پر اجماع صحابہ نقل کیا ہے۔

حضرت ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور قیدی کو آزاد کراؤ"۔ ؎۳

بہرحال اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات اور متعدد صحیح احادیث موجود ہیں۔

آثار

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ

؎۱ مسند احمد، ج ۲، ص ۹۱ - ج ۴، ص ۱۰۴۔ بخاری، المظالم، الاکراہ۔ مسلم، البر۔ ابوداؤد، الادب، الترمذی، صفۃ القیامہ از ابن عمرؓ۔

؎۲ مسلم، نکاح، لقطہ، ابوداؤد، الزکوٰۃ، مسند احمد، ج ۳، ص ۳۴۔

؎۳ بخاری ـــ یہ الفاظ بھی ہیں کہ مریض کی عیادت کرو۔

"جو معاملہ بعد میں سامنے آیا ہے اگر وہ پہلے آتا تو میں اغنیاء کے فضول اموال لے لیتا اور ان کو فقراء مہاجرین پر تقسیم کر دیتا ہے"[1]

حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا کہ

"اللہ سبحانہ نے اغنیاء کے مال پر اتنا فرض کیا ہے جو فقراء کو کافی ہو سکے اگر وہ بھوکے ننگے اور جفاکشی میں ہوں گے تو اس وجہ سے ہوں گے کہ امراء نے انھیں ان کا حق نہیں دیا اور اللہ روز قیامت ان کا حساب کرے گا اور انھیں عذاب دے گا"

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ فرمایا کہ

"مال میں علاوہ زکوٰۃ کے بھی حق ہے"

حضرت عائشہؓ، حسن بن علیؓ اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ان صحابہ نے ارشاد فرمایا کہ

"اگر کوئی شخص کسی مقتول کے لیے یا ادائے قرض کے لیے یا فقر کی وجہ سے مانگے تو اسے دینا واجب ہے"

صحیح روایت میں ہے کہ حضرت ابوعبیدہ اور تین سو صحابہ کرام کا (کسی غزوہ میں) زادِ راہ ختم ہو گیا تو آپ نے جس کے پاس جو کچھ تھا سب یکجا جمع کر لیا اور سب کو برابر کھانے کے لیے تقسیم فرماتے رہے۔

یہ اجماع قطعی ہے اور اس کا کوئی مخالف نہیں ہے۔

شعبی مجاہد اور طاؤس وغیرہ سے صحیح روایت ہے کہ ان سب نے فرمایا کہ

"مال میں علاوہ زکوٰۃ کے حق ہے"

مخالفین کے اقوال پر ابن حزمؒ کی تنقید

ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ ماسوا ضحاک بن مزاحم کے کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہے، ضحاک نے فرمایا ہے کہ حکم زکوٰۃ سے ہر حق منسوخ ہو گیا ہے مگر اصل بات یہ

---

[1] ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند بے حد صحیح اور بلند ہے۔

ہے کہ ضحاک کی توروایت بھی حجت نہیں ہے تو ان کا قول کیسے دلیل بن سکتا ہے؟[۱]

مزید برآں یہ کہ جو حضرات ضحاک کے اس قول کو دلیل قرار دیتے ہیں خود ان کا مسلک اس قول کے برخلاف ہے کہ ان کے نزدیک بھی مال پر علاوہ زکوٰۃ کے بہت سے حقوق عائد ہیں، مثلاً محتاج ماں باپ پر خرچ کرنا، بیوی کا نفقہ، غلام پر خرچ کرنا، (پالتو) جانوروں پر خرچ کرنا، اور (ادائے) قرض و دیت پر صرف کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ ان فقہا کی رائے متناقض ہے۔ چنانچہ انہی فقہا کا یہ قول بھی ہے کہ اگر کوئی شخص پیاسا ہو اور اس سے جان کا خطرہ ہو جائے تو وہ جہاں سے اسے پانی ملے لے سکتا ہے اور اس کے لیے قتال بھی کر سکتا ہے۔

ان فقہائے کے نزدیک اس میں کیا فرق ہے کہ پیاسا اپنی جان کی مدافعت کرے اور اس کے لیے قتال بھی کرے لیکن بھوکا ننگا اپنی جان کی مدافعت نہ کرے ــــــ بلاشبہ یہ بات قرآن و سُنت، قیاس اور اجماع کے خلاف ہے۔

کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ حالت اضطرار میں میتہ یا خنزیر کھائے درآنحالیکہ کسی مسلمان یا ذمی کے پاس زائد از ضرورت طعام موجود ہو کہ اس صاحب طعام پر بھوکے کو کھلانا فرض ہے اور اس صورت میں وہ مضطر، مضطر نہیں رہتا۔ اور اس کے لیے وہ قتال بھی کر سکتا ہے اگر خود مارا گیا تو صاحب طعام پر قصاص لازم ہو گا اور اگر اس نے صاحب طعام کو مار ڈالا تو قصاص نہیں ہے، کیونکہ اس نے کھانے سے روکا اور اس

۱۔ ضحاک کو یحییٰ بن سعید کے علاوہ کسی نے ضعیف نہیں کہا ہے بلکہ احمد، ابن معین، ابوزرعہ، عجلی اور دارقطنی نے ثقہ کہا ہے اور ابن حبان نے اسے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ حافظ نے التقریب میں کہا ہے کہ ثقہ ہے اور مرسل زیادہ ہیں (میزان الاعتدال، ج ۲، ص ۳۲۵، ۳۲۶۔ تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۴۵۳، ۴۵۴۔) مزید یہ کہ ضعف روایت سے ضعف رائے لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ ابن حزمؒ نے دعویٰ کیا ہے کیونکہ محدثین کے نزدیک ابن ابی لیلیٰ ضعیف ہیں مگر وہ فقہ میں امام ہیں۔

عمل سے طائفہ بغیہ کے حکم میں آگیا۔

فَإِنۢ بَغَتۡ إِحۡدَىٰهُمَا عَلَى ٱلۡأُخۡرَىٰ فَقَٰتِلُواْ ٱلَّتِي تَبۡغِي حَتَّىٰ تَفِيٓءَ إِلَىٰٓ أَمۡرِ ٱللَّهِۚ (الحجرات : ۹)

پھر اگر چڑھا جاوے ایک ان میں سے دوسرے پر تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے جب تک پھر آوے اللہ کے حکم پر۔

حق سے روکنے والا اس شخص پر بغاوت کرنے والا ہے جس کا حق ہے اور اسی اصول کی بنا پر حضرت ابوبکر رضؓ نے مانعینِ زکوٰہ سے قتال کیا۔[1]

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۱۵۹۔

علامہ ابن حزمؒ کے اس کلام پر شیخ احمد شاکر نے بڑی عمدہ بات کہی ہے جس کو اگر ہم یہاں درج کردیں تو مناسب ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ کے احکام عدل و انصاف اور عقل و حکمت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ہمارے جو مسلمان بھائی مغربی قوانین اور تہذیب کے سحر میں گرفتار ہیں وہ اسلامی شریعت کے ان احکام کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو انھیں معلوم ہو جائے کہ اسلامی نظام دنیا کا ارفع ترین نظامِ حیات ہے، جس میں جسم اور روح دونوں کی مکمل رعایت موجود ہے اور ہر زمان اور ہر مکان کے لیے موزوں ہے۔ اگر مسلمان قرآن و سنت کے احکام پر عمل کریں اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں مکمل اسلامی نظام جاری کرلیں تو وہ ایک مرتبہ پھر عالمی قیادت کے منصب پر سرفراز ہو جائیں، غور فرمائیے دنیا کے اکثر تباہ کن انقلابات اسی وجہ سے آئے ہیں کہ مالداروں نے ناداروں پر ظلم کیا اور اغنیا ... دنیا کی خیرات خود سمیٹ کر بیٹھ گئے اور ان کے پڑوس میں بھوک کے دم توڑتے رہے۔ ... اسلام یہ نکتہ بتاتا ہے کہ اغنیا کے مال کا تحفظ ہی اس میں ہے کہ وہ ناداروں سے حسنِ سلوک کرتے رہیں اور اللہ نے ان کے جو حقوق ان پر عائد کیے ہیں وہ ادا کرتے رہیں۔

تیسری فصل

ان اقوال کے درمیان ترجیح

فریقین کے اقوال میں محل اختلاف

ہم نے فریقین کی جو آراء اور ان کے دلائل پیش کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ محل اختلاف زیادہ وسیع نہیں ہے بلکہ ہر دو فریق کے مابین مقاماتِ اتفاق بھی ہیں۔

ا) والدین اگر ضرورتمند ہوں اور اولاد کے پاس فراخی ہو تو اولاد پر والدین کا نفقہ واجب ہے۔

ب) اصولاً رشتہ دار کے حق میں بھی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس قدر اختلاف ہے کہ کس درجے کی قرابت نفقہ لازم کرتی ہے۔

ج) مضطر (مجبور) کو غذا، کپڑا اور ٹھکانا دینے میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ الجصاص احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ بلا شبہ زکوٰۃ فرض ہے مگر زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ ایسے مواقع جہاں دینا فرض ہے مثلاً جائع مضطر (بھوکے مضطر) کو، برہنہ شخص کو اور ایسی میت کے لیے جس کے تکفین اور تدفین کا کوئی انتظام نہ ہو[1] اور اسی کے مثل وہ شخص ہے جو عاریتاً الماعون یعنی کلہاڑی، ڈول اور گھریلو اشیا لینے پر مجبور ہو کہ مسلمان کی تکلیف دور کرنا بالاجماع فرض کفایہ ہے۔

د) مسلمانوں پر نازل ہونے والے عام مصائب کا دور کرنا بھی فرض ہے، مثلاً دشمن کا خطرہ دور کرنا، مسلمان قیدیوں کو کافروں کی قید سے چھڑانا اور قحط اور افلاس

---

[1] احکام القرآن، ج ۳، ص ۱۳۱۔

کا مقابلہ کرنا۔ اس بارے میں کسی فقیہ کا اختلاف نہیں ہے کہ فرد کے حق پر اجتماع کا حق مقدم ہے، اور بالاجماع ان عام مصائب کو مسلمانوں سے دور کرنا واجب ہے۔

الرملی شرح المنہاج میں فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کی مضرت کو دور کرنا فرض کفایہ ہے یعنی اگر بھوکے ننگے کی ضرورت زکوٰۃ سے اور بیت المال سے پوری نہ ہو سکے تو غنی مسلمان پر اپنے لواحقین کی ضروریات پورا کرنے کے بعد ان کے لباس و غذا کا انتظام فرض ہے اور اس میں بھی زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ محض دفع مضرت ہی نہ ہو بلکہ اہل ضرورت کو بقدر کفایت دیا جائے یعنی گرمی سردی کے لحاظ سے موزوں لباس ہو اور غذا اور لباس کے ساتھ اس کے لوازم بھی ہوں یعنی اُجرتِ طبیب، دوا کی قیمت اور ضروری خدمت [1]

نیز ہم زکوٰۃ کے فی سبیل اللہ کے مصرف میں امام نوویؒ اور فقہائے شافعیہ کی یہ رائے ذکر کر چکے ہیں کہ اگر باقاعدہ لشکروں کی کفالت بیت المال سے نہ ہو سکے تو اغنیاء پر علاوہ زکوٰۃ کے بھی ان کی کفالت لازم اور فرض ہے۔

ابوبکر بن العربی احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ اگرچہ مال پر ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے لیکن اگر زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد کوئی ضرورت پیش آجائے تو بالاتفاق اس ضرورت کے پورا کرنے کے لیے صرف کرنا لازم ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تمام مسلمان قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ دینا واجب ہے خواہ اس میں مسلمان اغنیاء کا سارا مال کھپ جائے،

اسی طرح اگر والی زکوٰۃ ضرورتمندوں پر تقسیم نہ کرے تو بھی اغنیاء پر لازم ہے کہ وہ علاوہ زکوٰۃ کے فقراء کو مستغنی کریں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا فرض ہے [2]

القرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

---

[1] نہایۃ المحتاج، ج ۷، ص ۱۹۴۔

[2] احکام القرآن، ص ۵۹، ۶۰۔

فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر زکوٰۃ کی وصولیابی کے بعد مسلمانوں کی کوئی ضرورت پیش آجائے تو اس ضرورت کے پورا کرنے کے لیے مال خرچ کرنا ضروری ہے۔ اور امام مالکؒ کا قول ہے کہ مسلمانوں پر اپنے قیدیوں کا رہا کرانا واجب ہے اگرچہ تمام مال بھی صرف کرنا پڑے۔ اور اس پر اجماع ہے نیز اس سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے[1]۔

الشاطبی اپنی تصنیف الاعتصام میں فرماتے ہیں کہ

اگر بیت المال خالی ہو جائے اور اہل لشکر کی ضروریات باقی ہوں تو امام (حکومت) بتقاضائے انصاف اغنیاء پر بقدر ضرورت ٹیکس لگا سکتا ہے تا آنکہ بیت المال میں کسی مد سے سرمایہ آجائے[2]۔

ان اقوال کے پیش نظر ان فقہاء کی رائے کا جو یہ کہتے ہیں کہ مال میں ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے یہ مطلب ہوا کہ ان کے نزدیک بھی امراء اور حکمرانوں کے وہ ظالمانہ ٹیکس درست نہیں ہیں جو حکمران محض اپنی وسعت کے لیے لگاتے ہیں اور جن سے عامۃ المسلمین تنگ ہوتے ہیں، گویا ان فقہاء نے اس خطرے کے پیش نظر یہ رائے اختیار کی ہے کہ کہیں حکمراں اس کو ناحق ٹیکس لگانے کا ذریعہ نہ بنالیں، اس لیے انھوں نے حکمرانوں کے اس ظالمانہ رویہ کے سدباب کے لیے فرمایا کہ

"مال میں ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے"[3]

بہرحال ہر دو آراء کے حامل فقہاء کے مابین بعض امور میں حقیقی اختلاف رائے بھی موجود ہے۔

ا) فصل اور پھلوں کی کٹائی کا حق (حق الحصاد)۔

ب) مویشی (اونٹ، بیل اور گھوڑوں) کے حقوق۔

---

[1] تفسیر القرطبی، ج ۲، ص ۲۲۳۔

[2] الاعتصام، ص ۱۰۳۔

[3] "زکوٰۃ اور ٹیکس" کے بیان میں مزید تفصیل آئے گی۔

ج) حق ضیافت ۔

د) حق الماعون (روزمرہ کی ضروریات عاریتاً لینے کا حق)

یہ تمام مذکورہ حقوق ان فقہاء کے نزدیک جو فرماتے ہیں کہ مال میں ماسوا زکوٰۃ کے بھی حق ہے۔ فرض ہیں اور جو مسلمان ان کے پورا کرنے میں کوتاہی کرے گا وہ گنہگار ہوگا اور اللہ سبحانہٗ کے یہاں سزا کا مستحق ہوگا۔ جبکہ دوسرے فقہاء کے نزدیک یہ حقوق مستحب ہیں جو ان کو پورا کرے گا ثواب کا مستحق ہوگا اور جو کوتاہی کرے گا اس پر کوئی گناہ نہیں ہے الاّ یہ کہ ضرورت موجود ہو تو یہ واجب ہو جائیں گے جیسا کہ الجصاص نے ڈول، کلہاڑی، ہانڈی وغیرہ کے عاریتاً دینے کے بارے میں کہا ہے[1] کہ ان اشیاء کا بوقت ضرورت عاریتاً واجب ہے اور نہ دینے والا مستحق مذمت ہے اور اس کا یہ رویہ مسلمانوں کے اخلاق سے ہم آہنگ نہیں ہے درانحالیکہ فرمانِ نبوتؐ ہے کہ

"میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں"۔[2]

ھ) ان جزئی حقوق میں سب سے زیادہ اہم حق فقراء کا ہے جو ان فقہاء کے نزدیک جن کی رائے یہ ہے کہ مال میں علاوہ زکوٰۃ کے بھی حق ہے اغنیاء کے مال پر واجب ہے اور ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے علاقے کے فقراء کے لباس، طعام اور مسکن کی ضروریات پوری کریں اور حکومت ان کو اس امر پر مجبور کرے یعنی جبکہ زکوٰۃ اور موارد ریاست فقراء کی ضروریات پوری کرنے میں ناکافی ثابت ہوں۔

موازنہ و ترجیح

۱) پھلوں اور فصلوں کی کٹائی کے وقت کے حق (حصاد) کے بارے میں ہم نے

---

[1] الجصاص: احکام القرآن، ج ۳، ص ۵۸۴۔

[2] البخاری: ادب المفرد، ابن سعد: الطبقات، الحاکم: المستدرک، البیہقی: الشعب، از ابوہریرہؓ بسند صحیح، (التیسیر ج ۱، ص ۳۶۲)۔

فصلوں اور پھلوں پر زکوٰۃ کے بیان میں کہا ہے کہ حق حَصَاد سے مراد عُشر اور نصف عُشر ہے، جیسا کہ سلف کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے اور اس آیت کا مکی ہونا اس امر میں مانع نہیں ہے کیونکہ اس کی توضیح یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مکہ مکرمہ میں (عُشر کا) اجمالی حکم دیا اور مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفصیل بیان فرمائی، یعنی آیت حَصَاد مجمل تھی سُنّت نے اس کی تفصیل بیان کی اور اس کی وضاحت بیان کی اور سلف کے نزدیک نسخ کے یہی معنی ہیں۔

۲) حق ضیافت کے بارے میں احادیث سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس سے مراد وہ مہمان ہے جو ایک شہر سے دوسرے شہر جائے گویا وہ ابن السبیل (مسافر) کے مترادف ہے اسی لیے حضرت ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ ابن السبیل ہی ضیف ہے[۱] اور احادیث میں وضاحت ہے کہ یہ حق ضیافت یہ ہے کہ جب مہمان (یا ابن السبیل) آئے تو اس کی مہمان نوازی کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مہمان نوازی زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔

۳) حق ماعون واجب ہے کیونکہ اگر واجب نہ ہوتا تو اس کے نہ دینے والے کے بارے میں قرآن میں وعید بیان نہ ہوتی اور جن فقہاء نے کہا ہے کہ الماعون زکوٰۃ ہے انھوں نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ الماعون کی تفسیر گھریلو اشیاء اور دیگر ضروریات کے عاریتاً دینے سے نہیں ہو سکتی

۴) اغنیاء کے مال میں فقراء کا حق ہونا اور ان کی ضروریات لباس وطعام کے پورا کرنے کا واجب ہونا متعدد قرآنی آیات اور احادیث سے ظاہر ہے۔ لیکن فقہاء نے بیشتر مواقع پر آیت بِرّ (لَيْسَ الْبِرَّ) کو محل استدلال میں پیش کیا ہے۔ اور اس حدیث کو ذکر کیا ہے کہ ــــــ "مال میں ماسوا زکوٰۃ کے بھی حق ہے"؛ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے آیت بِرّ اور اس حدیث کو ایک واضح اصول کے طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۰۸۔ تفسیر آیۃ البِرّ

جہاں تک اس سے متعلق دلائل کا تعلق ہے تو وہ روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہیں کہ اسلامی نظام کی طبیعت کا مقتضا بھی یہی ہے اور قرآن سُنّت سے بھی یہی ہویدا ہے کہ تکافل اجتماعی ایک فریضہ لازمہ ہے اور باہمی تعاون اور مساوات لازمی ہے۔ یعنی یہ کہ ہر قوی کمزور کا بوجھ اٹھائے اور ہر غنی فقیر کی دست گیری کرے، ہر رشتہ دار اپنے عزیز قریب کی دیکھ بھال کرے، پڑوسی اپنے پڑوسی سے حسن سلوک کرے ـــــ جو شخص ان حقوق و واجبات کو ادا نہیں کرتا اس کا نہ تو اسلام سے کوئی تعلق ہے اور نہ سُنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا کوئی حصّہ ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے بری ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنو تمیم کا ایک شخص آیا اور عرض کی کہ میرے پاس بہت مال ہے اور اہلِ خانہ اور متعلقین ہیں، مَیں کس طرح خرچ کروں، آپؐ نے فرمایا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو وہ تمہیں پاک کر دے گی، رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرو اور سائل پڑوسی اور مسکین کا حق ادا کرو[1]

اس حدیث میں آپؐ نے زکوٰۃ کے بعد سائل، پڑوسی اور مسکین کا حق رکھا اور اقارب سے صلہ رحمی کا زکوٰۃ پر عطف فرمایا، خود قرآن میں آیا ہے کہ

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ (الاسراء: ۲۶)

اور دے ناتے والوں کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو

اور ایک اور حدیث میں ہے کہ مانگنے والے کا بہرحال حق ہے خواہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر آئے[2]

---

[1] احمد نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں (الترغیب و الترہیب، ج ۱، ص ۲۶۳۔) ابو عبید اور ابن المنذر نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (الدر المنثور، ج ۱، ص ۲۹۔)

[2] احمد نے مسند الحسین بن علی میں اور ابو داؤد نے کتاب الزکوٰۃ ـــــ باب حق السائل ـــــ میں روایت کیا ہے حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے اور رجال ثقہ ہیں، (السیوطی: اللآلی ج ۲، ص ۱۴۰) شیخ احمد شاکر نے اپنی تعلیق مسند میں (ج ۳، ص ۱۷۳) اسے صحیح کہا ہے۔

اُن احادیث کی توجیہ جن سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ مال میں سوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان احادیث کی کیا توجیہ کی جائے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس نے زکوٰۃ ادا کر دی اس پر کوئی حق لازم نہیں رہا اور مال میں ماسوا زکوٰۃ کے اور کوئی حق نہیں ہے؟!

حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ مال کا ایک دوامی محدود اور لازمی حق ہے جو ہر صاحب نصاب پر ہمیشہ لازم رہتا ہے تاکہ نعمتِ الٰہی کا شکر ادا ہو جان و مال کا تزکیہ ہو اگرچہ کوئی مستحق اور فقیر موجود نہ ہو، یعنی صاحبِ نصاب مسلمان شخص سے عام حالات میں ماسوا زکوٰۃ بطور فرض کوئی مطالبہ نہیں ہے، اس نے زکوٰۃ ادا کر کے اپنے مال کا شر دور کر دیا ہے، اب اگر وہ کچھ دینا چاہے تو وہ نفلی ہے اور تطوّع ہے جبکہ دیگر حقوق وقتی طور پر عائد ہونے والے حقوق ہیں اور ان کا وجوب زکوٰۃ کے وجوب کی طرح نہیں ہے اور نہ ان کی مقدار زکوٰۃ کی مقدار کی طرح متعین و مقرر ہے بلکہ ان میں بلحاظ احوال وضروریات فرق ہو سکتا ہے اور حالات وزمانے کے اعتبار سے ان کی مقداریں تبدیل ہو سکتی ہیں مزید یہ کہ یہ حقوق اشخاص پر فرض نہیں ہیں بلکہ فرض علی الکفایہ ہیں، یعنی اگر کچھ افراد ان حقوق کو ادا کر دیں تو سب کی جانب سے ادا ہو جائیں گے۔ کبھی یہ حقوق متعین بھی ہو جاتے ہیں مثلاً کوئی شخص کسی مضطر کو دیکھے تو اس پر اس کی ضرورت پورا کرنا لازم ہے، یا کسی شخص کا کوئی بھوکا ننگا پڑوسی ہو تو اس پر اس کی مدد فرض ہے۔

یہ حقوق افراد کے ایمان اور ان کے ضمیر پر موقوف ہیں اور ریاست کا اصولاً دخل نہیں ہے لیکن بہت سے حاجتمند افراد موجود ہوں اور ان کے لیے وسائل دولت ناکافی ہوں تو ریاست بذریعہ قانون ان پر لازمی ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔

ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کی کہ —— مال میں زکوٰۃ کے سوا کوئی حق نہیں ہے —— یہ تعبیر کی ہے کہ مال میں بسبب مال زکوٰۃ کے سوا کوئی حق نہیں ہے البتہ مال کے سبب کے علاوہ دیگر اسباب کی بنا پر مال پر واجبات عائد ہوتے ہیں، مثلاً رشتہ داروں اور بیوی کا نفقہ اور غلام اور (پالتو) جانوروں کے اخراجات، اور دیت

عاقلہ، اور قضائے دَین (قرض کی ادائیگی) اور اسی طرح مصائب کے وقت دینا فرض ہے اور بھوکے کو کھلانا اور ننگے کو پہنانا فرض کفایہ ہے، اس کے علاوہ بھی دیگر مالی واجبات ہیں جو کسی عارضی سبب کی وجہ سے واجب ہوتے ہیں لیکن مال ان کے وجوب کی شرط ہوتا ہے جیسے حج کہ سبب وجوب تو خود انسانی وجود ہے لیکن مال شرط وجوب ہے جبکہ زکوٰۃ میں مال ہی سبب ہے اور مال ہی کے ساتھ زکوٰۃ فرض ہے یہاں تک کہ اگر مستحق زکوٰۃ موجود نہ ہو تو دوسرے مقام پر زکوٰۃ بھیجے کیونکہ یہ حق اللہ ہے [1]

---

[1] کتاب الایمان الکبیر، ج ۷، ص ۳۱۶ (مجموع الفتاوی)

نواں باب

زکوٰۃ اور ٹیکس

۱) ٹیکس کی حقیقت اور زکوٰۃ کی حقیقت۔
۲) ٹیکس کے عائد کرنے اور زکوٰۃ کی فرضیت کا اساسی تصور۔
۳) ٹیکس کا ظرف اور زکوٰۃ کا ظرف۔
۴) ٹیکس اور زکوٰۃ کے اصول ہائے انصاف۔
۵) ٹیکس اور زکوٰۃ کے مابین تناسب اور ارتفاع۔
۶) ٹیکس کی ضمانتیں اور زکوٰۃ کی ضمانتیں۔
۷) کیا زکوٰۃ کے ساتھ دیگر ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں؟
۸) کیا موجودہ ٹیکس فریضۂ زکوٰۃ سے مستغنی کرتے ہیں؟

زکوٰۃ اور ٹیکس

اس باب میں ہم اسلام کے فریضہ زکوٰۃ کا جدید ترین نظام ٹیکس سے موازنہ کریں گے یعنی ٹیکس کا وہ نظام جس کی تاسیس بہترین عقول اور جدید ترین مالی نظام نے کی ہے۔ ہم زکوٰۃ کا موازنہ اس نظام ٹیکس سے نہیں کریں گے جو رومی عہد اور ایرانی دور میں موجود تھا اور جو قرون وسطیٰ کے یورپ میں جاری تھا بلکہ ہم زکوٰۃ کا موازنہ جدید ترین نظام ضرائب سے کریں گے جو بہت سے ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا اب اپنی ترقی یافتہ صورت میں موجود ہے اور جس میں مسلسل ترمیمات کے ذریعے حسن و عمدگی پیدا کی گئی ہے، جسے تجربات انسانی نے نکھار دیا ہے اور جسے عقل انسانی نے سنوار دیا ہے۔

ہم اس باب کی فصلوں میں زکوٰۃ اور ٹیکس کے امتیازات اور خصائص پر روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ان ہر دو میں کون سے امور امتیاز کے حامل ہیں اور کون سے پہلو باہم مشابہ ہیں اور یہ کہ زکوٰۃ ایک خصوصیت کا حامل ایک ایسا مالی فریضہ ہے جس کا اپنا جدا فلسفہ ہے اور جو اپنی طبیعت اور اساس کے لحاظ سے اپنے موارد اور مصادر کے اعتبار سے اور اپنے نصاب اور مقادیر (QUANTITIES) کے پہلو سے اور اپنے اہداف و مقاصد اور اپنی ضمانتوں کے اعتبار سے ہر ٹیکس سے ممتاز اور جدا ہے ہم بتائیں گے کہ "نظام زکوٰۃ" آج کے ترقی یافتہ نظام سے ہر پہلو سے بلند تر ہے اور فکر انسانی کی آج تک جس نظریہ مالیات تک رسائی ہوئی ہے اسلام کا نظام زکوٰۃ اس پر رفعت و تقدم رکھتا ہے اور ایسی لاتعداد خوبیوں کا حامل ہے جس سے آج کا ترقی یافتہ نظام ٹیکس تہی دامن ہے۔

●

اس باب میں آٹھ فصلیں ہیں

پہلی فصل: ٹیکس کی حقیقت اور زکوٰۃ کی حقیقت
دوسری فصل: ٹیکس کے لزوم اور فرضیت زکوٰۃ کا اساسی تصور
تیسری فصل: ٹیکس کا ظرف اور زکوٰۃ کا ظرف
چوتھی فصل: ٹیکس اور زکوٰۃ کے اصول ہائے انصاف
پانچویں فصل: ٹیکس کی ضمانتیں اور زکوٰۃ کی ضمانتیں
چھٹی فصل:
ساتویں فصل: زکوٰۃ کی موجودگی ٹیکس کا جواز
آٹھویں فصل: ٹیکس زکوٰۃ سے مستغنی نہیں کرتے۔

پہلی فصل

ٹیکس کی حقیقت اور زکوٰۃ کی حقیقت

ماہرین مالیات کے نزدیک حکومت کو ٹیکس کی ادائیگی بشرط قدرت مالداروں پر لازمی ہے، اس سے قطع نظر کہ ان ٹیکسوں کے بالعوض پبلک اداروں سے ٹیکس دہندہ کو کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں اور خود حکومت ان ٹیکسوں سے کس طرح پبلک اخراجات پورے کرتی ہے اور کس طرح اقتصادی اجتماعی اور سیاسی مقاصد پورے کرتی ہے۔[1]

جبکہ زکوٰۃ مسلمانوں کے مال میں اللہ کا مقرر کردہ حق ہے اور یہ حق فقراء، مساکین اور دیگر مستحقین کو ادا کیا جائے گا اور اس زکوٰۃ کا مقصود اللہ کی نعمت پر شکر ادا کرنا، ثواب حاصل کرنا اور مال وجان کا تزکیہ ہے۔

زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان موافقت کے پہلو

مندرجہ بالا تعریفات سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ اور ٹیکس کے مابین کچھ پہلو موافقت کے ہیں اور کچھ فرق کے۔ ہم ان میں سے پہلے موافقت کے پہلو بیان کرتے ہیں۔

ا) جبر اور لزوم کا عنصر جو ٹیکس میں موجود ہے اور جس کے بغیر ٹیکس کا وجود ہی متحقق نہیں ہوتا زکوٰۃ میں بھی موجود ہے کہ اگر مسلم اپنے جذبۂ ایمانی سے زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس سے جبراً لی جائے گی، اور نہ دینے والے اور انکار کرنے والے سے بذریعۂ طاقت لی جائے گی اور اگر نہ دینے والے خود طاقتور ہوں تو ان سے جنگ کی جائے گی۔

---

[1] الدکتور محمد فؤاد ابراہیم: مبادی علم المالیہ، ج ۱، ص ۲۶۱۔

ب) ٹیکس مقامی اداروں[1] اور حکومت کے اداروں اور با اختیار ہستیوں کو ادا کیا جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی دراصل اس نظام کے توسط سے جسے قرآن نے عاملین علیہا کہا ہے حکومت کو ہی دی جاتی ہے جیسا کہ ہم اپنے مقام پر اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

ج) ٹیکس دہندہ (TAX GIVER) کو اپنے ٹیکس کے بالمقابل کوئی منفعت حاصل نہیں ہوتی بلکہ ٹیکس دہندہ معاشرہ کا ایک فرد ہونے کی حیثیت میں ٹیکس دیتا ہے کیونکہ وہ اس معاشرے کے متعدد فوائد سے مستفید ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ دینے والا مسلم بھی کسی منفعت کے بالمقابل زکوٰۃ نہیں دیتا بلکہ وہ اس معاشرے میں رہنے کے عوض زکوٰۃ دیتا ہے جس کی حمایت کفالت اور اخوت سے وہ مستفید ہو رہا ہے، اس استفادہ کی بنا پر اس پر لازم ہوا کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی اعانت کرے اور فقر، عجز، اور مصائب حیات میں انھیں ضمانت فراہم کرے اور امت مسلمہ کی مصالح عامہ کے بروئے کار لانے، اور دعوت حق کے فروغ میں اپنی ذمے داریاں پوری کرے صرفِ نظر اس امر کے کہ ادائے زکوٰۃ سے خود اسے کیا فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

د) ٹیکس کے بھی موجودہ نظام میں کچھ اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی اہداف بیان کیے جاتے ہیں اسی طرح زکوٰۃ کے بھی اعلیٰ ترین اور وسیع ترین مقاصد ہیں جو ان مذکورہ پہلوؤں کو بھی مشتمل ہیں اور ان کے علاوہ انسان زندگی کے دیگر پہلوؤں کو بھی محیط ہیں، اور بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں[2]

زکوٰۃ اور ٹیکس کے مابین فرق کے پہلو متعدد پہلوؤں سے زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق ہے ہم چند اہم امور کا ذکر کرتے ہیں۔

---

[1] قرون وسطی کے یورپ میں مالکان زمین کسانوں سے ٹیکس لیا کرتے تھے۔

[2] اس کتاب میں "مقاصد زکوٰۃ" ملاحظہ کیجئے۔

۱- نام اور عنوان سب سے پہلا فرق زکوٰۃ اور ٹیکس کے مابین ان کے ناموں سے نمایاں ہے کہ زکوٰۃ کے معنی پاکی، نشوونما اور برکت کے ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے مال کے اس حصہ کو جو زکوٰۃ دہندہ فقراء کو دیتا ہے زکوٰۃ کہا ہے اور اس سے دہندہ کے نفس میں یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ اس کا یہ عمل سراسر خیر و برکت کا حامل، اس کے مال کو نشوونما دینے والا اور اس کو پاک کر دینے والا ہے۔

جبکہ ٹیکس (ضریبہ) کا لفظ محض جبر و الزام کا مفہوم ادا کرتا ہے یعنی یہ ایک تاوان ہے جو زبردستی اور بالجبر مالدار شخص پر لاد دیا گیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ لوگ ٹیکس کو ایک بے حد ناگوار بوجھ اور ان کے مال پر پڑ جانے والا ڈنڈ سمجھتے ہیں۔

زکوٰۃ کا لفظ اپنے پاکیزگی برکت اور نشوونما کے مفاہیم کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ صاحب مال جس مال کو اللہ کا حق ادا کیے بغیر کنز کرتا ہے وہ نجس و ناپاک رہتا ہے اور زکوٰۃ ہی ہے جو اس مال کو پاک کرتی ہے اور صاحب مال کو بخل اور حرص سے پاک کرتی ہے۔

زکوٰۃ کا لفظ بتلاتا ہے کہ جو مال بظاہر ادائے زکوٰۃ سے کم ہوتا نظر آتا ہے درحقیقت وہ نشوونما پا رہا ہے اور اس میں افزودگی ہو رہی ہے چنانچہ اللہ سبحانہ نے ارشاد فرمایا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (البقرہ: ۲۷۶)

مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات۔

اور فرمایا

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ (سباء: ۳۹)

اور جو خرچ کرتے ہو کچھ چیز وہ اس کا عوض دیتا ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا۔" (ترمذی)

زکوٰۃ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکی، نماء اور برکت صرف مال ہی میں نہیں ہوتی بلکہ خود زکوٰۃ دہندہ بھی پاکیزگی اور تزکیہ حاصل کرتا ہے اور زکوٰۃ وصول کرنے والے

کانفس بھی حسد سے اور نفرت سے پاک ہو جاتا ہے کہ اسے مالِ زکوٰۃ سے اپنی معیشت کو استوار کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت ہو جاتی ہے جبکہ زکوٰۃ دہندہ کو بخل و حرص سے نجات مل جاتی ہے اور اس کی جان و مال اور اولاد میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا۔

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا

(التوبہ : ۱۰۳)

لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ ان کو پاک کرے اس سے اور تربیت۔

۲- ماہیت وکیفیت ٹیکس محض ایک تمدنی پابندی ہے جبکہ زکوٰۃ عبادت، ذریعہ ثواب، شکر الٰہی اور فریضہ دینی ہے اسی لیے اس کی ادائیگی میں نیت شرط ہے کیونکہ نیت کے بغیر کوئی عبادت متحقق نہیں ہوتی، چنانچہ فرمایا کہ

"اعمال کا مدار نیتوں پر ہے"

اور حق سبحانہٗ کا فرمان ہے۔

وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ

(البینہ : ۵)

اور ان کو حکم یہی ہوا کہ عبادت کریں اللہ کی۔ نری کر اس کے واسطے بندگی۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری کتب فقہ میں زکوٰۃ کو عبادات کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے بیس سے زائد مقامات پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ بیان کیا ہے اور سنت میں لاتعداد مقامات پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کیونکہ زکوٰۃ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن اور عبادات چہارگانہ میں سے ایک عبادت ہے۔

چونکہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اس لیے صرف مسلمانوں ہی پر فرض ہے اور شریعت اسلامیہ کی سماحت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس مالی ذمے داری کو جو عبادت اور شعار دینی کی خصوصیت رکھتی ہے غیر مسلموں پر بھی لازم کیا جائے بخلاف ٹیکس کے کہ اس میں مذہب کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ صرف قدرت ادائیگی مدنظر ہوتی ہے۔

متعین کرتی ہے اور وہی وصول کرتی ہے اور اگر حکومت چاہے تو اس مقدار کو کم کر دے یا کسی خاص سبب سے اس کا کچھ حصہ معاف کر دے یا سرے سے کوئی ٹیکس یا تمام ٹیکس منسوخ کر دے۔ اور اگر حکومت ٹیکس میں چھوٹ دے دے یا ٹیکس دہندہ سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ نہ کرے تو اس پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ جبکہ زکوٰۃ ہر لحاظ سے خدا اور بندے کے درمیان ایک تعلق ہے کہ خدا ہی نے مال دیا ہے اسی نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے اور اسی نے اس کی مقداریں اور نصاب متعین کیے ہیں۔ اس لیے اگر اسلامی ریاست موجود نہ ہو اور وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین کو تقسیم نہ کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ از خود اپنی زکوٰۃ مستحقین کو پہنچائیں۔ جیسے اگر کوئی مسلمان ایسی جگہ ہو جہاں نہ مسجد ہو اور نہ امام ہو تو وہ خود اپنی نماز ادا کرے گا اور ہرگز نماز ترک نہیں کرے گا۔

اسی لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ بخوشی ادا کرے اور اللہ سے اس کی قبولیت کا خواستگار رہو، اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے جیسا کہ ٹیکس دہندگان ٹیکس سے بچنے کے طریقے ایجاد کرتے ہیں اور جبراً ہی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے ادائے زکوٰۃ ایک فریضۂ الٰہی ہے جسے وہ حصول ثواب اور رضائے حق کے لیے ادا کرتے ہیں۔

۷۔ اھداف و مقاصد زکوٰۃ کے روحانی اور اخلاقی فوائد اس قدر کثیر اور رفیع ہیں کہ نظام ٹیکس کی تو وہاں تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی جن کو ہم پہلے ہی "مقاصد زکوٰۃ" میں بیان کر چکے ہیں۔ ان میں سے سب سے عظیم مقصد اور سب سے رفیع ہدف وہی ہے جسے قرآن کریم نے مندرج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ

(التوبہ : ۱۰۳)

لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ ان کو پاک کرے اس سے اور تربیت اور دعا دے ان کو، البتہ تیری دعا ان کو آسودگی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر زکوٰۃ دہندہ کو دعا دیتے کہ اس کے مال اور اس کے نفس میں برکت ہو اور مستحب یہ ہے کہ ہر وصول کنندہ زکوٰۃ یہی دعا دے بلکہ بعض فقہائے نے اس دعا کو واجب کہا ہے کہ آیت لفظ امر پر مشتمل ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

ٹیکس اس قسم کے روحانی مقاصد اور اخلاقی اہداف سے یکسر خالی ہے، یہاں تک کہ ایک عرصے تک یہی تصور رہا کہ ٹیکس کا خزانۂ سرکار میں مال جمع کرنے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے لیکن اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی تغیرات سے یہ تصور ابھرا کہ ٹیکس کے بہر حال کچھ اقتصادی اور اجتماعی مقاصد بھی ہیں، مثلاً یہ کہ افراد معاشرہ کو خرچ کرنے یا پس انداز کرنے یا آسائشات پر کم خرچ کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ بہر حال ٹیکس کے یہ مادی فوائد ہیں اور تا ہنوز ماہرین مالیات ٹیکس کے ان مادی مقاصد سے بلند تر اخلاقی اور روحانی فوائد و اہداف دریافت نہیں کر سکے۔

۸۔ زکوٰۃ اور ٹیکس کا اساسی تصور

ٹیکس کا کوئی اساسی تصور موجود نہیں ہے بلکہ یہ متضاد قانونی اور نظریاتی بنیادوں پر قائم ہے، درانحالیکہ زکوٰۃ کی اساس واضح ہے جس کو ہم علیحدہ فصل میں بیان کریں گے۔

زکوٰۃ عبادت بھی ہے اور ٹیکس بھی ہے

زکوٰۃ چونکہ ایک مالی حق ہے جو ریاست وصول کرتی ہے اور اگر دہندگان بخوشی رضامندی سے نہ دیں تو ریاست جبراً لے سکتی ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی معاشرے کے مصالح پر صرف ہوتی ہے اس لحاظ سے زکوٰۃ ٹیکس ہے۔ مگر زکوٰۃ عبادت بھی ہے اور شعار اسلام بھی ہے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بھی ہے اور ایمان کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کی ادائیگی اطاعت اور صلاح (نیکی) ہے، اس کا نہ دینا فسق ہے اور اس کا انکار کفر ہے اور یہ حق دہندہ کی تاخیر سے، حکومت کے تساہل سے اور وقت گزرنے سے ساقط نہیں ہوتا۔

ہمارے فقہائے کرام نے بھی اس امر پر تنبہ کیا ہے کہ زکوٰۃ ٹیکس بھی ہے اور عبادت بھی، اگرچہ فقہائے نے ٹیکس کا لفظ استعمال نہیں کیا کہ یہ بعد کی اصطلاح ہے البتہ اس کے

مفہوم کو لفظ "حق" سے ادا کیا ہے کہ فقراء اور مساکین کا یہ حق اغنیاء کے مال میں واجب ہے[1] اور یہ کہ زکوٰۃ صلہ رحمی ہے۔

الروض النضیر کے مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ

"اللہ سبحانہ نے فقراء کے لیے مال اغنیاء میں زکوٰۃ فرض کی ہے تاکہ ان کا حق اخوت ادا ہو ان سے ہمدردی اور الفت کا اظہار ہو اور ان سے سلوک اور اعانت کا اللہ کا حکم پورا ہو، اور ان کے مالی حقوق ادا ہوں جس طرح کہ وہ جسمانی حقوق عبادات کے ذریعے ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ صلہ رحمی بھی ہے اور عبادت بھی ہے اور عبادت ہونے کے لحاظ سے نیت فرض ہے اور چونکہ صلہ رحمی ہے اس لیے اس میں نائب بنایا جا سکتا ہے اور نادہندہ پر جبر کیا جا سکتا ہے اور امام اگر جبراً وصول کرے تو دہندہ کی جانب سے نیت میں اس کا نائب ہوگا۔ نیز مرنے والے کے مال میں سے زکوٰۃ لی جائے گی اگرچہ اس نے وصیت نہ کی ہو اور چونکہ زکوٰۃ صلہ رحمی ہے اس میں فقراء کی زیادہ سودمند مصلحت کو مدنظر رکھا جائے گا اور بچہ کے مال پر بھی واجب ہوگی اور چونکہ مقصود مواسات ہے اس لیے قابل لحاظ مال پر فرض ہے اور اموال نامیہ یعنی نقود، مال تجارت، ارضی پیداوار اور مویشی پر فرض ہے۔ اور جس جنس سے مواسات ہو سکتی ہے اس میں نصاب بھی متعین کر دیا گیا ہے اور تعب اور محنت کے لحاظ سے مقدار کا تعین کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بارانی زمین کی پیداوار پر عشر ہے اور انسانی محنت سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار میں نصف عشر ہے"۔[2]

---

[1] بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۳۷۔

[2] الروض النضیر، ج ۲، ص ۳۸۹۔

دوسری فصل

لزوم ٹیکس اور فرضیت زکوٰۃ کا اساسی تصوّر

ماہرین مالیات نے ٹیکس کی کیفیت کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے اس کے بیان سے اور اس کی اس اساس کی توضیح سے جو اس کے لزوم میں قرآن کے پیشِ نظر ہے واضح ہوگا کہ زکوٰۃ ایک مستقل فلسفہ اور ایک مخصوص تصوّر کا حامل فریضۂ آلہٰی ہے۔

ٹیکس کے لزوم کی قانونی اساس

ٹیکس کے لزوم کی قانونی اساس کی تعبیر میں مفکرین اور ماہرین مالیات کا اختلاف ہے۔

تعاقدی تصوّر

اٹھارہویں صدی عیسوی کے فلاسفر اس امر کے قائل رہے ہیں کہ دراصل ٹیکس کے لزوم کی قانونی اساس فرد اور ریاست کا باہمی تعاقُد (معاملہ) ہے کہ مالدار ریاست کو ٹیکس دیتا ہے اور اس کے بدلے مرافقِ عامّہ PUBLIC FACILITIES حاصل کرتا ہے اور اس طرح ریاست اور شہریوں کے درمیان عقد اجتماعی منعقد ہوتا ہے چنانچہ جان جاک روسو نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اس عقد اجتماعی کی کیفیت کی تعبیر بھی مختلف الفاظ میں کی گئی ہے۔

میرابو کہتا ہے کہ یہ معاملہ بَیع (خرید و فروخت) کا معاملہ ہے اور اس میں ٹیکس فرد INDIVIDUAL کی فوری قیمت ہے جس کے بدلے وہ معاشرے کی حمایت حاصل کرتا ہے۔

آدم سمتھ (ADAM SMITH) کہتا ہے کہ یہ اُجرت پر کام کرانے کا معاملہ ہے کہ

ریاست شہریوں کی خدمات انجام دیتی ہے اور شہری اس کے بدلے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

مونٹیکو اور ہوبز اس کو معاملہ تامین INSURANCE قرار دیتے ہیں کہ مالدار جزء باقیماندہ پر اپنی قسط ٹیکس کی صورت میں ادا کرتا ہے۔

لیکن اہل نقد نے کہا ہے کہ ٹیکس میں اور ٹیکس دہندہ کو حاصل ہونے والے فوائد میں کوئی تناسب نہیں ہوتا کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر شہری کو امن عامہ، انصاف، تعلیم اور دفاع وطن کے جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں ان کی ہر ہر شہری کے لحاظ سے مقدار کا تناسب ہو سکے (کہ جو شہری جس قدر ٹیکس ادا کر رہا ہے اسی قدر اسے فوائد بھی حاصل ہو رہے ہیں) بالفرض اگر یہ ممکن بھی ہو تو بھی یہ ایک ظالمانہ تصور ہے کیونکہ فقراء (اہل احتیاج) مالدار طبقوں کی ریاستی اعانت کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں اور اس تبادلہ اور اجرت کے تصور کے تحت انھیں زیادہ ٹیکس ادا کرنے چاہئیں۔

تامین کے تصور میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ریاست کے فرائض امن SECURITY فراہم کرنے تک محدود ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ عقد تامین کا مطلب یہ ہوگا کہ ریاست نقصاروں کا عوض بھی دے حالانکہ ریاست ایسا نہیں کرتی۔

اقتدار ریاست کا تصور اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ٹیکس کا تعاقدی تصور درست نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی جگہ یہ دوسرا تصور پیش کیا گیا کہ دراصل ریاست اجتماعی ضروریات پوری کرتی ہے اور حکومت کے پیش نظر خاص افراد کی مصالح نہیں ہوتیں بلکہ عام مصالح اور قومی یکجہتی ہوتی ہے چونکہ ان خدمات کی انجام دہی کے لیے اخراجات کی ضرورت ہے اس لیے ریاست اپنے اقتدار کی مدد سے شہریوں پر یہ لازم کرتی ہے کہ وہ ان اخراجات میں اس کی مدد کریں اور اس بوجھ کو اٹھائیں بعد ازاں ریاست از خود ذمے داری کے اس بوجھ کو شہریوں کی مالی حالت کے اعتبار سے ان پر تقسیم کر دیتی ہے کہ اس سے اجتماعی یکجہتی کا وہ تقاضا بھی پورا ہو جاتا ہے جس کی اساس پر جدید سیاسی جمعیتیں قائم ہیں[1]

---

[1] الدکتور محمد حلمی مراد: میزانیۃ الدولۃ، ص ۷۳، ۷۵۔ مصر سنہ ۱۹۵۵ء

فرضیت زکوٰۃ کی اساس

فرضیت زکوٰۃ اور دیگر مالی حقوق کی فرضیت کی اساس حسب ذیل تصورات پر ہے۔

تکلیف کا تصور عام پہلا تصور انسان کے مکلف ہونے کا عام تصور ہے یعنی خالق منعم کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے بندوں پر جو چاہے مالی اور جسمانی حقوق و فرائض عائد کر دے تاکہ بندے اپنے مولیٰ کا حق ادا کریں، اس کی نعمت پر شکر کریں اور اللہ ان کا امتحان لے کہ کون ان میں اچھے عمل کرتا ہے اور کون اللہ کے ہادی پیغمبروں کی پیروی کرتا ہے اور پھر اللہ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے۔

انسان اس دنیا میں ایک ذمے دار و جواب دہ وجود بنا کر بھیجا گیا اور اس کی تخلیق یونہی عبث نہیں ہے۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (المومنون : ۱۱۵)

سو کیا تم خیال رکھتے ہو کہ ہم نے تم کو بنایا کھیلنے کو اور تم ہمارے پاس پھر نہ آؤ گے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (القیامہ : ۳۶)

کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بے قید۔

بلا شبہ انسان یونہی بے کار نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ اس کا ایک مقصد تخلیق ہے جس کی توضیح کے لیے انبیاء اور رسول آئے جنھوں نے خدا کے اوامر و نواہی بیان کیے اور حق سبحانہٗ کے فرائض اور واجبات بیان کیے تاکہ نیکو کاروں کو ان کے اعمال حسنہ کا صلہ ملے اور برے اعمال کی سزا دی جائے۔

اللہ سبحانہٗ نے مسلم پر نماز فرض کی کہ وہ دن میں پانچ مرتبہ ہوائے نفس دواعی غفلت اور جذبات تساہل پر قابو پا کر نماز ادا کرے، سال بھر میں ایک مرتبہ مسلم کو ایک ماہ کے روزوں کا مکلف قرار دیا کہ بندہ اپنے مولیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کھانا پینا اور لذتیں ترک کر دے،

اور پوری عمر میں ایک مرتبہ حج کا مکلف قرار دیا تاکہ بندہ رضائے الٰہی کے لیے اپنا گھر اور وطن چھوڑ کر وادیٔ غیر ذی زرع پہنچے بیت اللہ کا طواف کرے اور شعائر حج ادا کرے۔

جس طرح اللہ سبحانہٗ نے خالص بدنی عبادت نماز روزہ فرض کیں، بدنی اور مالی عبادت حج فرض کی اسی طرح خالص مالی عبادت زکوٰۃ فرض فرمائی تاکہ بندہ رضائے رب کی خاطر زندگی کا سرمایہ اور فتنہ دنیا صرف کرے تاکہ معلوم ہو کہ کون اللہ کی عبادت کرتا ہے اور اس کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اور کون مال دنیا ہی کی پرستش کر کے ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(الحشر : ۹)

اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

تصورِ استخلاف

حقیقت یہ ہے کہ مال اللہ کی ملکیت ہے اور انسان کو بطور نیابت اس میں فرائض متعلقہ کی انجام دہی سپرد کی گئی ہے۔

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (النجم : ۳۱)

اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔

لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ (طٰہٰ : ۵)

اُسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان و زمین میں اور ان دونوں کے بیچ میں اور نیچے سیلی زمین کے۔

غرض دنیا کی ہر شئے خالصتاً اللہ سبحانہٗ کی ملک ہے اور کوئی بھی اس کے ایک ذرے میں بھی اس کا شریک نہیں ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ

وَّمَالَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ۔ (سبا : ۲۲)

تو کہہ پکارو ان کو جن کو دعویٰ کرتے ہو سوا اللہ کے۔ وہ نہیں مالک ایک ذرہ بھر کے آسمانوں میں نہ زمین میں۔ اور نہ اُن کا ان دونوں میں ساجھا۔ اور نہ ان میں کوئی اس کا مددگار۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ

(الزمر : ۶۲)

اللہ بنانے والا ہے ہر چیز کا اور وہ ہر چیز کا ذمہ لیتا ہے۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان : ۲)

اور بنائی ہر چیز پھر ٹھیک کیا اس کو ماپ کر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (الحج : ۷۳)

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ہر گز نہ بنا سکیں ایک مکھی اگرچہ سارے جمع ہوں۔

تمام اموال اللہ کی ملک ہیں وہی دینے والا ہے اور وہی منعم ہے اور وہی اکیلا ہر شئے کا خالق ہے اور جو پیداوار انسان حاصل کرتا ہے وہ اللہ کی مخلوقات ہی سے حاصل کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ماہرین اقتصادیات کہتے ہیں کہ انسان کی پیداوار PRODUCTION دراصل منفعت کی تخلیق ہے مادہ کی تخلیق نہیں ہے یعنی انسان مادہ میں حسب منشا رد و بدل کر کے اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔ مگر اس تغیر سے ان اشیاء کی ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی بلکہ ہوتا یہ ہے کہ انسان بعض اشیاء کو اصل جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتا ہے اور ایسے مقام پر لے جاتا ہے جہاں ان کی احتیاج زیادہ ہوتی ہے یا ان کا ذخیرہ کر لیتا ہے تاکہ مستقبل میں کام آسکیں یا ان میں آمیزش سے پکا کر پیس کر نقش کر کے کوئی نئی شئے وجود میں لے آتا ہے بہر حال یہ جملہ صورتیں تغیر و تبدل

کی ہیں تخلیق مادہ کی نہیں ہیں[1]

ماہرین معاشیات بھی اسی حقیقت پر متفق ہیں کہ انسان کا کام محض تغیر و تبدل کے ذریعے موجود اشیاء کو اپنی ضرورت کے مطابق بنانا ہے جبکہ موجد اصلی اللہ ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ : ۵۰)

کہا صاحب ہمارا وہ ہے جس نے دی ہر چیز کو اس کی صورت۔ پھر راہ سوجھائی۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىٕبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم : ۳۲، ۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی تمھاری میوے۔ اور کام میں دی تمھارے کشتی کہ چلے دریا میں اس کے حکم سے اور کام میں دیں تمھارے ندیاں اور کام میں لگائے تمھارے سورج اور چاند ایک دستور پر اور کام میں لگائے تمھارے رات اور دن اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی۔ اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو۔

بلکہ تغیر و تبدل کے طریقے بھی انسان کو اللہ ہی نے بتائے ہیں اسی نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے اور اسی نے انسان کو علم عطا کیا ہے انسان جب زمین میں کاشت کرتا

---

[1] الدکتور رفعت المحجوب : الاقتصاد السیاسی، ج ۱، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔
الدکتور علی عبد الواحد وافی : الاقتصاد السیاسی، ص ۷۴، ۷۶۔

اور اس میں بیج ڈالتا ہے تو ذرا غور فرمایئے کہ فصل کی تیاری تک انسان کا عمل کس قدر ہے اور حق سبحانہ کی قدرت کا اظہار کتنا ہے کہ اللہ نے زمین کو زراعت کے قابل بنایا، ہوائیں چلائیں، پانی برسایا، گرمی اور روشنی فراہم کی، مٹی میں چھپے ہوئے بیج کو مٹی ہی سے غذا فراہم کی اور ننھے سے بیج کو حکم دیا کہ وہ ہرا بھرا پھل دار درخت بن جائے۔

انسان کے تمام اعمال عقل، تدابیر اور قدرت کے محتاج ہیں اور یہ صلاحیتیں اللہ نے اسے عطا کی ہیں۔

اَفَرَئَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ (الواقعہ : ۶۳، ۷۰)

بھلا دیکھو تو! جو بوتے ہو۔ کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کرنے والے۔ اگر ہم چاہیں کر ڈالیں اس کو روندن پھر تم سارے دن رہو باتیں بناتے۔ ہم قرضدار رہ گئے۔ بلکہ ہم بے نصیب ہوئے۔ بھلا دیکھو تو! پانی جو تم پیتے ہو۔ کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے۔ یا ہم ہیں اتارنے والے۔ اگر ہم چاہیں اس کو کر دیں کھارا، پھر کیوں نہیں حق مانتے؟

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ (عبس : ۲۱، ۲۸)

اب نگاہ کرے آدمی اپنے کھانے کو کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے۔ پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر پھر اگایا اس میں اناج اور انگور اور ترکاری۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا

مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝

(یٰسٓ : ۳۳، ۳۵)

اور ایک نشانی ہے ان کو زمین مردہ ۔ اس کو ہم نے جلایا اور نکالا اس میں سے اناج، سو اس میں سے کھاتے ہیں ۔ اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجور کے، اور انگور کے اور بہائے اس میں بعضے چشمے کہ کھاویں اس کے میووں سے اور وہ بنایا نہیں ان کے ہاتھوں نے ۔ پھر کیوں شکر نہیں کرتے ۔

بندے اپنے رب کا کیوں شکر ادا نہیں کرتے حالانکہ جو پھل اور جو رزق وہ کھاتے ہیں وہ مردہ زمین سے اللہ نے پیدا کیا ہے اور ارضی پیداوار ہی نہیں بلکہ ہر پیداوار اللہ کے حکم سے ہوتی ہے اور ہر شئے میں جو مادہ استعمال ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی تخلیق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ لوہے جیسی سخت شئے جو بے حد مفید ہے ہم نے نازل کی ہے ۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے اتارا لوہا، اس میں سخت لڑائی ہے ۔ اور لوگوں کے کام چلتے ہیں ۔

اَنْزَلْنَا کا لفظ بتلا رہا ہے کہ لوہے کا زمین پر اُتارا جانا حکمتِ رب اور تدبیر الٰہی ہے جس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ہر چلنے والا مادہ اور حرکت دینے والی قوت اللہ کی پیدا کردہ ہے خواہ کوئلہ ہو، پیٹرول ہو یا بجلی ہو، انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اس نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ یہ ایک قوت ہے جو اس کے لیے مفید ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ راہنمائی بھی اللہ ہی نے فرمائی ہے کہ اے انسان، تیرے لیے زمین کے پرتوں میں فلاں شئے مخفی ہے تو اسے اس طرح دریافت کر اور اس طرح اپنے کام میں لا ۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ

اَنْتُمْ شَاكِرُوْنَ (الانبیاء : ۸۰)

اور اس کو سکھایا ہم نے بنانا ایک تمہارا پہناوا، کہ بچاؤ ہو تم کو تمہاری لڑائی سے۔ سو کچھ تم شکر کرتے ہو۔

مختصر یہ کہ مال سارا کا سارا اللہ ہی کا ہے اور انسان جس قدر عمل اور جد و جہد کرتا ہے وہ اسی وقت بار آور ہوتی ہے جب اس میں اللہ کی مشیت اور اس کی امداد شامل ہوتی ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (النحل : ۵۳)

اور جو تمہارے پاس ہے کوئی نعمت، سو اللہ کی طرف سے۔

جب ہر شئے اللہ کی ملک ہے اور اس ملکیت میں انسان اللہ کا نائب ہے تو اسے اللہ کے بندوں پر اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے پر اس مال کا کچھ حصہ خرچ کرنا چاہیے تاکہ واہب نعمت کا شکر ادا ہو۔ اسی لیے فرمایا

اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ : ۲۵۴)

خرچ کرو کچھ ہمارا دیا۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ : ۴)

اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (النور : ۳۳)

دو ان کو اللہ کے مال سے جو تم کو دیا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (آل عمران : ۱۸۰)

اور نہ سمجھیں جو لوگ بخل کرتے ہیں ایک چیز پر کہ اللہ نے اُن کو دی ہے اپنے فضل سے، کہ یہ بہتر ہے اُن کے حق میں، بلکہ یہ بُرا ہے ان کے واسطے، آگے طوق پڑے گا جس پر بخل کیا تھا، دن قیامت کے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (الحدید : ۷)

اور خرچ کرو جو کچھ تمہارے ہاتھ میں دیا اپنا نائب کر کر۔

مالکِ حقیقی ہر مال کا اللہ ہے اور انسان کو اللہ نے بطور نیابت اس میں تصرف کا اختیار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تصرف اجازت دینے والے کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے، جیسے کوئی شخص کسی کو اپنا نائب اور وکیل بنا دے تو وکیل اور نائب اپنے مؤکل کی مرضی کے مطابق اس کے مال میں تصرف کرے گا اور اس کی اجازت سے کرے گا اور اپنی مرضی سے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

الامام الرازی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

"فقراء عیال خدا ہیں اور اغنیاء اللہ کی جانب سے مال کے رکھوالے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے کہ اس کے خزانے کے رکھوالے اس مال کو محتاجوں میں تقسیم کریں"[۱]

ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ

"اللہ سبحانہٗ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اپنی نعمت کے طور پر اپنے بندوں کو مال عطا فرمایا اور اس کے شکر کا یہ طریقہ مقرر فرمایا کہ صاحبِ مال، مال میں سے کچھ حصہ اللہ سبحانہٗ کی نیابت کے طور پر ان لوگوں کو دے جن کے پاس مال نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہٗ نے تمام انسانوں سے رزق کا وعدہ فرمایا ہے"[۲]

اگر غنی بخل اختیار کرے اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اللہ کے بندوں کو نہ دے تو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہوگا چنانچہ حدیث قدسی ہے کہ

"مال میرا مال ہے، فقراء میری عیال ہیں، اغنیاء میرے وکلاء ہیں، اگر میرے وکلاء میرے عیال کو دینے میں بخل کریں گے تو میں انھیں وبال

---

[۱] التفسیر الکبیر، ج ۱۶، ص ۱۰۳۔

[۲] احکام القرآن، ص ۹۴۵۔

کا مزا چکھاؤں گا۔" [1]

اگرچہ حدیث کی سند مستند نہیں ہے لیکن معناً حدیث صحیح ہے اور کتاب و سنّت کی روح کے مطابق ہے۔

مال کے اللہ کی ملکیت ہونے کا تصور مسلمانوں میں خوب اچھی طرح راسخ رہا ہے اور اس تصور کو تواتر کا درجہ حاصل ہے یہاں تک مانگنے والے فقراء بھی "اللہ کا مال" کہہ کر مانگتے ہیں۔

ایک اور حدیث ہے۔

"روز قیامت اغنیاء پر فقراء کی جانب سے بربادی ہوگی کہ وہ کہیں گے کہ اے خدا انھوں نے ہمیں ان حقوق سے محروم رکھا ہے جو تو نے ان پر فرض کیے تھے، اللہ سبحانہٗ فرمائے گا کہ میری عزت و جلال کی قسم میں تمھیں اپنے سے قریب کرتا ہوں اور انھیں دور کرتا ہوں۔" [2]

افراد اور معاشرے کے درمیان کفالت باہمی

قدیم فلاسفہ اجتماع کہتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے اور

جدید ماہرین اجتماعیات نے کہا ہے کہ انسان حیوان اجتماع ہے یعنی انسان بغیر اجتماع کے حقیقی زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ ہر فرد معاشرے کا مقروض ہوتا ہے یہاں تک کہ انسان پیدائش کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اسے معاشرہ کی اعانت اور تعاون حاصل نہ ہو، معاشرے سے انسان کو بے حساب فوائد، فضائل اور معارف حاصل ہوتے ہیں، انسان گفتگو معاشرے سے سیکھتا ہے، عادات، رسم و رواج سماج سے حاصل کرتا ہے اور تہذیب و ثقافت، تمدن و حضارت اور قواعد مذہب اور اصول ہائے معاملات معاشرے سے سیکھتا ہے۔

---

[1] یہ حدیث مجھے نہیں ملی اور نہ اس پر کوئی نقد ملا۔

[2] الطبرانی، بروایت حضرت انس بسند ضعیف (جمع الفوائد ج ١، ص ١٤٢)

اگر معاشرہ نہ ہوتا تو فرد گونگا بہرہ جانور ہوتا اور اسے دنیا کے امور کی کوئی واقفیت نہ ہوتی، وہ اس بچہ کی طرح ہوتا جسے اچھے بُرے کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ یہ معاشرہ ہے جو ہر فرد کے وجود کو سنوارتا اور اسے زندگی کی کیفیات سے ہم آہنگ کرتا ہے، اور اسے عقائد وروایات اور لغت وثقافت کی میراث سے روشناس کراتا ہے [1]

فرد کو جہاں معاشرے سے معنوی فوائد اور تہذیبی منافع حاصل ہوتے ہیں وہاں اسے مادی اور اقتصادی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں بلکہ فرد جو بھی مکاسب حاصل کرتا ہے اس میں معاشرے کے دیگر افراد اس کے شریک ہوتے ہیں اور پورے معاشرے کے تعاون سے فرد کی معاشی جدوجہد بارآور ہوتی ہے۔

ایک کسان جب اپنے کھیت سے غلہ حاصل کرتا ہے تو پورے معاشرے کا تعاون حاصل ہوتا ہے، معاشرے نے اس کے کھیت کے لیے نہریں نکالیں، پانی کے راستے بنائے، پانی کی بہم رسانی کا بندوبست کیا، اس کے لیے آلات زراعت ایجاد کیا اور اس کے لیے لباس وغذا اور رہائش فراہم کی اور اسے امن کا وہ ماحول دیا جس میں وہ اپنی توجہات اپنی کشاورزی پر مرکوز کر سکے۔

تاجر کا مال جمع کرنا اور تجارت کرنا سراسر معاشرے پر موقوف ہے اور بغیر اس سماجی تعاون کے وہ تجارت نہیں کر سکتا غرض کسی بھی پیشہ سے منسلک فرد ہو اور کسی بھی ذریعہ سے روزی کمانے والا انسان ہو اس کو سماجی تعاون لامحالہ درکار ہے اور جس قدر مالکِ مال کا مال زیادہ ہوگا، سماجی تعاون میں اسی مقدار سے اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اسی مقدار سے فرد کی جدوجہد اور اس کی کوششوں کا دائرہ محدود ہوتا جائے گا۔

ایک بہت وسیع وعریض فارم ہو، ایک بڑا کارخانہ ہو اور ایک بہت بڑا ادارہ ہو، اس میں بہت سے افراد شریک ہوتے ہیں اور سیکڑوں اور ہزاروں افراد اس میں اپنی جسمانی محنتیں، اپنی فکری صلاحیتیں اپنی ذہنی قوتیں کھپاتے ہیں۔

---

[1] احمد الخشاب: علم الاجتماع، ص ۳۶۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو مال فرد کو ملتا ہے اور جسے وہ اپنی تجوریوں میں جمع کرتا ہے وہ دراصل جماعت کا مال ہے کہ اجتماعی جدوجہد ہی نے اس مال کو وجود بخشا ہے اسی لیے قرآن کریم نے جماعت مسلمین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء : ۵)

اور مت پکڑا دو بے عقلوں کو اپنے مال، جو بنائے اللہ نے تمہاری گزران۔

اس آیت سے فقہا نے سفہا پر اور مبذرین اور مال کے تلف کرنے والوں پر حجر (پابندی) لگانے کا حکم مستنبط کیا ہے حالانکہ بظاہر مال کے مالک وہی ہیں لیکن چونکہ درحقیقت مال جماعت کا ہے اگر مال کا مالک اس مال کو نشوونما دیتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے تو اس کے فوائد معاشرے کو پہنچیں گے اور اگر مال تلف کرتا ہے اور ضائع کرتا ہے تو اس کے نقصانات بھی معاشرے کو پہنچیں گے، چنانچہ آیت میں "ان کے مال" نہیں بلکہ "تمہارے مال" کہا، اور اسی طرح لهم قیاما نہیں، بلکہ لکم قیاما کہا ہے کہ مال سے قیام فرد مالک کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا قیام ہے۔

اسی طرح فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا (النسا : ۲۹)

اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق، مگر یہ کہ سودا ہو آپس کی خوشی سے، اور نہ خون کرو آپس میں، اللہ کو تم پر رحم ہے۔

اس آیت میں مومنوں کو ممانعت کی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مال کھائیں جس طرح انھیں ممانعت کی گئی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں اور دونوں مقامات پر "اموالکم" اور "انفسکم" کی تعبیر اختیار کی گئی تاکہ معلوم ہو کہ مال سب کا ہے اور اسی طرح

کی جان سب کی جانوں کے مساوی ہے۔

یعنی اُمتِ مسلمہ جان اور مال دونوں میں متکافل اور متضامن ہے اور اس اُمت کے افراد حقوق و مصالح اور جان و مال میں ایک دوسرے کی کفالت کرنے اور باہدگر معاون بنتے ہیں، جس نے کسی کا مال کھایا اس نے گویا پورے معاشرے کا مال کھایا اور جس نے کسی نفس پر تعدی کی اس نے گویا پوری جماعت کے نفوس پر تعدی کی۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط

(المائدہ : ۳۲)

جو کوئی مار ڈالے ایک جان، سوائے بدلے جان کے، یا فساد کرنے پر ملک میں، تو گویا مار ڈالا سب لوگوں کو، اور جس نے جلایا ایک جان کو گویا جلایا سب لوگوں کو۔

قرآن کریم کا اعجاز دیکھیے کس قدر مختصر الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت آشکارا کر دی ہے اور کتنے بڑے اصول کو مختصر سی تعبیر کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔ جس طرح کہ سورۃ نساء میں فرمایا ہے کہ —— تم سب اپنے مال کو باطل طریقوں سے نہ کھاؤ —— کہ ایک فرد کا مال پورے معاشرے کا مال ہے اور پورا مُسلم معاشرہ باہم پیوست اور متضامن مبنی بر اخوت معاشرہ ہے۔

سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں مال کی اضافت پورے معاشرے کی جانب کر کے مالکم کہا گیا ہے اور یہ وہ اصول ہے جس کی جانب رسائی حاصل کرنے کی اشتراکیوں نے سعی کی ہے مگر انھیں مبنی بر انصاف راہ نہ مل سکی، اگر وہ اسلام کو اختیار کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اسلام نے فرد کی ملکیت اور اس کے مال کو اپنی تحویل میں رکھنے کے حق کا احترام بھی کیا ہے اور ہر فرد کے مال کو اُمت کا مال بھی قرار دیا ہے اور وہ اس طرح کہ اسلام نے مال کثیر رکھنے والے افراد پر مصالح عامہ کے حامل بہت سے حقوق عائد کیے ہیں اور مال قلیل رکھنے والوں پر بھی کچھ حقوق عائد کیے ہیں تاکہ اُمت اور نظام

انسانیت اضطراری حالات سے نکل سکے اور ان حقوق کے علاوہ اسلام نے ہر مالدار شخص کو بڑا احسان، صدقات اور خیرات پر آمادہ کیا ہے[1]۔

بہر حال فرد کے مال میں اجتماعی حق لازم ہے مگر اس حق سے اس کی ملکیت ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا کچھ حصہ مصالح عامہ کے لیے لیا جاتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو مقررہ حقوق سے بھی زیادہ لے لیا جاتا ہے۔ معاشرے کی نائب ریاست یہ حق لے کر معاشرے کے مستحق افراد پر صرف کرتی ہے معاشرے کی حفاظت کرتی ہے اور اس سے بغی اور عدوان کو دور کرتی ہے۔

اگر کسی مسلم معاشرے میں مستحق افراد ــــ فقراء ــــ نہ ہوں تب بھی مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے رہیں تاکہ ان کی یہ زکوٰۃ ذخیرہ ہوتی جائے اور "فی سبیل اللہ" کی مد میں صرف ہوتی رہے۔ کیونکہ جب تک مسلمان موجود ہیں یہ مصرف لامحالہ باقی رہے گا۔

اخوتِ باہم اخوت کے معنی بڑے گہرے اور وسیع ہیں اور کفالت باہم کے مفہوم سے زیادہ وسعت رکھتے ہیں کہ اخوت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ منفعتوں کا تبادلہ ہو اور کچھ لے کر کچھ دیا جائے بلکہ جذبۂ اخوت خالص انسانی اور روحانی جذبہ ہے جو انسان کے اندر سے ابھرتا ہے اور انسان اپنے بھائی کے لیے وہ پسند کرتا ہے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے بلکہ اپنے بھائی کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔

اسلام میں اخوت کی دو بنیادیں ہیں ــــ ایک اشتراکِ انسانیت اور دوسری اشتراکِ عقیدہ۔

انسانوں کی زبانوں کے اختلاف کے باوجود ان کے رنگ و نسل کے باوجود تمام انسان ایک ہیں اور ایک باپ کی اولاد ہیں، اسی لیے قرآن نے کہا یابنی آدم[2] اور اسی

---

[1] تفسیر المنار، ج ۵، ص ۳۹۔

[2] قرآن کریم میں یہ الفاظ پانچ مرتبہ آتے ہیں، چار مقامات سورۂ الاعراف میں اور ایک مرتبہ، سورۂ یٰسٓ میں، اسی طرح یاایھا الناس کے الفاظ بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔

طرح فرمایا یا ایہا الناس۔ اور ارشاد فرمایا کہ

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النساء : ۱)

لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے، جس نے بنایا تم کو ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا اور بکھیرے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو اللہ سے، جس کا واسطہ دیتے ہو آپس میں، اور خبردار رہو ناتوں سے، اللہ ہے تم پر مطلع۔

یا ایہا الناس کے بعد الارحام کا لفظ بڑی معنویت کا حامل ہے یعنی یہاں پر یہ یاد دلانا ہے کہ بنی نوع انسان تمام ایک ہی آدم کی اولاد ہیں اور ان سب کے درمیان انسانیت کی عمومی قرابت موجود ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اخوت کی تائید و توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ ——— "سب اللہ کے بندے بھائی بھائی ہو جاؤ"

(احمد، ابو داؤد)

یہی نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی اخوت کے تصور کو عقیدۂ ایمانی کے طور پر بیان فرمایا کہ

"اے اللہ اے ہر شئے کے رب و مالک میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں" (احمد و ابو داؤد)

اس عالمگیر انسانی اخوت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں کو محروم کر کے خیر و نعمت کو صرف اپنے قبضہ میں نہ کر رکھے بلکہ ہر نعمت آلہٰی میں اللہ کے بندوں کو شریک کرے۔

عالمگیری انسانی سے زیادہ مضبوط اور زیادہ گہری تاثیر کی حامل اخوت عقیدۂ اسلامی کی اخوت ہے جو نسب اور خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط تعلق ہے اور اس سے

فکر و روح کا تعلق قائم ہوتا ہے اسی لیے فرمایا کہ

"مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات : ۱۰)

اس اسلامی اخوت اور رشتہ ایمان کا بھی تقاضا یہی ہے کہ مسلمان باہم اجتماعی معاشی کفالت کریں، اور عملی طور پر آپس میں تعاون کریں اور تمام مؤمنین ایک ہی دارالاسلام میں رہیں کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں پورا دارالاسلام ان کا وطن ہے اور اس دارالاسلام کے تمام باشندے ایک معاشرہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی اس اخوت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ

"مؤمن آپس میں بنیاد کی طرح ہیں جس کا ہر پتھر دوسرے کی مضبوطی کا باعث ہے۔" (بخاری و مسلم)

"باہمی محبت اور مودت میں مؤمنوں کی مثال جسد واحد کی طرح ہے کہ اگر جسم کے کسی حصے میں کوئی تکلیف ہو تو جسم کے تمام اعضاء درد اور تکلیف محسوس کرتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

"مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس پر ظلم ہونے دیتا ہے۔" (بخاری)

"وہ شخص مؤمن نہیں ہے جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اسے معلوم ہو کہ وہ بھوکا ہے۔" (الطبرانی)

مسلم معاشرہ ایک بُنیان مرصوص ہے، ایک خاندان ہے بلکہ ایک جسم کی طرح ہے جس کے ایک حصہ کی تکلیف سے پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، اس مسلم معاشرہ میں اگر کوئی فرد قدرت عمل نہ رکھے یا اپنی ضرورت کے بقدر نہ کما سکے یا وہ آفات زمانہ کا شکار ہو جائے، یا کسی بھی طرح محتاج اور ضرورتمند ہو جائے تو پورے معاشرے پر اس کی اعانت اور مدد فرض ہے اور اس کو سہارا دے کر اس قابل بنانا لازم ہے کہ وہ معاشرے میں سر اٹھا کر چلے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر باعزت طریقے پر رہے۔

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ فرضیت زکوٰۃ کی نظری اساس ٹیکس کے تصور سے بہت وسیع بے حد جامع اور زیادہ دائمی ہے۔ اگرچہ باہمی کفالت کے تصور میں زکوٰۃ اور ٹیکس میں قدر مشترک موجود ہے لیکن بعد میں بیان کردہ ہر سہ تصورات میں زکوٰۃ منفرد اور ٹیکس سے ممتاز ہے۔

تیسری فصل

ٹیکس کا ظرف اور زکوٰۃ کا ظرف

ماہرین مالیات کے نزدیک ٹیکس کی بلحاظ ظرف درج ذیل چار اقسام ہیں۔

۱) راس المال پر ٹیکس
۲) آمدنی پر ٹیکس
۳) اشخاص پر ٹیکس
۴) مصارف پر ٹیکس

زکوٰۃ میں "مصارف ٹیکس" کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے کہ حقیقت زکوٰۃ تو یہ ہے کہ اغنیاء سے لے کر فقراء پر تقسیم کی جاتی ہے اور دین وملت کے مصالح پر صرف کی جاتی ہے کیونکہ خرچ کرنے والا جس طرح غنی ہو سکتا ہے اسی طرح فقیر بھی ہو سکتا ہے۔ نظام ٹیکس میں مصارف واخراجات پر ٹیکس اس لیے لگایا جاتا ہے تاکہ زیادہ آمدنی حاصل ہو جبکہ اسلام کی نظر میں یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے البتہ اسلام میں باقی تین طرح کے ٹیکس موجود ہیں، یعنی راس المال پر ٹیکس، آمدنی پر ٹیکس اور اشخاص پر ٹیکس۔

ہم اس فصل میں زکوٰۃ کے یہ سہ پہلو بیان کرتے ہیں۔

پہلی بحث

رأس المال پر ٹیکس

اموالِ زکوٰۃ اور ان کی مقادیر کا بغور مطالعہ کرنے سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شریعت نے ایک ٹیکس کا نظام نہیں اختیار کیا ہے بلکہ زکوٰۃ میں متعدد ٹیکس کا نظام اختیار کیا ہے۔

چنانچہ زکوٰۃ رأس المال پر بھی عائد ہوتی ہے، مویشی پر بھی عائد ہوتی ہے، سونے اور چاندی پر بھی ہوتی ہے اور تجارتی سامان پر بھی عائد ہوتی ہے، اور آمدنی پر بھی عائد ہوتی ہے اور اس کے بہت سے فروع پر بھی عائد ہوتی ہے یعنی زرعی پیداوار پر، معدنی پیداوار پر، ان عمارات پر جو کرایہ پر دی گئی ہوں، کارخانوں اور آلات کی آمدنی پر، ہر آمدنی دینے والے مال پر، عمل اور کسب کی آمدنی پر، تنخواہوں اور اُجرتوں پر، اور آزاد پیشوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر، جیسا کہ ہم اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

رأس المال پر ٹیکس کی تمام خوبیاں زکوٰۃ میں موجود ہیں

شریعت اسلامیہ نے مویشی، تجارت اور نقود کے رأس المال پر زکوٰۃ عائد کی ہے اور اب اشتراکی نقطۂ نظر یہی ہے کہ ٹیکس صرف رأس المال پر عائد ہونا چاہیے اور اسی پر مالی نظام استوار ہونا چاہیے۔[1]

---

[1] الدکتور رشید الدقر، علم المالیۃ، ص ۳۵۲۔

راس المال پر ٹیکس کے محاسن

رائس المال پر ٹیکس کے مؤیدین اس کے حق میں یہ دلائل دیتے ہیں۔

۱) راس المال کی ملکیت سے اصحاب مال کو متعدد اجتماعی اور اقتصادی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور صاحب مال کو کسب کے مواقع میسر آجاتے ہیں، دولت کی موجودگی سے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور مسلسل آمدنی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

۲) راس المال پر ٹیکس تمام افراد کی دولتوں کو مشتمل ہوتا ہے یہاں تک ان دولتوں کو بھی شامل ہو جاتا ہے جو بطور آمدنی نہیں دی جاتیں اور اس بنا پر آمدنی پر ٹیکس کے ذیل میں بھی نہیں آتیں۔ جیسے قیمتی تحائف، زیورات اور جواہرات اور نقد اموال۔

۳) اس ٹیکس کے ذریعے معطل پڑے ہوئے مال پر بھی ٹیکس عائد ہو جاتا ہے اور اس کو فائدہ بخش کاموں میں لگانے کی تحریک پیدا ہوتی ہے تاکہ بار بار کے ٹیکس سے وہ مال ختم نہ ہو جائے جبکہ آمدن پر ٹیکس عام زیر گردش مال ہی پر عائد ہوتا ہے اور بڑے بڑے رائس المال (CAPITAL) اس سے بچ جاتے ہیں۔

۴) رائس المال پر ٹیکس سے ارباب مال اس امر پر آمادہ ہوتے ہیں کہ سرمایہ کو پیداواری امور میں لگائیں، خواہ پیداوار کم ہو یا زیادہ۔

۵) اس ٹیکس سے آمدنی پر ٹیکس کی مقداروں اور اس کی بڑھتی ہوئی شرحوں میں تخفیف کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور حکومتیں زیادہ آمدنی کے پیش نظر آمدنی ٹیکس کی شرح میں چھوٹ دے دیتی ہیں۔

۶) رائس المال پر ٹیکس کی زد ان غیر مالک (NOT HAVES) طبقوں پر نہیں پڑتی جو صرف اپنے عمل سے روزی حاصل کرتے ہیں اور اسی بنا پر اس ٹیکس کو اشتراکی نقطہ نظر سے ایک اصلاحی ٹیکس تصور کیا جاتا ہے [۷]

---

۷ الدکتور رشید الدقر: علم المالیۃ، ص ۳۴۷، الدکتور سعد ماہر حمزہ: موارد الدولۃ، ص ۱۶۶۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر راس المال پر ٹیکس کے مؤیدین بالخصوص اشتراکی میلان رکھنے والے حضرات اس ٹیکس کے حق میں ہیں۔

راس المال پر ٹیکس کے مخالفین راس المال پر ٹیکس کے مخالفین ان دلائل کو غلط بتاتے ہیں اور سرمایہ دارانہ اقتصادیات کی حمایت کرتے ہیں۔

۱) راس المال (سرمایہ) پر ٹیکس عائد کرنے سے بہت سی صورتوں میں بچت کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے اور سرمایہ کو پیداواری کاموں میں لگانے کی دلچسپی بھی کم ہو جاتی ہے بالخصوص جائیداد اور کارخانوں جیسی غیر منقولہ اشیاء پر ٹیکس عائد کرنے سے بچت کرنے والوں کی ہمتیں پست ہوتی ہیں اور لوگ اپنی آمدنی کو اثاثوں میں تبدیل کرنے کے بجائے انھیں خرچ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

۲) قابل ٹیکس راس المال کی تحدید ہی دشوار ہے اس لیے کہ راس المال اور اس کی طبیعت کے بارے میں نظریات مختلف ہیں اور پوری دقت کے ساتھ شخصی ملکیتوں کی تقدیر بہت دشوار ہے۔ اس سلسلے میں ٹیکس دہندگان کے بیانات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے بیانات درست نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ نقود کو چھپا بھی سکتے ہیں۔

۳) راس المال پر سالانہ ٹیکس لگنے سے آمدنی کا یہ اہم ذریعہ ختم ہو سکتا ہے کہ راس المال آمدنی کی طرح نو بہ نو افزائش نہیں پاتا بلکہ اس میں سے جس قدر سرمایہ لے لیا جاتے گا وہ اس میں سے ختم ہو جائے گا۔ اس طرح کے مسلسل ٹیکس سے انفرادی دلچسپی کم ہو جائے گی اور پھر بالآخر ٹیکس کی آمدن بھی گھٹ جائے گی[1]

راس المال پر ٹیکس کے لزوم کی مراعات اسی وجہ سے بعض ماہرین کی رائے ہے کہ راس المال پر ٹیکس کی صورت

---

[1] موارد الدولۃ، ص ۱۶۸۔

میں درج ذیل امور ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

۱) ٹیکس کی شرح ایسی نہ ہو کہ اصل سرمایہ کا ایک بڑا حصّہ اس میں نکل جائے بلکہ ایسی مناسب شرح ہو جو اس کی آمدنی سے پوری ہو سکے اور اصل سرمایہ پر ٹیکس نہ پڑے۔

۲) صرف راس المال پر ہی ٹیکس نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ دیگر ٹیکس بھی ہو، بالخصوص آمدنی پر ٹیکس [1]

۳) ایک مخصوص حد تک سرمایہ اور ایک مخصوص حد تک آمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ ہو۔

۴) قرض اور رہن وغیرہ مستثنیٰ کر کے ٹیکس عائد کیا جائے۔[2]

زکوٰۃ میں امور مذکورہ کی رعایت اسلام میں زکوٰۃ راس المال پر عائد ہوتی ہے اور اس میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں اور ان تمام نقائص سے محفوظ ہے جن پر تنقید کی گئی ہے۔ چنانچہ

۱) ہر راس المال پر زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ مالِ نامی (GROWING WEALTH) پر زکوٰۃ ہے اور نما کی شرط کا مقصود یہی ہے کہ زکوٰۃ فضل اور اضافہ پر لی جائے اور اصل سرمایہ باقی رہے کیونکہ خود زکوٰۃ کے معنی نماء (افزائش) کے ہیں [3] اسی لیے ہم نے ان فقہا کی رائے کو ترجیح دی ہے جن کے نزدیک مباح اور مستعمل زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ ان میں نما نہیں ہوتا، بخلاف اس صورت کے جبکہ یہ زیورات کنز ہوں اور عام حالات سے زیادہ مقداریں ہوں اور اسی طرح میں جبکہ زیورات مرد استعمال کریں یا سونے کے برتن وغیرہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہے، کیونکہ اس طرح بلاضرورت دولت غیر مفید طور پر معطل ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ رہائشی گھروں، استعمال کے کپڑوں،

---

[1] علم المالیہ، ص ۳۵۵۔

[2] موارد الدولۃ، ص ۱۷۶۔

[3] فتح الباری، ج ۳، ص ۱۶۸۔

گھریلو سامان، سواری کے جانوروں، ہتھیاروں، آلاتِ حرفت، اور کتابوں پر زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ اشیاء نامی نہیں ہیں اور مالک کے زیرِ استعمال ہیں [1]

جبکہ نظام ٹیکس میں رہائشی گھر بھی ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور سوئٹزرلینڈ کی بعض ولایات میں مختلف آمدنیوں کے علاوہ تمام منقولہ اشیاء اور قابلِ تقسیم اشیاء پر ٹیکس عائد ہوتا ہے [2]

۲) شریعت اسلامیہ نے غیر محلول رأس المال جیسے کارخانے وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں کی ہے بلکہ زیرِ گردش رأس المال پر زکوٰۃ عائد کی ہے یا اصل سرمایہ کی آمدنی پر زکوٰۃ عائد کی ہے جیسا کہ زرعی زمین پر زکوٰۃ ہے اور اسی طرح ان عمارات وغیرہ پر زکوٰۃ ہے جو کرایہ پر دی گئی ہوں۔ اس طرح زکوٰۃ بچت کرنے والوں کی ہمتیں پست نہیں کرتی اور انھیں اپنی آمدنی کے خرچ پر آمادہ نہیں کرتی۔ جیسا کہ بعض ٹیکسوں کے نتیجے میں یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔

۳) شریعت نے ہر کم وبیش رأس المال پر زکوٰۃ عائد نہیں کی ہے بلکہ ایک نصاب متعین کیا ہے جو کہ غنا کی کم سے کم مقدار ہے جو کہ نقود اور تجارتی سامان میں ۸۵ گرام سونا ہے، اس مقدار پر سال گزرنے کے بعد جبکہ مالک کی ضرورت سے زائد ہو زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔

۴) زکوٰۃ کی مقدار اتنی زائد نہیں ہے کہ اس سے اصل سرمایہ کا ایک حصہ ہی جاتا رہے بلکہ نقود اور تجارتی سامان میں ۲.۵ (ڈھائی فیصد) کی ایک بہت ہی معتدل شرح مقرر کی ہے اسی طرح مویشی میں انتہائی مناسب مقدار مقرر کی ہے اور یہ زکوٰۃ بھی دراصل رأس المال پر نہیں بلکہ اس کی آمدنی پر ہی ہے۔

ابن قدامہ، المغنی میں فرماتے ہیں کہ

---

[1] فتح القدیر، شرح العنایہ علی الہدایہ، ج ۱، ص ۴۸۷، ۴۸۹۔

[2] علم المالیۃ، ص ۳۵۵۔

زکوٰۃ میں جن اشیا میں سال کے گزرنے کی شرط ہے وہ وہ ہیں جن میں نماء موجود ہے تاکہ زکوٰۃ حاصل شدہ منافع سے اور نماء سے لی جائے اور بار بار وجوب زکوٰۃ سے مال ختم نہ ہو جائے۔ [1]

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں۔

سال کی مدت اس لیے ضروری ہے تاکہ افزائش متحقق ہو جائے کہ سال بھر میں مختلف فصلیں بھی تیار ہو جاتی ہیں اور تجارت میں بازار کا اتار چڑھاؤ بھی ہو جاتا ہے۔

ابن الہمام فتح القدیر میں سال گزرنے کی شرط کی حکمت میں بیان کرتے ہوتے فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا اصلی مقصود مواسات فقراء ہے کہ اپنے فضل مال میں اسے دے دے۔ زکوٰۃ کا وجوب اس مال میں جس میں نماء نہ ہو فضل مال کے برخلاف ہو بالخصوص جبکہ اس کو خرچ کرنے کی ضرورت بھی ہو، بہرحال نامی مال میں سال گزرنے کی شرط کا مقصود یہ ہے کہ فی الواقع نماء متحقق ہو جائے۔ [2]

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت زکوٰۃ رأس المال پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اس کے نماء پر ہوتی ہے لیکن چونکہ اس افزائش کا تعین دشوار ہے اس لیے اساس یہ ہے کہ جس مال میں افزائش کا گمان ہو اس پر زکوٰۃ ہے [3]، کیونکہ احکام شرعی کی اساس اسباب و علل ہوتے ہیں حکم نہیں ہوتے۔ [4]

---

[1] المغنی، ج ۲، ص ۲۷۵، ۱۶۲۔

[2] فتح القدیر، ج ۱، ص ۴۸۲۔

[3] المغنی، ج ۲، ۶۲۵ ص۔

[4] اس کی مثال یہ ہے کہ مسافر کو رمضان کے روزوں کی رخصت اور نماز کے قصر کا حکم ہے جس کی اساس فطرۃً مشقت ہے خواہ فی الواقع مشقت ہو یا نہ ہو۔

دوسری بحث

آمدنی پر زکوٰۃ

دورِ جدید میں آمدنی ٹیکس کا ایک اہم محل ہے۔ قدیم ادوار میں جائیداد آمدنی کا اہم ذریعہ رہی ہے تو آج کل محنت وعمل سے یا سرمایہ سے یا دونوں کے اشتراک سے حصول آمدن کے بہت سے ذرائع پیدا ہو چکے ہیں صنعتی ارتقاء کے ساتھ ملکی اور غیر ملکی تبادل اشیاء کی رفتار بڑھ گئی اور محنت اور سرمایہ سے وجود میں آنے والی اشیاء عام ہو گئیں اور اس سے تجارتی اور صنعتی منافع بڑھ گئے، منقولہ مالیتیں سرٹیفکٹ اور حصص کی صورت میں ظاہر ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی کارخانوں اور بڑی بڑی تنصیبات میں ملازموں اور مزدوروں کو تنخواہ کی صورت میں اور مزدوری کی صورت میں آمدنیاں ہونے لگیں۔

ایک جدید ریاست کے وسیع اختیارات کے پیش نظر اور بیان کردہ آمدنیوں کے مدِ نظر آمدنیوں پر براہِ راست ٹیکس عائد کیے گئے اور اس طرح چنگی اور صرف پر بالواسطہ ٹیکسوں کی اہمیت کم ہو گئی اور ماہرین مالیات نے یہ رائے اختیار کی کہ حالات جدیدہ کے تناظر میں کہ عام خدمات کا بوجھ اُٹھانے میں بغیر جائیداد کے آمدنی حاصل کرنے والے افراد کی، جائیداد کے ذریعے آمدن حاصل کرنے والے افراد کے ساتھ شرکت ضروری ہو گئی ہے آمدنی پر ٹیکس عائد کرنا زیادہ قرین انصاف ہے[1]

آمدن کا مفہوم آمدن کا مفہوم یہ ہے کہ باقی رہنے کے قابل متعین ذریعہ سے حاصل ہونے والی ثروت ہے۔

---

[1] سعد ماہر: موارد الدولۃ، ص ۱۱۷۔

۱) یعنی آمدن کا ایک ذریعہ ہونا ضروری ہے خواہ وہ ذریعہ آمدن OF
INCOME جائیداد ہو یا منقولہ شئے ہو یا زرنقد ہو، یا معنوی ہو جیسے عمل و محنت (جس کی زرِ نقد سے قیمت متعین کی جا سکے) یا ذریعہ آمدن مادی و معنوی دونوں کا مجموعہ ہو، گویا ذریعۂ آمدن یا تو رأس المال ہوگا یا عمل ہوگا یا دونوں کا مجموعہ ہوگا، چونکہ رأس المال کی دو صورتیں ہیں ایک جائیداد کی اور ایک منقولہ اشیاء کی تو ان سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی منقولہ دولت سے حاصل ہونے والی اور غیر منقولہ دولت سے حاصل ہونے والی ہوگی۔ بلا اشتراکِ غیر ذہنی کاوش سے یا ہاتھ سے عمل کر کے حاصل ہونے والی آمدن پیشہ ورانہ آمدن ہے جبکہ عقد اجارہ کے ساتھ اشتراکِ غیر کی صورت میں حاصل ہونے والی آمدن اجرت، تنخواہ اور معاوضہ کی مشکل ہے۔ اور چونکہ تیسرا ذریعہ مال اور عمل دونوں کو جمع کرتا ہے اس لیے اس سے حاصل شدہ آمدن منافع کی صورت ہے۔[1]

غرض ذریعۂ آمدن کی اس تفریق کی بنا پر آمدن فائدہ، منافع اور اجرت کہلاتی ہے۔

۲) ان تمام مصادر اور ذریعہ ہائے آمدن میں اصل شئے بقاء اور ثبات ہے جو کہ ایک تناسبی امر ہے کہ ان ذریعوں کے احتمالِ بقاء میں فرق ہے اور رأس المال بہ نسبت عمل کے زیادہ باقی رہنے والا ہے[2] اور تناسب بقاء کے لحاظ سے ٹیکس بھی مختلف ہوتا ہے کہ اگر ذریعۂ آمدن صرف عمل ہو تو یہ شرح کم ہو جاتی ہے اور دونوں کے امتزاج کی صورت میں یہ شرح درمیانی رہتی ہے۔ بلکہ سرمایہ کی نوعیت کے لحاظ سے بھی شرح ٹیکس مختلف ہوتی ہے کہ زرعی زمین کی آمدنی پر ٹیکس زیادہ ہوتا ہے جبکہ عمارتوں کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی پر ٹیکس کم ہوتا ہے کہ ایک عرصہ بعد عمارتیں قابلِ مرمت ہو جاتی ہیں یا منہدم ہو جاتی ہیں۔[3]

---

[1] محمد فؤاد ابراہیم؛ علم المالیۃ العامہ، ج ۱، ص ۳۲۲۔

[2] ایضاً

[3] موارد الدولۃ۔

شریعت اسلامیہ میں آمدنی پر زکوٰۃ

اسلام نے جس طرح مویشی اور تجارتی سرمایہ اور زر نقد پر زکوٰۃ عائد کی ہے اسی طرح اسلام نے آمدن پر بھی زکوٰۃ عائد کی ہے جس کی واضح مثال زرعی پیداوار پر عائد ہونے والا عشر اور نصف عشر ہے۔ اور اس تفریق کے ذریعے بھی اسلام نے ہمیں ٹیکس کا ایک زریں اصول عطا کر دیا ہے کہ ٹیکس کی شرح محنت سے متوازن ہونی چاہیے کہ اگر محنت کم ہو تو شرحِ ٹیکس زیادہ ہو اور اگر محنت زیادہ ہو تو شرح ٹیکس کم ہو۔

اسی اصول کے تحت اسلام نے مدفون خزائن سے حاصل ہونے والی دولت پر خُمس (۲۰٪) بارانی زمین کی پیداوار پر عُشر (۱۰٪) اس زمین کی پیداوار پر جسے بذریعہ آلات سیراب کیا ہو (جس کی سیرابی میں کسی بھی طرح کی انسانی کاوش کا دخل ہو، یعنی غیر بارانی) پر نصف عشر (۵٪) اور محنت و عمل سے حاصل ہونے والی آمدن پر ۲.۵٪ (رُبع عُشر) زکوٰۃ عائد کی ہے۔

اسی بنا پر بعض فقہاء نے کہا ہے کہ محنت و مشقت کے لحاظ سے کانوں سے نکلنے والی اشیاء پر خُمس سے لے کر رُبع عُشر تک زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔[1]

اسلام میں آمدن پر زکوٰۃ کی ایک اور صورت شہد پر عُشر کا ہونا ہے اور ہم نے اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ تمام حیوانی پیداواروں پر عُشر ہے۔ اسی طرح معدنی ثروت کی پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدن پر بھی زکوٰۃ ہے چنانچہ لولو، عنبر اور مچھلی سے حاصل ہونے والی آمدن پر زکوٰۃ ہے۔ اُجرت پر دی جانے والی زمین کی اُجرت پر زکوٰۃ ہے اور مالک اجرت پر زکوٰۃ ادا کرے گا جبکہ زارع حاصل شدہ پیداوار پر زکوٰۃ دے گا۔ عمارتوں اور گاڑیوں کی اُجرت اور کرایوں سے حاصل شدہ آمدنی پر زکوٰۃ ہے اور اسی طرح آزاد پیشوں اور کسب و عمل سے حاصل ہونے والی آمدنیوں اور اجرتوں، تنخواہوں، معاوضوں اور مختلف پیشوں سے حاصل ہونے والی آمدنیوں پر زکوٰۃ ہے۔

●

[1] کتاب ہذا، تیسرا باب، ساتویں فصل۔

تیسری بحث

اشخاص پر عائد ہونے والی زکوٰۃ[1]

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ماہرین مالیات نے بلحاظ محل ٹیکس کی تین قسمیں کی ہیں۔

سرمایہ پر عائد ہونے والے ٹیکس

آمدنی پر عائد ہونے والے ٹیکس

اشخاص پر عائد ہونے والے ٹیکس

پہلے دو ٹیکسوں کے بارے میں ہم گفتگو کر چکے ہیں، اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی کون سی قسم تیسری صورت کے ضمن میں آتی ہے۔

اشخاص پر ٹیکس بلا امتیاز ٹیکس دہندہ کی مالی حالت کے ہر فرد پر عائد ہوتا ہے اور اس میں مرد و عورت اور بچے سب شامل ہوتے ہیں اور بسا اوقات کچھ شرائط ہوتی ہیں جو جن افراد میں موجود ہوں ان پر ٹیکس عائد ہوتا ہے، جیسے سیاسی اہلیت کی شرط یا اقلیت کا فرد ہونا وغیرہ۔

اس ٹیکس کے محاسن و معائب اس ٹیکس کی خوبی یہ ہے کہ مالیاتی ادارے کو اس تشخیص کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس ٹیکس کے دہندگان کتنے ہیں کہ سب ہی اس ٹیکس کے دہندگان قرار پاتے ہیں اور محصول میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں، البتہ اس ٹیکس کے خلاف یہ بات جاتی ہے کہ یہ 'اصول مقدرت' کے خلاف ہے اور اس میں دہندہ کی اہلیت ادائیگی ملحوظ نہیں ہے۔ مگر اس خامی کے باوجود بعض جدید ریاستوں میں بھی کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے یہ ٹیکس عائد کیا جاتا ہے مثلاً یہ مقصود ہوتا ہے کہ قوم میں ایک اجتماعی شعور بیدار ہو اور انھیں یہ احساس دلایا جائے کہ

معاشرے کی ذمے داریوں میں سب برابر کے شریک ہیں۔ چنانچہ بعض امریکی ریاستوں میں یہ ٹیکس عائد ہے اور اس کی آمدنی تعلیم اور سڑکوں وغیرہ پر صرف کی جاتی ہے اور فرانس میں بھی یہ ٹیکس موجود ہے اور جو شہری اس سے بچنا چاہے اُسے تین دن راستوں کی مرمت کی خدمت انجام دینی پڑتی ہے[1]

زکوٰۃ الفطر اشخاص پر ٹیکس کی صورت اسلام نے سال میں ایک مرتبہ روزوں کے اختتام اور یوم عید کے موقع پر ہر شخص پر زکوٰۃ الفطر عائد کی ہے اور اس میں یہ خوبیاں رکھی ہیں کہ اس کی فرضیت اور اس کا حصول سہل ہے اور وہ تمام افراد کو عام ہے اور اس کے باوجود شخصی ٹیکس کی تمام خامیوں سے مبرا ہے کہ یہ بہت معمولی ہے اور ہر شخص بآسانی دے سکتا ہے اور ایک عظیم عبادت سے ملحق ہونے کی بنا پر اس روحانی اور اخلاقی فوائد موجود ہیں مزید برآں یہ کہ جو اس کی ادائیگی کی مقدرت نہ رکھے وہ مستثنیٰ ہے

ہر شخص پر سالانہ اس زکوٰۃ کی فرضیت کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان شخص تنگی و فراخی ہر حال میں خرچ کرنے کی عادت رہے، ضرورتمندوں کی ضرورت کا احساس رہے اور بالخصوص ایام مسرت میں نادار مسلمان بھائیوں کو فراموش نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شخص جو خود زکوٰۃ لینے کا مستحق ہو اس کے بھی فطرہ دینے پر ممانعت نہیں ہے کہ حدیث نبوی میں ہے کہ "غنی کو اللہ پاک کر دے گا اور فقیر کو اللہ اس سے زیادہ دے گا جتنا اس نے دیا ہے"

یہی وجہ ہے کہ دور میں مسلمان زکوٰۃ الفطر بڑے اشتیاق سے ادا کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ وہ مسلمان جو زکوٰۃ کی ادائیگی میں تساہل برتتے ہیں فطرہ دینے میں وہ بھی تامل نہیں کرتے۔

---

[1] محمد فؤاد ابراہیم: مبادئ علم المالیۃ العامہ، ج ۱، ص ۳۰۵، ۳۰۷۔

چوتھی فصل

ٹیکس اور زکوٰۃ کے اصول ہائے زکوٰۃ

چونکہ ٹیکس ایک لازمی فریضہ ہے جسے اگر دہندہ از خود نہ دے تو جبراً وصول کیا جاتا ہے اس لیے دور جدید کے ماہرین مالیات نے بعض ایسے اصول تجویز کیے ہیں جو دہندگان کو ظلم اور ناانصافی سے بچاسکیں اور قوانین ٹیکس انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ اور ٹیکس موزوں اوقات میں اس طرح وصول کیے جائیں تاکہ دہندہ مشقت میں نہ پڑے۔ ان ماہرین کی رائے میں ٹیکس کی شرح اور اس کے تعین میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وصول کرنے والے ادارے ان اصولوں کو ملحوظ رکھیں۔

مشہور ماہر معاشیات آدم سمتھ نے اس سلسلے میں درج ذیل چار اصول بیان کیے ہیں۔

عدالت ، یقین ، ملائمت اور اقتصاد [1]

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ میں یہ اصول پہلے ہی ملحوظ رکھے ہیں جنھیں ہم آگے بیان کرتے ہیں۔

پہلی بحث

عدل وانصاف

عدل وانصاف اولین اصول ہے جس کی رعایت ہر ٹیکس میں ملحوظ رہنی چاہیے چنانچہ آدم سمتھ[1] کہتا ہے کہ

"لازم ہے کہ رعایا حکومت کے اخراجات میں اس طرح شرکت کرے کہ ہر فرد کو اس کی آمدنی کے بقدر ادائیگی لازم ہو۔"[2]

ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت نے ہر معاملہ میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور بالخصوص زکوٰۃ میں بھی انصاف کی پوری رعایت موجود ہے کہ عدل اللہ سبحانہٗ کی صفت ہے اور اسی پر زمین وآسمان قائم ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید : ۲۵)

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر۔

زکوٰۃ میں عدل وانصاف کے درج ذیل پہلو ہیں

۱: وجوب زکوٰۃ میں مساوات ہر نصاب زکوٰۃ کے مالک مسلمان شخص پر خواہ وہ کسی بھی رنگ ونسل اور کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا

---

[1] اٹھارہویں صدی عیسوی کا مشہور ماہر معاشیات (ADAM SMITH)

[2] احمد ثابت عریفہ، مقالہ الاسلام وضع الاسس الحدیثۃ للضریبۃ۔

ہو زکوٰۃ یکساں فرض ہے۔ اور اس فریضہ میں حاکم و محکوم، عوام و خواص، اور مذہبی لوگ اور دنیا دار سب برابر ہیں، جبکہ قدیم دور کے مغرب میں شرفاء اور اہل مذہب ٹیکس سے مستثنیٰ ہُوا کرتے تھے [1]

امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ

"زکوٰۃ مردوں، عورتوں، بچوں، بڑوں، ارباب عقل اور مجنوں سب پر فرض ہے کہ ارشاد ربانی ــــــ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا عام ہے اور اس حکم میں تمام افراد شامل ہیں کہ سب کے لیے تزکیہ ضروری ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ۔ انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے اغنیاء سے لی جاتی ہے اور ان کے غریبوں کو لوٹائی جاتی ہے۔ یہ حکم بھی عام ہے اور ہر مسلمان غنی اس میں شامل ہے [2]

۲ : نصاب سے کم مقدار کا استثنا زکوٰۃ میں ایک اصول انصاف یہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ معمولی مال پر زکوٰۃ عائد نہیں کی گئی بلکہ اس مال پر زکوٰۃ عائد کی گئی ہے جو بقدر نصاب ہو، تاکہ زکوٰۃ دہندگان کو سہولت ہو، اسی لیے فرمایا۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (الاعراف : ۱۹۹)

خوب کر معاف کرنا اور کہہ نیک کام۔

اور فرمایا

يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ط (البقرہ : ۲۱۹)

اور پوچھتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں ؟

---

[1] ایضاً۔

[2] المحلی، ج ۵، ص ۱۹۹، ۲۰۰۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے عفو کی تفسیر میں فرمایا کہ اس سے مراد فضل غنی ہے۔

۳: تکرار زکوٰۃ زکوٰۃ کے قانون میں انصاف و عدالت کی سب سے نمایاں صورت یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک ہی سال میں دو مرتبہ عائد نہیں ہوتی کہ فرمان نبوت ہے کہ

"و زکوٰۃ میں تکرار نہیں ہے"[1]

اسی حدیث کی بنا پر ابن قدامہ نے فرمایا ہے کہ ایک ہی سال میں ایک ہی سبب سے دو مرتبہ زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی[2] اور یہ وہ صورت ہے جسے جدید نظام مالیات اور ٹیکس میں تکرار ٹیکس کہا گیا ہے۔

مذکورہ فرمان نبوتؐ کی روشنی میں فقہائے اسلام نے ایسے اصول وضع کیے ہیں اور ایسی بالغ نظر توجیہات بیان کی ہیں جن کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

ا) چنانچہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مال کے مالک نے جن مویشی کی زکوٰۃ دے دی ہے ان کو اس زر نقد کے ساتھ جمع نہیں کیا جائے جس کی زکوٰۃ نہیں دی گئی ہے کہ اس جمع سے تکرار لازم آئے گی کہ مویشی کی حد تک زکوٰۃ مقرر ہو جائے گی اور ایک ہی سبب سے دو مرتبہ زکوٰۃ ہو جائے گی جو کہ از روئے حدیث ممنوع ہے۔[3]

ب) جس شخص نے زر نقد پر زکوٰۃ دے دی، بعد ازاں اونٹ وغیرہ مویشی خریدے اور اس نوع کے مویشی اس کے پاس پہلے بھی موجود تھے تو پہلے سے موجود مویشی کے سال کے اختتام پر زکوٰۃ کی ادائیگی میں ان بعد میں خریدے ہوئے مویشی کی زکوٰۃ نہیں دے گا کیونکہ یہ مویشی اس مال کا بدل ہیں جس کی زکوٰۃ دی جا چکی ہے، اور ایک ہی سال میں اس مال پر دوبارہ زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔[4]

---

[1] روایت ابو عبید (الاموال، ص ۳۷۵، و ابن ابی شیبہ۔

[2] المغنی، ج ۳، ص ۳۴، ۳۵۔

[3] البحر الرائق، ابن نجیم، ج ۲، ص ۲۳۹، ۲۴۰۔

[4] ایضاً۔ المحتار، ج ۲، ص ۲۱۔

ج) کسی شخص نے مویشی جانور بتعداد نصاب برائے تجارت خرید ے تو امام ابو حنیفہؒ ثوریؒ اور احمدؒ کے نزدیک ان مویشی کی زکوٰۃ تجارت ادا کرے گا اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ مویشی کی زکوٰۃ ادا کرے گا، دلیل اس قول کی یہ ہے کہ اس پر اجماع ہے اور پہلی رائے کے قائل حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ مساکین کے حق میں زیادہ بہتر ہے کہ تجارتی سامان میں اضافہ کے ساتھ زکوٰۃ میں اضافہ ہوگا۔[1] بہر حال فقہاء کا اس امر پہ اتفاق ہے کہ زکوٰۃ یا تو بلحاظ تجارت عائد ہوگی یا بسبب سائمہ ہونے کے، ہر دو اعتبار سے زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی کہ اس طرح ایک ہی مال پر ایک ہی سال میں دو مرتبہ زکوٰۃ عائد ہوجائے گی جو کہ از روئے حدیث درست نہیں ہے۔

د) فقہاء نے فرمایا ہے کہ وہ اونٹ گائے جو کھیتوں میں ہل چلانے کے لیے یا پانی دینے کے لیے ہوں ان پر زکوٰۃ نہیں ہے کہ زکوٰۃ پیداوار پر عائد ہوتی ہے اور یہ جانور پیداوار حاصل کرنے کے آلات کے درجے میں ہیں۔[2] ابو عبید نے اس کی وضاحت اس طرح بھی کی ہے کہ در حقیقت پیداوار پر عائد زکوٰۃ کی ادائیگی سے ان جانوروں کی بھی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے جبکہ اگر جانوروں پر علیحدہ سے زکوٰۃ عائد کی جائے تو یہ زکوٰۃ مکرر ہوجائے گی۔[3]

ﮦ) اسی اصول انصاف کے مد نظر اور اس امر کے پیش نظر کہ ایک ہی مال پر دو مرتبہ زکوٰۃ عائد نہ ہو فقہائے احناف نے کہا ہے کہ خراجی زمین پر عشر نہیں لیا جائے گا کہ اس طرح عشر اور خراج جمع ہوجائیں گے جس طرح کہ ایک ہی مال پر مویشی کی زکوٰۃ اور تجارت کی زکوٰۃ جمع نہیں ہوتیں۔[4]

---

[1] المغنی، بحوالہ مذکور۔

[2] الاموال، ص ۳۸۱۔

[3] ایضاً

[4] بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۵۷۔

۵) اصولِ عدل کی تطبیق ہی کے لیے جمہور فقہاء نے کہا ہے کہ مال کا قرض سے فارغ ہونا شرط زکوٰۃ ہے، اس لیے کہ جو مال قرض میں ادا ہونا ہے وہ معدوم کی طرح ہے بلکہ وہ مقروض شخص جس کے پاس ادائے قرض کے بعد مال باقی نہ بچے وہ تو غنی بھی نہیں ہے بلکہ اہلِ احتیاج میں سے ہے اور اس میں اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ برابر ہیں۔
بعض فقہائے نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ مقروض کی ملکیت ہی مال قرض پر کمزور ہے اور بعض دیگر فقہاء نے کہا ہے کہ قرض خواہ بھی اس مال پر زکوٰۃ ادا کرے گا تو اگر مقروض پر بھی زکوٰۃ عائد ہو تو ایک ہی مال پر دو مرتبہ زکوٰۃ عائد ہو جائے گی جو کہ از روئے حدیث ممنوع ہے [1]
مختصر یہ کہ ایک ہی مال پر سال واحد میں دو مرتبہ زکوٰۃ آجانے کی ہر صورت ممنوع ہے۔

۴: محنت کے لحاظ سے مقدار زکوٰۃ میں فرق

اسلام کی عدالت یہ ہے کہ اس نے زکوٰۃ کی مقداروں میں انسانی جہد و کاوش کے اعتبار سے فرق ملحوظ رکھا ہے اور اس کی واضح مثال یہ ہے کہ وہ زمین جو بغیر آلات کے سیراب ہو (بارانی زمین) اس پر عشر ہے اور جو زمین انسانی کاوش سے سیراب ہو اس پر نصف عشر ہے اسی طرح کنز اور کان وغیرہ سے حاصل ہونے والا مال محنت کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے اس لیے اس پر خمس عائد ہوتا ہے۔
یہ اصول انتہائی مبنی بر انصاف ہے اور ہمارے علم کی حد تک نظام ہائے ٹیکس میں سے کسی نظام نے اس کو ملحوظ نہیں رکھا ہے حالانکہ ماہرین مالیات کو شریعت اسلامیہ کے اس زریں اصول پر غور کرنا چاہیے اور اس حقیقی فرق کو سامنے رکھنا چاہیے کہ نظام ہائے ٹیکس میں صرف آمدنی ٹیکس کے مصدر کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس امر کی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی کہ حاصل شدہ آمدنی میں کس قدر انسانی محنت صرف ہوئی ہے۔

۵: ٹیکس دہندہ کے شخصی حالات

زکوٰۃ میں عدالت و انصاف کی مکمل رعایت

---

[1] المجموع، ج ۵، ص ۳۴۶۔

ملحوظ رکھنے کی خاطر زکوٰۃ دہندہ کے ذاتی حالات کی بھی رعایت کی گئی ہے، جبکہ نظام ٹیکس میں عین مال پر عائد ہونے والے ٹیکس مال کو مدِنظر رکھ کر عائد کیے جاتے ہیں اور ان میں ٹیکس دہندہ کے حالات و ظروف کو مدِنظر نہیں رکھا جاتا جبکہ شخصی ٹیکس میں یہ امور ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

۱) حدِ کفایت تک ٹیکس کا استثناء۔

۲) آمدنی کے مصدر کی رعایت۔

۳) اخراجات اور واجبات کو منہا کر کے خالص آمدن پر ٹیکس۔

۴) خاندانی ذمے داریوں کی رعایت۔

۵) فرضیت کی رعایت۔

اسلام نے پہلے ہی زکوٰۃ کی فرضیت میں ان امور کو ملحوظ رکھا ہے بلکہ دیگر ایسے امور بھی اسلام نے ملحوظ رکھے ہیں جن کی جانب ہنوز انسانیت کی رسائی نہیں ہوسکی اور اسلام کی یہ تعلیمات اس وقت منصۂ شہود پر آئیں جب دنیا کے معاشیات میں عین مال پر ٹیکس اور شخصی ٹیکس میں کوئی فرق سرے سے موجود نہیں تھا۔

ا) ایک مقررہ نصاب سے کم مقدار مال فرضیت زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اسلام میں زکوٰۃ اغنیاء پر فرض ہے تاکہ وہ ان کے فقراء کو لوٹائی جائے اور نصاب اسی غنی کی کم سے کم حد ہے۔

ب) ایک کم سے کم حد مال کی جو فرد کی اور اس سے متعلق افراد کی ضرورتوں کے لیے لازمی ہو، فرضیت زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دی گئی اور فقہاء نے وجوبِ زکوٰۃ کی یہ شرط بیان کی کہ وہ مال جس پر زکوٰۃ عائد ہو رہی ہے زکوٰۃ دہندہ کی حاجات اصلیہ سے زائد ہو خود قرآن نے فرمایا — قل العفو — یعنی زائد از ضرورت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"زکوٰۃ تونگر (غنی) ہی پر عائد ہوتی ہے"

ج) اگر قرض مقروض کے تمام مال کے بقدر ہو، تو اس مقروض کو وجوبِ زکوٰۃ سے

مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ہم پہلے ہی قرآن و سنت کی روشنی میں اس اصول کی وضاحت کر چکے ہیں[1]

اس مقام پر فقہائے احناف کی رائے ذکر کر دینا مناسب ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ جس شخص پر اتنا قرض ہو جو اس کے تمام مال پر حاوی ہو اور اس کے ذمے مطالبات بھی ہوں، مثلاً زکوٰۃ کی اور قرض کی ادائیگی، کسی شئے کی قیمت تلف ہو جانے والی کسی شئے کا تاوان اور بیوی کا مہر وغیرہ خواہ یہ واجبات فوری ادائیگی کے متقاضی (معجّل) ہوں یا ان کی ادائیگی بعد میں (موجّل) کی جا سکتی ہو، ہر حال میں اس شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ مقروض کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی اصل ضرورتوں کے لیے ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے حقیقتاً یا تقدیراً ہلاکت کو دور کر سکے اس لیے کہ اسے مطالبہ حبس اور اللہ کے مواخذہ سے بچنے کے لیے قرض کی ادائیگی ضروری ہے کہ قرض اس کے اور جنت کے درمیان حائل ہے اور اس سے بڑی آدمی کی کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی، غرض اس مال کی حیثیت ایسی ہوئی جیسے پینے کی ضرورت کے بقدر پانی کی موجودگی میں تیمم روا ہو جاتا ہے اور پہننے کے کپڑے شرعاً معدوم متصور ہوتے ہیں اور ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی خواہ وہ بقدر نصاب ہی کیوں نہ ہوں۔

۴) زکوٰۃ اخراجات اور ذمے داریوں کے استثناء کے بعد عائد ہوتی ہے جو کہ حضرت عطاءؒ کی رائے ہے وہ فرماتے ہیں کہ — زمین اور فصل کی پیداوار میں سے اپنے اخراجات نکال کر باقی پر زکوٰۃ ادا کرو، اور یہی نفقات اگر قرض کی صورت میں ہوں تو ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کی بھی یہی رائے ہے، اسی طرح حضرت امام احمدؒ سے مروی ہے کہ اگر نفقات قرض ہوں تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں، مثلاً بیج یا پیداوار پر قرض دینے والے بنک کا قرض ہو، اور اسی پر عمارتوں اور کارخانوں وغیرہ کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ کیجیے اسی کتاب میں مال زکوٰۃ سے متعلق شرائط کا بیان۔

تجارت میں سے بھی نفقات اسی وقت مستثنیٰ ہوں گے اور سال کے آخر میں بچنے والے اصل مال اور منافع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر کسی قسم کے اخراجات مثلاً دکان کا کرایہ قرض ہو تو وہ منہا کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۵) جیساکہ پچھلی فصل میں بیان ہو چکا ہے زکوٰۃ میں آمدنی کی کیفیت بھی مدِنظر رکھی گئی ہے یعنی زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی پر عشر اور نصف عشر زکوٰۃ ہے، لیکن تنخواہوں، اجرتوں اور آزاد پیشوں سے ہونے والی آمدنیوں پر رُبع عُشر زکوٰۃ ہے۔

نفاذ زکوٰۃ میں انصاف کی رعایت

اسلام نے نظامِ زکوٰۃ کے قوانین میں عدل کی واضح صورتوں اور انصاف کے روشن پہلوؤں ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان قوانین کے نفاذ اور ان کے اجراء میں بھی عدل و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور عاملین زکوٰۃ کو ہر طرح کی ہدایت اور راہنمائی کی ہے کہ وہ انصاف کریں اور عدل سے کام لیں، کیونکہ عدل و انصاف اپنے حقیقی معنی میں اسی وقت جاری ہو سکتا ہے جب اس کو نافذ کرنے والے افراد کے دلوں میں وہ ایمان کے درجے میں سرایت کیے ہوئے ہو ورنہ تو انصاف کے ضابطے قانون کی کتاب میں لکھے ہوئے رہ جائیں گے، اور کوئی ان پر عمل کرنے والا نہ ہوگا۔

چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کو لکھا کہ

"کسی امانت دار، قابلِ اعتماد، پاکدامن، ناصح اور آپ کے اور رعایا کے حق میں موزوں فرد کو جمع صدقات پر مامور کیجیے وہ لوگوں کے پاس جائے اور نرمی سے ان کے مسلک، طریقہ آمدنی، اور امانتوں کے بارے میں دریافت کرے اور صدقات جمع کرے۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ فی الوقت عمال خراج جن لوگوں کو صدقات کی وصولیابی پر روانہ کرتے ہیں وہ ظلم اور زیادتی روا رکھتے ہیں۔ حالانکہ نیک اور پارسا لوگ اس کام پر مامور ہونے چاہئیں۔"[1]

---

[1] الخراج، ص ۸۰۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"صدقہ پر عامل غازی فی سبیل اللہ کی طرح ہے" [1]

نیز آپؐ نے ایک عامل سے فرمایا کہ

"اے ابوالولید خدا سے ڈرو تاکہ روزِ قیامت یہ نہ ہو کہ کوئی اونٹ گائے اور بکری چیختی ہوئی آئے" [2]

●

---

[1] احمدؒ، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ الترغیب والترہیب، ج ۱، ص ۵۵۹۔ ط۔ الحلبی۔ الحاکم، ج ۱، ص ۴۰۶۔ حاکم نے شرط مسلم کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔

[2] طبرانی، اس حدیث کی سند صحیح ہے، بحوالۂ مذکورہ، ص ۵۶۳۔

بحث دوسری

تیقن

ٹیکس کے سلسلے میں تقاضائے انصاف کا دوسرا اصول تیقن ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مالدار شخص جس پر ٹیکس عائد ہو اُسے یقینی طور پر یہ معلوم ہو کہ اُسے کس قدر ٹیکس دینا ہے اور طریقۂ ادائیگی کیا ہے چنانچہ آدم سمتھ کہتا ہے کہ مالدار شخص کا یہ علم بے حد ضروری ہے کہ اس پر کیا مالی ذمے داریاں عائد ہیں کیونکہ اس کا علم نظام ٹیکس میں عدالت کا ثبوت ہے۔ اس بارے میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ ٹیکس دہندہ کو تیقن اسی وقت حاصل ہو گا جب وہ ایک معین ٹیکس ادا کرنے کا عادی ہو، اس کے احکام سے واقف ہو اور اس کے ضروری سے باخبر ہو، اسی بنا پر ٹیکس کے بعض ماہرین نے کہا ہے کہ پرانا ٹیکس جدید ٹیکس کی بہ نسبت زیادہ درست ہے، کیونکہ ٹیکسوں کی ردوبدل سے عدم اطمینان پیدا ہوتا ہے اور لوگ حکومت کی نیت پر شک کرنے لگتے ہیں[1]

زکوٰۃ میں تیقن کا اصول پوری طرح موجود ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی مقدار کی تحدید فرما دی ہے اور قرآن و سنّت میں اس کی تفصیلات ذکر کر دی گئی ہیں اور فقہ اسلامی میں اس کی وافر تشریحات موجود ہیں۔ اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ ان احکام کا ضروری علم حاصل کرے۔

غرض زکوٰۃ کا قانون غیر متغیر ہے اور اس میں ٹیکسوں کی طرح ردوبدل نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک فقہی اختلاف کا تعلق ہے تو دورِ جدید میں تدوینِ فقہ کر کے کسی ایک موزوں رائے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

●

---

[1] فؤاد ابراہیم ، مبادئ علم المالیۃ العامہ ، ص ۲۶۷ ۔

بحث تیسری

نرمی

آدم سمتھ کہتا ہے کہ ٹیکس میں انصاف کا تیسرا اصول نرمی ہے اور ٹیکس دہندگان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا ہے تاکہ وہ بغیر کسی شکوہ شکایت کے ٹیکس ادا کریں۔ اسلام نے اس اصول کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور متعدد ہدایات دی ہیں چنانچہ

۱) عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ

"زکوٰۃ وصول کنندگان زکوٰۃ کے جانوروں کو اپنے پاس نہ منگوائیں اور نہ ہی صاحب مال افراد زکوٰۃ کی تشخیص کے وقت غیر موجود رہیں۔ اور زکوٰۃ، زکوٰۃ دہندگان کے گھروں پر وصول کی جائے۔"[۱]

اس حدیث میں لاجَلَبَ اور لاجَنَبَ کے الفاظ آتے ہیں، جس کے معنی خطابی نے یہی بیان کیے ہیں کہ زکوٰۃ کے مال کو زکوٰۃ وصول کنندگان کے پاس نہ لے جایا جائے اور زکوٰۃ دہندگان مال سے دور نہ جائیں[۲] لاجنب کے یہ معنی بھی بیان کیے گئے ہیں کہ زکوٰۃ وصول کنندہ دور دراز مقام پر ہو اور وہاں مال زکوٰۃ لے جایا جائے[۳] امام شوکانی رح فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ وصول کنندہ کو جہاں مال موجود ہو وہیں آکر زکوٰۃ کا حساب کرنا چاہیے۔[۴]

۱؎ نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۶۔ مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۷۹۔

۲؎ معالم السنن، ج ۲، ص ۲۰۵۔

۳؎ نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۶، ۱۵۷۔

۴؎ ایضاً۔

وصول کیا کرتے تھے [1]

امام مالکؒ مؤطا میں ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا کہ سب سے پہلے عطیات پر زکوٰۃ معاویۃ بن ابی سفیان نے وصول کی [2] بظاہر ان کی مراد خلفا میں سب سے پہلے زکوٰۃ وصول کرنے والے سے ہے ورنہ درحقیقت عطیات پر سب سے پہلے زکوٰۃ عبداللہ بن مسعودؓ نے وصول کی۔

(۹) ان مستفاد آمدنیوں پر زکوٰۃ کا وجوب عام اسلامی ہدایات کے مطابق اور ایک مسلمان کے دل میں اس سے ہمدردی، ایثار، نیکی اور بخشش کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور معاشرے کا احساس اور اس کے بوجھ اٹھانے کا جذبہ بیدار رہتا ہے، جو کہ ایک مسلم معاشرے میں ہر مسلمان کی خصوصیات ہوتی ہیں اور مسلمان کی شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہیں ــــ اسی لیے قرآن نے متقین کے اوصاف کے بارے میں فرمایا ہے کہ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ : ۳)

جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اور فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ : ۲۵۴)

اے لوگو، جو ایمان لاتے ہو، جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

اور اسی لیے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ

"ایک مسلمان پر صدقہ واجب ہے اس کے مال پر، اس کے کسب پر اس کے عمل پر اور ہر اس شئے پر جسے وہ دے سکے"

---

[1] [illegible]

[2] المنتقی علی المؤطا، ج ۲، ص ۹۵۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابو موسی اشعریؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ ہے، صحابہؓ نے عرض کی اے اللہ کے نبیؐ! اگر کوئی نہ پائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے عمل کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور صدقہ بھی کرے، صحابہؓ نے عرض کی، اگر اسے عمل بھی نہ ملے، آپؐ نے فرمایا کہ ضرورتمند بے کس کی مدد کرے، صحابہؓ نے عرض، کہ اگر ایسا بھی نہ کر سکے، آپؐ نے فرمایا، کہ معروف عمل کرے برائی سے بچے، یہ ہی اس کے لیے صدقہ ہے۔[1]

غرض ان نو بہ نو آمدنیوں کو سال گزرنے کی شرط کی وجہ سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے دینا، بہت سے لوگوں کو آزاد چھوڑ دینا ہے کہ وہ کسب کرتے رہیں، خرچ کرتے رہیں اور خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں، لیکن اسے راہِ خدا میں خرچ نہ کریں، اس اللہ کی نعمت سے کسی کے ساتھ حسن سلوک نہ کریں۔

(۱۰) اگر مال مستفاد پر سال گزرنے کی شرط نہ ہو تو یہ مال زکوٰۃ کے ضبط اور تنظیم میں ممد ثابت ثابت ہوگا اور اس طرح زکوٰۃ دہندگان اور زکوٰۃ کے وصول کرنے والے ادارے میں تنظیم میں زیادہ سہولت پیدا ہوگی۔ اس لیے کہ سال گزرنے کی شرط سے یہ لازم آئے گا کہ ہر کم وبیش مال مستفاد، تنخواہ، معاوضہ، اور دیگر آمدنیوں کی آمد کی تاریخ درج کرنا ہوگی اور سال کے اختتام کی تاریخ بھی متعین کرنا ہوگی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک مسلمان سال بھر میں حاصل ہونے والے مختلف مال مستفاد کی دسیوں تاریخیں منضبط رکھے گا جو کہ یقیناً ایک دشوار امر ہوگا، اور اگر حکومت زکوٰۃ خود وصول کرے تو یہ امر اور بھی زیادہ دشوار ہو جائے گا اور زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے نظام کے چلنے میں تعویق کا سبب بنے گا۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب علی کل مسلم صدقۃ۔ ج ۲، ص ۱۴۳۔

بحث چوتھی

اقتصاد

نظامِ ٹیکس میں عدالت کا یہ چوتھا بنیادی اصول ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے میں اقتصاد برتا جائے اور اسراف سے دُور رہا جائے یعنی وہ ٹیکس جو ملازمین کی تنخواہوں اور دیگر اداروں اور تنظیمی امور میں صرف کیے جائیں، نیز اس کا مقصود یہ ہے کہ ٹیکس دہندگان کو اوقات و مال کے اس ضیاع سے بچایا جائے جو انھیں مالی اداروں کے چکر لگانے، اپنے توضیحات پیش کرنے، اپنے حسابات کی پڑتال کروانے، شکایات درج کروانے اور زیادتیوں کے رفع کروانے میں ہو سکتا ہے۔
یہ امر مخفی نہیں ہے کہ ٹیکس دہندگان اس لیے ٹیکس ادا کرتے ہیں کہ ریاست ان محصولات کے ذریعے عام اخراجات پورے کرے جس سے خود ٹیکس دہندگان کو بھی فائدہ پہنچے، لیکن اگر ٹیکس دہندہ کو یہ احساس ہو کہ اس کے ادا کردہ ٹیکس کا مصرف صحیح نہیں ہے اور اس کا بیشتر حصہ مالیاتی اداروں کے انتظام و انصرام پر ہی خرچ ہو جاتا ہے تو وہ اسے بُرا محسوس کریں گے اور اکتا جائیں گے اور ٹیکس کی ادائیگی سے گریز کے طریقے اختیار کریں گے۔

اسلام بالعموم اعتدال اور اقتصاد کا حکم دیتا ہے اور اسراف اور افراط سے منع کرتا ہے اور بالخصوص مال زکوٰۃ میں اس کی بے حد تاکید کی ہے چنانچہ روایات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے وصول کرنے والوں کو اقتصاد و عدل کا حکم فرمایا اور

کسی عامل کے ہدیہ لینے پر بھی سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور یہ حکم دیا کہ عاملین جس مقام سے زکوٰۃ وصول کریں اُسے وہیں تقسیم کردیں اور جب واپس آئیں تو ان کے پاس کچھ نہ ہو اور ریاست پران کی معتدل تنخواہ کی ذمّے داری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عاملین کو زکوٰۃ کے محصولات میں سے آٹھواں حصّہ دیا جائے اور اس سے زائد نہ دیا جائے کیوں کہ ان کے نزدیک زکوٰۃ آٹھ مصارف میں برابر تقسیم کرنا ضروری ہے۔

بعد کے فقہائے اُمت کے اقوال کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ رائے "معتمد علیہ مسالک اربعہ" سے انحراف ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ اللہ اور رسولؐ کی ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے جس میں بہر حال میں ان ائمہ کی تقلید حکم دیا گیا ہو اور ان کی رائے سے گریز حرام قرار دیا ہو، بلکہ خود ان ائمہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے[1] بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تقلید سے منع کیا ہے۔ جیسا کہ ہم مقدمۂ کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔

*****

---

[1] ملاحظہ کیجیے۔ مقدمہ جس میں اقوال فقہیہ کے درمیان موازنہ اور اختیار کے قواعد کی وضاحت کی گئی ہے۔

بحث دوم

کسب عمل اور آزاد پیشوں کی آمدنیوں کا نصاب

اسلام نے ہر کم و بیش مال پر زکوٰۃ عائد نہیں کی ہے بلکہ اس مال پر زکوٰۃ واجب کی ہے جو بقدر نصاب ہو اور قرض سے فارغ اور اصلی اور حقیقی ضروریات (الحوائج الاصلیہ) سے زائد ہو۔ اسی سے غنیٰ (مالداری) کا وہ مفہوم پیدا ہوتا جس پر زکوٰۃ واجب ہے کہ زکوٰۃ اغنیاء سے لی جاتی ہے اور اسی عفو کا مفہوم نکلتا ہے جس کو قرآن نے محلِ انفاق بتایا ہے (عفو جو زائد از ضرورت ہو) اور فرمایا کہ

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ : ۲۱۹)

پوچھتے ہیں کہ ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"صدقہ صرف مالداری پر ہے"

اور فرمایا کہ

"اس سے شروع کرو جس کی تم کفالت کرتے ہو"

- چونکہ زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب نصاب موجود ہو۔ تو یہاں نصاب کی مقدار کیا ہو؟

استاذ الغزالیؒ نے اپنے سابق کلام میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ان کے نزدیک زرعی پیداوار اور پھلوں کے نصاب کا اعتبار ہے، یعنی جس کی آمدنی اس قدر ہو جس قدر زرعی پیداوار پر ایک کاشتکار پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے تو اس پر زکوٰۃ عائد ہو جائے گی۔

ہو گئی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان جانوروں میں بچوں کی کثرت ہوتی ہے اور بھیڑیں اور بکریاں سال میں ایک سے زائد مرتبہ اور ہر مرتبہ میں ایک سے زائد بچے دیتی ہیں، اگر ہر چالیس پر ایک بکری کی شرح آگے بھی چلے تو یہ بچے بھی اس تعداد میں شمار ہوں گے، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپؓ نے فرمایا کہ بچوں کو بھی شمار کرو اگرچہ چرواہا بچہ کو ہاتھوں پر اٹھا کر لاتے۔ بہرحال اس سے یہی معلوم ہوا کہ حیوان میں چالیسواں حصہ ہی زکوٰۃ ہے جیسا کہ ابراہیم نخعی اور امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ گھوڑوں کی قیمت لگا کر اس پر چالیسواں حصہ زکوٰۃ عائد ہوگی۔

زکوٰۃ میں تصاعدی اصول کو کیوں مدِ نظر نہیں رکھا گیا

اس سوال کا جواب کہ زکوٰۃ میں تصاعدی پہلو کو کیوں مدِ نظر نہیں رکھا گیا بے حد اہم ہے اس لیے کہ دورِ جدید میں ٹیکس کی اس قسم کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور اس کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ اس سے امیری اور غریبی کا فرق کم ہو جاتا ہے اور معاشرے میں اقتصادی توازن پیدا ہوتا ہے۔

میری نظر میں زکوٰۃ میں تصاعدی پہلو کے نہ ہونے کی اہم وجوہ حسبِ ذیل ہیں۔

الف) زکوٰۃ ایک دائمی دینی فریضہ ہے اور جب تک انسان اور اسلام باقی رہے گا یہ فریضہ بھی باقی رہے گا اور ہر مسلمان سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ رہے گا اور ظروف و حالات سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب کہ تصاعدی ٹیکس خاص حالات کے علاج کے طور پر اور کسی ملک سے متعلق مخصوص اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے لگایا جاتا ہے اسی لیے اس کی شرح اوپر نیچے کی جانب گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور جب ضرورت نہ ہو تو اسے بالکل ختم بھی کر دیا جاتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ شریعتِ اسلامیہ علاوہ زکوٰۃ کے کوئی اور ٹیکس لگانے سے مانع نہیں ہے بلکہ اولوالامر کو اجازت ہے کہ وہ آمدنیوں کے فرق، بجٹ کی ضرورتوں اور عدمِ توازن

کے اسباب کی بنا پر تصاعدی اور غیر تصاعدی ٹیکس عائد کر سکتے ہیں جن سے زیادتی اور ناانصافی کا قلع قمع ہو، عدل قائم ہو اور ریاست کی ضرورتیں پوری ہوں، بشرطیکہ یہ ٹیکس فی الواقع ضرورت کے مطابق ہوں اور اہلِ شوریٰ سے رائے لی گئی ہو اور کتاب اور میزان سے راہنمائی لی گئی ہو جو اللہ نے اپنے پیغمبر پر اسی لیے اتاری ہیں تاکہ لوگ راستی (قسط) قائم کریں۔

ب) زکوٰۃ اپنے مصارف کے لحاظ سے بدرجۂ احسن ان مقاصد کو پورا کرتی ہے جو تصاعدی ٹیکس میں متصور کیے گئے ہیں چنانچہ زکوٰۃ سے دولت کے وسیع فاصلے کم ہوتے ہیں، اور کمزور غریب طبقوں کا معیار بلند ہوتا ہے کیونکہ زکوٰۃ سے منتفع ہونے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی کوئی آمدنی نہ ہو یا ہو تو محدود ہو، مثلاً فقراء، مساکین، غارمین اور ابن السبیل۔

بیشتر ٹیکس دولت مند طبقے سے اس لیے لیے جاتے ہیں کہ انھیں بالواسطہ طور پر واپس کر دیے جائیں مثلاً زرعی زمین پر ٹیکس اس لیے لیا جاتا ہے کہ اس کا اکثر حصہ اصلاح اراضی پر صرف کیا جائے جبکہ زکوٰۃ امراء سے لے کر براہ راست فقراء اور ذوی الحاجات کو لوٹائی جاتی ہے اور دین اسلام اور اسلامی ریاست کے بعض مصالح پر صرف کی جاسکتی ہے۔ یعنی زکوٰۃ اغنیاء سے اس لیے وصول کی جاتی ہے کہ فقراء کا معیار بلند ہو اور افرادِ معاشرہ کے درمیان دولت کے فرق کو مٹا کر توازن قائم کیا جائے اور اس طرح تصاعدی ٹیکس کا مقصود بدرجۂ اولیٰ حاصل ہو جائے۔

ج) تصاعدی ٹیکس کے قائلین جو مقاصد اور اہداف اس ٹیکس کے بیان کرتے ہیں اسلام ان مقاصد کو اور ذرائع سے بھی حاصل کرتا ہے، مثلاً اسلام نے میراث اور وصیت کے قوانین جاری کیے ہیں اور اسلام کسب حرام سے حاصل ہونے والے مال کو ضبط کر لینے کا حکم دیتا ہے اور اسلام سود کو اور ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار دیتا ہے اور ان سب ذرائع سے ملکیتوں میں کٹوتیاں واقع ہوتی ہیں، مختلف طبقات قریب قریب آتے ہیں اور عدل قائم ہوتا ہے۔

د) خود نظریۂ تصاعد پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں اور مالیاتی اور اقتصادی مفکرین نے درج ذیل اشکالات ظاہر کیے ہیں۔

- تصاعدی ٹیکس کے گروپ کی تحدید کسی مضبوط اساس پر قائم نہیں ہوتی بلکہ محض ایک تعسف اور تحکم پر ہوتی ہے اس لیے کہ مساوات تضحیہ کا جو اصول بیان کیا جاتا ہے، اس کے کوئی مستقل ضوابط موجود نہیں ہیں کہ کیا یہ مساوات ا یا ۲ کی زیادتی کی نسبت سے ہے یا زیادہ، کیا یہ تصاعد آمدنی کے ساتھ ہے، کیا جن لوگوں پر یہ ٹیکس عائد ہوتا ہے ان کے طبقات ہیں، کیا آمدنی اجزا میں منقسم ہو سکتی ہے.... یہ چند دشواریاں ہیں جو نظام تصاعدی میں پیش آتی ہیں اور تعسف کے دائرہ کو بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔[1]
- مسلسل تصاعد حسابی لحاظ سے ایک عملی استحالہ پر منتج ہوتا ہے کیونکہ اس تصاعد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر ٹیکس کی شرح آمدنی سے بڑھ جاتی ہے۔
- تصاعدی ٹیکس سے مالدار طبقوں پر زد پڑتی ہے اور سرمایہ کے ذخائر ختم ہو جاتے ہیں بالخصوص اشتراکی ممالک میں طبقاتی کشمکش اسی جانب لے جاتی ہے۔
- تصاعدی ٹیکس سے بچت اور منافع بخش کاموں میں سرمایہ لگانے کی کشش ختم ہو جاتی ہے جس سے پیداواری سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں۔[2]

---

[1] رشید الدقر: علم المالیہ، ص ۳۷۹۔

[2] فؤاد ابراہیم: مبادئ علم المالیہ، ج ۱، ص ۲۷۹۔

چھٹی فصل

ٹیکس کی ضمانتیں اور زکوٰۃ کی ضمانتیں

ٹیکس سے فرار ٹیکس میں آدمی کو اپنا مال دینا پڑتا ہے جس کی محبت اس کے دل میں رچی بسی ہے یہی وجہ ہے کہ ٹیکس دہندگان مختلف حیلوں بہانوں سے ٹیکس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ جو عام حالات میں لوگوں سے امانت دارانہ معاملات کرتے ہیں وہ بھی حکومت کو، جو ایک معنوی وجود ہے ٹیکس دینے سے گریز کا جذبہ رکھتے ہیں۔

فرار کے اسباب اس فرار کے متعدد نفسیاتی عوامل ہیں مثلاً یہ کہ ہر مالدار شخص چاہتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس باقی رہے یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو ٹیکس اس سے لیا جا رہا ہے وہ مبنی بر انصاف نہیں ہے، یا اس کا خیال ہے کہ وہ جو ٹیکس دیتا ہے حکومت کی جانب سے اسے فلاحی اقدامات کی صورت میں اس کا صلہ نہیں ملتا یا وہ سمجھتا ہے کہ حکومت ٹیکسوں کی رقوم کو مفاد عامہ میں صرف نہیں کرتی، یا اس کی رائے میں حکومت وصول زیادہ کرتی ہے اور دیتی کم ہے، یا بعض لوگ اس لیے ٹیکس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ ایسا کر رہے ہیں، یا ٹیکس دہندہ ایک ٹیکس سے فرار اس لیے چاہتے ہیں کہ یہ دوسرے ظالمانہ ٹیکس کا بدل ہو جائے۔ وغیرہ۔

جس قدر ٹیکس بھاری ہوگا لوگوں کا فرار کا جذبہ اسی قدر زیادہ ہوگا اسی طرح ٹیکس دہندگان اس صورت میں بھی ٹیکس سے فرار چاہیں گے جب وہ ٹیکسوں کے وجوب اور ان کے مصارف سے مطمئن نہ ہوئے ہوں۔

فرار کے اسالیب ٹیکس سے فرار کے مختلف طریقے ہیں چنانچہ قانون میں موجود خامیوں سے بھی ٹیکس دہندگان ٹیکس سے بچنے کی سعی کرتے ہیں اور بعض اوقات غلط گوشوارے داخل کر دیتے ہیں یا مشینری اور آلات پر آنے والے اخراجات بڑھا چڑھا کر دکھاتے ہیں اور بسا اوقات دولت کو چھپا لیتے ہیں۔

فرار کے نقصانات بہرحال بہت سے لوگ ٹیکسوں سے فرار کے مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں جن سے متعدد نقصانات رونما ہوتے ہیں۔

ا) خزانے کو نقصان پہنچتا ہے اور اس کے محصولات میں کمی آجاتی ہے۔

ب) کچھ افراد پورے ٹیکس ادا کرتے ہیں، ٹیکس چوری سے اصل وزن غیر منصفانہ طور پر ان کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔

ج) محصولات میں کمی پھر مزید ٹیکسوں کے عائد ہونے کا سبب بنتی ہے۔

د) محصولات میں کمی کی بنا پر بہت سے مفید منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچنے سے رہ جاتے ہیں۔

ھ) اس دھوکہ دہی اور بے ایمانی سے عام اخلاقی حالت کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

فرار کا سدِّباب اور حصولِ ٹیکس کی ضمانتیں جدید مالی قوانین میں ٹیکس سے فرار کے سدِّباب کے لیے بعض ضوابط بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ مثلاً

ا) مالی اداروں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ ٹیکس دہندہ کا حساب اور ضروری کاغذات چیک کر سکتے ہیں۔

ب) ٹیکس دہندہ اپنے حقیقی گوشوارے داخل کرے، بلکہ بعض ملکوں میں یہ بھی شرط ہے کہ یہ بیانات حلفیہ ہوں، اور عدم صحتِ بیان کی صورت میں سزا بھی رکھی گئی ہے۔

ج) جس شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ اس نے اپنے گوشوارے غلط داخل کیے ہیں اس سے ہرجانہ وصول کرنا۔

د) ملازمین وغیرہ کی تنخواہوں اور آمدنیوں سے ادائیگی سے پہلے ہی ٹیکس وضع کر لینا۔

۵) ٹیکس چوری کرنے والوں پر دیوانی اور فوجداری جرمانے عائد کرنا۔

۶) ٹیکس کے مفروض پر خزانے کا امتیازی حق ہو اس کے دوسرے قرض خواہوں پر ترجیح کا حامل ہو۔[1]

ان سب ضوابط کے باوجود مالیاتی ادارے ٹیکس سے فرار کو ختم کرنے میں اپنے عجز کا اظہار کرتے رہتے ہیں بالخصوص ان اموال میں جن کو چھپایا جا سکتا ہے، کیونکہ درحقیقت اس کا تعلق قانون کی دفعات سے نہیں ہے بلکہ ضمیر کی اصلاح سے ہے۔

شریعت اسلامیہ میں زکوٰۃ کی ضمانتیں زکوٰۃ کی صورت حال ٹیکس کی اس مذکورہ صورت حال سے قطعی طور پر مختلف ہے اور مسلمان زکوٰۃ کو اس زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے جس زاویۂ نظر سے ٹیکس دہندگان ٹیکس کو دیکھتے ہیں۔

دینی اور اخلاقی ضمانتیں مسلمان زکوٰۃ کو اپنے اور حکومت کے درمیان ایک معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ اپنے اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ تصور کرتا ہے اور یہی زکوٰۃ کے عبادت ہونے کا مفہوم ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس مفہوم کو ابوبکر بن العربی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ

"حقیقی مستحق اللہ سبحانہ ہے اور اس نے اپنے اس حق کو ان لوگوں کی جانب منتقل فرما دیا ہے جن کے رزق کی ذمے داری وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقہا کہہ کر خود اپنے ذمے لی ہے۔"

امام کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ

"مال کے ایک حصہ کو اللہ کے لیے علیحدہ کر دینا زکوٰۃ ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس مال کا فقیر کو مالک بنا دے، یا جو اللہ سبحانہ کا نائب ہو لہ بالدار سے لے کر فقیر کو دے اسے مالک بنا دے، چنانچہ فرمایا۔

---

[1] عبدالحکیم الرفاعی، حسین خلاف: مبادئ النظریۃ العامۃ للضریبۃ

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ (التوبہ : ۱۰۴)

کیا جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں سے اور لیتا ہے زکاتیں۔

اور فرمان نبوی ہے کہ

"صدقہ فقیر کے ہاتھ میں جانے سے پہلے رحمٰن کے ہاتھ میں جاتا ہے" [۱]

غرض زکوٰۃ عبادت ہے اور عبادت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ عمل پوری طرح خالصاً للہ کیا جائے۔ [۲]

زکوٰۃ دہندہ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ کے ذریعے اس پر کوئی زیادتی ہو رہی ہے اس لیے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ زکوٰۃ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ سبحانہٗ سراپا عدل ہے اور وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا کہ وہ خود رب العباد ہے۔

جب مسلمان کا تصور ہی یہ ہے کہ زکوٰۃ اس کے اور اس کے رب کے درمیان ایک معاہدہ ہے جو ہر پوشیدہ اور خفیہ بات کو جانتا ہے اور جو جانتا ہے کہ اللہ نقیر اور قطمیر (ریزے اور دانے) کا بھی حساب کرے گا، تو اس کے زکوٰۃ سے فرار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لحاظ سے مسلم کی تربیت اسلامی ہی ادائے زکوٰۃ کی سب سے بڑی ضمانت

---

[۱] ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اس خبر کو ابن مسعودؓ تک موقوف روایت کیا ہے۔ الآثار، ۱۷۱۶۳، ۱۷۱۶۶۔ تفسیر الطبری، ج ۱۴، ص ۴۵۹، ۴۶۱۔ ط۔ المعارف۔ یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ کہ آدمی جب صدقہ کرے تو کسب طیب سے صدقہ کرے کیونکہ اللہ صرف طیب رزق کو ہی قبول کرتا ہے، رحمٰن اس صدقہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح اسے بڑھاتا اور نشوونما دیتا ہے جس طرح آدمی کسی جانور کے بچے کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ البزار، (مجمع الزوائد ج ۳، ص ۱۱۲)

[۲] البدائع، ج ۲، ص ۳۹۔

ہے کیونکہ اسلام مسلمان کی تربیت ان خطوط پر کرتا ہے کہ اس میں زہدِ دنیا اور رغبت آخرت پیدا ہوتی ہے وہ راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے اور تمام دنیا کی نعمتوں پر اللہ اور رسولؐ کی محبت کو ترجیح دیتا ہے کہ اگر دنیا کے تمام لذائذ اور جملہ نعمتیں ایک طرف ہوں اور اللہ اور رسولؐ کی محبت دوسری جانب ہو اور اسے ان دونوں میں سے کسی کے اختیار کا موقع دیا جائے تو وہ بلاشبہ اللہ اور رسولؐ کی محبت کو اختیار کرے گا، خود اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ : ۲۴)

تو کہہ، اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو کمائے ہیں، اور سوداگری جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور حویلیاں جو پسند کرتے ہو تم کو عزیز ہیں، اللہ سے اور اُس کے رسولؐ سے اور لڑنے سے اُس کی راہ میں، تو راہ دیکھو جب تک بھیجے اللہ حکم اپنا، اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

اسلام کی اس تربیت کے زیرِ اثر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ مال کا حقیقی مالک اللہ ہے اور وہ اس مال میں بطورِ نیابت احکامِ الٰہی کے مطابق تصرف کرتا ہے، چنانچہ قرآن بیان کرتا ہے کہ مومنین نے دو مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ وہ کیا خرچ کریں، قرآن نے ایک مقام پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک مرتبہ انفاق کو بیان فرمایا اور دوسرے مقام پر مصارف کو بیان کیا۔

يَسْــَٔـلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (البقرہ : ۲۱۹)

اور پوچھتے ہیں تجھ سے کہ کیا خرچ کریں؟ تو کہہ جو افزود ہو۔

يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (البقرہ : ٢١٥)

تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ تو کہہ جو چیز خرچ کرو فائدے کی سو ماں باپ کو اور نزدیک ناتے والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر کو اور جو کرو گے بھلائی سو وہ اللہ کو معلوم ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ بنی تمیم کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس بہت سا مال ہے، فرمائیے میں اسے کس طرح خرچ کروں، آپ نے فرمایا زکوٰۃ ادا کرو جو تمہیں پاک کرے گی، اپنے اقرباء سے صلہ رحمی کرو مسکین، پڑوسی اور سائل کا حق ادا کرو، اس نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ ذرا مختصر ارشاد فرمائیے، آپ نے فرمایا، کہ قرابت داروں مساکین اور مسافروں کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو، اس نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں آپ کے ایلچی کو زکوٰۃ ادا کر دوں تو کیا میں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک بری ہو گیا آپ نے فرمایا، ہاں، اور تمہیں اجر ملے گا اور جو اس میں ردو بدل کرے گا گناہ اس پر ہو گا[1]

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس ایک دینار ہے، آپ نے فرمایا کہ اپنے اوپر صدقہ کرے، اس نے کہا کہ میرے پاس اور بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ اپنے بیٹے کو صدقہ کر دے اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور ہے، آپ نے فرمایا کہ اپنی بیوی کو دے دے، اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور ہے آپ نے فرمایا کہ اب تم جو مناسب سمجھو کرو[2]

بعض اصحاب آپ کی خدمت میں پورا مال نذر کر دیتے اور اپنی ضرورت روک کر

---

[1] الہیثمی : مجمع الزوائد، ج ۳، ص ٦٣ -

[2] المستدرک، ج ۱، ص ۱۵۱۴ -

چاہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے صرف فرمائیں، آپ اس پر انھیں متنبہ فرماتے،
چنانچہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونا لے کر آیا اور اس نے
عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مجھے کان میں سے ملا ہے، آپ اسے لیجیے
یہ میری جانب سے صدقہ ہے لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس پر
آپ نے اس سے اعراض فرمایا، وہ پھر داہنی جانب سے آیا اور یہی عرض کی، آپ
نے پھر اعراض فرمایا، پھر وہ بائیں جانب سے آیا، آپ نے پھر اعراض فرمایا، پھر
وہ پیچھے سے آیا اور عرض کی آپ نے وہ سونے کا ڈلا اس کے ہاتھ سے لے کر پھینک
دیا کہ اگر اس کے لگ جاتا تو اسے تکلیف پہنچتی، پھر فرمایا کہ تم میں سے کوئی جس شئے کا
مالک ہوتا ہے اُسے صدقہ لے کر آجاتا ہے اور خود لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے
بیٹھ جاتا ہے۔ بہترین صدقہ وہی ہے جو تونگری کے ساتھ ہو۔[1]

یہ ہے ایمان کا صحیح اور سچا اثر اور یہ ہے اسلامی تربیت کی تاثیر جو ایک مسلمان کو
آمادہ کرتی ہے کہ وہ خود ولی امر کے پاس آتا ہے اور اس سے اپنے مال کی زکوٰۃ لے لینے
کی درخواست کرتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے پاس لوگ آئے کہ ہمارے گھوڑوں کی زکوٰۃ
لے لیجیے[2] ایک شخص شہد کی زکوٰۃ لے کر آیا اور اس نے کہا کہ جس مال پر زکوٰۃ ادا نہ ہو اس
میں کوئی تاخیر نہیں ہے[3] حضرت ابن مسعودؓ نے اپنی زمین کا عشر اور نصف عشر دینے
کے بعد پیداوار کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ایک حصہ اپنے گھر والوں کی ضرورت کے
لیے رکھتے، ایک حصہ بیج کی ضرورت کے لیے رکھ چھوڑتے اور ایک تہائی راہِ خدا
میں صدقہ کر دیتے تھے[4]

---

[1] الذہبی، ج ۱، ص ۱۳۴۔
[2] مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۶۹۔
[3] مجمع الزوائد، ج ۲، ص ۷۷۔
[4] مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۶۸۔

مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے وہ خود پاک ہوتا ہے اور اس کا مال پاک ہوتا ہے اور نشوونما پاتا ہے۔ اور جو کمی واقع ہوتی ہے وہ محض ظاہری ہے حقیقی نہیں ہے، اسی لیے فرمایا کہ

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝ (الروم : ۳۹)

اور جو دیتے ہو پاک دل سے چاہ کر منہ اللہ کا۔ سو وہی ہیں جن کے دونے ہوئے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ (البقرہ : ۲۶۸)

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگی کا اور حکم کرتا ہے بے حیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا : ۳۹)

اور جو خرچ کرتے ہو کچھ چیز وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ بہتر ہے روزی دینے والا۔

اس مقام پر دورِ نبوتؐ کی دو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ عقیدہ وایمان کے زیرِ اثر ان دینی ضمانتوں کی کس قدر گہری تاثیر تھی کہ اس وقت لوگ نہ صرف یہ کہ فرض زکوٰۃ از خود ادا کرتے بلکہ واجب سے زائد ادا کرتے۔

سوید بن غفلہ سے مروی ہے کہ عہدِ نبوتؐ میں زکوٰۃ وصول کنندگان کو حکم تھا کہ دودھ پلانے والا جانور زکوٰۃ میں نہ لیا جائے، جدا جدا جانوروں کو جمع کیا جائے، اور یکجا جانوروں کو جدا نہ کیا جائے۔ بس ایک مرتبہ ایک زکوٰۃ وصول کنندہ کے ساتھ تھا، اس نے ایک چشمہ آب پر جا کر کہا کہ اپنے جانوروں کی زکوٰۃ دو، ایک شخص بڑی کوہان کا اونٹ لایا، اس نے اسے قبول نہیں کیا، پھر وہ دوسرا لے کر آیا جو اس نے قبول کر لیا

اور کہا کہ میں اگر اچھے اونٹ زکوٰۃ میں لوں گا تو آپؐ ناراض ہوں گے[1]

حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عامل زکوٰۃ بنا کر بھیجا، میں ایک شخص کے پاس پہنچا، اس نے اپنا مال میرے سامنے جمع کیا تو اس میں ایک ہی بنت مخاض تھی، میں نے کہا بس یہی اونٹنی دے دو یہی تمہاری زکوٰۃ ہے، اس نے کہا کہ اس کا دودھ بھی نہیں ہے اور سواری کے بھی کام نہیں آتی، البتہ میں یہ بڑی موٹی اونٹنی دے دیتا ہوں یہ لے لو، میں نے کہا کہ میں تو ایسا جانور نہیں لوں گا جس کے لینے کا مجھے حکم نہیں، چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلتے ہیں اگر وہ قبول کر لیں تو میں لے لوں گا، چنانچہ ہم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے کہا کہ اے نبیؐ اللہ، اس سے قبل میرے پاس اللہ کا رسولؐ یا اس کا ایلچی نہیں آیا اب یہ آپؐ کا ایلچی آیا تو میں نے اپنا تمام مال جمع کیا، اس نے مجھے بتایا کہ میرے مال پر ایک بنت مخاض ہے لیکن میرے پاس جو بنت مخاض تھی نہ تو اس میں دودھ ہے اور نہ سواری کے قابل ہے، اس پر میں نے ایک بڑی موٹی اونٹنی پیش کی، لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا، اب یہ آپؐ کی خدمت میں پیش ہے آپؐ اسے قبول فرمالیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر بنت مخاض ہی لازم تھی لیکن اگر تم بطور تطوّع زیادہ اچھی اونٹنی دیتے ہو تو ہم قبول کر لیتے ہیں، اور آپؐ نے اس کے مال میں خیر و برکت کی دعا کی[2]

حقیقت یہ ہے کہ یہ دینی ضمانتیں زکوٰۃ سے فرار سے مانع ہیں ــــ جبکہ تمام مغربی دنیا میں ٹیکسوں سے فرار ایک شیوۂ عام ہے چنانچہ ۱۹۳۶ء میں فرانس کے صدر نے کہا کہ اگر ٹیکس چوری نہ کی جائے تو ٹیکسوں کی شرح میں تخفیف کر دی جائے اور محصولات میں

---

[1] مختصر السنن، ج ۲، ص ۱۹۶۔ نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۳۳۔

[2] الذہبی، ج ۱، ص ۳۹۹، ۴۰۰۔ مختصر السنن، ج ۲، ص ۱۹۸، ۱۹۹، نیل الاوطار ج ۴، ص ۱۱۵۔ المجموع، ج ۵، ص ۴۲۷۔

اضافہ ہو جائے۔ روزویلٹ نے کہا کہ ٹیکس کی چوری میں قانونی اور غیر قانونی ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں، ٹائمز نے ایک مرتبہ لکھا کہ اگر ٹیکس چوری کا سدِ باب ہو جائے تو بجٹ کی ضروریات پوری ہو جائیں۔

قانونی اور تنظیمی ضمانتیں

ضمیر و اخلاق پر عائد کی جانے والی ان دینی اور اخلاقی ضمانتوں کے علاوہ شریعت اسلامیہ نے تحصیل زکوٰۃ کی چند قانونی اور تنظیمی ضمانتیں بھی فراہم کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں۔

زکوٰۃ وصول کنندگان سے تعاون اور ان سے مال کے پوشیدہ نہ رکھنے کا حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تمہارے پاس کچھ ناپسندیدہ سوار آتے ہیں، جب وہ آئیں تو انھیں خوش آمدید کہو، اور جو وہ زکوٰۃ لینا چاہیں وہ انھیں لینے دو اگر وہ انصاف کریں گے تو ان کے حق میں بہتر ہوگا اور اگر وہ ناانصافی کریں گے تو اس کا وبال خود ان پر ہوگا۔[1]

حضرت جریر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ ہمارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے آتے ہیں اور زیادتی کرتے ہیں، آپ نے فرمایا انھیں راضی رکھو، وہ بولے خواہ ہم پر ظلم کریں، آپ نے پھر فرمایا کہ انھیں راضی رکھو۔ حضرت جریرؓ فرماتے ہیں کہ آپ کے اس فرمان کے بعد ہمارے پاس جو زکوٰۃ وصول کنندہ آیا وہ راضی واپس گیا۔[2]

بشیر بن خصاصیہ سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ زکوٰۃ وصول کرنے والے ہم پر ظلم کرتے ہیں کیا ہم ان کے ظلم کے بقدر مال چھپالیں، آپ نے فرمایا، نہیں۔[3]

---

[1] مختصر السنن، ج ۲، ص ۲۰۲۔

[2] ابوداؤد۔

[3] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۵۶۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی وصولیابی میں بعض وصول کنندگان کی سختی اور ان کا ظلم اس امر کا جواز نہیں ہے کہ ان کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے، ان سے مال چھپایا جائے، اور ریاست کے میزانیہ کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنا جائے۔ لیکن اگر زکوٰۃ دہندگان یہ محسوس کریں کہ ان پر صریح ظلم کیا جا رہا ہے تو پھر وہ زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت انس رض سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلّم نے زکوٰۃ کی مقداریں بڑی وضاحت سے بیان فرمادی ہیں جو ان کے مطابق زکوٰۃ لے تو درست ہے اور اگر ان مقداروں سے زائد وصول کرے تو زکوٰۃ دہندہ انہیں نہ دے۔

سقوط زکوٰۃ کے حیلوں کا ابطال اسلام نے سقوط زکوٰۃ کے حیلوں سے بھی منع فرمایا ہے اگرچہ وہ بظاہر قانونی لحاظ سے جائز قرا پائیں جنھیں اہل مغرب ٹیکس سے فرار کے جائز طریقے کہتے ہیں اور فقہ کی زبان میں انھیں حیل شرعیہ کہا جاتا ہے، مثلاً سال گزرنے سے پہلے شوہر اپنی ملکیت بیوی کے نام کر اور وہ پھر سال گزرنے سے قبل شوہر کی طرف منتقل کر دے۔ بہر حال یہ حیلے حرام ہیں ا ور ان کی حرمت کی دلیل حدیث — انما الاعمال بالنیات — ہے۔

امام بخاریؒ نے حیلوں کے باطل ہونے پر حضرت انس رضؓ کی اس حدیث سے ہی استدلال کیا ہے کہ

> و زکوٰۃ میں کمی بیشی کرنے کے لیے یکجا جانوروں کو جدا جدا نہ کیا جائے اور جدا جدا جانوروں کو یکجا نہ کیا جائے "[1]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مثلاً تین اشخاص میں سے ہر ایک کے پاس چالیس چالیس بکریاں ہوں تو ہر ایک پر ایک بکری زکوٰۃ عائد ہوگی تو وہ تینوں اپنی بکریاں جمع کر لیں تاکہ تینوں پر ایک ہی بکری زکوٰۃ عائد ہو یا دو اشخاص میں ہر ایک کے پاس ایک سو ایک بکریاں ہوں اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکوٰۃ ہو جائے تو

---

[1] ابن القیم، اغاثۃ اللہفان، ج ۱، ص ۳۷۶، اعلام الموقعین، ج ۳۔

وہ علیحدہ علیحدہ کریں تاکہ ہر ایک پر ایک بکری زکوٰۃ عائد ہو۔[1]

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ زکوٰۃ نہ دے یا زکوٰۃ سے بچنے کے لیے مال زکوٰۃ کسی اور کو دے دے اور یا کوئی اور ایسا حیلہ کرے جس سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے۔[2]

زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حیلہ اختیار کرنا حرام ہے جیسا کہ امام ابو یوسف کے مذکورہ بالا قول سے ظاہر ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا کوئی حیلہ کرے تو قانوناً اس کے باطل ہونے کا حکم نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ قانون کا تعلق اعمال کے ظاہر سے ہے نیتوں سے نہیں ہے، جب کہ فقہائے حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک یہ حیلے قانون بھی باطل قرار پائیں گے۔

چنانچہ مسلک امام احمد بن حنبل کی کتب میں ہے کہ اگر کوئی شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لیے جائیداد خرید لے تو اس جائیداد کی قیمت پر زکوٰۃ ہو گی[3] اور اسی طرح فقہائے مالکیہ کے یہاں ہے جس کی تفصیل ہم پانچویں باب میں بیان کر چکے ہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے زکوٰۃ سے فرار کے لیے بیوی کے زیورات خرید لیے تو فقہائے احناف کے نزدیک ان پر زکوٰۃ عائد ہو گی۔

زکوٰۃ نادہندہ پر دیوانی اور فوجداری تعزیرات

حدیث میں زکوٰۃ نادہندہ کی سزا بیان ہوئی ہے چنانچہ احمد، ابوداؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ ہر چالیس اونٹوں کی تعداد پر ایک بنت لبون ہے اس حساب سے کوئی اونٹ علیحدہ نہیں کیا جائے گا جو اجر کی نیت سے یہ زکوٰۃ دے گا اسے ضرور اجر ملے گا اور جو نہیں دے گا اس سے ہم لے لیں گے اور اس کے نصف اونٹ بھی لے لیں گے اور یہ ہمارے رب کی طرف سے ایک فیصلہ ہو گا اور آل محمد کے لیے اس میں

---

[1] الموطا، ج ۱، ص ۲۶۴۔ الحلبی۔

[2] الخراج، ص ۸۰۔ السلفیہ۔

[3] شرح غایۃ المنتہی، ج ۱، ص ۱۰۱۔ القواعد النورانیہ، ص ۸۹۔

سے کچھ بھی حلال نہیں ہے۔
منتقی الاخبار میں ہے کہ یہ حدیث زکوٰۃ نادہندہ سے بزور زکوٰۃ لینے کے بارے میں حجت ہے[1] اور نصف اونٹ (یا نصف مال) ضبط کر لینا ایک نوع کی مالی سزا ہے جو ولی امر اختیار کر سکتا ہے تاکہ زکوٰۃ نادہندگان کو اس فعل سے روک سکے لیکن بہر حال یہ سزا لازم نہیں ہے۔

بعض ائمہ کی رائے یہ ہے کہ عدم ادائے زکوٰۃ پر مالی سزا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ سزا پہلے پہلے دی گئی پھر منسوخ ہو گئی نیز مال کی سزا اس حدیث کے برخلاف ہے کہ

"اللہ نے تم پر تمہاری جانوں اور تمہارے مالوں کو حرام کر دیا ہے" (مسلم)

اور اس لیے کہ صحابۂ کرام نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد تو کیا مگر ان سے مال نہیں لیا۔
لیکن بہر حال مذکورہ حدیث ان کی رائے کو رد کرتی ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور مالی تعزیر اور بھی متعدد دلائل سے ثابت ہے[2]

زکوٰۃ نادہندہ کی سزا صرف مالی سزا ہی نہیں ہے بلکہ جنگ کر کے ان سے مستحقین کا حق وصول کرنا بھی ان کی سزا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا اور فرمایا کہ

"قسم بخدا اگر انھوں نے ایک رسی بھی نہ دی جو وہ عہدِ نبوتؐ میں دیتے تھے تو میں ان سے اس پر قتال کروں گا"[3]

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ

"مانع زکوٰۃ کا حکم یہ ہے کہ بزور اس سے زکوٰۃ وصول کر لی جائے اگر نہ دے

---

[1] نیل الاوطار، ج ۴، ص ۱۲۲۔
[2] ابن القیمؒ: الطرق الحکمیہ، ص ۲۸۷، ۲۷۹، ۲۸۲ — ابن قیمؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے پندرہ ایسے فیصلے بیان کیے ہیں جن میں مالی سزائیں دی گئیں۔
[3] ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا پہلا باب۔

تو وہ محارب ہے اور اگر زکوٰۃ کے حکمِ الٰہی ہونے کو نہ مانے تو مرتد ہے اور اگر
منع نہ کرے مگر مال زکوٰۃ چھپالے تو منکر کا ارتکاب کرنے والا ہے اور اُسے
اس وقت تک تادیبی سزا دی جائے گی جب تک وہ زکوٰۃ پیش نہ کر دے یا
اس کی موت واقع نہ ہو جائے اس لیے کہ فرمان نبوتؐ ہے کہ
جو شخص کوئی منکر دیکھے اور وہ اسے بدل سکتا ہو تو وہ اسے اپنے ہاتھ
سے بدل دے زکوٰۃ نہ دینا بھی منکر ہے اور اسے بھی بزور بدل دینا چاہیے۔[1]

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ حق العبد ہے اور مدت گزرنے اور تقادم سے ساقط
نہیں ہوتی بلکہ جس شخص پر زکوٰۃ واجب ہے اس کی موت سے بھی ساقط نہیں ہوتی،
مرنے والے کے مال میں زکوٰۃ قرض کے طور پر ہوگی اور دوسرے قرض کی ادائیگی پر اس
کی ادائیگی مقدم ہوگی، کیونکہ یہ قرض حق اللہ اور حق العبد کا جامع ہے۔[2]

---

[1] المحلّی، ج ۱۱، ص ۳۱۳۔
[2] ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا باب: ادائے زکوٰۃ کا طریقہ!

ساتویں فصل

کیا زکوٰۃ کے ساتھ اور ٹیکس بھی لگائے جا سکتے ہیں؟

اسلام نے مسلمانوں کے مالوں میں زکوٰۃ کو ایک مقررہ حق کے طور پر لازم کیا ہے اور اس کی وصولیابی اور مصارف کے طریقے واضح کر دیے ہیں، بایں صورت کیا اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ وہ مصالح اُمت کی تکمیل اور دیگر اخراجات کے لیے مزید ٹیکس عائد کرلے۔ اس مسئلہ کی مکمل وضاحت کے لیے ہم اس موضوع کو تین مباحث میں بیان کرتے ہیں۔

بحث اول: ٹیکس عائد کرنے کے جواز کے دلائل۔

بحث دوم: ٹیکس عائد کرنے کی شرائط۔

بحث سوم: ٹیکس عائد کرنے کے خلاف رائے رکھنے والوں کے شبہات۔

بحث اوّل

ٹیکس عائد کرنے کے جواز کے دلائل

عادلانہ ٹیکسوں کے عائد کرنے کے جواز کے حسب ذیل دلائل ہیں۔

اوّل : اتحاد امّت ایک اجتماعی فریضہ ہے

ہم پہلے ہی اس موضوع پر دلائل، کیا مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے ؟ کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ بہرحال فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اگر زکوٰۃ کے ماسوا کوئی ضرورت مسلمانوں پر آجائے تو اس کا پورا کرنا واجب ہے، یہاں تک کہ جو فقہاء اس امر کے قائل ہیں کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا حق نہیں ہے، وہ بھی اس کے قائل ہیں، جیساکہ ہم نے نظریہ تکافل اور نظریہ اخوت کے ضمن میں بیان کیا ہے اور یہی وہ اصول ہے جو علاوہ زکوٰۃ کے ہر طرح کے حق کے وجوب کی اساس بن سکتا ہے۔

دوم : مصارف زکوٰۃ محدود ہیں جبکہ ریاست کے اخراجات وسیع ہیں

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ زکوٰۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جس کا ایک خاص مزاج ہے اور وہ مخصوص مقاصد کی حامل ہے، یعنی زکوٰۃ صرف مالی مقصد کی حامل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اجتماعی، اخلاقی، دینی اور سیاسی مقاصد بھی ہیں، اور تمام مرافق ریاست پر اس کی آمدنی صرف نہیں کی جاتی سوائے ان فقہاء کے نزدیک جن کے یہاں فی سبیل اللہ تمام مصلحتوں اور اطاعتوں پر مشتمل ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف قرآن نے بیان کیے ہیں جو دو انواع پر مشتمل ہیں، ایک نوع مسلمانوں

میں محتاج افراد کی ہے یعنی فقرا، مساکین، فی الرقاب، الغارمین اور ابن السبیل اور دوسری نوع ان افراد کی ہے جن کے مسلمان محتاج ہوتے ہیں یعنی مجاہدین، مؤلفۃ قلوبہم اور عاملین علیہا، اور الغارمین لمصلحۃ المجتمع، (معاشرتی فلاح کے سلسلے میں مقروض ہوجانے والے)۔

زکوٰۃ کی جدا مد اور علیحدہ بیت مال ہے اور اس کی آمدنی کو دیگر مصارف میں صرف کرنا جائز نہیں ہے اسی لیے امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ مال خراج کو مال زکوٰۃ کے ساتھ ملانا درست نہیں ہے کیونکہ خراج عام مسلمانوں کے لیے ہے جب کہ زکوٰۃ انہی مصارف میں صرف ہوگی جو قرآن نے بیان کیے ہیں۔[1]

اسی لیے فقہاء نے کہا ہے کہ پلوں کی تعمیر، راستوں کے بنانے، نہریں نکالنے، مساجد، مَرابِط، (جانوروں کو باندھنے کی جگہ) مدارس اور پانی پینے کے مقامات تعمیر کرنا زکوٰۃ کے مال سے درست نہیں ہے[2] لیکن بہر حال یہ امور ضروری ہیں اور ان پر ہر ریاست کو توجہ دینا لازم ہے۔

اولاً مسلمان ان مصارف پر جنگوں سے حاصل ہونے والے خمس غنائم سے صرف کیا کرتے تھے، اسی طرح ان مصالح پر ان موارد سے خرچ کرتے تھے جو انہیں دشمنوں سے بغیر جنگ بطور فئے حاصل ہوتے تھے، فتوحات کے عہد اول میں یہ دونوں مصادر مسلمانوں کی تمام ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے کافی تھے اور انہیں مزید ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ نیز یہ کہ اس دور کی ریاستوں کی ذمے داریاں آج کے دور کی بہ نسبت محدود تھیں۔ جبکہ دورِ جدید میں یہ دونوں اہم مصادر ختم ہوچکے ہیں اور اب مصالحِ امت کی تکمیل کے لیے کوئی ذریعہ اس کے ماسوا نہیں ہے کہ ٹیکس لگائے جائیں اور ان سے کاروبار ریاست چلایا جائے، کیونکہ فقہی اصول ہے کہ فرض کی تکمیل جس شئے پر موقوف ہو وہ بھی

---

[1] الخراج، ص ۹۵۔

[2] المغنی، ج ۲، ص ٦٦٧۔

فرض ہوجاتی ہے ؛

ہم نے اس سے قبل فقہائے شافعیہ کی یہ رائے بیان کی ہے کہ وہ منتظم اہل لشکر جن کی خزانہ عامہ سے تنخواہیں مقرر ہوں ان پر زکوٰۃ کے مال سے صرف کرنا درست نہیں ہے، اور فی سبیل اللہ کا حصہ ان مجاہدین کے لیے ہے جو باقاعدہ حکومت کے ملازم نہ ہوں اور بنیتِ حصول ثواب شریک جہاد ہوں، امام نووی فرماتے ہیں کہ حکومت کے باقاعدہ ملازم فوجیوں کو مال زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مال سے تنخواہیں دی جائیں گی اور اغنیاء مسلمین پر ان کی اعانت لازم ہوگی[1]

سوم : شریعت کے کلی قواعد

زکوٰۃ کے علاوہ ٹیکس کے جواز کی دلیل صرف یہی اصول نہیں ہے جو اوپر بیان ہوا کہ جس شئے پر کسی فرض کی تکمیل موقوف ہو وہ بھی فرض ہوجاتی ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی اصول کلیہ اور تشریعی مبادی موجود ہیں، مثلاً

مصالح کی رعایت، حصول مصلحت پر فساد کا دور کرنا مقدم ہے۔

اعلیٰ تر مصلحت کے حصول کے لیے کم تر مصلحت کو ترک کردینا، اور عام ضرر کو دور کرنے کے لیے خاص ضرر کو انگیز کرنا[2]

ان تمام قواعد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکس کا عائد کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مصالح اُمت کے حصول اور مفاسد اور اضرار کے دور کرنے کے لیے ضروری بھی ہے ــــ اِلّا یہ کہ ایسے مصادر موجود ہوں جو ٹیکس سے مستغنی کردیں، جیسے پیٹرول ــــ اگر دورِ جدید میں کوئی ریاست ٹیکس عائد نہ کرے تو ہر جانب سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا اور عسکری خطرات پیدا ہوجائیں گے۔

---

[1] الروضہ، ج ۲، ص ۳۲۱ ۔ تحفۃ المحتاج، ج ۳، ص ۹۶ ۔

[2] ابن نجیم : الاشباہ والنظائر۔

مختلف عصور میں فقہائے اُمّت نے بیت المال کی امداد کے لیے ٹیکس عائد کرنے کے جواز کے فتاوی دیے ہیں چنانچہ امام غزالیؒ جو کہ مصالح مرسلہ کے اختیار کرنے میں سخت رویہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں کہ

"اگر مالیہ کی کمی واقع ہو جائے اور اخراجاتِ لشکر کے پورا کرنے کے لیے سرمایہ نہ رہے درانحالیکہ دشمن کا بھی خطرہ ہو اور اہل شر کے فتنہ کا اندیشہ ہو تو امام کے لیے اغنیاء پر مقدارِ کفایت لازم کر دینا جائز ہے، کیونکہ اگر دو شر اور دو ضرر جمع ہوں تو شرعی اصول یہ ہے کہ بڑے شر اور عظیم ضرر کو دور کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اغنیاء بیت المال کو جو کچھ دیں گے، وہ جان و مال کے اس نقصان سے بہت کم ہو گا جو کہ اسلامی حکومت کے کمزور ہو جانے سے رونما ہو سکتا ہے"[1]

امام شاطبی مالکی فرماتے ہیں کہ

"اگر امام کو ضرورت ہو کہ سرحدوں کی حفاظت کے لیے لشکر میں اضافہ کیا جائے اور بیت المال سے لشکر کی ضروریات پوری نہ ہو سکتی ہوں تو امام اغنیاء پر ضرورت کے مطابق وظائف (ٹیکس) عائد کر سکتا ہے اور اسی طرح پھل اور پیداوار پر بھی وظیفہ (ٹیکس) عائد کر سکتا ہے"۔

یہ اقوال بلاشبہ بعد کے فقہاء کے ہیں اور دورِ اول کے فقہاء سے اس طرح کے اقوال اس لیے منقول نہیں ہیں کہ اس زمانے میں بیت المال میں ان تمام ضروریات کے پورا کرنے کی وسعت موجود تھی، لیکن بعد کے ادوار میں مسلمانوں کی شان و شوکت ماند پڑ گئی اور وہ کافروں کا ہدف بن گئے۔ اس لیے نئے ٹیکسوں کی ضرورت پیش آئی تاکہ ضررِ عظیم اور متوقع نقصانات سے بچایا جا سکے[2]

امام غزالیؒ اور امام شاطبیؒ کے ہر دو اقوال اس اصول پر مبنی ہیں کہ زیادہ ضرر سے تحفظ

---

[1] المستصفی، ج ۱، ص ۳۰۳۔

[2] الاعتصام، ج ۱، ص ۱۰۴۔

اختیار کرنے کے لیے کم تر ضرر کو قبول کر لیا جائے۔

چہارم: جہاد بالمال اور اس کے مطالبات

اسلام نے مسلمانوں پر جہاد بالمال اور جہاد بالنفس فرض قرار دیا ہے چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (التوبہ: ۴۱)

نکلو ہلکے اور بوجھل، اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات: ۱۵)

ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے اللہ پر اور اُس کے رسول پر، پھر شبہ نہ لائے اور لڑائی کی اللہ کی راہ میں، اپنے مال اور جان سے۔ وہ جو ہیں وہی ہیں سچے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط (الصف: ۱۱)

ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (البقرہ: ۱۹۵)

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں اور نیکی کرو۔ بے شک اللہ چاہتا ہے نیکی والوں کو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جہاد بالمال زکوٰۃ کے علاوہ ایک فریضہ ہے اور اولوالامر (حکمرانوں) کو یہ اختیار ہے کہ وہ ہر غنی شخص پر جہاد بالمال کے ضمن میں کوئی حصہ متعین کرے۔

چنانچہ امام ابن تیمیہؒ صاحب غیاث الامم سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اب لشکروں کے اخراجات اور انھیں مسلح کرنے کے مصارف بہت بڑھ چکے ہیں اور قوموں کی ہر طرح کی علمی صنعتی اور اقتصادی ترقی ناگزیر ہو چکی ہے جس کے لیے وافر دولت کی ضرورت ہے جو ٹیکس لگا کر ہی پوری کی جاسکتی ہے اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ قوم اپنے جان و مال اور عزت کی حفاظت کر سکے۔

پنجم: مفادات کے مطابق ذمّے داریاں

ٹیکسوں سے حاصل شدہ مال مرافق عامہ میں صرف ہوتا ہے جس سے تمام افراد معاشرہ مستفید ہوتے ہیں اور دفاع، امن، تعلیم، صحت، نقل و حمل اور آب کاری و آب رسانی کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ ہر فرد ریاست کی فراہم کردہ ان سہولتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اس لیے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مال سے ریاست کی مدد کرے، یعنی فرد معاشرے سے جو فوائد حاصل کر رہا ہے ان کے بالمقابل اس پر جو ذمّے داریاں اور پابندیاں عائد ہوں وہ انھیں پورا کرے اور یہی اصول ہے جسے فقہا نے الغرم بالغنم کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

بحث دوسری

ٹیکس عائد کرنے کی شرائط

اسلام میں جس ٹیکس کی اجازت ہے وہ حسب ذیل شرائط کا حامل ہے۔

پہلی شرط: حقیقی احتیاج

پہلی شرط یہ ہے کہ ریاست کو مال کی حقیقی احتیاج ہو اور کوئی اور مصدر بھی موجود نہ ہو۔ کیونکہ مال میں اصل اساس حرمت (احترام مالِ غیر) ہے اور بلا ضرورت شدیدہ اور سخت احتیاج کے کسی کی شخصی ملکیت پر دست درازی درست نہیں ہے یعنی اگر حکومت کے پاس مال موجود ہو اور اس کے پاس حصول سرمایہ کے ذرائع موجود ہوں تو ٹیکس لگانا جائز نہیں ہے۔

بعض فقہاء نے اس شرط کی بڑی سخت تاکید کی ہے اور ان کے نزدیک جب تک سرکاری خزانہ بالکل خالی نہ ہو جائے ٹیکس لگانا درست نہیں ہے اور اس شدت کا مقصود یہ ہے کہ حکام جائز ناجائز ٹیکس لگا کر اسراف سے کام نہ لیں۔

تاریخ اسلامی میں فقہائے اسلامی کی عزیمت کے درخشاں ابواب موجود ہیں کہ انھوں نے حکام کو ناجائز ٹیکس عائد کرنے سے روکا اور اس سلسلے میں سختی برتی۔

چنانچہ شاہِ مصر قطز ملک ناصر کے ایما پر تاتاریوں سے جنگ کے لیے لشکر تیار کرنا چاہا تو اس نے مشورہ کے لیے قاضیوں اور فقہا کو جمع کیا، فقہاء اور علما میں شیخ عزالدین بن عبدالسلام اور قاضی بدرالدین سنجاری بھی تھے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اس موقع پر کہا کہ بلادِ اسلام پر دشمن حملہ آور ہو تو بلاشبہ اسلامی حکومت پر جہاد فرض ہے اور بیت المال خالی ہو، اور

بادشاہوں کے پاس عطیات اور صلۂ خدمات کے طور پر دی جانے والی تھیلیاں بھی نہ ہوں تو رعایا سے اخراجاتِ جہاد لینا درست ہے لیکن مال موجود ہونے اور آلات فاخرہ موجود ہونے کی صورت میں لوگوں سے مال لینا درست نہیں ہے[1]

شام میں ظاہر بیبرس نے تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تو بیت المال میں ان وسیع اخراجات کی گنجائش نہیں تھی تو اس نے علمائے شام میں ٹیکس لگانے کے بارے میں فتویٰ طلب کیا، علمائے نے مصلحت و ضرورت کے پیشِ نظر ٹیکس لگانے کی اجازت دے دی، اس وقت امام نوویؒ موجود نہیں تھے، بادشاہ نے انھیں بلوایا اور کہا کہ اس فتویٰ پر تم بھی دستخط کر دو، امام نوویؒ نے انکار کیا، تو سلطان نے سبب دریافت کیا، اس پر امام نوویؒ نے فرمایا کہ تم ایک بندوق دار تھے اور تمھارے پاس کچھ نہیں تھا پھر خدا نے تمھیں بادشاہ بنا دیا، اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایک ہزار غلام ہے اور ہر غلام کے پاس سونے کی تھیلی ہے اور تمھارے پاس دو سو باندیاں ہیں اور ہر باندی کے پاس زیورات کی پوٹلیاں ہیں، یہ سارا مال جہاد میں صرف کرو اور تمھارے خدم و حشم عام لوگوں کی طرح صوف پوش رہیں، جب یہ سارا مال جہاد کی تیاریوں میں صرف کر لوگے تب میں فتویٰ دوں گا کہ اب رعایا سے ٹیکس لینا جائز ہے۔ یہ سن کر ظاہر بیبرس امام نوویؒ سے ناراض ہو گیا اور انھیں دمشق سے نکال دیا اور آپ نویٰ چلے گئے، بعد ازاں اس نے دمشق آنے کی اجازت دے دی لیکن امام نوویؒ نے کہا کہ جب تک ظاہر وہاں موجود ہے میں وہاں نہیں جاؤں گا، ظاہر ایک ماہ بعد ہی مر گیا۔[2]

امام نوویؒ نے سلطان ظاہر بیبرس کو یہ خط بھی لکھا کہ

"جب تک بیت المال میں سرمایہ موجود ہے اور حکومت کے پاس زمین موجود

---

[1] النجوم الزاہرہ، ج ۷، ص ۲۷، ۳۷۔ السلوک لمعرفۃ دول الملوک، ج ۱، ص ۱۶ م، ۷ اسم۔ طبقات الشافعیہ

[2] الاستاذ محمد الغزالیؒ: الاسلام المفتری علیہ، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

ہے، رعایا سے ٹیکس لینا جائز نہیں ہے، اس وقت بیت المال میں سرمایہ موجود ہے، خدا برکت دے اور شاد و آباد رکھے[1]

دوسری شرط : ٹیکسوں کے وزن کی منصفانہ تقسیم

اگر حکومت کو سرمایہ کی احتیاج ہو اور ٹیکس کے ماسوا حصول سرمایہ کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو ٹیکس لگانا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ٹیکس کے بار کو لوگوں میں منصفانہ طریقے پر تقسیم کیا جائے کہ کسی پر زیادتی اور ظلم نہ ہو واضح رہے کہ اس مقام پر عدل و انصاف سے مراد مساوات نہیں ہے کیونکہ دو مختلف درجے کے لوگوں میں مساوات انصاف نہیں ہوتا ظلم ہوتا ہے، یہاں پر تقاضائے انصاف یہی ہے کہ ہر اجتماعی اور اقتصادی طبقے کے لوگوں سے ان کی حیثیت کے مطابق لیا جائے۔

چنانچہ ابو عبید نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضہ نے بیان کیا کہ حضرت عمر رضہ بنطیوں سے زیتون کے تیل اور گیہوں پر تو نصف عشر (۱/۲۰) لیا کرتے تھے تاکہ مدینہ میں یہ سامان زیادہ مقدار میں پہنچے اور دوسرے دالوں اور دالوں پر دسواں حصہ لیا کرتے تھے[2]

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضہ نے اہل حرب تاجروں پر دسواں حصہ، ذمی تاجروں پر بیسواں حصہ اور مسلمان تاجروں پر چالیسواں حصہ مقرر فرمایا تھا[3]

ایک شہر سے دوسرے شہر سامان کی منتقلی پر چنگی لی جاتی۔ حضرت عمر رضہ مستامنین سے عُشر (۱/۱۰) (معاملہ مثل) کے اصول پر کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت ابو موسیٰ نے حضرت عمر رضہ کو تحریر کیا تھا کہ غیر مسلم مسلمان تاجروں سے عشر لے رہے ہیں[4] اور آپ رضہ ذمیوں سے

---

[1] السخاوی : ترجمۃ الامام النووی۔

[2] الاموال، ص ۵۳۳۔

[3] ایضاً

[4] الخراج، یحییٰ بن آدم، ص ۱۷۲۔

نصف عشر (۱/۲۰) اس لیے لیا کرتے تھے کہ ان سے اسی پر صلح ہوئی تھی کہ ان سے یہ[1] شرح سامان کی ایک شہر سے دوسرے شہر منتقلی کے وقت وصول کی جائے جبکہ مسلمان شہر میں رہتے ہوئے بھی اپنے سامان تجارت کی زکوٰۃ دے گا، نیز ذمیوں سے ان کے پھلوں، فصلوں، مویشی اور دیگر اموال پر کوئی مطالبہ نہیں ہوگا اور نصاریٰ بنی تغلب سے حضرت عمر رضہ نے ایک مخصوص معاملہ کے ساتھ صلح کی تھی۔

غرض قاعدہ یہ تھا کہ نبطیوں سے عشر لیا جاتا جیسا کہ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضہ کے زمانے میں بازار مدینہ کا عامل تھا اور ہم اس وقت نبطیوں سے عشر لیا کرتے تھے۔

لیکن بعد ازاں حضرت عمر رضہ نے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ مدینہ میں غذائی اشیاء زیادہ پہنچیں نبطیوں پر عشر (۱۰ / ۱) کم کرکے ۵ فی صد ٹیکس عائد کر دیا تھا۔ اور یہ وہ اصول ہے جو محصولات میں آج کی جدید ریاستیں بھی اختیار کرتی ہیں کہ اشیاء کی رسد بڑھانے کے لیے وطنی مصنوعات کے تحفظ کے لیے یا آسائشات کی درآمد میں کمی کے لیے محصولات میں کمی بیشی کر دی جاتی ہے۔

حضرت عمر رضہ کا یہ عمل کہ آپ نے مدینہ میں غذائی اشیاء کی فراہمی کو بڑھانے کے لیے ۱۰ / ۱ کو ۵ / ۱ کر دیا، ہمارے لیے مصالح کے پیشِ نظر ٹیکسوں کی شرح کم و بیش کرنے کی دلیل فراہم کرتا ہے۔ یہ بات ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد یہ ہیں کہ ثروت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو، اسی لیے اسلام نے ایسے طریقے اختیار کیے ہیں جن سے بڑی بڑی دولتیں تقسیم ہوتی رہیں اور بڑے بڑے فرق دور ہوتے رہیں اور امراء ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے۔

اگر دولت و غربت کے فاصلے کو کم کرنے کے لیے تصاعدی ٹیکس، کے سوا کوئی اور ذریعہ باقی نہ رہے تو اسلام اس کی تائید کرے گا تاکہ مالدار ایک درجہ نیچے آتے اور غریب ایک درجہ اوپر ہو جاتے لیکن اس میں وہ شخصی رعایتیں مدِ نظر رکھی جائیں جو ہم پہلے

---

[1] الاموال، ص ۵۳۳۔

بیان کر چکے ہیں کہ عائلی اخراجات اور قرضوں کو مستثنیٰ رکھا جائے۔

تیسری شرط: ٹیکس مصالحِ اُمت میں صرف کیے جائیں

ٹیکس حق وانصاف کے ساتھ لگائے جائیں اور انھیں مصالح امت میں صرف کیا جائے، لہو ولعب میں اور حکمرانوں کی آسائشوں پر صرف نہ کیے جائیں۔ قرآن کریم نے مصارفِ زکوٰۃ اس وضاحت کے ساتھ اسی لیے بیان فرمائے ہیں کہ حکمرانوں کو اس میں من مانی کرنے کا کوئی موقع باقی نہ رہے، خُلفائے راشدین زکوٰۃ وغیرہ سے حاصل شدہ سرمائے کو بڑی جزرسی کے ساتھ مصالحِ اُمت ہی پر صرف کرتے رہے اور خلافتِ راشدہ اور بعد کے مُلکِ عضوض میں یہی فرق ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سلمانؓ سے پوچھا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ، تو حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ اگر آپ کے پاس ایک درہم محصول میں آئے اور آپ اسے بلا حق صرف کر دیں تو آپ بادشاہ ہیں، اس پر حضرت عمرؓ آبدیدہ ہو گئے[1]

سفیان بن ابی العوجا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے استفسار کیا کہ میں خلیفہ ہُوں یا بادشاہ اگر میں بادشاہ ہُوں تو یہ بڑی مصیبت ہے۔ کسی نے کہا، امیر المؤمنین، خلیفہ جو لیتا ہے وہ حق کے ساتھ لیتا ہے اور حق کے ساتھ صرف کرتا ہے، آپ بحمد اللہ ایسے ہی ہیں جب کہ بادشاہ زیادتی کر کے لیتا ہے اور زیادتی کر کے صرف کرتا ہے یعنی اِس سے لے کر اُسے دے دیتا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے۔[2]

طبری بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے کسی رشتہ دار نے حضرت عمرؓ سے کچھ طلب کیا آپ نے اسے سرزنش کر کے باہر نکال دیا۔ جب آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ مجھ سے اللہ کے مال میں سے مانگ رہا تھا اگر میں اس کو دے دیتا تو

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۳۰۶، ۳۰۷۔

[2] ایضاً۔

اللہ کے سامنے کیا عذر پیش کرتا کہ میں خائن بادشاہ نہیں ہوں [1]

چوتھی شرط: اہل شوریٰ اور اُمّت کی رائے کا اتفاق

امام (سربراہ مملکت) کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ازخود بغیر ارباب حل وعقد کے شوریٰ کے ٹیکس عائد کردے چہ جائیکہ یہ اختیار اس کے کسی کارندے (وزیر خزانہ وغیرہ) کو ہو، کیونکہ مال کی اصل حرمت ہے اور اصلاً ذمے داریوں سے بریّ الذمہ ہیں البتہ جب مصلحت وضرورت اس امر کی متقاضی ہو کہ جن کے پاس مال ہے ان سے مال لیا جائے تو اہل حل وعقد کے مشورے کے ساتھ اور تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ماہرین کی آراء حاصل کرکے ٹیکس لگایا جائے۔

شوریٰ کا وجوب قرآن اور سنّت سے ثابت ہے

ہماری اس رائے کی تائید قرآن اور سنّت سے ہوتی ہے۔
قرآن نے شوریٰ کو اسلامی معاشرے کی ساخت کی اساس قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ٥

(الشوریٰ : ٣٨)

اور جنھوں نے حکم مانا اپنے رب کا اور کھڑی کی نماز۔ اور ان کا کام ہے مشورہ سے آپس کے اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔

ان آیات میں قرآن نے شوریٰ کو استجابت لرب، اقامت صلوٰۃ اور انفاق کا قرینہ قرار دیا ہے اور یہ مکّی آیات ہیں جن میں اصول وعقائد بیان کیے گئے ہیں اور مدح وثنا، اور مذمت وسرزنش کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جب کہ مدنی قرآن میں بیان احکام

---

[1] تاریخ الطبری، ج ۵، ص ۱۹۔

کا اسلوب ہے۔ مدنی قرآن میں فرمایا گیا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

(آل عمران : ۱۵۹)

اور ان سے مشورت لے کام میں۔ پھر جب ٹھہر چکا تو بھروسہ کر اللہ پر۔

یہ آیت غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوئی، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں ہی رہ کر مقابلہ کیا جائے یا باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے اور بیشتر صحابہ نے یہی رائے دی کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے، حالانکہ آپ کی رائے نہیں تھی لیکن آپ نے صحابہ کے مشورہ کو ترجیح دی اور باہر نکل کر مقابلہ کیا جس میں ستر صحابہ شہید ہوئے لیکن اس کے باوجود آیت میں شوریٰ کی تاکید کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اہم معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ فرماتے رہے، چنانچہ بدر کے موقع پر صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا، اور مہاجرین ہی کی رائے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انصار سے بھی رائے لی اور لشکر کی فرودگاہ کے بارے میں حباب بن المنذر کی رائے اختیار فرمائی، اسی طرح آپ نے اُحد اور خندق کے موقع پر مشورہ فرمایا، اور خندق کے موقع پر یہ مشورہ کیا کہ مدینہ کے ایک تہائی پھلوں پر احزاب سے صلح کر لی جائے، جس کا سعد بن معاذ اور سعد بن معاذ نے مشورہ نہیں دیا اور آپ نے اس رائے کو ترک فرمادیا۔ یوم حدیبیہ کے موقع پر مشرکین کے بچوں کے بارے میں مشورہ کیا اور صدیق اکبرؓ نے جواب دیا ہم کسی کے قتال کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کے لیے آئے ہیں، آپ نے اس رائے کو قبول فرمایا، اور واقعۂ افک میں صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ مجھے میرے گھر والوں کے بارے میں تہمت سے متعلق مشورہ دو اور حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے حضرت عائشہؓ کو جدا کرنے کے بارے میں مشورہ کیا۔[1]

علامہ ابن کثیرؒ نے ان تمام مشوروں کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ آپ جنگوں وغیرہ

---

[1] تفسیر ابن کثیرؒ، ج ۱، ص ۴۲۰۔

میں مشورہ کیا کرتے تھے، بہرحال فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مشورہ پر عمل واجب ہے یا آپؐ تطییب قلوب کے لیے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔[1]

آیت میں حکم شوریٰ بالکل واضح ہے اور امر کے صیغے میں ہے اس لیے مسلمان امراء اور حکام پر مشورہ کی اتباع لازم ہے بالخصوص جب کہ مسلمانوں کی طویل تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں پر بہت سے مصائب مستبد حکمرانوں کے استبداد کی بنا پر آئے ہیں۔

کیا حکام شوریٰ کے پابند ہیں؟

بلاشبہ حکام شوریٰ کے پابند ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ کے بعد صحابہ کی رائے پر عمل فرماتے اور جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ عزم کا کیا مطلب ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ اہل الرائے سے مشورہ کر کے ان کی اتباع کرنا۔[1]

اگر شوریٰ لازم نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہتی بلکہ ایسا مشورہ مستبد حکمرانوں کے لیے ایک ذریعۂ مذاق بن جائے گا کہ وہ اُمت سے مشورہ کر کے اپنی استبدادی رائے پر عمل کریں گے، جیسا کہ عورتوں کے بارے میں حدیث گھڑی ہوتی ہے کہ ان سے مشورہ کرو مگر ان کے مشورہ پر عمل نہ کرو، یہ بالکل غلط ہے اور قرآن صریحاً اس کے خلاف ہے۔

بلکہ اُمت کے اہل حل وعقد کا فرض ہے کہ وہ حکمرانوں کو اس امر کا پابند کریں کہ وہ ہر معاملہ اہم میں مشورہ لیں اور اکثریتی رائے کو قبول کریں، کیونکہ معاہدۂ حکمرانی بھی اسی بنیاد پر طے پایا ہے اور اس معاہدہ کی شرط مشورۂ اُمت کو تسلیم کرنا ہے۔

آیت میں شوریٰ کو بعض معاملات کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک عمومی حکم ہے جس میں جہاں صلح و جنگ اور بین الاقوامی معاملات شامل ہیں وہاں لامحالہ ٹیکس عائد کرنے کا مسئلہ بھی شامل ہے کہ ٹیکس بہت سے دُور رس اثرات کا حامل ہوتا ہے اسی لیے جمہوری حکومتوں میں عوام کے نمائندوں کی رائے ضرور لی جاتی ہے اور اس کے بعد ٹیکس میں کوئی رد و بدل کیا جاتا ہے۔

●

---

[1] ایضاً۔

بحث تیسری

ٹیکس کے خلاف رائے رکھنے والوں کے شبہات

بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ ٹیکسوں سے مستغنی کر دیتی ہے اور زکوٰۃ کی موجودگی میں کسی ٹیکس کے لگانے کی ضرورت نہیں ہے، اس سلسلے میں ان کے درج ذیل شبہات ہیں۔

پہلا شبہ: مال میں ماسوا زکوٰۃ کے کوئی حق نہیں ہے

مشہور یہ ہے کہ زکوٰۃ ہی مال پر ایک حق ہے اور اس کے سوا کوئی حق لازم نہیں ہے اس لیے ٹیکس لگانا جائز نہیں ہوگا۔

دوسرا شبہ: شخصی ملکیت کا احترام

اسلام نے شخصی ملکیت کا احترام کیا ہے اور ہر شخص کے جان و مال اور عزت کے تحفظ کی ضمانت دی ہے چنانچہ حدیث ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، اور یہ کہ جب تک کوئی شخص خوش دلی سے اجازت نہ دے اس کا مال لینا جائز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ٹیکس ہر طرح کے جواز پیش کرنے کے باوجود جبراً ہی لیے جاتے ہیں اور ان میں دینے والے کی طیب نفس شامل نہیں ہوتی۔

تیسرا شبہ: مکس کی مذمت اور عشور کی ممانعت کے بارے میں احادیث

مکس کی مذمت اور مکس لینے والوں کے جنت سے دور ہونے کے بارے میں

احادیث آئی ہیں۔

چنانچہ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

"صاحب مکس جہنمی ہے"[1]

عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

"جنت میں صاحب مکس داخل نہیں ہوگا"[2]

اگرچہ ان دونوں احادیث میں کلام ہے لیکن ان کی تائید صحیح مسلم کی مروی حدیث غامدیہ سے ہوتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ ——— اگر صاحب مکس بھی ایسی توبہ کرتا تو اس کی مغفرت بھی ہو جاتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ صاحب مکس کا گناہ زنا کے گناہ سے بھی زیادہ شدید ہے۔

اسی طرح عشّارین کے بارے میں احادیث مروی ہیں جو اگرچہ صحت کے درجے کو نہیں پہنچی ہیں لیکن ایک، دوسری کی مؤید ہیں۔

حضرت عثمان بن العاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو معاف کردے گا ماسوا زناکار کے اور عشّار کے"[3]

ابن الاثیر کہتے ہیں کہ مکس وہ ٹیکس ہے جو عشّار لیتا ہے[4]

البغوی کہتے ہیں کہ صاحب مکس سے مراد وہ شخص ہے جو تاجروں سے عُشر کے نام پر چنگی وصول کرلے[5] المنذری کہتے ہیں کہ مکس لینے والے عُشر کے نام پر یا بغیر کسی نام کے چنگی لے لیتے ہیں، یہ حرام اور سحت ہے اور یہ اپنے پیٹوں میں

---

[1] الترغیب والترہیب، ج ۱، ص ۵۶۸۔

[2] ایضاً، ج ۱، ص ۵۶۶، ۵۶۷۔

[3] مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۸۸۔

[4] النہایۃ فی غریب الحدیث، ج ۴، ص ۱۱۰۔

[5] الترغیب والترہیب، ج ۱، ص ۵۶۷۔

جہنم کی آگ بھرتے ہیں۔[1]

المناوی کہتے ہیں کہ صاحب مکس سے مراد عشّار ہے جو لوگوں سے ٹیکس وصول کرے نیز الطیبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ ہلاک کرنے والے امور میں سے ہے۔ اور الذہبی نے اسے کبائر میں شمار کیا ہے[2] کیونکہ یہ قطع طریق ہی کی ایک قسم ہے جو کہ چوری سے بھی بڑھا ہوا جرم ہے کہ اگر وہ زیادتی کر کے لوگوں پر نئے نئے ٹیکس عائد کرے تو یہ ظلم ہے اور اس ناانصافی میں شریک سب اکالون للسّحت (حرام کھانے والے) ہیں۔[3]

عشور کے بارے میں سعید بن زید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ

"اے معشر عرب اللہ کی حمد بیان کرو کہ اس نے تم سے عشور ختم فرمائے۔"[4]

نیز آپ نے فرمایا کہ

"عشور تو یہود و نصاریٰ پر تھے اور مسلمانوں پر عشور نہیں ہیں۔"[5]

المناوی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ پر عشور واجب ہیں جب ان سے عشر پر صلح ہو جاتے تو وہ ان پر لازم ہے جب کہ مسلمانوں پر عشور زکوٰۃ کے سوا عشور نہیں ہیں۔ غرض یہ حدیث مسلمانوں سے مکس لینے کی تحریم پر مشتمل ہے۔

---

1. ایضاً۔
2. الذہبی: الکبائر، ص ۱۱۹۔
3. فیض القدیر، ج ۶، ص ۴۴۹۔
4. مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۸۷۔
5. مسند احمد، ج ۳، ص ۴۷۴۔

پہلے شبہ کا جواب

اس کا جواب ہم پہلے ہی تفصیل سے دے چکے ہیں کہ واضح دلائل سے یہ امر ثابت ہے کہ شریعت میں ماسوا زکوٰۃ کے بھی مال میں حق ہے اور عملاً اس اصول پر اجماع ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب

جہاں تک انفرادی ملکیت کے احترام کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ مال پر حقوق کا عائد ہونا اس کے احترام کے برخلاف نہیں ہے کیونکہ بہرحال انسانی اخوت، دینی تعلق اور ضرورتمندوں کی ضرورت کے لحاظ سے فقراء اور مساکین کا حق مسلمانوں کے مال پر عائد ہوتا ہے۔

فرد کے مال پر جماعت کو اس لیے بھی حق حاصل ہے کہ فرد جو کچھ کماتا ہے وہ جماعت ہی کے ذریعے کماتا ہے اور اجتماعی صلاحیتیں اور ذرائع ہی فرد کو صاحب ثروت بنانے میں ممد ہوتے ہیں، بغیر ان ذرائع کے وہ صاحب ثروت نہیں بن سکتا اور درحقیقت یہی انسان کے مدنی الطبع ہونے کا تقاضا ہے۔

اللہ سبحانہٗ انسان کا خالق ہے، رازق ہے اور وہی اس کے لیے حصول زر کے مواقع فراہم کرتا اور اسباب مہیا کرتا ہے اور اصلاً مال کا مالک اللہ ہی ہے اور انسان اس مال میں اللہ کا وکیل اور نائب ہے اس لیے امین اور وکیل کی ذمے داری کے طور پر انسان پر فرض ہے کہ وہ ہر اس موقع پر مال خرچ کرے جہاں مال کا دینے والا خرچ کرنے کا مطالبہ کرے۔

اگر اسلامی ریاست میں اس قدر محتاج موجود ہوں کہ زکوٰۃ ان کی ضروریات کے لیے ناکافی ہو، یا جماعت کی عسکری اور اقتصادی ضروریات اس امر کی متقاضی ہوں کہ صرف کیا جائے یا دعوت و تبلیغ کے لیے ضرورت ہو تو ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے

اغنیاء پر واجبات عائد کرنا ضروری ہے جس کا حصول ٹیکسوں کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور اصول ہے کہ جو شئے کسی امرِ واجب کے تحقق کے لیے لازمی ہو وہ خود بھی واجب ہو جاتی ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب

مکس (چنگی) کی مذمت میں جو احادیث وارد ہیں ان میں سے اکثر کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہے اور جن احادیث کی صحت ثابت ہے وہ ٹیکس کی ممانعت پر قطعی نہیں ہیں، کیونکہ از روئے لغت و شرع مکس کے معنی متعین اور واضح نہیں ہیں۔ چنانچہ اللسان میں ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے بازاروں میں سامان فروخت کرنے والے سے جو دراہم لیے جاتے تھے وہ مکس ہے نیز مکس وہ ہے جو عشّار لیا کرتے تھے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ زکوٰۃ وصول کنندہ وصولی زکوٰۃ کے بعد جو کچھ لیتا وہ مکس کہلاتا تھا نیز مکس وہ ٹیکس ہے جو ماکس وصول کرے۔ لسان العرب میں ہے کہ مکس کے معنی نقص کے ہیں، یعنی بیع میں ثمن میں کمی کرنا[1]

البیہقی فرماتے ہیں کہ مکس کے معنی نقصان کے ہیں اگر عامل اہل زکوٰۃ کے حق میں سے کم کر دے تو وہ صاحب مکس ہے[2]

اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ صاحب مکس وہ عامل زکوٰۃ ہے جو ظلم و تعدی کرے اور زکوٰۃ دہندہ سے بغیر حق کچھ لے لے یا جو مال زکوٰۃ اس کے پاس جمع ہو اس میں سے کچھ رکھ لے چنانچہ بعض روایات میں عاشر کے معنی یہی بیان کیے گئے ہیں[3] اور اس مفہوم کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے جو زکوٰۃ کے عاملوں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں

---

[1] لسان العرب، مادہ، مکس۔

[2] فیض القدیر، ج ۶، ص ۴۴۹۔

[3] مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۸۷، ۸۸۔

پر وعید کے بیان پر مشتمل ہیں اور انہی وعیدوں کے پیش نظر سعد بن عبادہ، ابو مسعود اور عبادہ بن الصامت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انھیں زکوٰۃ کی وصولیابی پر نہ مامور کیا جائے۔

مکس کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ ظالمانہ ٹیکس ہو سکتے ہیں جو اسلام سے پہلے دنیا میں مروج تھے کہ یہ ٹیکس بلغیر حق لیے جاتے اور ان کے مصارف میں عدل و انصاف کو ملحوظ نہ رکھا جاتا، نیز یہ کہ یہ ٹیکس شہریوں کی قدرت و استطاعت سے زیادہ ہوتے اور ملی مصالح پر صرف ہونے کے بجائے بادشاہوں کی عیش و عشرت پر صرف ہوتے تھے۔

فقہ حنفی کی کتاب التبیین میں ہے کہ جو احادیث عَشّار کی مذمت میں منقول ہیں ان میں عَشّار سے وہ شخص مراد ہے جو ظلماً لوگوں سے ان کا مال لے[1] اسی طرح الدر المختار میں ہے[2]

ٹیکسوں کی وہ قسمیں جو ناانصافی پر مبنی ہوں اور لوگوں سے ان کی استطاعت سے زیادہ وصول کیے جائیں ان پر مکس اور عَشّار کے لفظ کا اطلاق ہوگا، چنانچہ الذہبی نے اس کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے کیونکہ مکّاس اور عاشر بلا استحقاق لیتا ہے اور بلا استحقاق صرف کرتا ہے[3]

بہرحال وہ ٹیکس جو مذکورہ شرائط کے ساتھ عائد کیے جائیں اور جن کا مقصود بجٹ کی ضروریات اور عسکری اقتصادی اور ثقافتی ضروریات کی تکمیل ہو، اور جن سے مقصود یہ ہو کہ قوم کی تعلیمی اور معاشی ضروریات پوری کی جائیں اور انھیں تمام ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں تو اس کے جواز میں شبہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اسلامی حکومت کے لیے ناگزیر ہے کہ

---

[1] البحر الرائق، ج ۲، ص ۲۴۹۔

[2] الدر المختار و حاشیۃ۔ ج ۲، ص ۴۲۔

[3] الکبائر، ص ۱۱۹۔

وہ مصلحت اور ضرورت کے مطابق ٹیکس عائد کرے۔

رفع عشور کی حدیث کا مفہوم جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں سے عشور رفع کر لیے گئے ہیں، تو اس حدیث کی صحت ثابت نہیں ہے، نیز یہ صریح الدلالت نہیں ہے بلکہ اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔

ابو عبید کی تاویل ابو عبید صاحب مکس اور عاشر کے بارے میں وعید پر مشتمل احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ان احادیث کی توجیہ یہ ہے کہ یہ وہ محصولات ہیں جن کا سراغ جاہلیت میں ملتا ہے۔ عرب و عجم کے تمام بادشاہ اس قسم کے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ وہ اپنے علاقہ میں تاجروں کے داخلہ پر ان کے اموال کا دسواں حصہ لے لیا کرتے تھے۔ اس کی وضاحت ہمارے بیان کردہ ان مکاتب نبوی سے ہوتی ہے جو آپ نے مختلف شہروں کے حاملوں کو تحریر فرمائے کہ وہ لوگوں کے جانوروں کو اکٹھا کر کے زکوٰۃ وصول نہ کریں اور نہ ان سے دسواں حصہ لیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جاہلیت کا دستور تھا جسے اسلام نے ختم کر دیا اور اس کے بجائے فریضۂ زکوٰۃ مقرر کیا جس کی مقدار چالیسواں حصہ ہے یعنی ہر سو درہم پر پانچ درہم، اس مقدار کے مطابق زکوٰۃ لینے والا عاشر نہیں ہے اور یہی مفہوم اس حدیث کا کہ مسلمانوں پر عشور نہیں ہیں بلکہ عشور یہود اور نصاریٰ پر تھے۔ اور اسی طرح وہ حدیث ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں اس میں عاشر سے مراد وہ ہے جو ناجائز ٹیکس لے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی حدیث کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ان سے استفسار کیا گیا کہ کیا حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے عُشر لیا تو انھوں نے کہا نہیں مجھے معلوم نہیں ہے۔ زیاد بن حدیر کی حدیث ہے کہ ہم کسی مسلمان یا معاہد سے عُشر نہیں لیتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمانوں سے رُبع عُشر اور ذمیوں سے نصف عُشر لیتے تھے۔

غرض رفع عشور سے مراد یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب و عجم کے بادشاہ عُشر کی صورت میں جو ٹیکس لیتے تھے اسلام نے اس میں تخفیف کی اور چالیسواں حصہ فرض

گیا۔ حدیث میں وارد یہود و نصاریٰ سے مراد اہل حرب ہیں چنانچہ عبدالرحمن بن معقل بیان کرتے ہیں کہ میں نے زیاد بن حدیر سے پوچھا کہ آپ عُشر کن سے لیتے تھے انھوں نے کہا کہ ہم مسلمانوں سے عُشر نہیں لیتے تھے بلکہ اہل حرب تاجروں سے لیتے تھے کہ وہ بھی ہم سے لیتے تھے[1]۔ مسلمان غیر مسلم اقوام سے ان کے طرزِ عمل کے مطابق سلوک کیا کرتے تھے، اور اسی اصول پر آج کل عمل ہوتا ہے۔

ذمی یہود و نصاریٰ سے نہ تو اہل حرب کی طرح عُشر لیا جاتا اور نہ مسلمانوں کی طرح رُبع عُشر، بلکہ ان سے نصف عُشر لیا جاتا تھا۔ یہی مسئلہ ہے جس سے ابوعبید کو اوّلاً اشکال پیدا ہُوا بعد ازاں جب انھوں نے حضرت عمرؓ کی حدیث پر غور کیا تب انھوں نے سمجھا کہ یہ حضرت عمرؓ نے علاوہ جزیہ اور خراج کے ان سے صلح کی تھی، یعنی بربنائے صلح ان کے تاجروں سے عُشر لیا جائے گا[2] اور یہ اس لیے کہ ان کے مواشی اور نقود پر کچھ نہیں لیا جاتا جو مسلمانوں سے لیا جاتا ہے[3]۔

امام ترمذیؒ کی توجیہ عشور کے ایک معنی جزیہ کے بھی بیان کیے گئے کہ جزیہ کو خراج الرؤس بھی کہا جاتا ہے اور حدیث میں ہے کہ

"مسلمانوں پر خراج نہیں ہے"

چنانچہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس فرمانِ نبوتﷺ کہ "مسلمانوں پر عشور نہیں ہے" کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں پر جزیہ نہیں ہے کیونکہ اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ

"یہود و نصاریٰ پر عشور ہے۔ مسلمانوں پر نہیں ہے"[4]

---

[1] الاموال، ص ۷۰۷، ۷۰۸۔

[2] ایضاً، ص ۷۰۹، ۷۱۰۔

[3] احکام الذمیین والمستامنین فی دار الاسلام۔

[4] سنن الترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء لیس علی المسلمین جزیۃ، ج ۲، ص ۳۹۹۔ طحمص۔

یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ اگر ذمی اسلام لے آئے تو اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔

المناوی کی رائے

المناوی نے التیسیر میں پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ مسلم سے مکس (ضریبہ) لینا حرام ہے، اور ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو، کیونکہ المقریزی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع ملی کہ مسلمان تاجر ہندوستان آئے تو ان سے عُشر لیا گیا تو انھوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو تحریر کیا کہ مسلمان تاجروں سے دو سو درہم پر پانچ درہم اور ذمی تاجروں سے ہر بیس درہم پر ایک درہم لو، بعد ازاں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ ٹیکس ختم کر دیا[1] کیونکہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے کسی والی کو لکھا کہ مکس ختم کر دیا جائے اور رفح میں قائم بیت المکس کو منہدم کر دیا جائے[2]

ہماری نظر میں المناوی کا کلام تحقیق طلب ہے۔ کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ

۱) انھوں نے عشور کی حدیث کو صحیح یا حسن تسلیم کر لیا ہے، حالانکہ یہ حدیث نہ صحیح ہے اور نہ حسن اور خود المناوی نے فیض القدیر میں یہی بیان کیا ہے۔

۲) اس سے یہ فرض کرنا لازم آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا عمل اس حدیث کے برخلاف تھا اور صحابہ کرام نے بھی ان کو اس پر متنبہ نہیں کیا۔

۳) حضرت عمرؓ کا یہ عمل منکر تھا اور کبیرہ گناہ تھا کیونکہ صاحب مکس جنت میں نہیں جائے گا ـــــ ظاہر ہے کہ یہ صورت خلفائے راشدین کی سنت کے اتباع کے حکم کے خلاف ہے۔

۴) اس کا ایک مفہوم یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ نے ایک بے انصافی کا آغاز کیا جسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ختم کیا حالانکہ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

---

[1] التیسیر شرح الجامع الصغیر، ج ۱، ص ۳۶۸۔

[2] الاموال، ص ۷۰۴۔

نے حضرت عمرؓ کی سنتوں کا احیاء کیا اور بنو اُمیہ کے دور میں جاری ہونے والے مظالم کو ختم کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ظالمانہ ٹیکسوں کا خاتمہ کیا اور جو ٹیکسوں کی وصولیابی میں مختلف قسم کی ناانصافیاں کی جاتی تھیں ان کو مٹایا، چنانچہ ابن حزم نے زریق بن حیان الدمشقی سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انھیں تحریر کیا کہ وہ مسلمان تاجروں سے ہر چالیس دینار پر ایک دینار وصول کریں اور جو اس میں کمی رہے تو وہ اسی حساب سے لی جاتے[1]

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ حدیث کہ "مسلمانوں پر عشور نہیں ہے" اس امر کی دلیل نہیں بنتی کہ مسلمانوں سے مبنی بر انصاف ٹیکس وصول کرنا حرام ہے۔

مسالک اربعہ کے فقہاء منصفانہ ٹیکسوں کو جائز کہتے ہیں

منصفانہ ٹیکسوں کی مخالفت میں جو شبہات بیان کیے جاتے ہیں ہم نے ان کا جواب دے دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ فقہ اسلامی میں علاوہ زکوٰۃ کے ٹیکس بیان کیے گئے ہیں جن میں بعض کو عادلانہ ٹیکس شمار کیا گیا ہے اور بعض کو غیر عادلانہ ٹیکس کہا گیا ہے لیکن فقہاء نے ان ٹیکسوں کو ضرائب کے عنوان سے ذکر نہیں کیا ہے بلکہ فقہائے مالکیہ نے "وظائف" اور "خراج" کا نام دیا ہے۔ بعض فقہائے احناف نے "نوائب" کہا ہے اور بعض حنبلی فقہاء نے "الکلف السلطانیہ" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

فقہ حنفی کی تصریحات

متقدمین اور متأخرین فقہائے احناف نے منصفانہ ٹیکسوں کو بیان کیا ہے چنانچہ علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ "نوائب" (ٹیکس) منصفانہ بھی ہوتے ہیں، مثلاً نہر کے کھودنے کے لیے، محلہ کی حفاظت کے لیے حارس (چوکیدار) مقرر کرنے کے لیے لشکروں کی تیاری اور قیدیوں کا فدیہ دینے

---

[1] المحلی، ج ۶، ص ۶۶۔

کے لیے، امام (سربراہِ مملکت) بوقت ضرورت ٹیکس عائد کرسکتا ہے، لیکن بعض ٹیکس غیر منصفانہ بھی ہوتے ہیں جیسے ہمارے دور کے ظالمانہ ٹیکس[1]

القنیہ میں ابوجعفر بلخی کا قول ہے کہ اگر سلطان رعایا کی مصلحت کے پیش نظر ٹیکس عائد کرے تو وہ خراج کی طرح لوگوں پر ایک لازمی قرض ہو جائے گا، جیسے راستوں کو مامون کرنے کے لیے چوکیداروں اور محافظوں کو متعین کرنے اور نہروں وغیرہ کی درستگی کے لیے ٹیکس لینا ظلم نہیں ہے بلکہ درست ہے اور اس کی ادائیگی سے باز رہنا درست نہیں ہے، لیکن اس مسئلہ کی تشہیر نہ کی جائے کہ اس سے حکام ٹیکس لگانے میں جری ہو جائیں گے۔

ابن عابدین فرماتے ہیں کہ اس میں یہ قید ضروری ہے کہ بیت المال اس کے لیے کافی نہ ہو[2]

مسالک فقہاء کی آراء

مسلمانوں پر خراج عائد کرنا مصالح مرسلہ میں سے ہے اور بلاشک جائز ہے۔ آج اندلس میں مزید خراج کی ضرورت ہے کیونکہ دشمن سے مقابلہ ہے اور بیت المال ناکافی ہے اس لیے خراج قطعی طور پر جائز ہے، جہاں تک اس کی مقدار کا تعلق ہے تو وہ امام کی رائے پر موقوف ہے[3]

الغزالیؒ اور الشاطبیؒ کی رائے ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ اگر بیت المال خالی ہو تو خراج جائز ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے الکلف السلطانیہ اور المظالم المشترکہ کے بارے میں بیان سے ان کے نزدیک اس کے جواز کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔[4]

غرض مسالک اربعہ کے فقہاء نے ضرائب عادلہ کو جائز کیا ہے اگرچہ انھوں نے اس تحفظ کی بنا پر اس کے جواز کا برملا فتویٰ نہیں دیا ہے کہ حکمراں ٹیکس لگانے میں جری ہو

---

[1] حاشیۂ ابن عابدین، ج ۲، ص ۵۸۔

[2] ردالمحتار، ج ۲، ص ۵۹۔

[3] تہذیب الفروق القواعد السنیہ، ج ۱، ص ۱۴۱۔

[4] غیاث الامم۔ کما فی کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۲۱۳۔

جائیں گے اور عوام پر ظلم شروع کر دیں گے۔

ظالمانہ ٹیکسوں سے متعلق بعض فقہی جزئیات

اگر حکمراں رعایا پر ظالمانہ ٹیکس عائد کر دیں تو ایسی صورت سے متعلق فقہاء نے بعض فقہی جزئیات بھی بیان کی ہیں۔

۱) ظالمانہ ٹیکس میں معاملہ کفالت درست ہے یعنی جو کچھ کفیل سے ظالمانہ طریقہ پر لیا گیا ہے کفیل بنانے والا اس میں کفیل سے رجوع کر سکتا ہے، لیکن ظالم کا کفیل سے حق مطالبہ ثابت نہیں ہے[1]

۲) جو شخص ان ظالمانہ ٹیکسوں کی تقسیم اور مصارف کا بندوبست کرے گا وہ بشرط عدل ماجور ہوگا یعنی وہ ہر شخص سے اس کی قدرت واستطاعت کے مطابق لے اور انصاف کے ساتھ تقسیم کرے[2]

۳) ان ظالمانہ ٹیکسوں سے کسی حیلہ اور سفارش سے بچنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی ناد ہندگی کا بار دوسرے لوگوں پر نہ پڑے۔

اس مقام پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ ٹیکس دینا ظالم کی ظلم میں اعانت کرنا ہے، اگر کوئی شخص اس ظلم کو اپنے آپ سے دفع کرے تو جائز ہونا چاہیے۔ لیکن بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس طرح ظلم سے بچنے سے یہ ظلم ان کمزور لوگوں کی طرف سے منتقل ہو جائے گا جو ظلم سے کسی ذریعے سے نہیں بچ سکتے[3] اور یہی رائے صحیح ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس سلسلے میں بڑی عمدہ بات فرمائی ہے۔

اگر بستیوں و شہروں میں لوگوں سے ظالمانہ اجتماعی ٹیکس (المظالم المشترکہ) وصول

---

[1] حاشیۃ رد المختار، ج ۲، ص ۵۸، ۵۹۔

[2] ایضاً۔

[3] ایضاً۔

کیے جائیں اوران سے جان ومال اور مویشی کی تعداد اور درختوں کی تعداد پر ٹیکس لیے جائیں، یاان سے زکوٰۃ اور خراج کی شریعت کی مقررہ مقدار سے زائد وصول کیا جائے یا ان اشیاء پر ٹیکس لیا جائے جن پر شریعت میں کچھ نہیں ہے جیسے اشیاء کی خرید وفروخت پر ٹیکس، اگرچہ یہ ٹیکس جہاد کی وجہ بیان کر کے وصول کیے جائیں، جیسا کہ صاحب غیاث الامم نے ذکر کیا ہے، یا بادشاہ کی کسی مقام پر آمد، یا ولی عہد کی پیدائش وغیرہ پر لیا جائے یا ان کو سامان زیادہ قیمت پر فروخت کیا جائے یا نفوس کی تعداد اور جانوروں کی تعداد اور مال کی مقدار پر وصول کیا جائے۔

یہ سب لوگ ان اموال کی ادائیگی پر مجبور ہیں، اس میں کسی کو کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیے بلکہ اہتمام عدل کرنا چاہیے اور کسی حال میں بھی ظلم و ناانصافی نہیں ہونی چاہیے، یعنی دہندگان کوئی ایسا اقدام نہ کریں جس سے دوسرے پر ظلم ہوتا ہو بلکہ انصاف سے اپنا حصہ دے دے اور اگر زائد دے دے تو اس طرح دوسرے کا حق ادا ہو جائے گا اور یہ اس کا حسن سلوک شمار ہو گا اور اگر وہ چاہے تو وہ اس سے بعد میں مطالبہ کر سکتا ہے اور اسے قرض کی طرح اسے ادا کرنا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص غیر موجود ہو اور موجود لوگ اس کی طرف سے ادائیگی کر دیں تو اس پر اس کی واپسی لازم ہو گی[1]

●

---

[1] مطالب اولی النہی، ج ۳، ص ۵۶۹، ۵۷۰۔ ابن تیمیہؒ کا کتابچہ المظالم المشترکہ، دمشق سے علیحدہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

آٹھویں فصل

کیا ضرائب زکوٰۃ سے مستغنی کر سکتے ہیں؟

یہ بڑا اہم سوال ہے اور اس کا جواب دینا ناگزیر ہے کیونکہ دورِ جدید میں ہر صاحب ثروت مختلف نوعیتوں کے ٹیکس ادا کرتا ہے اور ان ٹیکسوں کی مجموعی مقدار زکوٰۃ کی مقدار سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے، مزید برآں یہ کہ ٹیکسوں کے بھی کئی مصارف وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں یعنی معذوروں کی مدد، بے روزگاروں کو روزگار کی فراہمی اور بے سہارا لوگوں کو سہارا فراہم کرنا اور تعلیم اور علاج کی سہولتیں مفت فراہم کرنا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام ٹیکس زکوٰۃ سے مستغنی کر دیتے ہیں یا نہیں؟

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ زکوٰۃ میں تین اہم بنیادی امور کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱) وہ متعین مقداریں جو شریعت نے متعین کی ہیں یعنی عشر، نصف عُشر اور رُبع عُشر۔

۲) اللہ کے حکم کے ادائیگی کی نیت اور اس حکم کو فرض عبادت سمجھ کر انجام دینے کا ارادہ۔

۳) قرآن کریم کے بیان کردہ آٹھ مصارف میں زکوٰۃ کی تقسیم۔

اب ملاحظہ کیجیے کیا ٹیکسوں سے یہ تینوں امور انجام پاتے ہیں؟

جہاں تک مقداروں کا تعلق ہے تو بہرحال ٹیکسوں میں شریعت اسلامیہ کی مقرر کردہ یہ مقداریں ملحوظ نہیں ہیں بلکہ ان مقداروں سے کم و بیش ہیں بلکہ بعض ایسی اشیاء پر جن پر شریعت نے زکوٰۃ متعین کی ہے نظام مالیات میں کوئی ٹیکس نہیں ہے

اور بعض ایسی اشیاء پر ٹیکس لگائے ہیں جن پر شریعت میں زکوٰۃ نہیں ہے۔
اس مقام پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نقود پر ٹیکس ربع عشر سے بہت زائد ہوتے ہیں اور اگر فرض کر لیا جائے کہ کم مقدار میں ہوتے ہیں، تو اس باقی ماندہ مقدار کو ادا کر دینا چاہیے۔

نیت کی شرط میں زکوٰۃ کے عبادت ہونے اور اس کے خالصتاً اللہ کے لیے انجام دیے جانے کا تصور ناگزیر ہے اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ٹیکس میں بھی اخراجِ مال کی نیت ہوتی ہے۔

مصارف کے نقطہ نظر سے امام زکوٰۃ اغنیاء سے لے کر ان مصارف میں صرف کرے گا جن کی تحدید قرآن کریم نے فرمائی ہے اور اسی طرح وصول کی جائے گی جو طریقہ اسلام نے اس کی وصولیابی کا متعین کیا ہے اور اسی نام سے اور عنوان سے لی جائے گی جو اسلام نے مقرر کیا ہے کیونکہ شعائر اسلام میں سے ہے۔ اسی لیے فقہائے مالکیہ نے کہا ہے کہ زکوٰۃ کے نام سے حکمراں جو مال ظالمانہ طور پر وصول کر لیں زکوٰۃ دہندہ کی جانب سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اس کا مفہوم یہ ہوا کہ مکس کے عنوان سے پہلے جو مالیہ وصول کیا جاتا تھا اور ٹیکس کے نام سے جو مالیہ آج وصول کیا جاتا تھا وہ زکوٰۃ کے قائم مقام نہیں ہو سکتا اور نہ ٹیکسوں کی ادائیگی سے زکوٰۃ دہندہ زکوٰۃ سے مستغنی ہو سکتا ہے۔

مگر اس جواب کا یہ نتیجہ مرتب ہوگا کہ ایک دین دار مسلمان تمام ٹیکس بھی ادا کرے اور بعد ازاں زکوٰۃ بھی ادا کرے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اوپر دہرا مالی بوجھ ہو جب کہ جو حضرات زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان پر یہ وزن نہیں ہے اور یہ بات دین کے سہل اور حرج کے بغیر ہونے کے برخلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بار بار یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیوں نہ موجودہ ٹیکسوں کو زکوٰۃ کی جگہ تصور کر لیا۔

مسلمانوں کی زندگیوں میں موجود تضاد

در اصل مذکورہ الجھن مسلمانوں کی زندگی کے اس تضاد سے پیدا ہوئی ہے کہ مسلمان ایک جانب زکوٰۃ کو فرض و عبادت تصور کرتے ہیں اور دوسری طرف

دین اسلام بحیثیت ایک نظام کے اپنی زندگیوں میں جاری نہیں کرتے، دین کو مانتے ہیں مگر دین کو جاری نہیں کرتے، یہ ایسا عجیب تضاد ہے جو اس سے پہلے کبھی اس قدر وسعت کے ساتھ رونما نہیں ہوا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں مسلمان حکمران زکوٰۃ وصول کرتے رہے ہیں اور مسلمان اپنے تمام اموال کی زکوٰۃ دیتے رہے ہیں۔ بلاشبہ بعض حکمرانوں نے وصولیابی میں جور و ظلم سے کام لیا اور بعض مسلمانوں نے ادائیگی میں تقصیر کی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ زکوٰۃ بالکلیہ معطل ہو گئی ہو، اور لوگوں کے نفوس میں دین اسلام کی وقعت اس حد تک ختم ہو گئی کہ انھوں نے کاملاً نظام زکوٰۃ کو خیرباد کہہ دیا ہو۔

عقیدہ و عمل کے اس تضاد کو سامراجی قوتوں نے زیادہ وسیع کیا ہے

مسلمانوں کی زندگی پر حاوی فکر و عمل کا تضاد درحقیقت سامراج کا پیدا کردہ ہے کہ غیر ملکی قوتیں عالم اسلام پر قابض ہو گئیں اور انھوں نے نظام اسلام کے ہر مظہر کو مٹا کر اپنا نظام حیات جاری کر دیا اور اپنے نظام تعلیم کی مدد سے خود مسلمانوں میں سے ایک ایسی نسل اٹھائی جو اسلامی عقائد کے بارے میں شکوک سے دوچار اور اسلام کے فرائض و احکام کے بارے میں تذبذب کا شکار تھی اور یہی نفسیاتی، فکری اور عملی مؤثرات تا ہنوز کارفرما ہیں اور مسلمانوں کی شریعت و ثقافت اور اخلاق و عمل پر بڑی گیرائی سے اثر انداز ہیں۔

مسلمانوں کو فسق و فجور اور بدکاری کی جانب راغب کرنے کے لیے اسلام کا فوجداری قانون معطل کر دیا گیا!

مسلمانوں کو سود خوار بنانے کے لیے اور یہودی سود خواروں کا نرم چارہ بنانے کے لیے اسلام کا مدنی قانون ختم کر دیا گیا!

اسلام کے رفاہِ عام پر مبنی اجتماعی مالی نظام پر ضرب لگانے کے لیے نظام زکوٰۃ منسوخ کر دیا گیا اور ٹیکس جاری کر کے سرمایہ دارانہ سودی نظام کی اساس رکھ دی گئی یہاں تک کہ ایک زمانے میں مصری اسمبلی میں نظام زکوٰۃ کی تجویز پیش ہوئی تو خود مسلمانوں نے

اس کی مخالفت کی کہ اب "دین" فرد کی نجی زندگی کا معاملہ ہے امر ریاست نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چند اسلامی ممالک سے مغربی سامراج رخصت ہو چکا ہے لیکن وہ اپنے پیچھے اپنی تیار کردہ ایک ایسی نسل چھوڑ گیا جس نے تہذیب مغرب کی گود میں پرورش پائی ہے اور جس کو مغربی تہذیب و ثقافت گھٹی میں پلائی گئی ہے اور اب یہ نسل سامراج کے تفویض کردہ فرائض کو انجام دے رہی ہے، اسلام کو رجعت اور پسماندگی قرار دیتی اور مغرب کے لادینی طرزِ زندگی کو ترقی اور حضارت تصوّر کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ اسلامی دنیا سے بحیثیت ایک نظام کے بالکل ختم ہو چکی ہے اور اگر بعض اربابِ خیر زکوٰۃ نہ دیتے رہتے تو زکوٰۃ کا نام تک باقی نہ رہتا!

اسلامی حکومتوں کا فریضہ

بلاشبہ زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں اس فریضہ کی تقدیس موجود ہے۔ اس لیے اس کی اس اہمیت اور تاریخی پس منظر کی وسعت کی بنا پر اس کو اسی نام، اسی عنوان، انہی مقادیر اور مصارف کے ساتھ دیگر ٹیکسوں کے ساتھ ساتھ جاری کرنا چاہیے اور اسلام کے نظام حیات کے اجراء کی جو حکومتیں دعویدار ہیں انھیں چاہیے کہ وہ فقہائے شریعت اور ماہرینِ مالیات کے تعاون سے ایسے ادارے وجود میں لائیں جن کی مدد سے نظام زکوٰۃ از سرِ نو بحال ہو سکے، نہ صرف زکوٰۃ بلکہ مکمل اسلامی نظامِ حیات کا عملاً جاری کرنا تمام مسلمانوں اور جملہ اسلامی ریاستوں کا ناگزیر فریضہ ہے۔

مسلمان فرد کی ذمّے داری

اگر اسلامی ریاستیں نظام زکوٰۃ جاری نہ کریں یا بالفاظ دیگر نظام اسلامی برپا نہ کریں اور اسی طرح اسلام سے روگردانی کیے رہیں تو کیا ایک مسلمان فرد کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ٹیکسوں کو زکوٰۃ کے حساب میں محسوب کر کے ادائے زکوٰۃ کی نیت کر لے اور اس طرح ایک ہی مال پر ٹیکس اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے دہرے وزن سے بچ جائے؟

بعض فتاویٰ

مختلف عصور میں فقہائے نے اس صورتِ حال کے بارے میں فتویٰ دیا ہے جن میں بعض سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ ٹیکسوں کو زکوٰۃ

کے حساب میں محسوب کرنا جائز ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ فقہائے شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ جو خراج ظلماً لیا جائے وہ عُشر کے قائمقام نہیں ہے اور اگر حکمران عُشر کے بدلے یہ خراج وصول کریں تو صحیح قول یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور اگر حکومت کا وصول کردہ خراج کم ہو اور بحساب شریعت زکوٰۃ زیادہ بنتی ہو تو باقی ماندہ زکوٰۃ ادا کر کے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ جس زمین پر زکوٰۃ واجب ہے اس پر عُشر کے بدلے خراج لینا اسی طرح ہے جس طرح آج کل زکوٰۃ کی جگہ ٹیکس لیا جاتا ہے اور اس مال پر لیا جاتا ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہے اور ان مصارف پر صرف کیا جاتا ہے جن میں زکوٰۃ صرف کی جاتی ہے۔

لیکن اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ حکومت جو ٹیکس لیتی ہے اسے وہ زکوٰۃ کا بدل نہیں تصور کرتی اسی لیے یہ ٹیکس مسلم اور غیر مسلم سب سے لیے جاتے ہیں اور ہر طرح کے مصارف میں صرف کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک فتویٰ امام احمدؒ سے منقول ہے کہ بادشاہ اگر سرزمین صُلح سے نصف پیداوار لے لے تو آپ نے فرمایا کہ یہ ظُلم ہے لیکن اگر مالک زکوٰۃ کی نیت کر لے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔[1]

ابن تیمیہؒ سے منقول ہے کہ جو مال حکومت ٹیکس (مکس) کے نام سے وصول کرے اسے بہ نیت زکوٰۃ دینا جائز ہے اور اس سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔[2] لیکن ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ میں ان کی رائے اس کے برخلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ حکمران جو محصول زکوٰۃ کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے لیں تو وہ زکوٰۃ شمار نہیں ہو گا۔[3] اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے کون سا صحیح ہے اور اگر دونوں صحیح ہیں تو بعد کا قول کون سا ہے۔

---

[1] شرح غایۃ المنتہی، ج ۲، ص ۱۳۳۔

[2] احمد بن محمد المنقور: الفواکہ العدیدہ فی المسائل المفیدہ، ج ۱، ص ۱۵۴۔ (ط۔ دمشق)

[3] مجموع الفتاویٰ، ج ۲۵، ص ۹۳۔

بہرحال ان فتاویٰ کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان مشقت میں مبتلا نہ ہوں اور ظالمانہ ٹیکسوں سے جس زحمت میں وہ مبتلا ہیں اس میں کچھ نرمی پیدا ہو، جب کہ ہمارے سامنے جو صورت ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ ٹیکسوں کے بارے میں تصور تو یہی ہے کہ یہ عادلانہ ٹیکس ہیں کیونکہ ان سے ریاست وحکومت کے مصارف پورے کیے جاتے ہیں۔ اور مسالک فقہیہ کی جو آرا ہم نقل کر چکے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "نوائب" "کلف سلطانیہ" اور "خراج" وغیرہ اس دور میں زکوٰۃ کے علاوہ واجبات تھے جو عوام کو دینے پڑتے تھے اور یہ زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتے تھے۔

مکس یا ٹیکس زکوٰۃ میں شمار نہیں ہوتا

بیشتر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ مکس یا ٹیکس زکوٰۃ کی جگہ کسی بھی حال میں شمار نہیں کیا جاسکتا بلکہ بعض فقہائے نے اس کو جائز سمجھنے والوں پر شدید تنقید کی ہے جیسا کہ علامہ ابن حجر الہیثمی الزواجر میں فرماتے ہیں کہ

ابن حجر ہیثمی کا کلام

بعض فاسق تاجر یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے جو محصول وصول کیے جاتے ہیں وہ اس پر زکوٰۃ کی نیت ادا کریں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، یہ ایک ظن باطل ہے اور مسلک شافعیؒ سے اس کا کوئی جواز نہیں ملتا کیونکہ حکمرانوں نے ان مکس وصول کرنے والوں کو زکوٰۃ کی وصولیابی پر متعین نہیں کیا بلکہ یہ مکاس ہر کم وبیش مال پہ محصول لے لیتے ہیں خواہ اس مال پر زکوٰۃ واجب ہو یا نہ ہو، بعد ازاں اس مال کو لشکروں کی تیاری پر صرف کرتے ہیں اگر بیت المال کے خالی ہونے کی بنا پر اس محصول کو جائز بھی قرار دیا جائے تو بھی یہ زکوٰۃ کا بدل نہیں ہے اس لیے کہ اس کو زکوٰۃ کے نام سے لیا ہی نہیں جاتا۔

بعض تاجروں نے مجھ سے یہ بھی بیان کیا کہ وہ جب مکّاس (ٹیکس وصول کنندہ) کو محصول دیتے ہیں تو زکوٰۃ کی نیت کر لیتے ہیں اس طرح گویا انھوں نے مکّاس کو زکوٰۃ دی اور اس نے اس کو زکوٰۃ کے علاوہ مصارف میں صرف کیا لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ مکّاس مستحق زکوٰۃ نہیں ہوتا بلکہ ان کے پاس مال ودولت اور قوت وشوکت سب

کچھ ہونا ہے اس لیے انھیں زکوٰۃ دینا بالکل درست نہیں ہے . . . . در حقیقت یہ مال کی شیطانی محبت ہے جو انسان حیلے سمجھاتی ہے حالانکہ زکوٰۃ فریضۂ آلٰہی ہے جس سے وہ کسی طرح بھی بری نہیں ہو سکتے۔

مکّاس (ناجائز ٹیکس وصول کرنے والے) کو فقہائے نے چوروں اور راہزنوں میں شمار کیا ہے بلکہ ان کا جرم راہزنوں کے جرم سے بھی زیادہ شدید ہے۔ اگر کوئی راہزن مال چھین لے اور مال والا زکوٰۃ کی نیت کرلے تو جس طرح یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی اسی طرح ٹیکسوں میں نیت زکوٰۃ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ بہر حال یہ سمجھنا کہ زکوٰۃ کی نیت کرکے ٹیکس دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی محض جہالت ہے۔[۱]

ابن عابدین کی رائے

علامہ ابن عابدینؒ الدالمختار میں مذکورہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس ظلم میں اضافہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ حکومت ٹھیکہ پر چنگی کا کام دے دیتی ہے اور ٹیکس وصول کرنے والے ایک ہی مال پر سال میں کئی مرتبہ ٹیکس وصول کرتے رہتے ہیں اس لیے ہمارے فقہائے احناف کی رائے یہ ہے کہ گزرنے والوں سے ٹیکس وصول کرنے کے لیے حکومت جو عاشر متعین کرتی ہے اس کو دیا ہوا محصول زکوٰۃ میں شمار کرنا درست نہیں ہے چنانچہ البزازیہ میں ہے کہ اگر ٹکس دیتے ہوئے زکوٰۃ کی نیت کی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اور یہی امام سرخسیؒ کی رائے ہے۔

ابن عابدین نے مزید فرمایا ہے کہ اگر ٹکس دیتے ہوئے یہ نیت کی کہ وہ وصول کنندگان کو زکوٰۃ دے رہا کہ ان پر جو لوگوں کے واجبات ہیں اس کے لحاظ سے وہ فقیر ہیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔[۲] بہر حال اس مسئلہ کو ہم تیسرے باب میں بیان کر چکے ہیں۔

سیّد رشید رضا کا فتویٰ

سیّد رشید رضا سے استفسار کیا گیا کہ ہندوستان کے مسلمان انگریز کو زرعی ٹیکس ادا کرتے ہیں تو کیا یہ اس

۱۔ الزواجر عن اقتراف الکبائر، ابن حجر ہیثمی، ج ۱، ص ۱۴۹۔

۲۔ حاشیۂ ردالمختار، ج ۲، ص ۲۴۔

عُشر یا نصف عُشر کا بدل ہو سکتا ہے جو شریعت نے مقرر کیا ہے۔

سید رشید رضا نے اس سوال کا المنار میں یہ جواب دیا کہ

عُشر اور نصف عُشر کی مقداریں شریعت کے حکم کے مطابق مصارف ثمانیہ میں صرف ہونی چاہئیں اگر دارالاسلام کا مسلمان حکمران یہ زکوٰۃ وصول کرے تو دہندہ کی طرف سے ادا ہو جائے گی اور اگر حکومتِ اسلامی یہ زکوٰۃ وصول نہ کرے تو زکوٰۃ دہندہ کو خود ادا کرنی چاہیے اور انگریز جو زرعی ٹیکس لیتے ہیں وہ ٹیکس ہی ہیں زکوٰۃ نہیں ہیں اور نہ ان سے زکوٰۃ ادا ہو گی بلکہ اسے ان ٹیکسوں کے علاوہ اپنے پاس سے زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی[۱]

شیخ شلتوت کا فتویٰ

شیخ الازہر شیخ شلتوت سے استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ٹیکسوں کو زکوٰۃ کی جگہ متصوّر کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں ہے بلکہ مالی عبادت ہے، ہر چند کہ اس میں اور ٹیکس میں بعض اتفاق کے پہلو بھی ہیں لیکن اختلاف کے پہلو کہیں زیادہ ہیں یعنی مصدر تشریع دونوں کا مختلف ہے، وجوب کی اساس جدا جدا ہیں، اہداف و اغراض علیحدہ علیحدہ ہیں، نسبتوں اور مقادیر میں فرق ہے اور مصارف و نفقات مختلف ہیں۔

زکوٰۃ اللہ سبحانہٗ کا مقرر کردہ دائمی ایمانی فرض ہے اور فقراء اور مساکین کی امداد کا مستقل ذریعہ ہے جب کہ ٹیکس حاکم وقت عائد کرتا ہے اس لیے ان دونوں کا مصدر تشریع مختلف ہے اور ان کے مقاصد، مقادیر اور دوام و استقرار بھی جدا جدا ہیں۔

ٹیکس کی حیثیت قرض کی سی ہے جو دینا لازم ہے ٹیکس کی ادائیگی کے بعد اگر مال بقدر نصاب زکوٰۃ ہو تو اس پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے اور ٹیکسوں کی وجہ سے جو بوجھ صاحبِ مال پر پڑتا ہے اس سے یہ گنجائش نہیں نکلتی کہ زکوٰۃ نہ دے کر فقراء کو محروم کر دیا جائے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کو اقتصاد کا مشورہ دیا جائے اور اقتصادیات کو اسلام کے مطابق استوار کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔

---

[۱] الفتاویٰ، ص ۱۱۶، ۱۱۸۔

امر عقیدہ، تقاضائے ایمانی اور مقتضائے اسلام ہے اور نظام اسلام کی جانب رجوع کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اسلام کے تمام احکام کو مضبوطی سے تھاما جائے۔ بلاشبہ آج مُسلم مالی، نفسیاتی اور اجتماعی تعویقات سے دوچار ہے جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اسلام عملاً نافذ اور جاری نہیں ہے اور مُسلم فرد کو ایک ایسا انگیز کرنا پڑ رہا ہے جو تمام تر غلط اور ضلع پر قائم ہے اور سراسر اسلام سے متناقض ہے۔

اگر مسلم کسی ایسی ریاست میں مقیم ہو جہاں ریاست فقراء اور تنگدست لوگوں کو دست گیری کرتی ہو اور مستحق زکوٰۃ کوئی مسلمان موجود نہ ہو تو بھی زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی بلکہ دیگر مصارف میں زکوٰۃ کو صرف کیا جائے گا، مثلاً اسلام کی دعوت، تالیف قلوب اور داعیان اسلام کی تیاری کے مراکز قائم کرنا اور کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا۔ اگر بالفرض ان امور میں زکوٰۃ صرف کرنا ممکن نہ ہو تو کسی قریبی ملک زکوٰۃ بھیج دی جائے تاکہ زکوٰۃ کے شرعی مصارف میں صرف ہو سکے۔

جہاں تک ابن تیمیہؒ اور امام احمدؒ کے فتاویٰ کا تعلق ہے تو ان کے فتاویٰ جس دَور سے تعلق رکھتے ہیں اس وقت نظام زکوٰۃ قائم تھا اور بالعموم تمام مسلمان زکوٰۃ دیتے اس لیے ان کا فتویٰ ایک استثنائی صُورت ہے جب کہ آج حالات بالکل مختلف ہیں اور اگر یہی حالات ان ائمہ کے پیشِ نظر ہوتے تو ان کا فتویٰ یقیناً مختلف ہوتا، کیونکہ آج اگر یہ اجازت دے دی جائے کہ مسلمان ٹیکسوں کو زکوٰۃ میں محسوب کر سکتے ہیں تو جو چند مسلمان زکوٰۃ دیتے ہیں وہ بھی زکوٰۃ نہیں دیں گے اور زکوٰۃ کا فریضہ دینی بالکل ختم ہو جائے گا جیسا کہ اور بہت سے اسلامی احکام مسلمانوں کی زندگی سے ختم ہو چکے ہیں۔

خاتمہ

اسلام کا نظام زکوٰۃ منفرد اور جدید نظام ہے

گزشتہ ابواب سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی ہے کہ اسلام کا نظام زکوٰۃ تاریخ انسانیت میں جدید اور منفرد نظام ہے اور ایسا نظام ہے جس تک انسانی فکر کی کبھی رسائی نہیں ہوئی اور نہ کسی آسمانی شریعت نے اس قدر مفصل نظام وضع کیا۔

بلاشبہ اسلام کا نظام زکوٰۃ اجتماعی، سیاسی، اخلاقی اور دینی پہلوؤں کا حامل بے مثال مالی اور اقتصادی نظام ہے۔

زکوٰۃ مالی اور اقتصادی نظام اس لیے ہے کہ یہ ایک محدود مالی ٹیکس ہے جو رؤس پر عائد ہوتا ہے جیسے زکوٰۃ الفطر اور اموال پر اور آمدنیوں پر عائد ہوتا ہے جیسے عام زکوٰۃ، یہ بیت المال کا ایک مستقل اور دائمی مصدر ہے جو ناداروں کی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کے لیے صرف ہوتی ہے اور کنز اور دولت کے ارتکاز کے خلاف ایک مؤثر جنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

زکوٰۃ اجتماعی نظام اس لیے ہے کہ یہ درحقیقت معاشرے کے تمام افراد کے لیے ایک نظام تامین ہے جس سے ہر فرد معاشرہ کو مصائب و آفات سے تحفظ ملتا ہے۔ انسانی اخوت و یکجہتی وجود میں آتی ہے، حاصلین (HAVES) اور غیر حاصلین (HAVES NOT) کے فاصلے کم ہوتے ہیں، معاشی ناہمواریاں دور ہوتی ہیں، قادرین اور عاجزین کے درمیان نفرت و حسد کی دیواریں منہدم ہوتی ہیں اور مصلحین کو امور خیر کے انجام دینے کی سہولتیں فراہم ہوتی ہیں کیونکہ سبیل خیر میں جو بوجھ ان پر آجاتا ہے زکوٰۃ اسے رفع کر دیتی ہے اور اس طرح معاشرے کے متعدد اعلیٰ مقاصد اور اہداف کی تکمیل ہو جاتی ہے اور انسانی سماج کے بے شمار

مسائل کا حل نکل آتا ہے۔

زکوٰۃ کا سیاسی پہلو یہ ہے کہ ریاست زکوٰۃ کی تحصیل اور توزیع کے فرائض انجام دیتی ہے، عاملین علیہا کا ایک پورا نظام قائم کرتی ہے اور عدل کو ملحوظ رکھتی ہے اور ان مصارف کا اندازہ و تخمین کرتی ہے جو در دولت حکومت کے دائرہ اختیار میں ہیں جیسے مؤلفۃ القلوب اور فی سبیل اللہ۔

چونکہ زکوٰۃ قلوب کی تطہیر کرتی ہے اور اغنیاء کے نفوس کو بخل اور دنائت سے پاک کرتی ہے اور نار حسد کو بجھا کر محبت اور اخوت پیدا کرتی ہے اس لیے یہ ایک اخلاقی نظام بھی ہے۔

اور اس امر میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ زکوٰۃ ایک دینی نظام ہے اس لیے کہ زکوٰۃ فریضہ اسلامی ہے اور اس کا مقصود ہی ایمان کو تقویت دینا اور اللہ کی اطاعت کے لیے تیار ہونا ہے اور اس لیے کہ زکوٰۃ دین اسلام کا ایک رکن ہے جس کی مقادیر اور مصارف تمام دین ہی نے مقرر کیے ہیں۔ اور اس لیے کہ اس کا ایک حصہ اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت دین میں صرف ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کا اس قدر وسیع اور مفید نظام اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت اللہ سبحانہٗ کی نازل کردہ ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک امی قوم میں موجود نبی امی نے خود اپنی فکر سے ایسا نظام وضع کر لیا ہو جس کی پہلے کوئی نظیر موجود نہیں تھی۔

زکوٰۃ کے بارے میں غیر مسلموں کی گواہی

تھامس آرنلڈ اپنی تصنیف دعوتِ اسلام میں لکھتے ہیں کہ

"نظام زکوٰۃ اسلام کا ایک دینی فریضہ ہے جو بڑی باریکی اور جزرسی سے اسلامی معاشرے میں اخوت اور بھائی چارہ پیدا کرتا ہے، جس میں ہر رنگ و نسل کے مسلمان برابر ہیں اور ایک نیا مسلمان ہونے والا شخص اسلام قبول کرتے ہی وہی مرتبہ حاصل کر لیتا ہے جو ایک قدیم مسلمان کا ہے۔ بلا شبہ

نظام زکوٰۃ ایک منفرد اور بے مثل نظام ہے۔

ایک اور مستشرق لیوٹورڈش کہتا ہے کہ

اسلام دو عالمی اجتماعی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

اولاً، ایک نظام اخوت قائم کر کے اجتماعیت تشکیل دیتا ہے۔

ثانیاً، زکوٰۃ فرض قرار دے کر اغنیاء کے مال میں فقراء کا حق متعین کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر اغنیاء نہ دیں تو فقراء زبردستی لے سکتے ہیں۔

ایک مصنف کہتا ہے کہ

زکوٰۃ ایک دینی اور لازمی ٹیکس ہے، ایک اجتماعی نظام ہے جس میں فقراء کی مدد ہوتی ہے اور مستقل طور پر ان کی دست گیری کی جاتی ہے۔ تاریخ انسانیت میں اسلام نے سب سے پہلے یہ انوکھا اور منفرد نظام وضع کیا ہے کہ ایک ایسا ٹیکس عائد کیا جو عملاً ارباب ثروت سے لیا جاتا ہے اور فقراء میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ایک اجتماعی دائرہ میں اُمت کی وحدت قائم ہو جاتی ہے جس سے اسلامی نظام ایک ایسی اساس پر قائم ہوتا ہے جس میں نفرت و حسد نہیں ہوتا۔[1]

فرانسیسی مستشرق ماسیناں کہتا ہے کہ

اسلام نے ابنائے معاشرہ کی کفالت کا اجتماعی اصول دے کر صحیح معنی میں تصور مساوات قائم کیا ہے اور زکوٰۃ عائد کی ہے جسے ہر شخص بیت المال کو ادا کرتا ہے جس سے تمام بنیادی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے اور انفرادی ملکیت اور تجارتی سرمایہ کاری کی توثیق ہوتی ہے، ربا کا خاتمہ ہوتا اور بالواسطہ ٹیکسوں سے نجات ملتی ہے اور اس طرح ایک ایسا معاشی نظام تشکیل پاتا ہے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک نظام عدل کی صورت میں ابھرتا ہے۔

ایک اطالوی مصنفہ فاغلیری لکھتی ہیں کہ

---

[1] کرد علی: الاسلام والحضارۃ العربیۃ۔

تقریباً تمام مذاہب نے صدقات کی اخلاقی اور اجتماعی اہمیت واضح کی ہے لیکن یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے صدقات کے فضائل بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے حکماً اور عملاً نافذ کر دیا کہ ہر شخص اپنی ثروت اور دولت میں سے ایک حصہ فقراء، محتاجین اور ضرورت مندوں کے لیے ادا کرے، اور اپنے نفس کو بخل سے پاک کر کے آلہی کفالت کے نظام میں شریک ہو جائے۔[1]

بعض مصلحین اُمت کی آراء مستشرقین کے خیالات ذکر کرنے کے بعد اب ہم بعض مسلمان مصلحین کی آراء بھی ذکر کرتے ہیں، شاید ان کی آراء ہدایت اور موعظت کا ذریعہ بن جائیں۔

اسلام کی عظمت رفتہ کی بحالی نظام زکوٰۃ کے از سرِ نو قیام سے ممکن ہو سکتی ہے

علامہ سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ اسلام فرضیت زکوٰۃ میں تمام مذاہب سے ممتاز ہے۔ اگر مسلمان نظام زکوٰۃ قائم کر لیں تو ان کے رزق میں برکت ہو اور مسلم معاشرے میں کوئی نادار، مفلس نہ رہے۔ لیکن مسلمانوں نے خود اپنے اوپر زیادتی کی ہے کہ نظام زکوٰۃ کو معطل کر دیا ہے اور تمام اقوام عالم میں سیاسی اور مالی لحاظ سے پست ہو گئے اور حکومت بھی گئی اور عزت بھی ختم ہوئی اور مسلمان اپنی اولاد کی تربیت کے لیے بھی غیروں کے محتاج ہو گئے اب ہم اپنے بچوں کو علم و تربیت کے حصول کے لیے عیسائی مشنری اسکولوں میں بھیجتے ہیں اور ان کے ملی روابط منقطع کر کے انھیں غیروں کا غلام بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ ہم ایسے اسکول کھولیں، میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے پاس دین و عقل اور ہمت و غیرت نہیں ہے حالانکہ دوسری اقوام تو اپنی فہم و فراست اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اجتماعی خیر کے لیے سب مل کر مصارف کریں اور مسلمانوں کو خدا نے حکم دیا ہے لیکن مسلمان اسی ذلت پر راضی ہیں کہ غیروں ہی

---

[1] دفاع عن الاسلام، ص ۶۹۔

کے دست نگر بنے رہیں، اور خود اپنے آپ کو فراموش کیے رہیں تاکہ اللہ بھی اپنی رحمتیں ان سے دُور رکھے۔

اب داعیانِ اصلاح کا فریضہ یہ ہے کہ وہ حصول زکوٰۃ کی ایک تنظیم قائم کریں جسے اوّلاً اس تنظیم کے منسلکین ہی کی فلاح پر صرف کیا جائے اور اس امر کو ملحوظ رکھا جائے سامراج کی غلامی میں گرفتار اقوام کی آزادی جدّوجہد پر صرف کرنا بھی مؤلفۃ القلوب کے مصرف میں داخل ہے اور نظام اسلام کے از سرِ نو برپا کرنے کی مساعی پر صرف کرنا فی سبیل اللہ کے دائرے میں آتا ہے، اسی طرح دعوتِ اسلام اور اسلام پر بیرونی حملوں کی مدافعت بھی مصرف زکوٰۃ ہے۔

اسلام کی عظمت و تقدیس کی بحالی کے لیے ناگزیر ہے کہ نظامِ زکوٰۃ بحال کیا جائے بلکہ اگر نظامِ زکوٰۃ قائم ہو جائے تو اسلام کو مزید قوت حاصل ہو گئی اور مسلمانوں کو کافروں کی غلامی سے نجات دلائی جا سکے گی، اور یہ سب کچھ عُشر اور نصف عُشر کی معمولی زکوٰۃ فرض دے کر ممکن ہو جائے گا اور ہمارے سامنے یہ مثالیں بھی ہیں کہ غیر مسلم از خود اپنی قوم اور ملک کی فلاح پر اس سے کہیں زیادہ صرف کرتے ہیں جتنی ہم مسلمانوں پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔

فوائد زکوٰۃ امت ہی کو حاصل ہوتے ہیں مرحوم شیخ شلتوت حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد کہ

"زکوٰۃ ان کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء کو لوٹائی جاتی ہے"

فرماتے ہیں کہ

یہ تعلیم نبویؐ بتاتی ہے کہ زکوٰۃ اُمت کے بعض ہاتھوں میں موجود مال کو خود اُمت کے مصالح میں صرف کرنا ہے اور ان اغنیاء کے ہاتھوں سے لے کر جو اس مال کے امین ہیں اور محافظ ہیں ان ہاتھوں میں پہنچاتا ہے جو عمل کرنے والے اور جدّوجہد کرنے والے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں زکوٰۃ کی اہمیت

مجددِ عصر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی کتاب "اسلام اور جدید معاشی نظریات" میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"اسلام کا مقصد جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ ہے کہ دولت کسی جگہ جمع نہ ہونے پائے۔ وہ چاہتا ہے کہ جماعت کے جن افراد کو اپنی بہتر قابلیت یا خوش قسمتی کی بنا پر ان کی ضرورت سے زیادہ دولت میسر آ گئی ہو وہ اس کو سمیٹ کر نہ رکھیں بلکہ خرچ کریں اور ایسے مصارف میں خرچ کریں جن سے دولت کی گردش میں سوسائٹی کے کم نصیب افراد کو بھی حصہ مل جائے۔ اس غرض کے لیے اسلام ایک طرف اپنی بلند اخلاقی تعلیم اور ترغیب و ترہیب کے نہایت مؤثر طریقوں سے فیاضی اور حقیقی امداد باہمی کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے تاکہ لوگ خود اپنے میلانِ طبع ہی سے دولت جمع کرنے کو بُرا سمجھیں اور اسے خرچ کر دینے کی طرف راغب ہوں۔ دوسری طرف وہ ایسا قانون بناتا ہے کہ جو لوگ فیاضی کی اس تعلیم کے باوجود اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے روپیہ جوڑنے اور مال سمیٹنے کے خوگر ہوں یا جن کے پاس کسی نہ کسی طور مال جمع ہو جائے، ان کے مال میں سے کم از کم ایک حصہ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ضرور نکلوایا جائے۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اس کو ارکانِ اسلام میں شامل کر دیا گیا ہے۔ نماز کے بعد سب سے زیادہ اسی کی تاکید کی گئی ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص دولت جمع کرتا ہے اس کی دولت اس کے لیے حلال ہی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا

(التوبہ : ۱۰۳)

ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرو اور اس کے ذریعے سے انھیں پاک

اور ظاہر کرو۔

لفظ زکوٰۃ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مالدار آدمی کے پاس جو دولت جمع ہوتی ہے وہ اسلام کی نگاہ میں ایک نجاست ہے ایک ناپاکی ہے اور وہ پاک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا مالک اس میں سے ہر سال کم از کم ڈھائی فی صدی راہِ خدا میں خرچ نہ کر دے۔ ’’راہِ خدا‘‘ کیا ہے؟ خدا کی ذات تو بے نیاز ہے اس کو نہ تمہارا مال پہنچتا ہے نہ وہ اس کا حاجت مند ہے۔ اس کی راہ بس یہی ہے کہ تم خود اپنی قوم کے تنگ حال لوگوں کو خوش حال بنانے کی کوشش کرو اور ایسے مفید کاموں کو ترقی دو جن کا فائدہ ساری قوم کو حاصل ہوتا ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۝ (التوبہ : ٦٠)

’’صدقات تو دراصل فقراء اور مساکین کے لیے ہیں اور ان کارکنوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل پر مقرر ہوں اور ان لوگوں کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو اور لوگوں کی گردنیں بند اسیری سے چھڑانے کے لیے اور قرض داروں کے لیے اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے لیے اور مسافروں کے لیے‘‘

یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے۔ یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے یہ ان کے لیے بے کاروں کا سرمایۂ اعانت ہے۔ یہ ان کے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعۂ پرورش ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکرِ فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادھا اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی مدد کرو۔ کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا بنے گا؟ مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ کوئی آفت ناگہانی آپڑی، بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی،

سیلاب آگیا، دیوالہ نکل گیا، توان مصیبتوں سے مخلصی کی کیا سبیل ہوگی؟ سفر میں پیسہ نہ رہا تو کیونکر گزر بسر ہوگی؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لیے بے فکر کر دیتی ہے۔ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے ڈھائی فی صدی دے کر اللہ کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرا لو، اس وقت تم کو اس دولت کی ضرورت نہیں ہے یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں۔ کل جب تم ضرورت مند ہو گے یا تمہاری اولاد ضرورت مند ہوگی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے بھی زیادہ تم کو واپس مل جائے گا۔

یہاں پھر سرمایہ داری اور اسلام کے اصول و مناہج میں کلی تضاد نظر آتا ہے سرمایہ داری کا اقتضا یہ ہے کہ روپیہ جمع کیا جائے اور اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جائے تاکہ ان نالیوں کے ذریعے آس پاس کے لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس جھیل میں جمع ہو جائے۔ اسلام اس کے بالکل خلاف یہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ اوّل تو جمع ہی نہ ہو، اور اگر جمع ہو بھی تو اس تالاب میں سے زکوٰۃ کی نہریں نکال دی جائیں تاکہ جو کھیت سوکھے ہیں ان کو پانی پہنچے اور گرد و پیش کی ساری زمین شاداب ہو جائے۔ سرمایہ داری کے نظام میں دولت کا مبادلہ مقید ہے اور اسلام میں آزاد۔ سرمایہ داری کے تالاب سے پانی لینے کے لیے ناگزیر ہے کہ خاص آپ کا پانی پہلے سے وہاں موجود ہو، ورنہ آپ ایک قطرۂ آب بھی وہاں سے نہیں لے سکتے ——— اس کے مقابلے میں اسلام کے خزانۂ آب کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو وہ اس میں لا کر ڈال دے اور جس کو پانی کی ضرورت ہو وہ اس میں سے لے لے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طریقے اپنی اصل طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی پوری ضد ہیں اور ایک ہی نظم معیشت میں دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔"

زکوٰۃ کی ایک نمایاں خصوصیت

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ارکان اربعہ میں زکوٰۃ کی نمایاں خصوصیات بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی سب سے نمایاں خصوصیت جو اسے ٹیکس سے ممتاز کرتی ہے۔ ایمان و احتساب کی وہ رُوح ہے جو اس فریضہ میں جان ڈال دیتی ہے۔ بعد ازاں فرماتے ہیں کہ

زکوٰۃ اور ان ٹیکسوں کے درمیان جو شخصی سلطنتوں میں یا نئے زمانے کی جمہوری اور عوامی حکومتوں میں نظر آتے ہیں ایک نمایاں اور بنیادی فرق جو اس کے اثرات و نتائج پر پورے طور پر اثر انداز ہے وہ اس کی شرعی ساخت اور حیثیت ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلیغ و معجزانہ الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا

تؤخذ من اغنیاء ھم وترد علی فقرائھم

ان کے دولت مندوں سے لیا جائے اور ان کے غربا میں تقسیم کیا جائے۔

یہ زکوٰۃ کی وہ شرعی حیثیت ہے جو عہد اول میں نظر آتی ہے اور جو قیامت تک برقرار رہنی چاہیے وہ ان اغنیاء (جو اس کے شرائط فرضیت پر اترتے ہیں اور زکوٰۃ کا منصوص اور معین نصاب ان کے پاس موجود ہے) سے لے کر ان مصارف میں صرف کی جائے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں اور کسی تقنن اور قانون ساز ادارہ یا شخصیت کو اس کا حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ (التوبہ : ٦٠)

صدقات واجبہ تو صرف غریبوں کا حق ہیں۔

شریعت اور احادیث نبوی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد شہر کے فقراء اور اہل حاجت ہیں، زکوٰۃ کا یہ نظام ان حکومتوں میں بھی قائم

رہا جو اسلامی قوانین کی تطبیق پر سو فی صدی عامل نہ تھیں، چنانچہ فقرا و مستحقین ان حکومتوں کے سایہ میں کبھی اپنے حقوق سے کلیتہً محروم نہیں رہے اور حدود اللہ کبھی پوری طرح معطل نہیں ہوتے[1] یہ وہ حکومتیں ہیں جن کی خدمت میں بہت غرض مند مؤرخ اور مستشرق پیش پیش نظر آتے ہیں بلکہ ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے داعی ہیں۔

اس کے برعکس جو ٹیکس موجودہ حکومتوں میں لگائے جاتے ہیں وہ زکوٰۃ کی عین ضد ہیں یہ ٹیکس (خواہ ظالمانہ ہوں یا عادلانہ، کم ہوں یا زیادہ) زیادہ تر متوسط طبقہ اور غربا سے وصول کیے جاتے ہیں اور اغنیاء و امرا کی طرف لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ یہ دولت جو کسانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور مزدوروں، کاریگروں اور تاجروں پر لگائے ہوئے ٹیکسوں سے حاصل ہوتی ہے، بڑی سخاوت، بلکہ بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ صدر مملکت اور بیرونی مہمانوں کے استقبال اور ان کی شاہانہ اور پر تکلف ضیافتوں پر (جن کو دیکھ کر الف لیلہ کے خیالی قصے یاد آجاتے ہیں) بیرونی ملکوں کے سفارت خانوں کی شاندار کاکٹیل پارٹیوں پر جن میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے، حکومتوں کی پروپیگنڈہ مشینری پر جس کا کام عوام کی دولت کو لوٹنا اور ان کا خون چوسنا ہے، غیر ملکی صحافیوں، نیوز ایجنسیوں اور ریڈیو، ٹی وی کے اناؤنسروں پر جن کا مقصد جھوٹی خبریں گھڑنا، بے گناہوں پر الزام رکھنا اور اپنے دشمنوں کو دن رات گالی دینا اور ہر وقت برا بھلا کہنا ہے اور ان اخباروں پر جن کو آج کل فوجوں اور ہتھیاروں سے زیادہ مفید اور کارگر سمجھا جاتا ہے خرچ کی جاتی

---

[1] اس کے ثبوت کے لیے امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج کافی ہے جو خلیفہ ہارون رشید کے ایماء اور تجویز پر لکھی گئی اور جس سے خراج زکوٰۃ اور صدقات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہے اور اس دولت کا سب سے بڑا مصرف انہی چیزوں کو سمجھ لیا گیا ہے"
آج ہر "عوامی" جمہوری، اشتراکی اور سوشلسٹ حکومت اسپنج کی طرح عوام
کا خون چوستی ہے اور پروپیگنڈہ، سیاسی رشوت اور صحافتی تلبیس کے سمندر
میں انڈیل دیتی ہے، اس لحاظ سے ان ٹیکسوں کی اصل تصویر اور موجودہ
حکومتوں کا اصل مرقع پیش کرنے کے لیے اس سے بہتر تعبیر نہیں ہو سکتی کہ یہ
ٹیکس غرباء سے لے کر امراء کو دے دیا جاتا ہے"۔ اسلامی زکوٰۃ جو اللہ تعالیٰ کی
طرف سے مالدار و مالک نصاب پر فرض کی گئی ہے اور جو اس امت کے
ساتھ درحقیقت لطف و رحمت کا معاملہ اور نعمت نبوّت کا ثمرہ اور نتیجہ
ہے ایک ایسا ٹیکس ہے (اگر اسے ٹیکس کہنا ضروری ہو) جس کا بار سب سے
کم اور برکت سب سے زیادہ ہے اس لیے کہ وہ اغنیاء سے وصول کیا
جاتا ہے اور فقراء کو لوٹا دیا جاتا ہے"۔

آخر میں زکوٰۃ کے موضوع پر میں اپنی یہ تحقیق ماہرین مالیات کی خدمت میں پیش کرتا
ہوں تاکہ وہ جان سکیں دنیا کے تمام نظام ہائے مالیات میں سب سے پہلے اسلام نے
بہترین اصولوں محکم ضمانتوں اور عدل و انصاف پر مبنی نظام زکوٰۃ قائم کیا ہے۔ اس
روشنی میں ماہرین مالیات کو چاہیے کہ وہ اسلام کی دی ہوئی ہدایات اور دور جدید کے
عملی حالات کے پیش نظر نظام زکوٰۃ کو از سر نو استوار کرنے کی سعی کریں اور ٹیکسوں کی فہرست
میں زکوٰۃ کو سر فہرست رکھیں۔

میں اپنی یہ تحقیق ان حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو کسی بھی طرح "اجتماعی
کفالت" سے متعلق ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ انسانی تاریخ میں یہ اوّلین "اجتماعی
کفالت" کا نظام ہے جو حکومت کے توسط سے بروئے کار آتی ہے۔ درانحالیکہ مغرب
میں ضعفاء اور محتاجین کی امداد و تعاون کی تاریخ ہی سترھویں صدی سے شروع ہوتی
ہے اور ہم نے بھی انشورنس کا نظام مغرب ہی سے لیا ہے، کیوں نہ ہم اسلام کے نظام
"کفالت" اور اجتماعی ضمانت کے نظام کو اختیار کریں!

میں اپنی یہ تحقیق ان مسلمان دانشوروں کی خدمت میں بھی پیش کرتا ہوں جن کے نام اسلامی اور صوبے میں مشرقی ہیں لیکن قلب ونظر سراسر مغربی ہیں، تاکہ انھیں علم ہو کہ اسلام محض انسان کی نجی زندگی کا معاملہ اور درونِ خانہ عبادت کی مذہبی رسوم کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسلام دین و دنیا کے تمام امور پر مشتمل، علم و عمل کے ہر پہلو پر حاوی حقوق و واجبات کے تمام گوشوں پر محیط، حریت و عدل کے تمام تقاضوں کا جامع اور زندگی کے ہر ہر پہلو کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے اور اس کی واضح مثال نظام زکوٰۃ ہے۔

میں اپنا یہ مطالعہ تمام مسلمان حکومتوں کو پیش کرتا ہوں تاکہ وہ اسلامی شریعت کی رجوع کریں اور یکے بعد دیگرے اسلامی قانون کو اختیار کریں تاکہ مسلمانوں کی زندگی سے عقیدہ و عمل کے تضادات دُور ہوں اور مسلمان ریاستیں اس قابل ہو سکیں کہ جس طرح وہ سیاسی سامراج سے آزاد ہو چکی ہیں اسی طرح وہ مغرب کی ذہنی غلامی سے بھی آزاد ہو جائیں اور اپنے قوانین اور نظام حیات کا سرچشمہ قانون اسلام کو بنالیں۔

اور سب سے آخر میں میں اپنی یہ علمی کاوش ان حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو اسلامی نظام کے داعی ہیں اور فقہ اسلامی سے متعلق ہیں کہ ہو سکتا ہے قرآن و سنّت کی روشنی میں کیے گئے اس مطالعہ سے ان کے ایمان اور یقین میں اضافہ ہو اور وہ کامل یقین و ایمان کے ساتھ مسلمانوں کی قیادت کر سکیں اور ان کی حق و عدل کی جانب راہنمائی کر سکیں اور انھیں علم کی اساس پر اس امر سے آگاہ کر سکیں کہ شریعت اسلامیہ ہر دَور اور ہر مقام کے لیے موزوں ہے اور یہی واحد نظام زندگی ہے جو انسان کی صلاح دنیا اور فلاح آخرت کا ضامن ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اشاریہ (اعلام)

آمدی ، ابوالحسن علی ، اصول فقہ کی مشہور کتاب الاحکام فی اصول الاحکام کے مصنف ۔ م ۶۳۱ھ ۔

ابہری ، محمد بن عبداللہ بن صالح ، مالکی مسلک کے فقیہ ۔ م ۳۹۵ھ ۔

ابن الاثیر ، علی بن محمد ، الکامل فی التاریخ کے مصنف ۔ م ۶۳۰ھ

ابن الاثیر ، مجدالدین ، مبارک بن محمد ۔ م ۶۰۶ھ

اجہوری ، علی بن محمد ۔ م ۱۰۶۶ھ

احمد بن ثابت عوبضہ ، مشہور مصری ماہر قانون ۔

اسحاق ، بن ابراہیم بن مخلد الحنظلی ، ابن راہویہ ، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے استاذ ۔ م ۲۳۷ھ

ابواسحاق ، عمرو بن عبداللہ سبیعی کوفی ، تابعی ہیں ۔ م ۱۲۶ھ

اسماء بنت ابی بکر ، حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی ، ذات النطاقین ، حضرت زبیر بن العوام کی اہلیہ ، ان کے دو فرزندان عبداللہ اور عروہ کی والدہ ۔ م ۷۲ھ

اشہب ، بن عبدالعزیز قیسی ، مسلک مالک کے مطابق مشہور مصری فقیہ ، م ۲۰۴ھ

اصبغ ، بن الفرج ، ابوعبداللہ ، ابن وہب کے تلامذہ میں سے تھے اور مسلک مالک میں بڑا درک رکھتے تھے ۔ م ۲۲۵ھ

اعظمی ، ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمی ، ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں ، ازہر میں تعلیم

حاصل کی، انگریزی میں مقالہ تحریر کیا جس میں شاخت کے مزعومات کا علمی رد کیا۔

ابوالاعلیٰ مودودی ، عصرِ جدید کے مائہ ناز مفکر، ملت اسلامیہ کے مجدد، جماعت اسلامی کے مؤسس و بانی۔

انس ، بن مالک بن نضر، مشہور صحابی، خادم رسول، م ۹۲ھ

اوزاعی ، عبدالرحمٰن بن عمرو، مشہور فقیہ، م ۱۵۷ھ

ایوب السختیانی ، ابن ابی تیمیۃ البصری، مشہور فقیہ، م ۱۳۱ھ

الباجی ، ابوالولید، سلیمان بن خلف بن سعد، مسلک مالک کے مشہور فقیہ، قاضی، اور مؤطا امام مالکؒ کے شارح۔ م ۴۷۴ھ

الباقر ، ابوجعفر محمد بن علی، زین العابدین، م ۱۱۸ھ

ابن بشیر ، ابن بطال، مسلک مالک کے فقیہ،

البغوی ، عبداللہ بن محمد البغدادی، م ۳۱۷ھ

ابوبکر صدیقؓ ، عبداللہ بن ابی قحافہ، خلیفۂ رسولؐ، رفیقِ غار۔ م ۱۳ھ

ابوبکر الاحم ، عبدالرحمٰن بن الاحم العبدی، ابن معین نے ثقہ کہا ہے، ابوحاتم نے صدوق کہا ہے، مسلم اور نسائی نے ان سے ایک ایک حدیث روایت کی ہے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ ، عبدالرحمٰن بن عبدالملک، امام بخاریؒ نے ان سے دو حدیثیں نقل کی ہیں، ان کی توثیق اور تضعیف میں اختلاف ہے، امام نسائی نے بھی ان سے روایات نقل کی ہیں۔ م ۳۳۵ھ

ابوبکر عبدالعزیز ، بن جعفر، حنبلی مسلک کے مشہور فقیہ، غلام الخلال کے نام سے متعارف ہیں۔ م ۳۶۳ھ

البلاذری ، احمد بن یحییٰ، معروف مؤرخ، مشہور کتاب فتوح البلدان کے مصنف، م ۲۵۸ھ

بلال بن رباح ، صحابی رسولؐ ، م ۲۰ھ

البہی الخولی ، صاحب تصانیف مصر کے مشہور داعی اسلام۔

البیہقی ، احمد بن الحسین ، السنن الکبریٰ (مجموعۂ حدیث) کے مصنف م ۴۵۸ھ

ابن تیمیہؒ ، احمد بن عبدالحلیم ، مشہور مجتہد و فقیہ ، م ۷۲۸ھ

الثوری ، سفیان بن سعید ، مشہور فقیہ و محدث ، م ۱۶۱ھ

ابو ثور ، ابراہیم بن خالد الکلبی ، فقیہ ، صاحب الشافعیؒ ، م ۲۴۰ھ

جابر بن زید ، تابعی فقیہ ، م ۹۳ھ

جابر بن عبداللہ ، صحابی ، فقیہ ، م ۷۸ھ

الجصاص ، احمد بن علی ابوبکر الرازی ، مشہور حنفی فقیہ ، م ۳۷۰ھ

جعفر الصادق ، جعفر بن محمد الہاشمی ، فقیہ ، اہل بیت کے امام ، م ۱۴۸ھ

ابن الجوزی ، عبدالرحمٰن بن علی ابوالفرج ، حنبلی مسلک کے فقیہ ، م ۵۹۷ھ

الجوینی ، عبدالملک بن عبداللہ ، مسلک شافعیؒ کے فقیہ ، امام الحرمین م ۴۷۸ھ

ابن الحاجب ، عثمان بن عمر ، مالکی ، اصولی و نحوی ، م ۶۴۶ھ

الحازمی ، ابوبکر بن محمد بن موسیٰ ، م ۵۸۴ھ

ابن حامد ، حسن بن حامد بن علی ، حنبلی مسلک کے امام ، م ۴۰۳ھ

ابن حبیب ، عبدالملک ، مالکی فقیہ ، م ۲۳۸ھ

ابو حثمہ ، عبداللہ ، یا عامر الانصاری ، صحابی رسولؐ ، جو اُحد میں آپؐ کے لیے راستہ بنانے کی خدمت پر مامور تھے۔

ابن حجر ، احمد بن علی العسقلانی ، فتح الباری کے مصنف ، م ۸۵۲ھ

ابن حجر الہیثمی ، احمد بن محمد ، شافعی فقیہ ، "المنہاج" اور "الزواجر" کے مصنف م ۹۷۴ھ

ابن حزم ، علی بن احمد ، ابو محمد الظاہری ، المحلّیٰ کے مصنف ، م ۴۵۶ھ

حسن بصری ، ابن ابی الحسن ، تابعی ، فقیہ ، م ۱۱۰ھ

حسن بن صالح بن حی الہمدانی ، فقیہ عابد ، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ان کی حدیث نقل کی ہے،

بعض نے ان کو ضعیف کہا ہے کیونکہ تشیع کی جانب میلان تھا اور جمعہ میں نہیں آتے تھے، اس لیے ان کے نزدیک فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز تھا۔ م ۱۶۶ھ

حسن بن علی بن ابی طالبؓ ، نواسہ رسولؐ، فرزند علی، جنت کے گل سرسبد۔ م ۴۹ھ

حسن بن علی ، فقیہ حنفی، الجواہر المضیہ میں اس نام سے متعدد شخصیات مذکور ہیں۔

حسین العبدی ، بن محمد زیاد العبدی النیسابوری، القبانی کے لقب سے مشہور ہیں اور محدث ہیں۔ م ۲۸۹ھ

حربی ، ابراہیم بن اسحاق۔

حقینی ، علی بن جعفر بن الحسن، زیدی مسلک کے فقیہ اور متکلم۔ م ۴۹۰ھ

حماد بن ابی سلیمان ، ابو اسماعیل الکوفی، مشہور فقیہ، امام ابو حنیفہؒ کے استاذ، م ۱۱۹ھ

خرشی ، ابو عبداللہ محمد مالکی، مختصر الخلیل کے شارح۔ م ۱۱۰۱ھ

خرقی ، ابوالقاسم عمر بن حسین بن عبداللہ، فقیہ حنبلی، م ۳۳۴ھ

ابوالخطاب ، محفوظ بن احمد الکلواذی، حنبلی مسلک کے امام م ۵۱۱ھ

الخطابی ، محمد بن محمد بن ابراہیم، ابو سلیمان، فقیہ، محدث، لغوی۔ م ۳۸۸ھ

ابن خلدون ، عبدالرحمن بن محمد، مشہور فلسفی، مؤرخ، علم الاجتماع کا مؤسس۔ م ۸۰۸ھ

خلاف ، الشیخ عبدالوہاب، فقیہ معاصر۔

خلیل ، بن اسحٰق الجندی المصری، مالکی فقیہ، المختصر کے مصنف۔ م ۷۷۶ھ

ابو خیثمہ ، زہیر بن حرب، حافظ، ثقہ، مسلمؒ نے ان سے روایت نقل کی ہے۔ م ۲۳۴ھ

داؤد الظاہری ، بن علی بن خلف، فقیہ، مسلک ظاہریہ کے امام۔ م ۲۷۰ھ

دراز ، شیخ محمد عبداللہ، معاصر عالم و فقیہ۔ م ۱۹۵۸ء

ابوالدرداءؓ ، عویمر بن زید الانصاری، صحابی رسولؐ۔ م ۳۲ھ

الدردیر ، احمد بن محمد العدوی المالکی المصری ، م ۱۲۰۱ھ

الدسوقی ، محمد بن عرفۃ ، المالکی المصری ، م ۱۲۳۰ھ

ابن دقیق العید ، محمد بن علی بن وہب ، ساتویں صدی ہجری کے مجدد ، م ۷۰۲ھ

دہلوی ، احمد بن عبدالرحیم ، شاہ ولی اللہؒ ۔ م ۱۱۷۶ھ

ابوذر غفاری ، جندب بن جنادہ ، صحابی رسولؐ ۔ م ۳۲ھ

ذہبی ، محمد بن احمد ، حافظ حدیث ، مؤرخ ونقاد ۔ م ۷۴۷ھ

رافعی ، ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد ، مسلک شافعیؒ کے امام ۔ م ۶۲۳ھ

رافعی ، مصطفےٰ صادق ، معاصر ادیب ۔ م ۱۹۳۷ء

ربیع بن انس ، البکری ، الحنفی ، ابوحاتم نے صدوق کہا ہے ۔ امام نسائیؒ نے فرمایا کہ
ولیس بہ بأس ۔ م ۱۳۹ھ

ربیعہ ، بن ابی عبدالرحمٰن ، تابعی ، مسلک مالک کے مشہور فقیہ ، م ۱۳۶ھ

ابورزین ، مسعود بن مالک اسدی ، تابعی ، م ۸۵ھ

ابن رشد ، محمد بن احمد (امجد) مشہور مالکی فقیہ ، م ۵۲۰ھ

ابن رشد ، محمد بن احمد ، (الحفید) قاضی ، فلسفی ، فقیہ ، م ۵۹۵ھ

رشید رضا ، مشہور مصری معاصر عالم ، تفسیر المنار کے مصنف ۔ م ۱۳۵۴ھ

ابن رشید ، محمد بن عمر بن محمد ، فقیہ مالکی ، محدث ، مفسر ، م ۷۲۱ھ

رملی ، شمس الدین ، المنہاج کے شارح ۔

ریس ، محمد ضیاء الدین ، استاذ تاریخ اسلامی ، الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ
کے مصنف ۔

ابن الزبیر ، عبداللہ بن زبیر بن عوام ، صحابی رسولؐ ۔ م ۷۳ھ

زرکشی ، بدرالدین بن عبداللہ بن محمد شافعیؒ ، م ۷۹۴ھ

زروق ، احمد بن محمد بن عیسیٰ ، ۸۹۹ھ

زفر ، بن ہذیل بن قیس العنبری ، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ، مشہور فقیہ ،

م ۱۵۸ھ

زمخشری ، محمود بن عمر، تفسیر الکشاف کے مصنف۔ م ۵۳۸ھ

زنبلاور ، معاصر مستشرق۔

ابوزہرہ ، شیخ محمد، معاصر فقیہ، صاحب تصانیف۔

زہری ، محمد بن مسلم بن شہاب، فقیہ تابعی، م ۱۲۴ھ

زید بن ثابت ، کاتب وحی، جامع قرآن، صحابی رسولؐ۔ م ۴۵ھ

زید بن علی ، زیدیہ مسلک کے امام، فقیہ اہل بیت۔ م ۱۲۰ھ

ابن ابی زید ، عبداللہ بن عبدالرحمٰن، فقیہ مالکی، م ۳۸۶ھ

سالم بن عبداللہ، بن عمر بن الخطاب، تابعی فقیہ، سات فقہاء مدینہ میں سے ایک۔ م ۱۰۶ھ

سحنون ، عبدالسلام بن سعید تنوخی، فقیہ مالکی، م ۲۴۰ھ

سُدی ، اسماعیل بن عبدالرحمٰن، مفسر، م ۱۲۷ھ

سرخسی ، محمد بن احمد ابوبکر، مشہور حنفی فقیہ، المبسوط کے مصنف، م ۴۸۳ھ

سعد بن ابی وقاص، الزہری، سابقین اولین اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک، صحابی رسولؐ۔ م ۵۵ھ

سعید بن جبیر ، مشہور تابعی۔ م ۹۵ھ

سعید بن عبدالعزیز، الحاکم کہتے ہیں کہ وہ اہل شام کے لیے اس مرتبہ کے حامل ہیں جس کے اہلِ مدینہ کے لیے امام مالکؒ حامل ہیں۔ م ۱۶۷ھ

سعید بن المسیب، سید التابعین، م ۹۴ھ

ابوسعید الخدری، سعید بن مالک بن سنان الخزرجی، ان سات صحابہ میں سے ایک جنھوں نے ایک ہزار سے زائد احادیث روایت کی ہیں۔ م ۷۴ھ

سفیان بن عینیہ، ثقہ، حافظ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان

نہ ہوتے تو ارض حجاز میں علم باقی نہ رہتا۔ م ۱۹۸ھ

سلمان فارسی، ابوعبداللہ، ابن الاسلام، صحابیٔ رسولؐ، م ۳۳ھ

سلمہ بن الاکوعؓ، صحابیٔ رسولؐ، م ۷۴ھ

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ، تابعی، فقیہ، ثقہ، م ۹۴ھ

سلیمان بن حرب، ابوایوب بصری، مکہ کے قاضی، ثقہ، حافظ حدیث۔ م ۲۲۴ھ

سلیمان بن موسیٰ، فقیہ شام، تلامذہ مکحول میں اعلم۔ م ۱۱۵ھ

سلیمان بن یسار، مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے ایک۔ م ۱۱۰ھ

سہل بن حثمہ، صحابیٔ رسولؐ۔

سید قطبؒ، فی ظلال القرآن کے مصنف، مشہور اسلامی مفکر۔ م ۱۹۶۶ء

ابن سیرین، محمد ابوبکر البصری، فقیہ تابعی، م ۱۱۰ھ

شاطبی، ابواسحٰق ابراہیم بن موسیٰ، المالکی، الموافقات کے مصنف، م ۷۹۰ھ

شاکر، شیخ احمد بن محمد، قاضی، محدث، لغوی، نقاد، المحلّی، الرسالہ، المسند الطبری کے محققانہ حواشی تحریر کیے۔

ابن شبرمہ، عبداللہ بن الطفیل، قاضی، فقیہ، م ۱۴۴ھ

شریح، بن الحارث بن قیس، قاضی، تابعی، م ۸۷ھ

شریک بن عبداللہ، قاضی، فقیہ، ثقہ، صدوق۔ م ۱۷۷ھ

شعبی، عامر بن شراحیل الکوفی، فقیہ تابعی، م ۱۰۵ھ

ابوالشعثاء، سلیم بن اسود بن حنظلہ، تابعی، ثقہ، م ۸۵ھ

شلتوت، شیخ محمود، سابق شیخ الازہر، مشہور معاصر صاحب تصانیف عالم۔

شہر بن حوشب، تابعی، بعض نے توثیق کی اور بعض نے تضعیف کی ہے۔ م ۱۰۰ھ

شوکانی، محمد بن علی الیمنی الزیدی، مجتہد فقیہ، م ۱۲۵۵ھ

شیرازی، ابواسحٰق، ابراہیم بن علی بن یوسف، مسلک شافعیؒ کے فقیہ، م ۴۷۶ھ

صدر الشریعۃ، مسعود بن احمد بن برہان، فقیہ حنفی۔
صدیق حسن خان، نواب ریاست بھوپال، امام مجتہد، م ۱۳۰۷ھ
صنعانی، محمد بن اسماعیل، زیدی فقیہ، م ۱۱۸۲ھ
جمیری، عبدالواحد بن الحسین، فقیہ شافعی، م ۳۸۶ھ
ضحاک، بن مزاحم، مفسر، م ۱۰۰ھ
ابوطالب، یحییٰ بن الحسین، م ۴۲۴ھ
طاؤس، ذکوان بن کیسان، تابعی، م ۱۰۶ھ
طبری، محمد بن جریر، مفسر، مؤرخ، م ۳۱۰ھ
طحاوی، احمد بن محمد بن سلامہ، حافظ، فقیہ حنفی، م ۳۲۱ھ
طلحۃ بن عبداللہ، تابعی، فقیہ، م ۹۷ھ
عائشہ بنت ابی بکر الصدیقؓ، ام المؤمنین، اُمت کی جملہ خواتین میں سب سے بڑی فقیہ خاتون۔ م ۵۸ھ
ابن عابدین، محمد امین، حنفی فقیہ، رد المحتار کے مصنف۔ م ۱۲۵۲ھ
ابوالعالیہ، رفیع بن مہران، تابعی۔ م ۹۰ھ
عبادۃ بن صامت، صحابی رسولؐ۔ م ۳۴ھ
ابوالعباس، احمد بن ابراہیم، فقیہ اہل بیت، م ۳۵۳ھ
عبداللہ بن شداد، بن الہاد اللیثی، تابعی، ثقہ۔
ابن عبدالبر، ابوعمر یوسف بن عبداللہ، حافظ، فقیہ، الاستیعاب کے مصنف، م ۴۶۳ھ
ابن عبدالحکم، محمد بن عبداللہ، فقیہ مالکی، م ۲۶۸ھ
عبدالرحمان حسن، سابق وکیل الازہر۔
عبدالرحمان عیسیٰ، مدیر تفتیش علوم الدینیہ، الازہر۔
عبدالرحمان فہمی، اسلامی عجائب گھر قاہرہ کے ڈائرکٹر۔

اکثر نے تضعیف کی ہیں۔ م ۱۱۱ھ

اُمِّ عطیہ ، نسیبہ بنت کعب، صحابیہ، غزوات میں تیمارداری کرتی تھیں۔
م ۱۳ھ

ابن عقیل ، ابوالوفا علی بن محمد، حنبلی فقیہ۔ م ۵۱۳ھ

عکرمہ بن عبدالبربری، حضرت ابن عباس کے شاگرد، فقیہ مکہ، تابعی۔ م ۱۰۷ھ

علیش ، الشیخ محمد بن احمد المصری، مسلک مالک کے مفتی۔ م ۱۲۹۹ھ

علی بن الحسین، بن علی بن ابی طالب، زین العابدین، تابعی۔ م ۹۳ھ

علی بن ابی طالب، چوتھے خلیفہ راشد، م ۴۰ھ

علی مبارک ، مصری وزیر، جنھوں نے دار الکتب المصریہ قائم کیا۔ م ۱۸۹۳ء

ابن علیہ ، اسماعیل بن ابراہیم، محدث، و فقیہ۔ م ۱۹۳ھ

عمر الحافظ ، بن احمد بن محمد بن موسیٰ نیشاپوری، حنفی فقیہ۔ م ۳۶۶ھ

عمر بن الخطاب ، خلیفہ دوم۔ م ۲۳ھ

عمر بن عبدالعزیز، پانچویں خلیفہ راشد، مجدد ملت۔ م ۱۰۱ھ

عمرو بن دینار ، مفتی مکہ مکرمہ۔ م ۱۲۵ھ

عمرو بن شرحبیل الہمدانی، ابن مسعودؓ کے شاگرد۔ م ۶۳ھ

عمرو بن العاصؓ، صحابی رسولؐ، فاتح مصر۔ م ۴۳ھ

عمرو بن میمون ، تابعی۔ ثقہ، م ۷۴ھ

عمران بن حصین، صحابی رسولؐ۔ م ۵۲ھ

عمرة بنت عبدالرحمٰن، حضرت عائشہؓ کی زیر تربیت رہیں اور ان سے روایات نقل کیں۔ ۹۸ھ

عیسیٰ عبدہٗ ، معاصر عالم۔

عیاض بن موسیٰ، فقیہ و محدث، م ۵۴۴ھ

غزالیؒ ، محمد بن محمد، ابوحامد، م ۵۰۵ھ

غزالی ، شیخ محمد، معاصر عالم۔

فاطمہ بنت قیس ، صحابیہ م ۵۰ھ

فخر الرازی ، محمد بن عمر بن الحسین، مفسر و متکلم، م ۶۰۶ھ

قاسم ، بن ابراہیم، ائمہ اہل بیت میں سے ہیں، م ۲۴۲ھ

قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، تابعی، عالم۔ م ۱۰۸ھ

ابن القاسم ، عبد الرحمٰن العتقی، امام مالکؒ کے شاگرد، م ۱۹۱ھ

القاسمی ، جمال الدین بن محمد، علامہ شام، م ۱۳۳۲ھ

قتادہ بن دعامہ، تابعی، م ۱۱۷ھ

ابن قدامہ ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد، حنبلی فقیہ، المغنی کے مصنف، م ۶۲۰ھ

قرافی ، شہاب الدین ابو العباس، فقیہ مالکی، اصولی، م ۶۸۴ھ

قرطبیؒ ، احمد بن عمر، شارح مسلم، م ۶۵۶ھ

قرطبیؒ ، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، مفسر، فقیہ مالکی، م ۶۷۱ھ

قشیری ، عبد الرحمٰن بن عبد الکریم، فقیہ، شافعی، م ۵۱۴ھ

قفال ، عبد اللہ بن احمد، م ۴۱۷ھ

قہستانی ، احمد بن محمد، فقیہ حنفی۔

ابن القیمؒ ، ابو عبد اللہ، محمد بن ابی بکر، امام محقق، م ۷۵۱ھ

ابو قلابہ ، عبد اللہ بن زید، تابعی، م ۱۰۴ھ

کاسانی ، علاؤ الدین ابو بکر بن مسعود، فقیہ حنفی، م ۵۸۷ھ

ابن کثیر ، ابو الفداء اسماعیل القرشی، م ۷۷۴ھ

الکرخی ، ابو الحسن عبید اللہ بن دلال، حنفی فقیہ، م ۳۴۰ھ

ابن اللبان ، محمد بن عبد اللہ بن الحسن، فقیہ شافعیؒ، م ۴۰۲ھ

اللخمی ، علی بن محمد، مالکی فقیہ، م ۴۷۸ھ

ابن ابی لیلیٰ ، محمد بن عبد الرحمٰن، فقیہ، قاضی کوفہ، امام ابو حنیفہؒ کے ہم عصر، م ۱۴۸ھ

لیث بن سعد بن عبدالرحمٰن، امام ثقہ، م ۱۷۵ھ

ابن الماجشون، عبدالملک بن عبدالعزیز، مفتی اہل مدینہ، م ۲۱۲ھ

مؤید باللہ ، احمد بن الحسین، فقیہ زیدی، اہل بیت کے امام، م ۴۱۱ھ

مازری ، محمد بن علی بن عمر، فقیہ مالکی، شارح مسلم، م ۵۳۶ھ

مالقی ، محمد بن الحسن، فقیہ مالکی، م ۷۷۱ھ

ماوردی ، ابوالحسن علی بن محمد، الاحکام السلطانیہ کے مصنف، م ۴۵۰ھ

مجاہد ، بن جبر المکی، تابعی، م ۱۰۳ھ

محمد باقر الصدر ، معاصر عالم

محمد بن الحسن الشیبانی، امام ابوحنیفہ کے شاگرد، م ۱۸۹ھ

محمد حمید اللہ حیدر آبادی، مشہور معاصر محقق، مقیم پیرس۔

محمد بن حنفیہ ، بن علی بن ابی طالب، تابعی ثقہ، م ۷۳ھ

محمد عبداللہ العربی، معاصر عالم۔

محمد عبدہٗ ، مفتی مصر، مصلح معاصر، م ۱۹۰۵ء

محمد عزیز ، پاکستانی ماہر اقتصادیات۔

محمد بن کعب القرظی، تابعی، ثقہ، م ۱۰۸ھ

محمد بن مسلمہ ، حنفی فقیہ۔

محمد بن یحییٰ ، شافعی فقیہ، م ۵۴۸ھ

محمود ابوالسعود ، ماہر اقتصادیات

مخلوف ، حسنین محمد، مفتی مصر، معاصر۔

مخلوف ، محمد حسنین المالکی، فقیہ، مفسر، ادیب، م ۱۳۵۵ھ

مراغی ، احمد مصطفیٰ، صاحب تفسیر۔

مرتضیٰ ، محمد بن یحییٰ، زیدی فقیہ، م ۳۱۰ھ

مرۃ الہمدانی ، بن شراحیل، تابعی، ثقہ، م ۷۶ھ

مروان بن الحکم ، معاویۃ بن یزید کے بعد نو ماہ حکومت کی، م ۶۵ھ

فرحون ، اسماعیل بن یحییٰ ، امام شافعیؒ کے شاگرد، م ۲۶۴ھ

مسروق ، تابعی ، فقیہ ، م ۶۲ھ

مقریزی ، احمد بن علی، مشہور مؤرخ ، الخطط المقریزیہ کے مصنف ، م ۸۴۵ھ

مکحول ، فقیہ تابعی ، م ۱۱۲ھ

معاذ بن جبل ، صحابی رسولؐ ، م ۱۸ھ

معاویۃ بن ابی سفیان ، صحابی رسولؐ ، م ۶۰ھ

مغنیہ ، محمد جواد ، شیعہ معاصر عالم۔

مغیرۃ بن شعبہ ، صحابی رسولؐ ، م ۵۰ھ

ابن مفلح ، حنبلی فقیہ ، م ۷۶۳ھ

مناوی ، محمد عبد الرؤف ، فیض القدیر کے مصنف ، م ۱۰۳۱ھ

ابن المنذر ، محمد بن ابراہیم ، فقیہ مجتہد ، م ۳۱۹ھ

منذری ، زکی الدین عبد العظیم مختصر سنن ابی داؤد کے مصنف ، م ۶۵۶ھ

مہدی ، احمد بن یحییٰ ، زیدی امام ، البحر الزخار کے مصنف ، م ۸۴۰ھ

ابو موسیٰ اشعری ، صحابی رسولؐ ، م ۴۳ھ

موسیٰ بن طلحہ ، بن عبد اللہ القرشی ، تابعی ، م ۱۰۳ھ

میمون بن مہران ، تابعی فقیہ ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی جانب سے الجزیرہ میں قاضی ، م ۱۱۶ھ

ابن ناجی ، قاسم بن عیسیٰ ، فقیہ مالکی ، م ۸۳۷ھ

الناصر ، حسن بن علی ، م ۳۰۴ھ

ابن نافع ، عبد اللہ الصائغ ، م ۲۰۶ھ

ابن نجیم ، البحر الرائق کے مصنف ، م ۹۷۰ھ

نحاس ، ابو جعفر بن یزید ، فقیہ تابعی ، م ۹۶ھ

ندوی ، سید ابوالحسن علی ، مفکر، داعیٔ اسلام۔
نووی ، یحییٰ بن شرف ، فقیہ شافعی ، م سنہ ۶۷۶ھ
ہادی ، یحییٰ بن الحسین ، اہلِ بیت کے امام ، م سنہ ۲۹۸ھ
ابوہریرہؓ ، صحابیٔ رسولؐ ، م سنہ ۶۷ھ
ابن الہمام ، محمد بن عبدالواحد ، حنفی فقیہ ، فتح القدیر کے مصنف ، م سنہ ۸۶۱ھ
واحدی ، علی بن احمد ، مفسر، نحوی ، م سنہ ۴۶۸ھ
وکیع بن الجراح ، محدث ، مفتی ، م سنہ ۱۹۶ھ
ابن وہب ، عبداللہ بن وہب ، مالکی فقیہ ، م سنہ ۱۹۷ھ
یحییٰ بن آدم ، الخراج کے مصنف ، م سنہ ۲۰۳ھ
یحییٰ بن حمزہ ، زیدی فقیہ ، م سنہ ۷۴۹ھ
یعقوب بن ابراہیم فقیہ حنبلی ، قاضی ، م سنہ ۴۸۶ھ
ابویعلیٰ ، محمد بن حسین الفراء ، قاضی ، حنبلی فقیہ ، م سنہ ۴۵۸ھ
ابویوسف ، یعقوب بن ابراہیم ، امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ، فقیہ مجتہد ، قاضی القضاۃ ، م سنہ ۱۸۲ھ

کتابیات

قرآن، تفاسیر و علوم قرآن

ابن قتیبہ: تفسیر غریب القرآن ط۔ الحلبی

الطبری: تفسیر الطبری ط۔ الحلبی

الجصاص: احکام القرآن مصر

الواحدی: اسباب النزول

امام راغب اصفہانی: مفردات القرآن، الحلبی

الزمخشری: تفسیر الکشاف

قاضی ابوبکر ابن العربی: احکام القرآن الحلبی

الطبرسی: مجمع البیان فی تفسیر القرآن

الرازی: التفسیر الکبیر مصر

ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، الحلبی

الانتصاف من الکشاف

الزرکشی: البرہان فی علوم القرآن، ط۔ الحلبی

السیوطی: الدر المنثور فی التفسیر بالماثور ط۔ المیمنیہ

〃 الاکلیل فی استنباط التاویل

〃 الاتقان فی علوم القرآن

الآلوسی: روح المعانی

حاشیۃ الجمل

القاسمی: محاسن التاویل، الحلبی

سید رشید رضا: تفسیر المنار

محمود شلتوت: تفسیر القرآن الکریم۔ دار القلم

سید قطبؒ: فی ظلال القرآن، الحلبی

محمد عزہ دروزہ: التفسیر الحدیث، الحلبی

محمد فؤاد عبد الباقی: المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم۔ جدید الشعب

حدیث، شروح و علوم حدیث

امام مالکؒ: المؤطا الحلبی

ابن ابی شیبہ: المصنف، ملتان

احمد بن حنبلؒ: المسند، دار المعارف

البخاریؒ: الجامع الصحیح، ط۔ الشعب

〃 التاریخ الکبیر، حیدر آباد

امام مسلمؒ: صحیح مسلم، قاہرہ

سلیمان بن الاشعثؒ: سنن ابی داؤد، ط۔ السعادہ

ابن ماجہؒ: سنن ابن ماجہ الحلبی

الترمذیؒ: جامع الترمذیؒ

امام ابی عبدالرحمٰن: سنن النسائی

الطحاویؒ: مشکل الآثار ، حیدرآباد

الخطابی: معالم السنن، ط۔ انصار السنۃ

الرازی: الجرح والتعدیل حیدرآباد

المنذری: مختصر سنن ابی داؤد

الحاکم: مستدرک علی الصحیحین، حیدرآباد

البیہقی: السنن الکبریٰ ، حیدرآباد

علی بن عثمان المارد ینی: الجوہر النقی ، حیدرآباد

الحازمی: الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار حیدرآباد

المقدسی، عبدالغنی: عمدۃ الاحکام، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ

ابوالبرکات ابن تیمیہ: منتقی الاخبار من احادیث سید الاخیار

المنذری: الترغیب والترہیب ، الحلبی

النووی: شرح النووی علی صحیح مسلم

ابن دقیق العید: الاحکام شرح عمدۃ الاحکام

التبریزی: مشکاۃ المصابیح

الذہبی: تلخیص المستدرک ، حیدرآباد

〃 میزان الاعتدال ، الحلبی

ابن قیم الجوزیہ: تہذیب سنن ابی داؤد

الزیلعی: نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ، ط۔ دار المامون

العراقی: تخریج احادیث الاحیاء

ابوزرعہ: طرح التثریب شرح التقریب

الہیثمی: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ط۔ مکتبۃ القدسی

العسقلانی: فتح الباری شرح صحیح البخاریؒ، المطبعۃ الخیریۃ

〃 بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام

〃 تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر، الہند

〃 تہذیب التہذیب حیدرآباد

〃 تقریب التہذیب، دار الکتاب العربی

〃 تخریج احادیث الکشاف

بدرالدین العینی: عمدۃ القاری، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ

السیوطی: الجامع الصغیر من حدیث البشیر النذیر، الحلبی

〃 اللآلی المصنوعۃ من الاحادیث الموضوعۃ، المکتبۃ التجاریۃ

〃 زہر الربی علی المجتبیٰ

〃 تدریب الراوی علی تقریب النواوی

صفی الدین الخزرجی: خلاصۃ تذہیب الکمال فی اسماء الرجال

علاؤالدین المتقی: کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال حیدرآباد

علی القاری: مرقاۃ المفاتیح ، ملتان

〃 المبین المعین لفہم الاربعین

المناوی: فیض القدیر شرح الجامع الصغیر

〃 التیسیر شرح الجامع الصغیر، بیروت

اسماعیل العجلونی: کشف الخفاء ومزیل الالباس عما اشتہر من الاحادیث علی السنۃ الناس

الصنعانی: سبل السلام شرح بلوغ المرام، مطبعۃ صبیح

امام شوکانیؒ: نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، الحلبی

امام شوکانیؒ: الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ
عبدالحی لکھنوی: الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل ، دار لبنان
" الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ ، حلب
محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری: تحفۃ الاحوذی بشرح جامع الترمذی ، القاہرۃ
عبدالرحمٰن البنا الساعاتی: الفتح الربانی بترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی و شرحہ بلوغ الامانی۔
ونسنک: مفتاح کنوز السنۃ، ترجمہ الاستاذ فؤاد عبدالباقی۔
ناصرالدین البانی: سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، دمشق
" سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ
جماعۃ من المستشرقین: المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث ، لیدن
المبارکفوری: مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ، الہند

فقہ حنفی

الامام ابویوسفؒ: کتاب الخراج السلفیہ
السرخسی: المبسوط مطبعۃ السعادۃ
" شرح السیر الکبیر حیدرآباد
الکاسانی: بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع
المرغینانی: الہدایۃ شرح بدایۃ المبتدی۔
البابرتی: العنایۃ علی الہدایۃ
ابن الہمام: فتح القدیر
شیخ زادہ: مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر، استنبول۔
ابن نجیم: البحر الرائق شرح کنز الدقائق۔
الحصکفی: الدر المختار شرح تنویر الابصار۔
" در المنتقی شرح الملتقی۔
ابن عابدین شامی: رد المحتار علی الدر المختار، استانبول

فقہ مالکی

امام مالکؒ: المدونۃ الکبریٰ، المطبعۃ الخیریۃ
ابن ابی زید القیروانی: الرسالۃ
ابوالولید سلیمان الباجی: المنتقی شرح الموطا، مطبعۃ السعادۃ
ابن رشد: بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، مطبعۃ الاستقامۃ
ابوالضیاء خلیل: مختصر خلیل
ابن ناجی: شرح الرسالہ ، مصر
علامہ زروق: شرح الرسالہ ، مصر
محمد الخرشی: شرح الخرشی علی مختصر خلیل
شرح الزرقانی علی الموطا
الشیخ محمد علی مفتی المالکیہ: تہذیب الفروق والقواعد السنیہ
الدردیر: الشرح الکبیر علی مختصر خلیل۔

الدردیر: الشرح الصغیر علی اقرب المسالک لمذہب الامام مالکؒ - الحلبی

الدسوقی: حاشیۃ الدسوقی۔

الصاوی: بلغۃ السالک لاقرب المسالک

شیخ محمد علیش: فتح العلی المالک فی الفتوی علی مذہب مالک، مطبعۃ مصطفیٰ محمد

فقہ شافعی

الشافعی: الام بولاق

الماوردی: الاحکام السلطانیہ، الحلبی

الشیرازی: المہذب المنیریہ

الغزالی: الوجیز المنیریہ

الرافعی: فتح العزیز شرح الوجیز، المنیریہ

النووی: المجموع شرح لمہذب، المنیریہ

〃 روضۃ الطالبین، طبع المکتب الاسلامی

〃 المنہاج

ابن حجر الہیثمی: تحفۃ المحتاج بشرح المنہاج

الرملی: نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج

فقہ حنبلی

الخرقی: مختصر الخرقی

ابو یعلی حنبلی: الاحکام السلطانیہ، الحلبی

ابن قدامہ المقدسی: المغنی، ط۔ المنار

ابن قدامہ المقدسی: الکافی، دمشق

〃 الشرح الکبیر علی المقنع

ابن تیمیہ: فتاوی ابن تیمیہ القاہرہ

〃 الاختیارات

ابن مفلح الفروع

ابو الحسن المرداوی: تصحیح الفروع، دار عمر للطباعۃ

〃 الانصاف فی الراجح من الخلاف، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ

منصور بن یونس البہوتی: الروض المربع شرح زاد المستنقع، مطبعۃ السنۃ المحمدیہ

عبد العزیز العنقری: حاشیۃ العنقری،

مرعی بن یوسف الکرمی: غایۃ المنتہی

مصطفیٰ السیوطی الرحیبانی: مطالب اولی النہی شرح غایۃ المنتہی، دمشق

محمد بن سالم بن ضویان: منار السبیل شرح الدلیل ط۔ المکتب الاسلامی۔

فقہ ظاہری

ابن حزم الاندلسی: المحلّی المنیریہ

فقہ زیدی

امام زید بن علی: مجموع الفقہ الکبیر مع شرح الروض النضیر

المہدی لدین اللہ یحیی بن المرتضی: البحر الزخار الجامع لمذاہب علماء الامصار۔